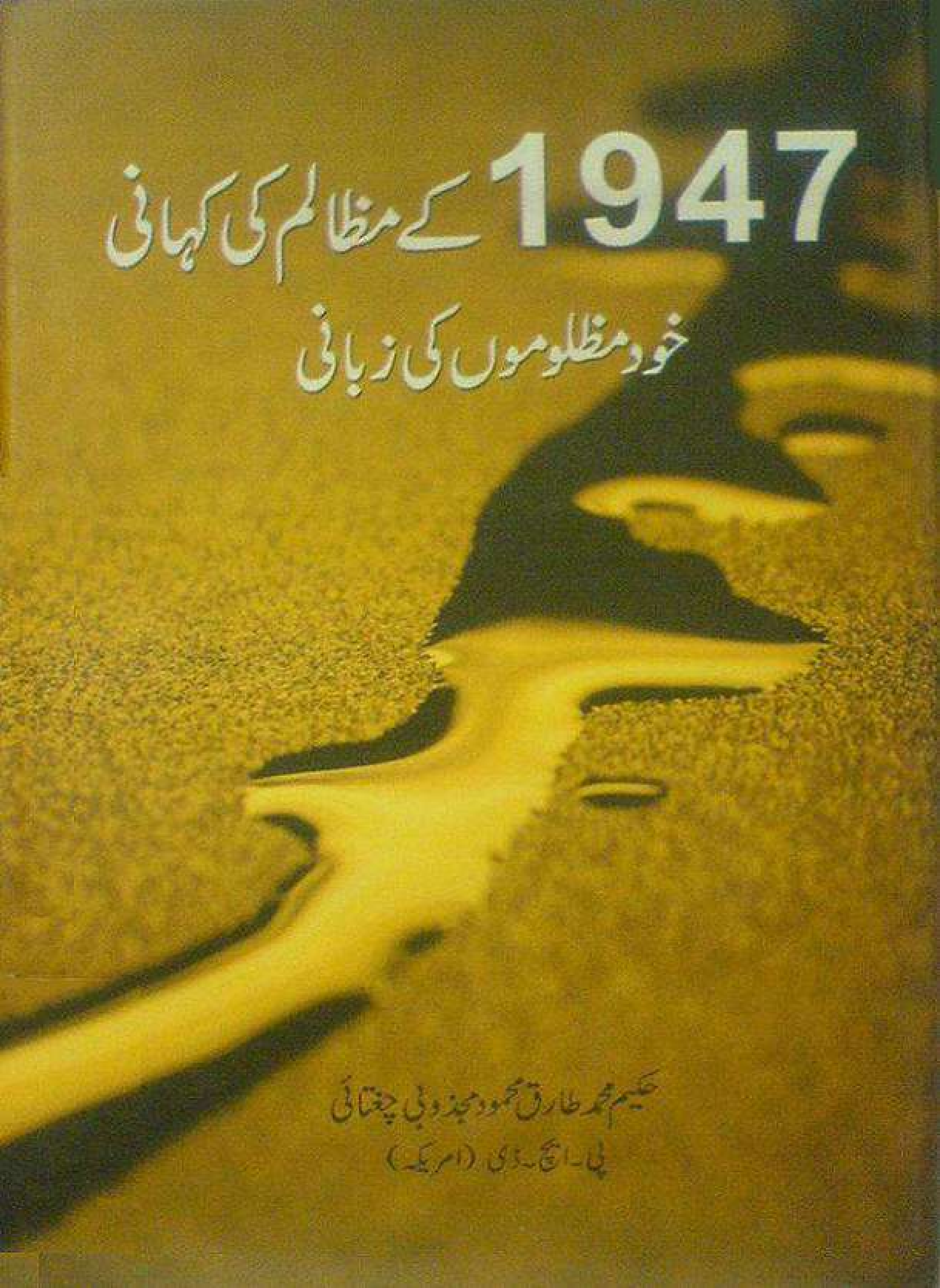

1947 کے مظالم کی کہانی

خود مظلوموں کی زبانی

حکیم محمد طارق محمود مجذوبی چغتائی
پی۔ ایچ۔ ڈی (امریکہ)

1947ء کے مظالم کی کہانی

خود مظلوموں کی زبانی

ایسے خون آشام قلب وجگر کو تڑپا دینے والے چشم دید واقعات جنہیں پڑھ کر ہر چشم پُرنم ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کی خون سے لکھی تحریریں جنہوں نے پاکستان کے لیے سب کچھ لٹا دیا اور اس مملکت سے ٹوٹ کر پیار کیا۔ تو پھر یہی صدا بلند ہوتی ہے کہ

کیا
آزادی کے چراغ خون سے جلتے ہیں؟

تحقیق وتالیف حکیم محمد طارق محمود چغتائی (گولڈ میڈلسٹ)

نوٹ:

اس کتاب کے جملہ حقوق بحق مصنف (حکیم محمد طارق محمود چغتائی) اور پبلشرز (علم وعرفان) محفوظ ہیں۔ ادارہ علم وعرفان نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

فہرست

1۔ حال دل 7
2۔ امرتسر کی ایک ہولناک رات 8
3۔ پٹیالہ کے مسلمانوں پر ٹوٹنے والی قیامت صغریٰ (1) 18
4۔ پٹیالہ کے مسلمانوں پر ٹوٹنے والی قیامت صغریٰ (2) 26
5۔ راہ آزادی کی کہانیاں 29
6۔ بیدر کا قتل عام 34
7۔ دلی کی بپتا 40
8۔ دہلی سے لاہور 52
9۔ مہاجر کیمپ کی بپتا 56
10۔ آزادی کے چراغ خون سے جلتے ہیں 60
11۔ وہ جو کٹ گئے تیری راہ میں 67
12۔ آزادی کی مٹی 71
13۔ لہو کی پہلی بارش 75
14۔ داستان ہجرت 80
15۔ نشان پاکستان 86
16۔ آزاد کشمیر کا ایک زندہ جاوید مجاہد 93
17۔ آزادی کے سائے میں 96
18۔ میں نے پاکستان بنتے دیکھا 101
19۔ لاہور جل رہا تھا 111
20۔ کوئی خطرہ نہیں 120

فہرست

21۔ لدھیانے سے لاہور تک 124
22۔ سورت کی دل خراش صورت 138
23۔ اور بھوانی مسلمانوں سے خالی ہو گیا 146
24۔ ہم نے پاکستان بنتے دیکھا 155
25۔ بچوں کا کردار تحریک پاکستان میں 162
26۔ معصوم خون 165
27۔ اور دیا جلتا رہا 169
28۔ عشو پگلی 186
29۔ جھنگڑ و دھرمسال کا معرکہ 195
30۔ ہردوار میں ہندوانہ گھاتیں 200
31۔ خواب یہ ہم دیوانوں کے 205
32۔ دو لاکھ مسلمانوں کی تڑپتی ہوئی لاشیں 210
33۔ حضور جی 225
34۔ داستان آزادی کا شمشیر بکف باب 243
35۔ روداد چمن 47ء کی 249
36۔ دلی کی بپتا 257
37۔ 47ء کے ناقابل فراموش مناظر 265
38۔ طلوع آزادی کی چند یادیں 285
39۔ گل آزادی 290
40۔ لہو لہو داستانیں 301

فہرست

41۔ انبالے سے لاہور تک 301
42۔ نذیر احمد نیشنل ایمرجنسی کے نام 304
43۔ پاکستان۔ میرے خوابوں کی جنت 309
44۔ سفرنامہ ہجرت 313
45۔ خاکستر میں چنگاری 320
46۔ چلتی ریل کی آخری بوگی 323
47۔ مسرور بانو 330
48۔ سونا کا لہو 334
49۔ پہلے یوم آزادی کی فوجی یادیں 337
50۔ جب میں نے ہجرت کی 345
51۔ تین مناظر جو مجھے اب تک یاد ہیں 352
52۔ 2 سوال آزادی کے 354
53۔ آدم خور 360

ملنے کے پتے

علم و عرفان پبلشرز
40۔ الحمد مارکیٹ، اُردو بازار لاہور
Ph: 042-37352332

سیونتھ سکائی پبلی کیشنز
غزنی اسٹریٹ اُردو بازار لاہور
Ph: 042-37223584

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	1947ء کے مظالم کی کہانی خود مظلوموں کی زبانی
تحقیق و تالیف	....	حکیم محمد طارق محمود چغتائی
ناشر	....	علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	....	جوہر رحمانیہ پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت	....	2003ء
کمپوزنگ	....	اقبال اعتبار
قیمت	....	-/250 روپے

کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے، ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔

اگر **آپ** ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم سے kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود **ADs** کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجیے، آپکی یہی مدد کافی ہوگی۔

یاد رہے، کتاب گھر کو صرف **آپ** بہتر بنا سکتے ہیں۔

حال دل

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

لفظ انقلاب کہنا بالکل آسان لیکن دیکھنا اور انقلابی مراحل سے گزرنا بالکل مشکل دنیا میں جتنے بھی انقلاب آئے تمام خون کی ندیاں اور انسانی سروں کے مینار لے کر آئے۔ بالکل یہی حال 1947ء کے انقلاب کا تھا۔ لاکھوں جانیں برباد ہوئیں اور لاکھوں عزتیں تار تار ہوئیں دل خون کے آنسو روتا ہے پھر بھی جگر تھام کر اگر ان داستانوں کو اکٹھا کیا جائے تو وہ داستانیں بھی لاکھوں ہی ہیں۔

اس موضوع پر قلم اٹھانا کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ صرف ایک واقعے سے محسوس کرلیں بندہ ایک سفر کے دوران کسی خیال میں کھویا ہوا تھا کہ ایک اجنبی عمر رسیدہ خاتون کے رونے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

وہ رو رو کر اپنی داستان غم بیان کر رہی تھی 1947ء کے بیتے حالات و واقعات کچھ اس انداز سے بیان کر رہی تھی کہ تمام مسافر پُرنم تھے۔ میں نے سوچا اس داستان کو لکھ لوں لیکن جب میں اس خاتون کے قریب ہوا اور اس سے عرض کیا کہ میں یہ کہانی لکھنا چاہتا ہوں اس نے غم بھرے لفظوں میں کہا کہ کیا لکھیں گے میرا جگر بار بار ایسے واقعات بیان کرنے سے قاصر ہے۔

قارئین کرام زیر نظر کتاب اپنے موضوع کی ایک انوکھی داستان ہے۔ بندہ نے ایسی داستانیں جو کہ حال غم کی یادوں کو زندہ کردے، زیادہ بیان کیں ہیں۔

میری التجاء ہے کہ اگر آپ کی نظر سے کوئی اور داستان غم گزری ہو یا خود آپ کے ساتھ یا آپ کے خاندان کے ساتھ بیتی ہو بندہ کو ضرور لکھیں۔ کیونکہ زیر نظر کتاب اردو سیارہ اور قومی ڈائجسٹوں کے بغیر نامکمل تھی بندہ ان کا مشکور ہے۔

خواستگارِ اخلاص وعمل

حکیم محمد طارق محمود عبقری مجذوبی چغتائی

قرطبہ چوک مزنگ سٹریٹ یونائیٹڈ بیکری
نزد دفتر چرچ کونسل جیل روڈ، لاہور
0300-9425937

امرتسر کی ایک ہولناک رات

> ”ہندوؤں نے میرے دونوں بھائیوں اور ابا جان اور امی جان کو میرے سامنے شہید کر دیا اور مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے۔ ان ہندوؤں سے جا کر کہہ دیں کہ ایک مسلمان گھرانے کی لڑکی کو اپنی عزت جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے“

یہ واقعہ مجھے کامریڈ موہن سنگھ بجلی نے سنایا۔

کامریڈ بجلی آل انڈیا سوشلسٹ پارٹی کی امرتسر شاخ کا ممبر تھا پارٹی کا دفتر ہال بازار میں سندھ شکار پور ہوٹل کے سامنے، مسجد خیر الدین کے پہلو میں تھا۔ نیچے گراموفون ریکارڈوں کی دکان تھی جہاں سے دن بھر کبھی کملا جھریا، کبھی اختری بائی، فیض آبادی، کبھی پیارو قوال اور کبھی سہگل، کانن اور مہنکج کے گیتوں کی آواز آیا کرتی۔ اسی دکان کی بغل سے تنگ سیڑھیاں اوپر پارٹی کے دفتر کو جاتی تھیں۔

سوشلسٹ پارٹی کے دفتر میں ہی امرتسر تانگہ ڈرائیور یونین کا دفتر بھی تھا جس کا سیکرٹری کامریڈ چمن اور جنرل سیکرٹری ظہیر کاشمیری تھا۔ ناٹے قد اور گٹھے ہوئے بدن والا کامریڈ چمن کوچوانوں کے چندے کی شراب پی کر شام کو پارٹی کے دفتر میں آ کر خوب اودھم مچاتا۔ کامریڈ اللہ رکھا ساجد جناح کیپ اور گھر دھلی شلوار قمیض اور بڑا مخلص معلوم ہوتا۔ وہ پنجابی کا شاعر بھی تھا، کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتا۔ ایک روز میں اور احمد راہی دفتر کی بالکونی میں کرسیاں ڈالے بیٹھے ہال بازار کی رونق دیکھ رہے تھے کہ کامریڈ ساجد ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ بازار میں ہندو سکھ لڑکیاں بڑی تعداد میں گزر رہی تھیں۔ غالباً اُس روز کوئی تہوار تھا۔

ظہیر کاشمیری نے پارٹی دفتر کے اوپر والے کمرے پر قبضہ جما رکھا تھا۔ چاروں طرف کتابوں کے ڈھیر پڑے رہتے۔ دری پر ایک صندوقچی رکھی تھی۔ کونے والی میز پر سیاہ پتھر کا ایک چورس ٹکڑا پڑا تھا۔ جس پر ٹیگور کے نقوش ابھرے ہوئے تھے۔ کامریڈ ساجد کامریڈ بجلی، کامریڈ شریف متین، کامریڈ چمن اور کامریڈ کنول ...... یہ لوگ سوشلسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ ظہیر کاشمیری خانساماں یونین اور تانگہ ڈرائیور یونین کے لیے کام کرتا۔ میں اور احمد رہی کبھی کبھی اس دفتر میں جا کر گپ بازی میں وقت گزارا کرتے۔

مجلس اِحرار کا ان دنوں امرتسر میں بڑا زور تھا۔ مسجد خیر الدین اور انجمن پارک کی فضائیں سید عطا اللہ شاہ بخاری اور شیخ حسام الدین کی جوشیلی بھڑکیلی تقریروں سے گونجا کرتی تھیں۔ اس جماعت میں بڑے مخلص کارکن بھی تھے مگر حکومت الٰہیہ کے پروگرام کی تفصیلات کو یہ واضح صورت میں امرتسری مسلمانوں کے سامنے پیش نہ کر سکتے تھے۔ میرے خیال میں اس جماعت کا سارا جوش، شعلہ فشاں تقریروں ہنگامہ خیز جلسوں، پُر ہجوم

جلوسوں اور فلک شگاف نعروں میں صرف ہوتا تھا۔ جو کچھ بھی تھا امرتسر کی سیاسی فضا کو پُر جوش، گرم اور بیدار رکھنے میں مجلس اِحرار بھی بڑا کام کر رہی تھی۔ اس جوش کو بعد میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی نیلی پوش تحریک نے بھی خوب گرمایا اور جب مسلم لیگ پاکستان کا مشن لے کر سامنے آئی تو امرتسری مسلمانوں کو پہلی بار اندھیرے کے سمندر میں دور...... روشنی کا ایک مینار اٹھتا دکھائی دیا۔ پاکستان کے قیام کا پروگرام ایک بڑا واضح اور مثبت پروگرام تھا۔ اس پروگرام کی قیادت ایک پُرعزم، بے لوث اور مردِ آہن کے ہاتھ میں تھی جس نے برہمنی سامراج کے مکروفریب کے پردے کو چاک کر کے اسلام کا پرچم بلند کیا تھا۔ پنجاب کے مسلمانوں اور خاص طور پر امرتسر کے مسلمان سیاسی طور پر 1857ء سے لے کر اس وقت تک سیاسی بے یقینی کے اندھیروں میں بھٹکتے رہے تھے۔ ہندوؤں کی تہذیب، کلچر اور مذہب الگ تھا۔ ان کے ساتھ مل کر وہ رہ نہیں سکتے تھے۔ ان سے الگ ہو کر رہنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ امرتسر میں ہر محرم اور عید میلاد پر ہندو مسلم فساد ہو جاتا تھا۔ پٹ رنگوں کا تعزیہ گورو بازار میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ جو کہ ہندو سکھوں کا گڑھ تھا۔ غیر مسلم اس تعزیئے پر پتھر پھینک کر بھاگ جاتے۔ ایک بار محرم پر کرموں ڈیوڑھی کے ہندو حلوائی نے کھولتا ہوا گھی مسلمانوں پر پھینک دیا جس کا بدلہ اسی وقت ہندو حلوائی کی دکان کو نذر آتش کر کے لیا گیا۔ امرتسر کا مسلمان، بہادر، دلیر اور نڈر تھا۔ ہندو سکھ ہمیشہ اس سے دب کر رہتے تھے۔ پھر بھی غیر مسلم اپنی فرقہ وارانہ شرارتوں سے باز نہ آتے تھے اور ہر مذہبی تہوار پر فساد کھڑا کر دیتے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے درشنی ڈیوڑھی میں عید میلاد النبیؐ کے جلوس پر ہندو لڑکوں کو پتھر پھینکتے اور پھر بھاگتے دیکھا ہے۔ میں ان دنوں ایم۔ اے۔ او ہائی سکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ عید میلاد کا جلوس شہر میں سے ہوتا ہوا سکتری باغ کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے چاند تارے والا سبز پرچم اٹھا رکھا تھا۔ ان دنوں جلوسوں میں جھنڈے اٹھانے کا بڑا شوق تھا۔ پرچم اٹھائے جب ہم سینہ تانے اپنے محلے میں سے گزرتے تو ہمیں محسوس ہوا کرتا گویا ہم دشمن پر فتح پا کر آ رہے ہیں۔ جب یہ جلوس درشنی ڈیوڑھی میں پہنچا تو ایک ہندو کے مکان سے چند اینٹیں ہمارے آگے پڑیں۔ میں نے مکان کی طرف دیکھا تو وہاں چھت پر سے دو چار ہندو لڑکے دوسرے مکان میں کود رہے تھے۔ ہم نے اس مکان کا بند دروازہ توڑ دیا۔ مگر پولیس نے مداخلت کر کے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ ہندو ہمیشہ چُھپ کر مسلمانوں کے جلسوں اور جلوسوں پر پتھر پھینکتے اور دُم دبا کر بھاگ جاتے۔ وہ کھل کر کبھی میدان میں سامنے نہیں آتے تھے۔ جب امرتسر کے شیر مسلمان میدان میں آتے تو میدان خالی ہوتا...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ غیر مسلموں کی یہ اشتعال انگیز حرکتیں کب تک جاری رہیں گی۔ اور مسلمانوں کی آنے والی نسلیں برہمنوں کی فتنہ پرور اور منافقانہ ذہنیت کے ساتھ اپنا مستقبل کیسے سنوار سکیں گی۔

چنانچہ اسی تہذیب اور عدم اطمینان کے عالم میں جب پاکستان کی قرارداد سامنے آئی تو مسلمانوں کو پہلی بار اپنی منزل کا سراغ ملا اور انہوں نے اس منزل درخشاں تک پہنچنے کے لیے جان و مال کی قربانیاں دینے کا عزم بالجزم کر لیا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ابھی تک ہندو لیڈروں کے دام میں گرفتار تھے اور کانگریس کی برہمنی جماعت کو ہی ہندوستان کی واحد جماعت سمجھتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب برہمنی سامراج اور مسلم دشمنی کے شعلے ان کے گھروں تک پہنچ گئے۔ تو ان پر ہندو کا منافقانہ اور اسلام دشمن اندازِ فکر کھل کر سامنے آ گیا۔ میں ان دنوں میٹرک کا امتحان دے رہا تھا۔ لیکن میری خانہ بدوشیاں مجھے اتنی عمر میں یہ بمبئی سے کلکتے، ناگ پور سے مدارس، ترچنا پلی، رامیشورم اور وہاں سے لنکا اور پھر وہیں سے رنگون تک گھما پھرا لائی تھیں۔ میں نے مدارس کے موپلد مسلمانوں کو اسلامی شعار پر انتہائی پابندی سے عمل کرتے دیکھا تھا۔ میں نے وزیگاٹیم میں مرہٹے مسلمانوں

کو سرخ آنکھیں لیے سلطان ٹیپو کے مزار پر نامعلوم خلاؤں میں گھورتے دیکھا تھا۔ میں نے رنگوں کی جامع مسجد میں مسلمانوں کو نمازِ جمعہ کے بعد دین اسلام کی مرکزیت اور عالم اسلام کی ترقی وخوشحالی کی دعائیں مانگتے سنا تھا۔ میں نے رنگوں کے زیر بادی برمی مسلمانوں کے محلوں میں صبح کے وقت قرآن کریم کی تلاوت کی پُرشکوہ آوازیں سنی تھیں۔ اور میں کولمبو کی ٹیپو مسجد میں ہر نماز پر مسلمانوں کے اجتماع عظیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ پھر میں نے اجین اور ناگ پور کے برہمنوں کو مسلمانوں کے ساتھ چھوت چھات کرنے اور دامن بچا کر نفرت سے گزرتے دیکھا تھا۔ میرے سامنے ہندو کلکتے کی زکریا سٹریٹ والی مسجد ناخدا کے آگے سے باجے بجاتے اور مسلمانوں کو مشتعل کرتے گزرا کرتے تھے۔ اس عمر میں ہی مجھے سیاسی بصیرت نہ سہی مگر اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ ہندوستان کے ہندو...... مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اور ان کے جھوٹے برتنوں کو ہاتھ لگائے بغیر کتوں کے آگے پھینک دیتے ہیں۔ امرتسر کے ہندو محلوں میں جگہ جگہ پانی کی سبیلیں لگی ہوتیں۔ ان سبیلوں پر ہندو اور سکھ یا تو شیشے یا تانبے کے گلاس میں پانی پیتے اور کسی غریب سبیل پر اوک سے پانی پی لیتے لیکن مسلمان کو ہر ہندو سبیل پر بانس کی نلکی میں پانی ڈال کر جانوروں کی طرح پینا پڑتا۔ گویا مسلمان کو ہندو اچھوتوں سے بھی کم تر سمجھتے تھے۔ یہ وہ ذلت انگریز رویہ تھا جسے کوئی بھی غیور قوم برداشت نہیں کر سکتی۔ اور مسلمان ایک بہادر اور غیور قوم ہے۔ اس نے کئی سو برس تک ہندوؤں پر حکومت کی تھی۔ وہ بھلا اس ذلت کو کیونکر زیادہ برداشت کر سکتی تھی۔ قرار دادِ پاکستان نے مسلمانوں کو ان کی عزتِ نفس، دین، کلچر اور غیرت کے تحفظ کا پیام دیا تھا۔ چنانچہ امرتسر کے تقریباً ہر مسلمان کے دل میں پاکستان کی شمع روشن ہو گئی اور وہ آندھیوں اور طوفانوں کے مقابلے کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔

دوسرے مسلمان گھروں کی طرح ہمارے گھر میں بھی مسلم لیگ اور پاکستان کا چرچا رہنے لگا۔ ہمیں اور تو کچھ علم نہیں تھا۔ ہاں اتنا ضرور معلوم تھا کہ پاکستان بن گیا تو مسلمانوں کو ایک علیحدہ ملک مل جائے گا۔ جس میں وہ آزادی اور عزت کے ساتھ رہیں گے۔ اور ایک مسلمان کے لیے آزادی اور عزت سے بڑھ کر اور کوئی شے اس دنیا میں نہیں ہے۔

شہر میں مسلم لیگ کے جلسے منعقد ہونے اور جلوس نکلنے شروع ہو گئے۔ ایک بار انجمن پارک میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔ میں اپنے چھوٹے بھائی مقصود کے ساتھ جلسہ سننے گیا۔ مجھے آج اچھی طرح یاد ہے کہ جب راجہ غضنفر علی خان تقریر کے بعد تالیوں کے شور میں سٹیج سے نیچے اتر رہے تھے تو ایک لیگی کارکن نے نعرہ لگایا۔

’’راجہ غن ظفر علی خان............زندہ باد‘‘

اور میں نے اپنے بھائی کو بتایا کہ یہ لفظ اصل میں غضنفر ہے۔ وقت گزرتا گیا۔ جنگ شروع ہو گئی پھر ختم ہو گئی۔ اور شہر میں سیاسی ہنگامے زیادہ تیز ہو گئے۔ گول باغ، انجمن پارک، مسجد خیر الدین، سکتری باغ، اور مسجد جان محمد میں ہر جمعہ کو جلسے ہونے لگے۔ شاید انہیں دنوں لندن سے کینٹ مشن آیا۔ شملہ کانفرنس ہوئی۔ پاکستان کی منزل قریب آ رہی تھی اور امرتسری مسلمانوں میں جوش وخروش بڑھ رہا تھا۔ عورتوں کے جلوس ’’پاکستان زندہ باد‘‘ کے نعرے لگاتے نکلنا شروع ہو گئے۔ پولیس ان پر آنسو گیس پھینکنے لگی۔ امرتسر کی کوئی دکان، کوئی ہوٹل، کوئی بیٹھک ایسی نہ تھی جہاں پاکستان اور قائداعظم کے بارے میں بات نہ ہوئی ہو۔ مارکیٹ حکم سنگھ میں صوفی غلام محمد ترک کا ترک ہوٹل اور کامریڈ ہوٹل، امرتسری شاعر،

ادیبوں اور دانشوروں کے ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس تھے۔ یہاں صبح و شام گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ سوشلسٹ پارٹی کے دفتر میں بھی ’’پاکستان زندہ باد‘‘ کے نعروں کی گونج پہنچ چکی تھی۔ ایک روز مجھے کامریڈ موہن بجلی نے کہا۔

’’یار تم لوگ تو معلوم ہوتا ہے۔ پاکستان بنا لو گے۔ لیکن ہمارا کیا بنے گا؟ ہم لوگ ہندوؤں کے ساتھ کیسے گزاریں گے‘‘؟

’’بہر حال اسلام کے مقابلے میں تم لوگ ہندو مذہب کے بہت قریب ہو۔ تمہارا گزارا ہو جائے گا‘‘۔ میں نے کہا۔

اس پر کامریڈ موہن سنگھ بجلی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ اور اس کے بالوں بھرے ادھیڑ عمر کے بجھے سے چہرے پر لگی عینک کے شیشے ماند پڑ گئے تھے۔ کامریڈ بجلی بڑا مخلص سکھ تھا۔ اسے نہ اسلام سے دلچسپی تھی، نہ ہندوازم سے اور نہ سکھ مت سے...... مگر کڑا کرپان ضرور پہنتا تھا اور کیس بھی اس نے رکھے ہوئے تھے۔ یہ حقیقت اس زمانے میں ہی میرے تجربے میں آ چکی تھی کہ ہندو اور سکھ کمیونسٹ ہو کر، دہریہ ہو کر بھی اپنے مذہبی شعائر پر کسی نہ کسی طور پر قائم رہتے تھے۔ ہمارے محلے کے رام گڑھیا ہائی سکول میں ہمارا حساب کا ماسٹر مونا سکھ تھا۔ اور دہریہ تھا۔ یعنی اس نے داڑھی مونچھ اور بال صاف کر رکھے تھے۔ پھر بھی وہ صبح کے وقت شبار کیرتن بڑے ادب سے ہاتھ باندھ کر سنتا اور ہر بات میں گرونانک اور گورو ارجن کے کسی قول کا حوالہ ضرور دیتا۔ اور اندر سے وہ دین اسلام کا کٹر دشمن بھی تھا۔

لیکن کامریڈ موہن سنگھ بجلی بڑا مرنجاں مرنج سکھ تھا۔ جب امرتسر میں 1946ء کے بعد ہندو مسلم فسادات کی آگ زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھی پھر بھی کامریڈ بجلی کرفیو کھلنے کے بعد پارٹی کے دفتر کا ایک چکر ضرور لگاتا۔ پارٹی کا دفتر مسلم اکثریت کے محلوں میں گھرا ہوا تھا۔ ہم نے اسے کئی بار سمجھایا کہ وہ یوں کھلے بندوں نہ آیا کرے۔ مگر اس نے ہر بار مسکرا کر یہی کہا ’’کامریڈ! مجھے مار کر کوئی کیا کرے گا‘‘

مگر لاہور اسمبلی ہال کی سیڑھیوں پر ماسٹر تارا سنگھ نے ننگی تلوار لہرا کر اعلان کر دیا تھا کہ سکھ پاکستان کبھی نہیں بننے دیں گے اور مسلمان ہر قیمت پر پاکستان بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اور امرتسر کے گلی کوچے پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے تھرا رہے تھے۔ چنانچہ ایک روز کامریڈ موہن سنگھ بجلی پر حملہ ہو گیا۔ کامریڈ بجلی نے بڑی مشکل سے جان بچا کر پارٹی کے دفتر میں آ کر پناہ لی۔ اس کے بعد اس نے ہال بازار میں دفتر کی طرف آنا بند کر دیا۔ موہن سنگھ بجلی محلّہ، بمبے والا کھوہ میں، تاروں والے باغ کے سامنے ایک گلی میں رہتا تھا۔ یہ محلّہ ہندو اکثریت کا محلّہ تھا۔ اس سے آگے جا کر چوک لوب گڑھ آتا تھا۔ جہاں دروازہ لوہگڑھ کے آس پاس دو چار محلے مسلمانوں کے تھے۔

جو واقعہ مجھے کامریڈ موہن سنگھ بجلی نے سنایا اس کا تعلق اگست 1947ء کے اواخر سے ہے۔ یہ بڑے آگ اور خون میں لتھڑے ہوئے دن تھے۔ کٹڑہ جھیل سنگھ چوک گولی ہٹی سے لے کر پھم والے بازار تک اور وہاں سے لے کر مسجد قاصداں تک سارے کا سارا جل کر راکھ بن چکا تھا۔ ادھر بازار گڑھیاں، کٹڑہ کرم سنگھ، بازار سرائے رامداس، بازار بھنگیاں، محلّہ اہلواہیاں اور ہندو اکثریت میں گھرے ہوئے اسی قسم کے دوسرے محلوں میں مسلمانوں کے گھروں کو نذر آتش کیا جا رہا تھا۔ ضلع گورداسپور اور امرتسر ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے تھے۔ ہندوؤں نے مکانوں پر ترنگے لہرا دیئے تھے۔ وہ فوج کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خالی گھروں کو لوٹ کر آگ لگا رہے تھے۔ ہندو محلوں سے مسلمانوں محلوں پر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ امرتسر کے گلی کوچوں، بازاروں، پارکوں، باغوں اور نالوں میں پڑی ہوئی لاشوں کو گدھ اور کتے نوچ رہے تھے۔ شہر کے وسط میں مسلمانوں کے

محلوں کے محلے ویران ہو چکے تھے۔ مسلمان اپنا سب کچھ لٹوا کر مہاجر کیمپوں میں دم بخود بیٹھے شہر کی چار دیواری سے اٹھتے سیاہ دھوئیں اور سرخ شعلوں کو تک رہے تھے۔ شریف پورہ کی مسلم آبادی کو مہاجر کیمپ قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کے باہر ہماری مشہور بلوچ رجمنٹ مشین گنیں لیے بیٹھی تھی۔ اسے جی ٹی روڈ عبور کر کے شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ شہر میں گورکھا' ڈوگرہ اور سکھ رجمنٹوں کا راج تھا۔ سوائے ہمارے محلے کٹڑہ مہاں سنگھ کے امرتسر کی ساری زخم خوردہ مسلم آبادی کیمپوں میں کوچ کر گئی تھی۔ کٹڑہ میں مہاں سنگھ کے مسلمان سمٹ سمٹ کر ہماری گلی کوچہ ڈبگراں میں آ گئے تھے۔ اور ہم ان لڑکوں کا انتظار کر رہے تھے۔ جو ہمیں اس گلی سے اٹھا کر شریف پورے کے کیمپ میں پہنچانے والے تھے۔ کرفیو کے کھلنے اور لگنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سوائے ہمارے محلے کے سارا امرتسر ہندو فوج کی تحویل میں تھا۔ اتنے بڑے شہر میں رہنے والی مسلم اکثریت کے مکانوں کو لوٹ لوٹ کر' آگ لگا لگا کر ہندو سکھ تھک چکے تھے۔ ہماری گلی کے منہ پر لوہے کا مضبوط دروازہ چڑھا دیا گیا تھا۔ پکی گلی' کیری باغ' محلّہ بکروانان' چوڑا کھوہ' پیلا ہسپتال اور کوچہ رنگریزاں کے سارے مسلمان گھرانے ہماری گلی میں پناہ لے چکے تھے۔ یہ لوگ ننگے سر' ننگے پاؤں اپنے مکانوں سے بھاگے تھے۔ ہندو فوج نے دستی بموں اور مشین گنوں سے ان کے گھروں پر حملہ کر دیا تھا۔ ان میں سے کسی کا سارا خاندان سامنے قتل کر دیا گیا تھا' تو کسی کے جوان بچے کے سینے میں گولی ماردی گئی تھی کوئی بچہ اپنی ماں کو پکار رہا تھا تو کوئی اپنے شہید ہو چکے باپ کو رو رو کر آوازیں دے رہا تھا۔ پاکستان ٹائمز کے مشہور آرٹسٹ اور پاکستان کے نامور باکسر محمود بٹ کا بڑا بھائی حامد بٹ میرا کلاس فیلو تھا۔ اونچا لمبا جوان اور ہاکی کا بہترین کھلاڑی۔ اس کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔ جب ہندو فوجیوں نے ان کے محلے پر حملہ کیا تو اس نے ایک پل کے لیے کھڑکی کی چق اٹھا کر باہر دیکھا۔ تھری ناٹ تھری کی ایک گولی اس کی گردن پر آ کر لگی اور وہیں شہید ہو گیا۔ اس ہنگامہ قیامت میں غم نصیب گھر والے حامد کی لاش بھی اپنے ساتھ نہ لا سکے۔ حامد بٹ اگر زندہ رہتا تو آج ہماری قومی ہاکی ٹیم کے اہم ستونوں میں سے ہوتا۔ پیر احمد شاہ کشمیری کڑیل جوان تھا۔ سرخ و سفید رنگت' چہرے پر شرعی ڈاڑھی مونچھ۔ پانچ وقت کا نمازی۔ پرہیز گار' نیک سیرت...... اور خوبصورت...... ہماری گلی سے یہ پتہ کرنے نکلا کہ کوچہ رنگریزاں کے سارے مسلمان آ گئے ہیں یا نہیں...... دربار ی پنساری کی دکان کے سامنے چوک میں ہندو تھانیدار مہتہ نے اسے گولی مار کر شہید کر دیا اس کی لاش بھی وہیں پڑی رہی۔ یہ آنکھیں کس کس مسلمان کی شہادت پر اشکبار ہوں؟ یہ سینہ کس کس کے ماتم میں خوں چکاں ہو؟ ہزاروں ماؤں کے لعل مشرقی پنجاب کے شہروں میں بے گورو کفن رہ گئے۔ جن بھائیوں کو ان کی بہنوں نے سہرے باندھنے تھے انہیں کفن بھی نصیب نہ ہو سکے۔ بے شک ہم نے پاکستان اپنے پیاروں کا خون دے کر حاصل کیا ہے۔ اور اپنی جانیں دے کر بھی اس کی حفاظت کریں گے۔

امرتسر آگ اور خون میں نہا رہا تھا۔ فائروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ فضا میں جلی ہوئی لاشوں اور جلے ہوئے مکانوں کی بو تھی۔ ویران سڑکوں پر راتوں کو کتے روتے رہتے۔ ہر طرف خوف و دہشت کا دور دورہ تھا کہ کامریڈ موہن سنگھ بجلی مجھ سے ملنے میرے محلے میں آیا۔ میں گلی کے کونے والے مکان میں کھڑکی کے ساتھ لگا پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے آہنی جنگلے میں سے نیچے جھانک کر دیکھا کہ کامریڈ بجلی ایک پولیس جیپ سے نیچے اترا اور گلی کے آہنی دروازے کو آہستہ آہستہ کھٹکھٹانے لگا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ مٹیالی پھیکی دھواں آلود دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں نے بجلی کو دیکھ کر اوپر سے آواز دی ''کامریڈ بجلی! کس لیے آئے ہو''؟

مجھے پہلا خیال آیا کہ شاید وہ ہندو سکھ پولیس کو ساتھ لے کر ہمارے محلے پر حملہ کرانے آیا ہے۔ میں نے سوچا اگر ایسی بات ہوئی تو میں اوپر ہی سے بندوق کا فائر کر کے اسے ڈھیر کر دوں گا۔ میری آواز پر کامریڈ بجلی نے چہرہ اٹھایا اور ہاتھ سے عینک درست کی اور بولا

''کامریڈ! نیچے آؤ۔ مجھے تمہیں ایک امانت دینی ہے''

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کس کی امانت کامریڈ بجلی''؟۔

''تم نیچے آؤ''۔ بجلی بولا۔ ''میں تمہیں سب کچھ بتائے دیتا ہوں''۔

''مجھے تمہارے ارادے ٹھیک معلوم نہیں ہوتے'' میں نے کہا۔

''تم فوج کو لے کر ہمارے محلّہ میں کیوں آئے ہو؟''

اتنا سن کر کامریڈ بجلی نے پولیس سے کہا کہ وہ جیپ لے کر کوتوالی چلے جائیں وہ اپنے آپ وہاں پہنچ جائے گا۔ جیپ وہاں سے چلی گئی۔ اب بجلی محلے میں اکیلا رہ گیا۔ سامنے دکانیں ٹوٹی پڑی تھیں۔ اور ان کا سامان باہر بکھرا ہوا تھا۔ ذرا دور چوک میں ایک بیل کی پھولی ہوئی لاش مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ بجلی اوپر منہ کر کے کہنے لگا۔ کامریڈ! میں اب بالکل تنہا اور اکیلا ہوں۔ اب تو نیچے آ جاؤ یا مجھے اپنے پاس اوپر بلا لو۔ واہگورو کی قسم! مجھے ایک ضروری امانت تمہیں دینی ہے۔''

اب میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس مکان میں اکیلا ہی بندوق لیے پہرہ دے رہا تھا۔ پہرہ کیا تھا بس اتنی ہی ڈیوٹی پر تھا کہ اگر ہندو فوجی حملہ کرنے آتا دیکھوں تو فوراً اطلاع کر دوں تا کہ گلی کے مسلمان وہاں سے بھاگ کر شریف پورے والے کیمپ میں پہنچ جائیں۔ اس مکان کا ایک دروازہ بازار میں بھی کھلتا تھا۔ اور بجلی بازار میں کھڑا تھا۔ خدا جانے کیوں مجھے کامریڈ بجلی کی بات پر اعتبار آ گیا۔ پھر بھی میں نے محلے کے مسلمانوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈالنا گوارا نہ کیا۔ میں نے چوبارے کے اوپر والے دروازے کو بند کر کے تالا لگا دیا۔ اور سیڑھیاں اتر کر بازار والے دروازے پر آ کر رک گیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازے کی کنڈی کھول دی۔ بندوق میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کا رخ اگرچہ براہِ راست بجلی کی طرف نہیں تھا۔ لیکن وہ میرے نشانے کی زد سے باہر بھی نہیں تھا۔

''کون سی امانت ہے کامریڈ بجلی؟''

موہن سنگھ کا چہرہ اترا ہوا تھا اور ڈاڑھی کے بالوں میں ہلکی ہلکی مٹی پڑی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے چلتا ہوا میرے پاس آیا جیسے اسے بندوق کا ذرہ برابر بھی خوف نہ ہو۔ میرے پاس آ کر بولا۔

''کامریڈ! یہاں سیڑھیوں میں بیٹھ کر ہی مجھ سے دو چار باتیں سن لو اور پھر اپنی امانت لے لو۔ واہگورو کی کرپا ہے۔ کہ تم مل گئے۔ ورنہ یہ بوجھ جانے کتنی دیر مجھ پر رہتا''۔

ہم دونوں سیڑھیوں میں بیٹھ گئے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں کوئی چیز رومال میں لپٹی ہوئی تھی۔ جسے اس نے اپنی صدری کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ رنگ اس کا بھی اڑا ہوا تھا۔ میں نے سیڑھیوں کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ سلاخ دار روشن دان میں سے مٹیالی، نا ذرہ دھوپ کی ہلکی ہلکی روشنی اور

نہال سنگھ کی جلی ہوئی دکان میں سے گندھے بہروزہ کی بو اندر آ رہی تھی۔ موہن سنگھ بجلی نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں جلدی جلدی جو دردناک واقعہ مجھے سنایا اسے میں آج آپ کو اپنی زبانی سناتا ہوں۔

جس روز کامریڈ موہن سنگھ بجلی پولیس جیپ میں بیٹھ کر مجھ سے ملنے آیا یہ اس سے ایک روز پہلے کا ذکر ہے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، موہن سنگھ بمبے والا کھوہ میں رہتا تھا جو کہ ہندو اکثریت کا محلّہ تھا اور 15 اگست کے بعد تو ان علاقوں میں کسی مسلمان کے رہنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان علاقوں سے مسلمانوں کی ساری آبادی دائم گنج اور ریگو برج کی جانب سے نکل کر مہاجر کیمپوں یا ریفوجی ٹرینوں میں بیٹھ کر پاکستان کی طرف کوچ کر چکی تھی۔ ان مسلمانوں کے چھوڑے ہوئے ویران محلوں میں ہندو سکھ لوٹ مار میں مصروف تھے۔ وہ مکانوں کو لوٹ لوٹ کر آگ لگا رہے تھے۔ امرتسر کا مشہور پنجابی شاعر اور ادبی محفلوں کی جان، چاچا عیسیٰ اسی علاقے میں شہید ہوا وہ ہندوؤں کی بنائی امن کمیٹی کے ارکان کے ساتھ امن کی بات چیت کرنے گیا۔ کہ اُسے گولی ماردی گئی۔ ہم نے اس کی لاش حاصل کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک بھنگی نے ہمیں ترک ہوٹل میں آ کر بتایا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے چاچا عیسیٰ کو گولی کھا کر گرتے دیکھا ہے۔

اب ان ویران دہشت زدہ گلی کوچوں میں ہندو سکھ غنڈے فوج اور پولیس کے ساتھ مل کر دندناتے پھرتے تھے۔ کہیں جلے بجھے مکان سلگ رہے تھے۔ اور کہیں تازہ لگی آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ مسجدوں کے منبر توڑ کر ہندوؤں نے وہاں مورتیاں لا کر رکھ دی تھیں۔ اور دروازوں پر کھریا مٹی سے ''اوم'' لکھ دیا تھا۔ موہن سنگھ بجلی کے بیان کے مطابق وہ شام کے وقت کرفیو لگنے سے کچھ دیر پہلے گول باغ کی طرف سے ہاتھی گیٹ کی جانب آ رہا تھا کہ سیتا مندر کے پاس اسے اس علاقے کی نام نہاد امن کمیٹی کا چیئرمن بلرام مل گیا۔ بلرام کبھی کبھار پارٹی کے دفتر میں بھی آیا کرتا تھا۔ ہمیشہ جھک کر ملتا۔ بڑا انکسار دکھاتا...... اس روز بلرام نے شراب پی رکھی تھی...... اور وہ موہن سنگھ بجلی کو زبردستی اپنے ساتھ ستیلا مندر کے پچھواڑے تالاب کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی کوٹھڑیوں میں سے ایک کوٹھڑی میں لے گیا۔ یہاں بلرام کے چھ سات ہندو دوست شراب پی رہے تھے۔ اور شور مچا رہے تھے۔ موہن سنگھ ان سب کو جانتا تھا۔ اس نے بہت کہا کہ اسے گھر جانا ہے۔ کرفیو کا وقت ہو رہا ہے۔ لیکن کسی نے ایک نہ سنی۔ بلرام نے شراب کا گلاس اٹھا کر کہا۔

''بجلی! کونسا کرفیو؟ کیسا کرفیو؟ امرتسر میں اب ہمارا راج ہے۔

آج ہم تمہیں سورگ کی سیر کروائیں گے...... اور قہقہہ لگا کر وہ پورا گلاس چڑھا گیا۔ اب موہن سنگھ بجلی کو علم ہوا کہ ان ہندوؤں نے شہر کے اندر سے کسی مسلمان لڑکی کو اغوا کر کے ساتھ والی کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے اور شراب ختم کرنے کے بعد اسے اپنی بربریت اور وحشت کا نشانہ بنانے والے ہیں۔ موہن سنگھ بجلی کا کہنا ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ خدا جانے وہ کس شریف باپ کی بیٹی تھی اور یہ لوگ اسے اٹھا لائے تھے۔ موہن سنگھ نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اس لڑکی کو ان درندوں سے ضرور بچائے گا۔ مگر بلرام اور اس کے غنڈے دوستوں کی آنکھیں شراب پی کر خونی ہو رہی تھیں۔ یہ بھوکے بھیڑیے کے جبڑوں سے اس کا تر نوالہ جھپٹنے والی بات تھی۔ پھر بھی موہن سنگھ بجلی کہتا ہے کہ میں نے اس بے کس و مجبور مسلمان بیٹی کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس مقصد کے حصول کے لیے خود بھی بلرام کے ساتھیوں کی ہاؤ ہو میں شریک ہو گیا۔ ایک ہندو غنڈہ تھوک کر اسے پاؤں سے

مسل کر بولا۔

”میں مسلمانوں کو یوں ہی مسل دوں گا۔ ہاہاہا...... بلرام! چلو اس مسلی (مسلمان عورت) کے پاس چلو............ سالی کو اب ہوش آ گیا ہوگا“

”بھرا تا جی! میری مانو“۔ دوسرا بولا۔ ”اس نے بے ہوشی کا بہانہ بنایا ہے“۔

بلرام اپنے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے ہچکولے کھا رہا تھا۔

”بہت...... چپ رہ رام مورتی!...... ان مسلمانوں کی عورتوں کو ہم الٹا لٹکا دیں گے۔ کیا سمجھتا ہے۔“

”بل جی! وہ سالی جے ہند نہیں کہہ رہی تھی“۔

موہن سنگھ نے پوچھا! ”کیا کہتی تھی وہ؟“

بلرام میز پر مکّا مارتے ہوئے چیخا ”کہتی تھی پاکستان زندہ باد............ ہت۔ ہت...... مزا چکھا دوں گا۔“

کامریڈ موہن سنگھ کہتا ہے کہ میں نے موقع غنیمت جان کر بلرام سے کہا ”یار بل! میں جا کر اس مسلمان عورت سے بات کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کس طرح جے ہند نہیں کہتی۔ اور فکر نہ کرو۔ میں اسے راضی بھی کر لوں گا۔

موہن سنگھ نے آنکھ ماری جس پر بلرام قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

سارے ہندو غنڈوں نے موہن سنگھ کی بات کو پسند کیا۔ رام مورتی بولا۔ بل جی! موہن کو بھیج دو۔ بوڑھا آدمی ہے۔ اس کی بات وہ مُسلی مان جائے گی۔“

چنانچہ موہن سنگھ بجلی ساتھ والی کوٹھڑی کا تالا کھول کر اندر آ گیا۔ اندر طاق میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ اندر گوبر کی بو پھیلی ہوئی تھی کونے میں ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر ایک لڑکی پڑی تھی۔ دیئے کی دھیمی روشنی میں موہن سنگھ نے دیکھا کہ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ بال یوں کھلے ہوئے تھے جیسے کسی نے زبردستی نوچے ہوں۔ وہ بمشکل اٹھارہ سترہ برس کی ذرا سی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ موہن سنگھ اس مسلمان لڑکی کے قریب گیا تو اس نے تڑپ کر گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ مسلمان لڑکی کی آنکھوں میں خونخوار چیتے کی چمک تھی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس نے گرج کر کہا۔ ”خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا“

موہن سنگھ بجلی کہتا ہے کہ میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا...... بیٹی! میں تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آیا۔ بلکہ تمہیں ان درندوں سے بچانا چاہتا ہوں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تیرے لیے کیا کروں وہ لوگ شراب پی رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔ اگر میں نے تمہیں یہاں سے بھگا دیا تو وہ میرے ساتھ تمہاری بھی تکا بوٹی کر دیں گے............ اور پھر اگر تو یہاں سے بھاگ کر نکلی بھی تو کسی دوسرے ہندو غنڈے یا ہندو سپاہی کے ہاتھ آ جائے گی............“

مسلمان لڑکی نے جب موہن سنگھ کے منہ سے بیٹی کا لفظ سنا تو اسے ذرا حوصلہ ہوا۔ ایک پل کے لیے اس نے موہن سنگھ کو غور سے دیکھا اور پھر اچانک گلے میں سے ایک موٹا سا تعویز نکال کر اسے دیتی ہوئی بولی:۔

’’میری یہ امانت اپنے پاس رکھ لیں اور کسی بھی مسلمان کو دے دیں میرا نام رضیہ بانو ہے۔ میں ایم۔ اے۔ او گرلز ہائی سکول میں دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ ہندوؤں نے میرے دونوں بھائیوں اور ابا جان اور امی جان کو میرے سامنے شہید کر دیا اور مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے۔ ان ہندوؤں سے جا کر کہہ دیں کہ ایک مسلمان گھرانے کی لڑکی کو اپنی عزت جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے............‘‘

بقول موہن سنگھ بجلی اس مسلمان لڑکی نے اچانک موہن سنگھ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور موصا تعویز اسے دے کر چشم زدن میں موہن سنگھ کی کرپان نیام سے کھینچی اور دیکھتے دیکھتے اسے اپنے دل میں اتار لیا۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ مسلمان لڑکی ایک ہلکی سی سسکی بھر کر چارپائی پر گر پڑی۔ موہن سنگھ ایک پل کے لیے تو پتھر سا ہو کر رہ گیا۔ لڑکی کے سینے سے خون جاری تھا اور وہ تڑپ رہی تھی۔ پھر اس نے شور مچا دیا۔ ساتھ والی کوٹھڑی سے سارے غنڈے لڑکھڑاتے گرتے پڑتے اندر آئے۔ اس وقت تک وہ مسلمان لڑکی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ موہن سنگھ نے کہا۔

’’اس نے میری کرپان سے خودکشی کر لی۔ میں اسے سمجھا رہا تھا کہ اس نے میری کرپان کھینچ کر دل میں گھونپ لی‘‘۔

ہندو غنڈوں نے وحشی ہو کر بھڑکیں ماریں اور بلرام نے کہا۔ ’’مر گئی ہے تو مرنے دو ہم کوئی دوسری لڑکی اٹھا لائیں گے۔‘‘

’’رام مورتی! چلو......چلو یارو......کوئی دوسری عورت اٹھا لاتے ہیں۔ مُسلی نہیں تو ہندو عورت ہی سہی ہاہاہا......‘‘

اور وہ سارے شرابی شور مچاتے، بڑھکیں مارتے کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔ موہن سنگھ اس مسلمان لڑکی کی لاش کے پاس اکیلا رہ گیا۔ بقول موہن سنگھ، اس لڑکی کی لاش کے چہرے پر ایک عجیب سکون اور نور تھا۔ دیئے کی دھیمی روشنی میں خون آلود کپڑوں میں اس کا سفید چہرہ ایسے لگ رہا تھا جیسے گلاب کے پھولوں کے پاس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

’’کامریڈ! ایک مسلمان لڑکی اتنی غیرت مند بھی ہو سکتی ہے۔ یہ مجھے اب معلوم ہوا تھا۔ سچ کہتا ہوں میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کا دیا ہوا تعویذ میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں کتنی ہی دیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ شہر کی جانب سے کبھی کبھی گولی چلنے کی آواز آ جاتی تھی۔ پھر میں نے اس بہادر مسلمان لڑکی کی لاش کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور باہر لے آیا۔‘‘

ستیلا مندر والے تالاب کے عقب میں کچا میدان ہے جو ذرا دور فتح شاہ بخاری اور حضرت شنکر شاہؒ کے مزار تک چلا گیا ہے۔ یہاں کہیں کہیں کیکروں کے جھنڈ ہیں۔ موہن سنگھ بجلی نے انہی کیکروں کے ایک جھنڈ میں زمین میں گڑھا کھودا اور رضیہ بانو کی لاش کو دفن کر دیا۔

موہن سنگھ بجلی کہنے لگا۔

کامریڈ! مجھے مسلمانوں کی طرح فاتحہ پڑھنا نہیں آتا تھا۔ لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے رب سے کہا تھا کہ ’’اے سب کے پالن ہار! اس غیرت مند مسلمان بچی کو شانتی دے......‘‘

میں سیڑھیوں میں دم بخود بیٹھا تھا۔ موہن سنگھ بجلی نے رضیہ بانو کی امانت وہ تعویز میرے حوالے کر دیا اور خشک سی آواز میں بولا۔

’’کامریڈ! یہ بچی جہاں دفن ہے وہاں میں اس کی قبر نہیں بنا سکتا کیونکہ مجھے معلوم ہے۔ ہندو اسے ڈھا دیں گے۔ میں وہاں مسلمانوں کے رواج کے مطابق جمعرات کو دیا بھی نہ جلا سکوں گا۔ اس پر پھول بھی نہ ڈال سکوں گا۔ لیکن کامریڈ! یقین کرو میں جب تک زندہ رہا، ہر جمعرات کو

وہاں آ کر اپنے آنسوؤں کے پھول اُرپن کرتا رہوں گا۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔ میں نے اس بچی کی امانت تجھے دے دی ہے۔ اب میرے دل سے بوجھ اتر گیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ کسی مسلمان کو یہ تعویز دے دینا۔ شہر میں کوئی مسلمان نہیں رہا تھا۔ میں نے سنا کہ تمہارے محلے میں مسلمان ابھی ہیں۔ چنانچہ میں تمہارے پاس آ گیا...... میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ میں جاتا ہوں۔ کوتوالی میں سپاہی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔

اس کے ساتھ ہی کامریڈ بجلی نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر دبایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں حیرت زدہ سا ہو کر رضیہ بانو شہید کا تعویز ہاتھوں میں لیے سیڑھیوں میں بیٹھا رہا۔

کامریڈ بجلی کی باتیں ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اچانک بازار میں فائر کی آواز آئی میں چونکا۔ جلدی سے دروازے کو اندر سے تالا لگایا اور چوبارے میں آ گیا۔ جنگلے میں سے نیچے جھانک کر دیکھا تو ایک فوجی ٹرک چوک میں کھڑا تھا اور سکھ ہندو فوجی چھلانگیں لگا کر نیچے کود رہے تھے۔ میں چشم زدن میں سیڑھیاں اتر کر گلی میں آ گیا اور محلے والوں کو ہندو فوجیوں کی آمد کی خبر سنائی...... اتنے میں ایک زوردار دھماکہ ہوا اور گلی کا آہنی دروازہ ایک طرف سے جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی گلی میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور لوگوں نے گلی کی دوسری جانب لال حویلی کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ پیچھے ایک اور دھماکہ ہوا۔ اب آہنی گیٹ ایک طرف سے اڑ چکا تھا۔ اور ہندو سکھ غنڈے تلواریں اور بلمیں لیے اچھلتے کودتے شور مچاتے گلی میں آ گئے تھے۔ لیکن اس وقت گلی میں سوائے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے گھریلو سامان کے اور کچھ نہ تھا۔ گلی کے سارے مسلمان لال حویلی اور گوجروں کے ڈیرے میں سے گزر کر پاتھی گراؤنڈ کے ساتھ والی دیوار سے ہوتے شریف پورے والے مہاجر کیمپ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اور کیمپ میں متعین بلوچ رجمنٹ کے جوان ان کے عقب میں کور فائرنگ کر رہے تھے۔

شریف پورے پہنچ کر میں ایک تھڑے پر بیٹھ گیا اور جب میں نے رضیہ بانو شہید کے تعویز کو نکال کر دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا بٹوہ نما تعویز تھا۔ میں نے اس کا بٹن کھولا تو اندر بادامی رنگ کا خستہ سا کاغذ نکلا جس پر قلم اور سیاہ روشنائی سے پوری سورۃ فاتحہ لکھی ہوئی تھی۔ میں نے اس مقدس امانت کو اپنی آنکھوں کے ساتھ لگا لیا۔ اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میری آنکھوں میں فتح شاہ بخاریؒ کے میدان والے کیکروں کا وہ جھنڈ پھر گیا جہاں اسلام کی ایک غیور بیٹی دفن تھی اور جس کی کوئی قبر نہ تھی جہاں کبھی کوئی دیا نہیں جلے گا۔ جہاں کبھی کوئی پھول نہیں ڈالے گا...... لیکن رضیہ بانو کبھی نہیں مر سکتی۔ اس نے اپنی لاکھوں بہنوں بھائیوں اور بیٹیوں کے خون سے اس باجبروت قلعے کی بنیادیں استوار کی ہیں۔ جس کی چوٹی پر پاکستان کا پرچم لہرا رہا ہے۔

زندہ باد! رضیہ بانو!

راوی اے حمید

پٹیالہ کے مسلمانوں پر ٹوٹنے والی قیامت صغریٰ

(حصہ اوّل)

پٹیالہ مشرقی پنجاب کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ موتی محل، نیلا بھون، بارہ دری ٹھنڈی سڑک نے شہر پٹیالہ کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔ ہر جگہ سبزہ تھا، پھولوں کی مہک تھی۔ امن و امان مثالی تھا۔ لوگ دروازے کھول کر سوتے تھے۔ مسلمان، ہندو اور سکھ مل جل کر رہتے آ رہے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے۔ حکیم نثار لکھنؤ سے سیر کرتے کرتے ایک دن پٹیالہ میں اتر گئے۔ انہیں ریاست اور اس کے لوگ اتنے پسند آئے کہ پھر واپس اپنے وطن نہیں گئے۔ پاکستان بننے کے بعد وہیں سے کراچی آ گئے۔

1945ء میں ریاست پٹیالہ میں بھی پاکستان کے نعرے لگنے لگے۔ مسلمان ''قائداعظم کے بیج لگا کر'' ''قائداعظم زندہ باد'' ''بن کے رہے گا پاکستان'' کے نعرے لگاتے، جلوس نکالتے لیکن ریاست کی مجموعی فضا پُر امن تھی۔ رستم ہند امام بخش اور رستم زماں پہلوانی میں پٹیالہ کا نام روشن کر رہے تھے۔

ابا جی محمد شریف مرحوم کہنہ مشق آرٹسٹ تھے۔ مالوہ، کیمز پٹیالہ کے مالک سیٹھ چرن داس ان کے بھائی بنے ہوئے تھے۔ چودھری عید محمد اور سیٹھ چرن داس نے مل کر ایک اور سینما بنایا تھا جس کی پینٹنگ ابا جی کروا رہے تھے۔ غالباً جون 47ء کا مہینہ تھا۔ ابا جی ہر پینٹر کو بتاتے جاتے کہ کہاں کہاں کس قسم کی کلر سکیم ہو گی۔ ایک پینٹر کو سمجھانے کے لیے لکڑی کی سیڑھی پر چڑھ رہے تھے کہ ایک ڈنڈا ٹوٹ گیا۔ ابا جی اور اسٹنٹ پینٹر دونوں نیچے گر گئے۔ ابا جی کی کن پٹی نیچے ڈرم سے ٹکرائی اور دماغ کو شدید چوٹ لگی۔ وہ بے ہوش ہو گئے۔ انہیں فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ سیٹھ چرن داس کے سُسر سرجن رگوناتھ نے بہت کوشش کی والد صاحب کی زندگی بچ جائے۔ پٹیالہ کا قانون تھا۔ کہ جو شخص ہسپتال میں وفات پا جاتا، اسے شہر نہیں لانے دیتے تھے۔ وہیں سے سیدھا قبرستان لے جایا جاتا۔ چونکہ سرجن رگوناتھ صاحب سے گھر والا معاملہ تھا انہوں نے میرے تایا غوث محمد مرحوم کو ہسپتال بلا لیا اور کہا کہ شریف صاحب کو گھر لے جائیے ورنہ آپ کو مشکل ہو گی کیونکہ ان کی زندگی چند گھنٹوں کی ہے، چنانچہ والد صاحب کو گھر لایا گیا۔ جہاں تھوڑی دیر بعد وہ انتقال کر گئے۔ یوں ہم چھوٹے چھوٹے تین بھائی اور شیر خوار بہن یتیم ہو گئے اور والدہ عین جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔

ان دنوں پورے پنجاب کے حالات دگرگوں تھے۔ میری خالہ انبالے میں تھیں۔ وہ یہ سوچ کر پٹیالہ واپس آ رہی تھیں کہ اب حالات کا مقابلہ والدین کے ساتھ مل کر کریں گے۔ جب ان کی ٹرین پٹیالے سے تھوڑا قریب پہنچی تو ایک سکھ نے میری خالہ کے بیٹے بھائی واحد کا ختنہ دیکھ لیا۔ اس نے شور مچا دیا کہ ہمارے ڈبے میں مسلمان سفر کر رہے ہیں۔ انہیں ختم کر دو۔ انہوں نے تلواریں نکال کر میری خالہ کو شہید کر ڈالا اور چلتی گاڑی سے

نیچے پھینک دیا۔ پھر واحد کے ساتھ وہی کچھ کیا۔ اس کے بعد بہن وحیدہ، سعیدہ اور بھائی اختر کو ایک ایک کر کے شہید کر دیا اور انہیں بھی گاڑی سے نیچے پھینک دیا۔ خالو نے جان بچانے کے لیے گاڑی سے چھلانگ لگا دی۔ ایک صاحب جو ہمارے خاندان کو جانتے تھے۔ اسی گاڑی میں سفر کر رہے تھے انہوں نے گھر آ کر اطلاع دی تو صف ماتم بچھ گئی۔ اس طرح پٹیالے میں سکھوں کے ہاتھوں شہادت ہمارے گھر سے شروع ہوئی۔ میرے نانا محلے کے چند نوجوانوں کے ہمراہ پتہ کرنے گئے۔ خالہ وحیدہ اور واحد کی لاش مل گئیں۔ چھوٹی بچی سعدیہ کی میت نہ مل سکی، شاید کوئی جانور لے گیا تھا۔ اختر زخمی حالت میں مل گیا۔ اور ماشاءاللہ آج بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ بعد میں خالو بھی آ ملے۔ صادق آباد میں کوئی پندرہ سال پہلے ان کا انتقال ہوا۔

ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ ہمارا علاقہ پاکستان میں شامل نہ ہوگا۔ مسلمانوں نے گھروں کی چھتوں پر کالے جھنڈے لہرا دیئے تھے وہ سکھ جو پاکستان کے علاقے سے آ کر پٹیالے میں پناہ گزین ہوئے تھے، چھوٹی موٹی چیزیں محلوں اور گلیوں میں بیچتے نظر آتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مسلمان گھروں کی جاسوسی کر رہے ہوں۔ رمضان کے روزے شروع ہوئے تو حالات خراب ہو گئے۔ پٹیالہ ریلوے اسٹیشن کے قریب دو تین مسلمان نوجوان شہید کر دیئے گئے۔ مہاراجے کے حکم پر مسلمان گھروں کی تلاشیاں لی گئیں اور کوئی ہتھیار یا چاقو تک ضبط کر لیے گئے۔ بعد میں یہ ہتھیار ہندوؤں اور سکھوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔

میں ان دنوں سٹی ہائی سکول میں زیر تعلیم تھا۔ اور پانچویں جماعت میں تھا۔ حالات بگڑے تو تایا جی نے مسلم ہائی سکول میں داخل کروا دیا۔ رمضان ختم ہوا جا رہا تھا خبر ملی کہ چاند نظر آ چکا ہے۔ کئی لوگوں نے دن کی روشنی میں بارہ بجے دیکھا تھا میرے تایا جان نے ایک تسلے میں پانی ڈال کر اس میں چاند دیکھنا شروع کیا تو وہ نظر آ گیا مگر الٹا تھا۔ میں نے خود بھی دیکھا تھا۔ بزرگوں نے اسے کسی آنے والی مصیبت کی نشانی بتایا تھا۔ غرض دوسرے دن عید خیریت سے گزری۔

عید کے پانچ، چھ دن بعد پٹیالہ میں اچانک کرفیو لگا دیا گیا۔ ہم سب اپنے گھروں کو تالے لگا کر یہ سوچ کر اپنے رشتے داروں کے پاس چلے گئے کہ جب حالت ٹھیک ہو جائیں گے، ہم گھر واپس آ جائیں گے، مگر پھر گھر دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ کسی نے گھر سے ایک تنکا بھی نہ اٹھایا تھا۔ جس محلے میں ہم گئے تھے، وہاں تیسرے چوتھے دن سکھوں نے شور مچا دیا مسلمانو! تمہاری مسجد کو آگ لگا دی گئی ہے۔ کچھ نوجوان، جن میں میرے پھوپھی زاد بھائی صادق بھی تھے۔ مسجد کی آگ بجھانے گئے مگر یہ سکھوں کی چال تھی۔ تا کہ انہیں گھیر کر ختم کر دیا جائے۔ میرے تایا مرحوم رو رو کر دعائیں مانگ رہے تھے کہ اے اللہ! صادق کو بچا کر لے آنا۔ بھائی صادق ان کا بھانجا ہونے کے ساتھ ان کا داماد بھی تھا۔ اللہ نے ان سب مسلمانوں کو محفوظ رکھا۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر واپس آ گئے۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ دوبارہ خطرہ محسوس کیا گیا تو وہ محلّہ چھوڑ کر چھتوں سے ہوتے ہوتے دوسرے محلے میں اپنی نانی کے مکان میں اتر گئے۔ وہاں اور لوگ بھی جمع ہو گئے، مگر تھے سب خالی ہاتھ۔

پانچ چھ دن بعد وہاں بھی خطرے نے گھیرا تو کچھ فاصلے پر اپنے ایک عزیز کے ہاں جا ٹھہرے۔ وہاں پہنچنے کے ایک گھنٹہ بعد ہم پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ جس کے نتیجے میں میری بڑی خالہ، خالو، ان کا جوان بیٹا جسے ہم بھائی جان کہتے تھے، بھابھی اور ان کے تین چھوٹے چھوٹے معصوم بچے شہید ہو گئے۔ ہم اپنی جانیں بچانے آگے کی طرف بھاگے اور ہادی حسین صاحب کے گھر پناہ لی۔ سب نے یہ جان لیا تھا کہ چند روز کے مہمان ہیں۔

آج نہیں تو کل قتل کر دیئے جائیں گے۔ ہر کوئی اپنا گھر کھول دیتا کہ جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو۔ ہادی حسین صاحب کے گھر میں کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وہاں بھی ''بھاگو'' ''بھاگو'' کا شور برپا ہوا چنانچہ وہاں سے بھی نکلنا پڑا۔ اب ہم چھتوں پر سے کودتے' بھاگتے کئی دن بھوکے پیاسے' ایک محلے سے دوسرے محلے میں جانیں بچاتے پھرتے تھے۔ ہم ہی نہیں' ہزاروں کی تعداد میں بوڑھے' جوان' لڑکے' لڑکیاں بے بسی کی حالت میں گھر سے بے گھر چھپتے پھرتے تھے۔ جوان لڑکیوں کے منہ پر کالک مل دی گئی تھی تاکہ بدصورت نظر آئیں اور سکھوں ہندوؤں کے ہاتھوں اغواء ہونے سے بچ سکیں۔ سب ہی بے بس تھے۔ کوئی کسی کے لیے کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ہم بھاگتے بھاگتے انگوروں والی مسجد پہنچے جہاں ہماری رشتے کی خالہ حمیدہ کا گھر تھا۔ وہاں دو سو سے زیادہ افراد پہلے سے موجود تھے۔ وہاں ہم نے آخری پناہ لی تھی۔ وہ پورا محلّہ اس لیے محفوظ تھا' کہ انگوروں والی مسجد کی چھت پر ڈاکٹر حکیم صاحب ایک بندوق لیے اور ہزاروں کارتوسوں کا تھیلا گلے میں لٹکائے پہرہ دے رہے تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب دو بھائی تھے۔ چھوٹے بھائی کریم صاحب تھے۔ شیراں والا دروازے اور توکلی مسجد کے پاس ان کی ڈسپنسری تھی۔ سارے لوگ وہاں سے علاج کراتے تھے۔ اور دونوں بھائیوں کو ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے۔ ڈاکٹر حکیم صاحب الحمداللہ بقید حیات ہیں اور بہاولپور میں مقیم ہیں۔

ڈاکٹر حکیم کے چھوٹے بھائی کریم کو ہندو سکھ پولیس والے اغوا کر کے لے گئے تھے اور انہیں شاہی قلعہ پٹیالہ کے سامنے واقع جیل میں شہید کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر حکیم نے اپنی تمام خواتین کو خود ہی ہلاک کر دیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ ہم سب کا انجام موت ہے تو میری بیوی بچیاں سکھوں کے ہاتھ کیوں لگیں۔

پٹیالے میں سکھوں اور مسلمانوں میں کچھ عرصہ اتحاد رہا تھا۔ یہ اتحاد اس وقت ٹوٹا جب 15 اگست کو شاہی قلعے پر ترنگا جھنڈا لہرا دیا گیا تھا۔ چونکہ کانگرس نے تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب سکھوں کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ سکھ کانگرسی جھنڈا دیکھ کر ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے اور ہندو اور پٹیل کیخلاف نعرے لگنے لگے۔ اس پر دلی سے کانگرسی رہنما راتوں رات پٹیالے پہنچے۔ انہوں نے قلعے کے سامنے سکھوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ جھنڈے کی کوئی بات نہیں ہم اسے ابھی اتروائے دیتے ہیں اور تمہارا پیلا خابعہ جھنڈا لہرا دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسا فوراً کر دیا گیا۔ اس موقع پر ہندو لیڈروں نے اشتعال انگیز تقریریں کیں کہ سکھ ہو یا ہندو ہم ایک ہی ہیں۔ پٹیالہ تمہارا ہے۔ کشمیر تک سارا پنجاب تمہارا ہے۔ مگر ہمارے تمہارے اصل دشمن تو مسلمان ہیں۔ جن سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بھی کئی جنگیں لڑیں۔ ان مسلمانوں کو ختم کرو تاکہ رنجیت سنگھ کی آتما کو سکون ملے اس پر سکھوں کے دماغ گھوم گئے۔ ایک نوجوان مسلمان عورت وہاں سے گزر رہی تھی' اسے شہید کر دیا گیا۔ اور اس کی برہنہ لاش بازار میں دس فٹ کی اونچائی پر لٹکا دی گئی۔ اس کے ساتھ ایک بینر باندھ دیا جس پر لکھا تھا ''لے کر رہیں گے پاکستان'' اس طرح سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمان کے قتل عام کا آغاز کر دیا۔

جب ہم انگوراں والی مسجد میں اپنی خالہ کے ہاں پناہ لیے ہوئے تھے' کھانے کو اور کچھ نہ تھا' گندم کی ایک بوری ان کے گھر پڑی تھی' وہی ابال کر تھوڑے دانے سب کھاتے رہے۔ دوسرے دن میرے تایا زاد بھائی عبداللطیف اکیلے آئے ان کے ہاتھوں میں کچھ روٹیاں اور اچار تھا۔ وہ یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ شام کو مزید راشن دے جاؤں گا۔ وہ اس محلے میں کچھ فاصلے پر رہتے تھے۔ ہم نے ان کی آخری بار شکل دیکھی۔ وہ بہت ہی پیارے بھائی تھے۔ میری چھوٹی ممانی کچھ دن پہلے بمبئی سے پٹیالہ آئی تھیں۔ وہ سر پر کپڑے کا ڈھاٹا باندھے ہاتھ میں ڈنڈا لیے بے چین پھر رہی تھیں کہ کوئی ہندو' سکھ ملے تو اسے ختم کر دیں۔

ڈاکٹر حکیم دن میں ایک دفعہ فائر کر دیا کرتے تھے۔ تاکہ سکھوں اور ہندوؤں کو خوف رہے۔ کہ یہاں جو لوگ جمع ہیں ان کے پاس بہت اسلحہ ہے۔ یہ صرف ان بزدلوں کے لیے ڈراوا تھا۔ میں ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کے پاس چلا گیا اور سلام کیا۔ کچھ دیر بعد پڑوس کی چھت پر جھانکا تو ایک شخص بڑے نوٹوں کی گڈی جلا رہا تھا۔ وہ رو بھی رہا تھا کہ ساری عمر کی کمائی راکھ ہو رہی ہے۔ ساتھ ہنس بھی پڑتا کہ یہ کافروں کے ہاتھ تو نہ آئیں گے۔ تین چار دن بعد ایک سکھ سفید جھنڈا لہراتے ہوئے آگے بڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اکیلا ہے۔ امن کا جھنڈا بھی ہاتھ میں ہے۔ آنے دو دیکھا جائے گا۔ قریب آ کر سکھ نے جو ایک فوجی تھا بلند آواز سے کہا ''ہم شانتی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ آج تک جو کچھ ہوا مہاراجہ پٹیالہ کو اس پر افسوس ہے۔ وہ شیراں والا گیٹ پر تقریر کریں گے اور آپ لوگوں سے معافی مانگیں گے۔ اس کے بعد آپ سب اپنے گھروں کو واپس چلے جانا''

ڈاکٹر صاحب، ہم سب پناہ گزیں اور اہل محلّہ دھوکے میں آ گئے۔ قافلے کی صورت میں شیراں والا گیٹ کی طرف چل دیئے۔ یہ قافلہ تقریباً دو ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ راستہ بالکل صاف تھا، مگر جونہی مین روڈ پر آئے شیراں والا گیٹ سے ہم پر فائرنگ ہونے لگی۔ اس پر بھگدڑ مچ گئی۔ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ ایک گولی میرے کندھے کو چھوتی گزری۔ پیچھے مڑ کر دیکھا، ایک نوجوان بیساکھیوں سے بھاگا آ رہا تھا۔ وہ گولی اس کے سینے میں لگی۔ وہ گر پڑا اسے خون کی الٹی آئی اور وہ شہید ہو گیا۔ میری چھوٹی ممانی کو سکھوں نے پکڑ لیا اور کہا تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ بہت خوبصورت اور جوان تھیں۔ انہوں نے کلمہ شہادت پڑھ کر سکھوں کے منہ پر تھوک دیا اور کہا کہ تم مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ ایک ظالم سکھ نے تلوار کے ایک ہی جھٹکے سے ممانی کی گردن تن سے جدا کر دی۔ میں اس جوان شہادت کے بعد بھاگ اٹھا۔ لاشوں کے ڈھیر لگ چکے تھے۔ ایک دکان میں گھسا۔ یہ نہایت نیک دل رمضان صاحب کی کریانے کی دکان تھی۔ وہ شہید کر دیئے گئے تھے۔ ان کی دکان خالی تھی۔ دکان کے تھڑے پر ایک عورت خون میں لت پت آخری سانس لے رہی تھی۔ اس کی چھاتیوں سے کوئی چھ ماہ کا بچہ لپٹا دودھ پی رہا تھا۔ پتہ نہیں اس بچے کا حشر کیا ہوا ہوگا۔ آج بھی پچھتاوا ہوتا ہے۔ کہ کاش! میں نے اس بچے کو اٹھا لیا ہوتا۔ میں زندہ دکان میں داخل ہوا تو سامنے والدہ میری چھوٹی بہن کو گود میں لیے سکتے کے عالم میں کھڑی تھیں دوسرے بھائی نہیں تھے۔ میں نے پوچھا اقبال اشفاق کہاں ہیں تو والدہ نے کہا مجھے پتہ نہیں۔ باہر گولیاں چل رہی تھیں۔ فائرنگ میں وقفہ ہوا تو میں اور والدہ صاحبہ واپس انگوروں والی مسجد کی طرف چلے گئے۔ سڑک شہیدوں اور زخمیوں سے بھری پڑی تھی۔ ہر طرف سے ''پانی، پانی'' کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر وہاں پانی تھا کہاں جو زخمیوں کے منہ میں ڈالتے۔ دو دن شہیدوں کی لاشوں کے درمیان گزرے۔ پھر فوجی ہمیں گھیر کر دوبارہ شیراں والا دروازے کی طرف لے گئے۔ راستے میں کئی کئی فٹ لاشوں کے ڈھیر لگے تھے۔ پھر موسلا دھار بارش ہوئی۔ ہم کھلے آسمان تلے ہی رہے۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ اللہ پاک نے ان شہیدوں کو غسل دیا ہو۔ دوسرے دن دھوپ نکل آئی۔ پھر ہمیں حکم دیا گیا ایک ایک کر کے شیراں والے دروازے سے ہو کر سٹی ہائی اسکول کے پاس جمع ہو جائیں۔ اس بہانے انہوں نے تلاشی لی اور جو کچھ تھا ہتھیا لیا۔ ناچار لوگ دروازے کے ساتھ بارہ دری کی جانب میدان میں جمع ہو گئے۔ ہمارے بچھڑے ہوئے کئی دن بعد ملے۔ ان میں ہمارے تایا غوث محمد بھی تھے۔ ان سے پتہ چلا کہ ان کے تین بیٹے بھائی لطیف، بھائی حمید اور بھائی شوکت شہید ہو گئے ہیں۔ یہ تینوں جوان تھے۔ بھائی حمید کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ اللہ والے تھے۔ بھائی شوکت ہمیشہ لاہور رہتے تھے۔ شادی انہیں پٹیالے لے آئی جو اتنی لمبی ہو گئی۔ ہونے والے سسرال تاریخیں

بڑھا رہے تھے۔ ورنہ وہ تو پٹیالہ میں زیادہ رکتے نہ تھے۔ شہادت ان کی قسمت میں تھی۔ میرے پھوپھی زاد بھائی مسجد کے قتل عام سے بچ گئے تھے' ان کا میری تایا زاد بہن نے برسوں بلکہ مرتے دم تک انتظار کیا کہ شاید ان کا سرتاج اچانک آ جائے۔ ان کا کچھ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں شہید ہوئے۔ بہن نے ان کی اکلوتی اولاد نسیم کو پالا جو آج اپنے گھر والی ہے۔

یہ جو زندہ بچ گئے۔ شیراں والا دروازے کے باہر اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہاں ایک سکھ بزرگ زار و قطار رو رہے تھے اور کہتے جا رہے تھے ''میری قوم نے چنگائیں کیتا۔ ظلم کمایا ای۔'' جب تک ہم دوسری منزل کی طرف رواں دواں نہ ہوئے وہ بزرگ کبھی ادھر جاتے' کبھی ادھر اور اپنی قوم کو ملامت کرتے جاتے۔ ریاستی حکام اب ہم سب کو قافلے کی صورت میں پٹیالے سے کوئی دس میل دور ایک پرانے قلعے کی طرف لے گئے جو بہادر گڑھ کا قلعہ کہلاتا تھا۔ چھوٹے بڑے زخمی غم زدہ غلاموں کی طرح رواں دواں تھے۔ راستے میں شہیدوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ کسی کو کتے بھنبھوڑ رہے تھے۔ کوئی نہر میں تیر رہی تھی اور کسی کو گدھ نوچ رہے تھے۔

عصر کے وقت ہم قلعے کے باہر جمع ہو گئے۔ کچھ بچوں کو پیاس لگ رہی تھی وہ بری طرح تڑپ رہے تھے۔ وہاں ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ جس میں کائی جمع تھی اور بدبو آ رہی تھی۔ ایک پرانہ رنگ آلود ڈبہ پڑا ملا' ایک روز دو آدمیوں نے اپنے ازار بند نکالے اور اسی ڈبے سے باندھ کر گندا پانی نکالا وہی بچوں کو پلایا۔ شام کو قلعے کا دروازہ کھلا تو جسے جہاں جگہ ملی' وہیں بیٹھ گیا۔ سب دل شکستہ اور زخمی تھے۔ کسی کی گردن کٹی ہوئی' کسی کا بازو نہیں تھا' کسی کی ٹانگ اور کسی کی آنکھیں نہیں تھیں۔ یہ مہاجر کیمپ کیا تھا۔ تین ماہ کی ایک جیل تھی۔ روزانہ سینکڑوں لوگ مر رہے تھے۔ زخمیوں اور بیماروں کا علاج میسر تھا نہ کوئی اور مدد ملی۔ روزانہ ایک ٹرک آتا جو لاشیں بھر کر لے جاتا۔ شروع میں ایک بڑا گڑھا کھودتے اور لاشیں اس میں ڈال کر مٹی بھر دیتے۔ بعد میں انہیں جلانا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں ایک ایک روٹی ملنے لگی آدھی صبح' آدھی شام کو کھا لیتے۔ پھر راشن دینا شروع کیا تو اس میں شیشہ پیس کر ملا دیتے۔ جس سے ہلاکتوں میں اضافہ ہو گیا۔ اباجی کے ماموں کا انتقال ہو گیا۔ ہماری پھوپھی روتی ہوئیں آئیں کہ کچھ کرو' لیکن کیا سکتے تھے۔ ایک پرانی چادر میں ان کو لپیٹ کر' نماز پڑھ کر ٹرک والوں کے حوالے کر دیا۔ تایا زاد بھائی بشیر صاحب کا لڑکا فوت ہو گیا۔ تو اسے بھی اس طرح ٹرک والوں کے سپرد کر دیا۔ لوگوں نے ایک رضا کار تنظیم بنا لی۔ جن کے پاس کچھ فالتو ہوتا' وہ سب اکٹھا کر کے ضرورت مندوں کو دے آتے۔ رفع حاجت کے لیے 20 فٹ کی ایک کھائی کھودی۔ جس کا ایک حصہ خواتین اور ایک حصہ مردانے کے لیے مخصوص تھا۔ جب ایک کھائی بھر جاتی تو دوسری کھود لیتے اور پہلی کو بند کر دیتے۔ وہاں کالے گڑ کی ایک دکان تھی۔ گرمی اور بارش سے گڑ پگھل کر باہر آیا تو میٹھے کو ترسے ہوئے لوگ اسے فرش سے اٹھا کر چاٹ لیتے تھے۔

جب ہم لوگوں کو دھوکے سے شیراں والا دروازے بلایا گیا تھا' میرے خالہ زاد بھائی ممتاز جو بمشکل بارہ سال کے تھے' ماموں زاد بہن امرا ضیاء' ماموں زادہ بھائی ضیا' ماموں زاد بھائی بجلی ٹیٹو' میری بھتیجی خورشید' بھتیجا اسلام اور سلیم یہ سب اس وقت بچے تھے اور ہم بچھڑ گئے تھے۔ وہ ہندوؤں سکھوں سے بچتے بچاتے نکلے مگر ایک سکھ کے ہاتھ لگ گئے۔ وہ ان کی جان لینے کی غرض سے انہیں گوردوارے لے گیا۔ اور وہاں ایک سکھ سے کہا کہ انہیں بھاگنے مت دینا' میں اوپر سے تلوار لے کر آتا ہوں۔ ظالم سکھ اوپر گیا نیچے والے کو ترس آ گیا اور کہنے لگا۔ ''پترو! جاؤ نس جاؤ۔ پیچھے مڑ کر نہیں

دیکھنا''۔ ممتاز بھائی ان سب کو لے کر بھاگے۔ بھوکے پیاسے تھے۔ مجھے پتہ نہیں تھا ہمیں کہاں جانا ہے۔ اور ہمارے بزرگ کہاں ہیں۔ خیر جب یہ ڈرے سہمے ایک سڑک پر پہنچے تو ایک تانگے والا مل گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''بچو! کہاں جا رہے ہو؟'' انہوں نے کہا کہ ہم اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئے ہیں، پھر وہ رونے لگے۔ تانگے والا شریف آدمی تھا کہنے لگا ''اب امن ہو گیا ہے۔ تم تانگے میں بیٹھ جاؤ میں تمہیں مسلمانوں کے پاس پہنچا دیتا ہوں۔ راستے میں کچھ لوگ ملے جو قافلے سے پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کے ہمراہ سارے بچے بہادر گڑھ قلعے میں پہنچے۔

جو لوگ بہادر گڑھ میں پناہ گزین تھے۔ ان کے عزیز و اقارب بچھڑ گئے تھے۔ کسی کی بیٹی نہیں تھی، کسی کی ماں غائب تھی اور کسی کا باپ نہیں تھا۔ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ اغواء ہوئے یا شہید۔ خورشید، اسلم اور سلیم بیٹوں کی والدہ یعنی میری بھابھی غائب تھیں۔ اعلانات ہونے لگے جو بچھڑے ہوئے ہوتے۔ ان کے اور ان کے رشتے داروں کے نام پکارے جاتے۔ اس طرح بہت برسوں کے بچھڑے ہوئے ملتے تو خوش ہو جاتے کچھ دن بعد میری بھابھی کے متعلق اعلان ہوا تو وہ بھی ہم سے آ ملیں۔ انہوں نے بتایا کہ جب شہیدوں کی لاشیں اکٹھی کی جا رہی تھیں تو وہ میرے تایا زاد بھائی محمد لطیف شہید بھائی کی لاش کے نیچے تھیں۔ ان کی ایک آنکھ میں گولی لگی تھی۔ ڈاکٹر نے چیک کیا تو ان میں بینائی تھی، لہٰذا انہیں ہسپتال داخل کر لیا گیا۔ جب طبیعت کچھ سنبھلی تو وہاں موجود سرجن رگوناتھ نے پوچھا! ''اگر تمہارا کوئی رشتہ دار ہو تو بتاؤ، ہم تمہیں بہادر گڑھ پہنچا دیں۔'' انہوں نے ابا جی مرحوم کا نام لیا سرجن صاحب پہچان گئے۔ انہوں نے بھابھی کو بہادر گڑھ پہنچا دیا۔

والد صاحب کی فرمائش پر ایک نیک بزرگ ہمارے گھر قرآن پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے دو بیٹے یعقوب اور ایوب بھی بہادر گڑھ پہنچ گئے۔ ان کی زبانی پتہ چلا کہ بلوائیوں نے ان کے بڑے بھائی، چھوٹی بہن، والدہ اور والد صاحب کو شہید کر کے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ وہ دونوں گھر پر نہیں تھے۔ اس لیے بچ گئے۔ ابا جی کے ایک ہندو شاگرد ناتھ ہم سے ملنے قلعہ آئے تھے۔

جس محلے میں ہم نے پہلی دفعہ پناہ لی تھی، وہاں پر ایک بہت ہی خدا ترس انسان مقبول صاحب رہتے تھے۔ وہ ہمارے رشتے کے ایک چچا اور پھلوں کے ایک تاجر برکت اللہ بچ بچا کر بارہ دری ایک انگریز دوست کے پاس پناہ لینے پہنچے، مگر اس کی کوٹھی خالی تھی۔ وہاں ہندوؤں نے گھیر کر ان تینوں کو شہید کر دیا۔ کپڑے کے ایک تاجر انگوراں والی مسجد کے قریب رہتے تھے۔ وہ اپنے جوان بیٹے کے ہمراہ بہادر گڑھ پہنچ گئے تھے۔ ان کے پاس خاصی رقم تھی۔ جس سے انہوں نے لوگوں کے سونے چاندی کے زیورات سستے داموں خریدنے شروع کر دیے۔ ان کے بال بچے فسادات سے پہلے ملتان آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک سکھ سے سودا طے کر لیا کہ ہمیں بہادر گڑھ سے دور لے چلو، پھر آگے ہم کوشش کر کے پاکستان پہنچ جائیں گے۔ سکھ نے وعدہ کر لیا۔ جب وہ کیمپ سے باہر نکلے تو اس وعدہ خلاف ظالم سکھ نے ان دونوں کو گولی مار کر شہید کر دیا اور رقم اور زیورات لے کر فرار ہو گیا۔ پاکستان آ کر ہم نے ان کے بال بچوں کو بتایا کہ انہیں ہمارے سامنے شہید کر دیا گیا تھا۔ وہ یہ سن کر یقین ہی نہیں کرتے تھے۔

دو ماہ بعد بہادر گڑھ کیمپ میں اعلان کیا گیا کہ جو کوئی ہنر جانتا ہو وہ کل دروازے پر آ جائے۔ مہاراجہ کو فارم کے لیے ضرورت ہے۔ اس طرح میرے نانا، تایا صاحبان اور کئی سو کے قریب لوگ جنگی قیدیوں کی طرح مسلح فوجیوں کے پہرے میں کام پر جانے لگے۔ وہ کوئی دس بجے کیمپ سے نکلتے اور مہاراجہ کے فارم پر مختلف کام سرانجام دینے کے بعد شام پانچ بجے کے بعد لوٹتے۔ راستے میں ایک دکان پڑتی تھی۔ کوئی چیز خریدتے تو

دکاندار قرآن شریف کے اوراق میں سودا لپیٹ کر دیتا۔ اس پر دل کڑھتا تھا' مگر کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ واپس آ کر انہیں کسی محفوظ جگہ دبا دیتے۔

تین ماہ بعد اعلان کیا گیا کہ مہاجرین تین ریل گاڑیوں کے ذریعے پاکستان پہنچائے جائیں گے۔ ہم لوگ آخری ٹرین میں آئے۔ بلوچ رجمنٹ ہماری حفاظت کے لیے ہمراہ تھی۔ مردوں کو چھت پر بیٹھنے کا حکم تھا۔ اور عورتوں اور بچوں کو بوگی میں۔ گاڑی اس طرح چلائی گئی کہ زیادہ خطرناک علاقے رات کو گزر جائیں تاکہ نقصان کا احتمال کم از کم ہو۔ ٹرین کہیں ہلکی کہیں تیز رفتار سے پاکستان کی طرف رواں رہی۔ کہیں ایسی جگہ نظر نہیں آئی جہاں شہیدوں کی لاشیں یا ڈھانچے نہ پڑے ہوں۔ کئی لوگ ریل کی چھت سے گر کر شہید ہو گئے۔ گاڑی ان کے لیے رک نہیں سکتی تھی۔ دو دن بعد رات کے دو تین بجے ٹرین پاکستانی سرحدی ریلوے اسٹیشن ہربنس پورہ پہنچی۔ وہاں میرے تایا صاحبان کو پتہ نہیں کیا ہوا کہنے لگے۔ ہم آگے کسی کے ذمہ دار نہیں' سب اپنی اپنی فکر کرو۔ چنانچہ والدہ صاحبہ' نانی جان' نانا جی ہم چار بھائی بہنوں کو لے کر ٹرین سے نیچے اتر آئے۔ اندھیری رات تھی۔ ہم بھائی بہنوں کے بنیان اور کچھے پھٹے ہوئے تھے۔ والدہ' نانی اور نانا جان بھی پھٹے کپڑوں میں تھے۔

ہم لوگ فکر مند تھے۔ کہ اب کہاں جائیں۔ اتنے میں کچھ آدمی ''جمیلہ جمیلہ'' کی آوازیں دیتے ہوئے ٹرین کے ساتھ آگے بڑھے۔ میری نانی صاحبہ کہنے لگیں مجھے لگتا ہے کہ میرا بیٹا حنیف ہے۔ ان کا کہنا ٹھیک نکلا۔ وہ قریب پہنچے تو میرے ماموں ہی تھے۔ ان کے ساتھ میرے عزیز خالو عبدالنبی تھے۔ جو اپنی بھابی کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ جن کا نام جمیلہ تھا۔ تیسرے فرد بھی میرے عزیز ہی تھے۔ وہ اپنی بیوی کے لیے آئے تھے جن کا نام بھی جمیلہ تھا۔ اس لیے تینوں جمیلہ جمیلہ پکارتے ہم تک پہنچے تھے۔

ماموں بمبئی سے کراچی پوسٹنگ کروا کر آ گئے تھے۔ وہ کئی دن سے روزانہ ہربنس پورہ آ کر ہمارے متعلق پوچھتے رہتے تھے۔ خالو اور ان کے بچے دہلی سے اور میرے پھوپھی زاد بھائی صدیق صاحب فیروز پور سے لاہور پہنچ گئے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی میرے ماموں ہمیں سیدھا کراچی لے آئے۔ میرے ایک تایا دو تین سال بعد کراچی ملنے آئے۔ دوسرے تایا نے حکومت سے زمین لینے کے لالچ میں ہمارے بھائی بہنوں اور والدہ کو کروڑ لال عین بلا لیا جہاں ہمارے قافلہ والوں کو بسایا گیا تھا' مگر جب زمین مل گئی تو انہوں نے والدہ اور بہن بھائیوں کو گھر سے نکال دیا۔ اس بُرے وقت میں تایا مہر محمد صاحب کام آئے۔ انہوں نے الگ مکان دلوا دیا۔ گھر کے لیے ہر ضرورت کی چیز پہلے سے لا دیتے۔ میں کراچی ماموں کے پاس رہا۔

سیٹھ چرن داس نے کئی دفعہ پیغام بھیجا کہ شریف صاحب کے بچے مجھ سے ملنے آئیں مگر پٹیالہ جانے کو جی نہیں چاہا۔ 1949ء میں پاک بھارت معاہدے کے تحت کچھ لوگ اغواء شدہ عورتوں اور بچوں کی تلاش میں پٹیالہ پہنچ گئے تھے۔ میرے ماموں اپنی بیٹی کو تلاش کرنے گئے تھے۔ خالو عبدالنبی مرحوم ہمارے پڑوسیوں کی نواسی حنیفہ کو لانے میں کامیاب ہو گئے۔ جب وہ اپنے والدین کے گھر سے نانی نانا کے گھر آ رہی تھی تو ایک سکھ نے اسے اغوا کر کے اس سے شادی کر لی تھی۔ ایک بچہ بھی ہوا تھا۔ حنیفہ پاکستان آ تو گئی' لیکن پٹیالہ واپس جانے کو دوڑتی تھی کیونکہ ممتا سے مجبور کر رہی تھی' مگر سرحد پر سخت پہرے نے اسے جانے نہ دیا۔ پتہ نہیں اب کہاں ہے۔ اس کے نانا نانی ضعیف ہے۔ ان پر بُرا وقت آیا' بیچارے بھیک مانگ کر گزر بسر کرتے رہے۔

کاش! جن لوگوں کو پاکستان کاٹتا ہے' وہ مشرقی پنجاب کی قربانیوں سے سبق سیکھیں۔ ہم نے بے شمار لوگوں کو اپنے سامنے شہید ہوتے دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ کسی کا بیٹا نہ رہا' کسی کا شوہر نہ رہا' کسی کا بھائی نہ رہا' ہزاروں بہو بیٹیاں اغوا ہو گئیں۔ سینکڑوں جوان لڑکیاں اور عورتیں اپنے معصوم بچوں سمیت کنوؤں میں کود گئیں۔

اردو بولنے والے ایک دوست نے مجھے ایک صاحب سے ملوایا کہ یہ پنجابی ہیں' آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ پتہ چلا وہ پٹیالے کے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ میرے گھر والے سب شہید کر دیئے گئے تھے۔ میرا نوجوان بھائی بی۔ اے تھا وہ بھی شہادت پا گیا۔ میں دو سال کا تھا کسی نے مجھے اٹھا لیا۔ وہی میرے ماں باپ ہیں۔ سٹی ہائی اسکول میں ہمارے ایک نیک دل جوان استاد تھے وہ گھاس منڈی میں شہید کر دیے گئے۔ ان کی ماں بھی شہید ہوئی۔ ان کی چھوٹی بہن اور باپ پاکستان آ گئے لیکن والد بچارے اب تک دیوانے ہیں' اپنے جوان بیٹے کو نہ بھول سکے۔

1968ء کے لگ بھگ میری ماموں زاد بہن سلمٰی پٹیالے گئیں۔ رات بھر انہیں آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ''پانی پانی'' جیسا کہ 1947ء میں ہزاروں شہید پانی مانگتے مانگتے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ان شہیدوں میں پانچ چھ ماہ سے لے کر آٹھ دس سال کے بچے بھی تھے۔ شہیدوں کی آوازیں انہیں اتنے سال بعد بھی سونے نہ دیتی تھیں۔ اس لیے وہ تین چار دن بعد ہی واپس اپنے وطن پاک پہنچ گئیں۔

(روای محمد افضال شریف)

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

ا۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچایئے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

پٹیالہ کے مسلمانوں پر ٹوٹنے والی قیامت صغریٰ

(حصہ دوم)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وطن واپسی ہوئی تو میں نے بھٹنڈہ ریاست پٹیالہ میں وکالت شروع کر دی۔ میں اس شہر میں نووارد اور تنہا مسلمان وکیل تھا۔ میری محنت اور فرض شناسی رنگ لائی اور میں جلد کامیاب وکیلوں میں شمار ہونے لگا۔ جن جوڈیشنل افسروں سے تعلقات قائم ہوئے ان میں سردار رنجیت سنگھ سرکاریہ قابل ذکر ہیں۔ وہ سکھ ہونے کے باوجود غیر متعصّبانہ رویہ اختیار کیے ہوئے تھے اور انصاف کرنے کی وجہ سے قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ یوں بھی پٹیالہ میں زیادہ تعصب نہیں تھا۔ اس وقت کا فرماں روا مہاراجہ بھوپندر سنگھ اپنی رعایا سے کوئی تعصب نہ رکھتا تھا۔ پٹیالہ میں کئی دفعہ وزیر اعلیٰ مسلمان مقرر ہوئے۔ جن میں سر لیاقت حیات کا نام زیادہ مشہور تھا۔ مہاراج بھوپندر سنگھ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مہاراج ہوا تو اس نے بھی تقریباً یہی پالیسی جاری رکھی۔

23 مارچ 1940ء کو جب لاہور میں قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو اس کے اثرات پٹیالہ میں بھی ظاہر ہوئے۔ مسلمانوں کی ہمدردیاں برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ تھیں۔ اور وہ پاکستان کے قیام کے خواہاں تھے۔ لیکن ریاست میں کسی سیاسی پارٹی کا قیام یکسر منع تھا۔ جیسے جیسے پاکستان کی تحریک پھیلتی چلی گئی۔ سکھ قائدین کے بیانات اس کے خلاف پریس میں آنے لگے۔ پھر انتخابات 1946ء میں مسلم لیگ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ اور جب 3 جون 1947ء کو لارڈ مونٹ بیٹن نے قیام پاکستان کا اعلان کیا تو سکھ لیڈر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی کے سامنے کرپان لہراتے ہوئے اعلان کیا کہ پاکستان ہماری لاشوں پر بنے گا۔ ایسے اشتعال انگیز بیانات سے ریاست پٹیالہ میں بھی اشتعال پھیل گیا۔ عید کا دن تھا۔ 18 اگست 1947ء کو بھٹنڈہ میں سکھوں نے مسلمانوں کو تہہ وتیغ کرنا شروع کر دیا۔ مجھے اطلاع ہوئی کہ بلوائی تمہاری طرف آ رہے ہیں۔ میرا محلّہ ہندوؤں کا تھا۔ اور میں واحد مسلمان وکیل تھا۔ وہاں سے اہل خانہ کے ہمراہ بھاگ کر ایک مسلمان محلّہ میں پناہ گزیں ہوا۔ باہر گولیاں برستی رہیں۔ ہم ایک شفیق مسلمان کے گھر محفوظ رہے۔ پانچ دن کے بعد گھر سے نکلے افراتفری میں والدہ صاحبہ بچی کو گود میں لیے اسٹیشن کی طرف نکل گئیں اور میں اپنی بیوی اور دو نوخیز لڑکوں کے ساتھ کسی دوسری طرف بھاگا۔ مگر چکر کاٹ کر اسٹیشن ہی پہنچ گئے۔ وہاں بے حد رش تھا۔ سکھ کرپانیں لہرا رہے تھے اور مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے۔ ایسے میں ایک سکھ بھالا لے کر مجھ پر لپکا۔ میں بے تحاشا بھاگتا چلا گیا۔ اور شہر کے باہر کھیتوں میں گھس گیا۔ کئی دن وہاں چھپا رہا۔ جب حالت ابتر ہوئی تو دوبارہ اسٹیشن کی طرف گیا وہاں سناٹا تھا اور خون سے زمین سرخ ہو رہی تھی۔

اچانک مجھے بیوی اور ماں کی یاد آئی اور یک لخت احساس ہوا کہ میں دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں۔ میں بے اختیار رونے لگا۔ مجھے ڈھارس دینے والا کوئی نہ تھا۔ بے یار و مددگار ایک سمت چلتا رہا یہاں تک کہ ایک گاؤں میں پہنچ گیا۔ کئی دن کی بھوک اور پیاس نے نڈھال کر دیا تھا۔ ایک دوازے پر دستک دے دی۔ ایک عورت دروازے پر آئی اور چلائی ”مارو، مارو! مسلمان آ گیا!“

میں جان بچانے کے لیے پھر بھاگا اور ایک کھیت میں گھس گیا اور کئی دن وہیں چھپا رہا۔

آخر کار چلتے چلتے ڈبوالی قصبے میں پہنچا۔ یہ جگہ بھٹنڈہ سے بارہ چودہ میل ہوگی۔ اتفاق دیکھئے کہ اس قصبے میں داخل ہوتے ہی تھانہ پولیس سامنے آ گیا۔ وہاں ایک کانسٹیبل پہرہ دے رہا تھا۔ وہ ہندو تھا۔ میری حالت زار دیکھ کر اسے رحم آ گیا۔ اس نے مجھے بٹھایا اور پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ اس طرح کئی دن فاقے کے بعد آخر کار اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے میرا رزق اتارا۔ میری بپتا سن کر اس نے کہا: ”تھانیدار سرسہ سے تبدیل ہو کر چندروز پہلے آیا ہے۔ اور تمہارے لیے یہ خوش خبری ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ اس وقت کسی تفتیش کے سلسلے میں شہر گیا ہوا ہے۔ تم آرام سے بیٹھو اور اس کا انتظار کرو وہ ضرور تمہارے لیے کوئی بندوبست کر دے گا۔

مجھے اس غیر متوقع خبر سے واقعی بڑی خوشی ہوئی اور میں تھانیدار کا انتظار کرنے کی بجائے اس کا پتہ دریافت کر کے عین موقع پر پہنچ گیا۔ جب میں نے تعارف کرایا تو اس کے چہرے پر خفگی کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے میری طرف سے منہ موڑ لیا۔ مگر میں مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق پھر اس کے رخ جا کر کھڑا ہوا۔ اس مرتبہ اس نے بگڑ کر زور سے کہا! ”مر گڈی دے وچ...... اور اس طرح وہ مجھے اپنے ساتھ جیپ میں سرسہ لے گیا۔ وہاں پہنچے ہی تھے کہ مسلمان پولیس والوں سے اسلحہ لے کر انہیں سبکدوش کر کے حصار میں پناہ گزیں کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ حصار پہنچ گیا۔ اس کیمپ میں حمزہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ حصار میں وکالت کرتے تھے اور پاکستان جانے کے لیے کیمپ میں پناہ گزین تھے۔

حصار میں قیام کے دوران میں نے سردار رنجیت سنگھ سرکاریہ سول جج بھٹنڈہ کو مطلع کیا کہ میرے بیوی بچوں اور والدہ کو تلاش کرائیں۔ کچھ عرصہ بعد مجھے اطلاع ملی کہ موصرف کی کوشش سے میرے بیوی بچے مل گئے ہیں۔

ہماری ٹرین 24 اکتوبر 1947ء کو حصار سے براستہ بھٹنڈہ پاکستان کے لیے روانہ ہوئی۔ میں نے پہلے سے اطلاع دے دی تھی۔ بھٹنڈہ اسٹیشن پر سردار رنجیت سنگھ سرکاریہ بذات خود میری بیوی کے ساتھ موجود تھا۔ بیوی کو پا کر جو خوشی ہوئی وہ جلد ہی رفع ہو گئی کیونکہ بچے موجود نہ تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ قتل کر دیئے گئے تھے۔ والدہ اور بچی کا بھی پتہ نہ چلا۔ بہر حال ہم غم کو سینے سے لگائے امروکا ریلوے اسٹیشن ضلع بہاولنگر پہنچ گئے۔ میری بیوی کی حالت بچوں کے بچھڑنے اور اذیت ناک لمحے گزارنے سے غیر ہو رہی تھی۔ وہ بس خلا میں گھورتی رہتی اور بچوں کو یاد کیے جاتی۔

امروکا اسٹیشن پر سامنے ایک مال گاڑی کھڑی تھی چونکہ زادراہ کے ہم متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے اسی میں بیٹھ گئے۔ مال گاڑی گھنٹوں چلتی رہی اور صبح سویرے ہمیں ڈیرہ نواب صاحب پہنچا دیا۔ وہاں سے ہم بہاولپور آئے۔ وہاں محرالدین صاحب وکیل سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے اور بڑے خلوص اور محبت سے ہمیں مہمان رکھا۔ ان کے مشورے سے میں نے مشتاق گورمانی صاحب وزیر اعلیٰ بہاولپور سے ملاقات کی۔ انہوں نے مجھے جنرل مارڈن سے ملنے کا مشورہ دیا جو اس وقت ریاست بہاول پور کی افواج کا کمانڈر تھا غالباً یہ مشورہ گورمانی صاحب

نے میری گزشتہ ملازمت بطور سی جی اور (آرمی ویلفیئر) کے پس منظر کی وجہ سے یاد تھا، مگر میں نے ان سے ملنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر میں چیف جسٹس بہاولپور ہائی کورٹ دین محمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے ملازمت دینے سے معذرت کی مگر وکالت کے لیے لائسنس دینے کا وعدہ کیا۔ اس وقت میں یکسر تہی دامن تھا۔ اس لیے یہ پیش کش قبول کرنے سے معذرت چاہی۔

بہاولپور میں جب روزگار کے مواقع میسر نہ آئے تو میں لاہور پہنچ گیا۔ وہاں تھوڑی سی کوشش کے بعد میرا تقرر بطور پراسیکیوٹنگ سب انسپکٹر ہوگیا۔ اس اثنا میں دانش مہاجر کیمپ میں اپنی والدہ اور بچی کی تلاش جاری رکھی۔ وہاں سے ان کا پتہ چل گیا اور ریلوے اسٹیشن کے نزدیک تیزاب احاطہ میں غلام حسین نامی ایک شریف النفس شخص کے ہاں وہ مع بچی مل گئیں۔ اس اچانک ملن سے ہماری آنکھوں سے اظہار تشکر کے طور پر آنسو جاری ہوگئے۔

26 نومبر 1947ء کو ملتان پہنچ کر میں بطور پی ایس آئی ملازمت پر حاضر ہوگیا۔ 172 روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ میری حالت غیر تھی۔ مسلسل پریشانی اور بدحالی کے علاوہ مفلسی نے اعصاب پر برا اثر ڈالا تھا۔ مگر ہم نے صبر وشکر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ محکمے کے افسران کی مہربانی سے مجھے دو ماہ کی تنخواہ پیشگی مل گئی۔ میں نے محلّہ قدیر آباد میں حکیم عطاء اللہ کا مختصر سا مکان کرائے پر لیا اور خدا تعالیٰ کا شکر کیا کہ دو وقت روٹی کا سامان ہوگیا۔ میں میلوں پیدل دفتر جاتا تھا۔ اور جب تک پی ایس آئی رہا گھر میں کوئی فرنیچر نہ تھا۔ ہم سب فرش پر سوتے تھے۔ ایک سال بعد جب میں نے دیکھا کہ اس قلیل تنخواہ میں گزارا نہیں ہوسکتا تو اپنے افسران کی وساطت سے آئی جی پولیس کو اپنی ترقی کی خاطر دوسرے منصب یعنی سب انسپکٹر (پراسیکیوٹنگ) کے لیے درخواست دی، مگر آئی۔ جی قربان علی خان نے کوئی نظیر نہ ہونے کی بنا پر میری درخواست ٹھکرا دی اور استعفا منظور کرلیا۔

یوں میں 1949ء سے وکالت کر رہا ہوں اور مالی طور پر فراغت سے ہوں، مگر بیوی کی دائمی معذوری اور ان کا دماغی توازن برقرار نہ رہنے اور اپنے بیٹوں کے قتل سے، میں ایک ایسے المیے سے دوچار ہوں جس میں عمر بھر باہر نہ آسکوں گا۔

یہ کہہ کر میاں نور محمد زاروقطار رونے لگے۔ اور میں انہیں دلاسا دیتے ہوئے سوچتا رہا کہ قیام پاکستان کے لیے ایسے کئی لاکھ انسانوں سے بے دریغ قربانیاں دیں۔ گھر بار چھوڑے، عزیز و اقارب کو قتل ہوتے دیکھا۔ صرف نظریہ پاکستان کے لیے، مگر آج کراچی اور دیگر جگہوں پر تعصب کی جو دھند ذہنوں پر چھا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ختم کرے۔ آمین

راوی:- میاں نور محمد ایڈووکیٹ

راہِ آزادی کی کہانیاں

(1)

''مسز پاکیزہ رفیق پٹیالہ میں رہتی تھی لیکن 1946ء میں ان کے والد کا تقرر رسول ہیڈ ورکس پر ہوا جس کی وجہ سے وہ قیام پاکستان سے پہلے ہی ادھر آ گئیں۔ یہ کہانیاں ان کے خاندان، عزیز و اقارب اور ملنے جلنے والوں کے حالات پر مبنی ہیں اور ان میں شمع آزادی کا نور جھلکتا ہے۔''

''مائی! تمہارا داماد، بیٹی اور نواسے ادھر پاکستان میں ہیں۔ انہیں لاہور کے قریب باؤلی کیمپ میں جا کر تلاش کرو'' سکھ سرحدی محافظ وحیدن مائی کو سمجھا کر اور بازو لہرا کر پاکستان کی سرحدی چوکی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

وہ کانٹے دار تاروں سے لہولہان بے حس ہاتھوں کو دیکھتی اور کبھی اس سڑک پر نظریں ڈالتی جو فیروز پور کو جا رہی تھی۔ نومینز لینڈ عبور کر کے جب وہ پاکستانی پرچم کے سائے میں کھڑے بلوچ رجمنٹ کے سرحدی محافظ کے پاس پہنچی تو اس نے مائی کی بڑی دلجوئی کی۔ اسے کچھ کھانے پینے کو بھی دیا۔ جب مائی نے اس سے منصور، ہمونہ، منیر اور اختر کے متعلق پوچھا تو اس نے وحیدن مائی کو فوجی ٹرک میں ان مہاجرین کے ساتھ بٹھا دیا جو باؤلی کیمپ جا رہے تھے۔ راستہ بھر مائی ان سے بھی اپنے داماد، بیٹی اور نواسوں کے متعلق پوچھتی رہی۔

تیسرے دن وہ گنڈا سنگھ والا کی سرحد پر تھی اور پاکستانی چوکی سے آگے بھارتی چوکی پر جا کر فیروز پور جانے والی سڑک کو گھور رہی تھی۔ اس پار جدھر کو یہ سڑک جاتی تھی، اس کے تمام عزیز رہ گئے تھے۔ بھارتی سرحدی محافظوں نے ایک بار پھر اسے پاکستانی سرحدی محافظوں کے حوالے کر دیا۔ وہ دوبارہ باؤلی کیمپ لے جائی گئی۔ لیکن وہاں سے پھر ادھر سرحد پر لوٹ آئی۔

دو تین ماہ بیت گئے۔ اب وحیدن مائی دونوں ممالک کے سرحدی محافظین کے لیے جانی پہچانی شخصیت بن چکی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ کئی دوسری مجبور و بے کس عورتوں کی طرح مائی بھی اپنے پیاروں کے کھو جانے سے نیم پاگل ہو چکی ہے۔ اب انہوں نے اسے کچھ سمجھانا یا باؤلی کیمپ بھیجنا ترک کر دیا تھا۔ البتہ اسے کھانے پینے کو کچھ دیتے رہتے تھے۔ خستہ حالی میں وہ کچھ بیمار ہو گئی اور پھر دسمبر 1948ء کی ایک ٹھٹھرتی صبح کو اس کا بے جان اکڑا ہوا جسم شیشم کے ایک پیڑ کے نیچے پایا گیا۔ اسے امانتاً دفن کرنے سے پہلے گنڈا سنگھ والا پولیس نے اس کے کئی فوٹو کھنچوائے اور اس کی شناخت کے لیے انہیں لاہور کے اخبارات میں شائع کرایا۔ اس کے بعض رشتے داروں نے جن میں راویہ کے والد بھی تھے وحیدن کو پہچان لیا۔ مزید شناخت سرحدی محافظوں کے ان بیانات سے ہو گئی جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جن افراد کے نام لے کر وہ پکارتی تھی وہ رشتے داروں کے لیے جانے پہچانے نام تھے۔ اس کی بیٹی میمونہ تو راویہ کی ممانی تھی۔

مرحومہ وحیدن، پٹیالہ کے رہنے والی تھی لیکن بیوہ ہونے سے پیشتر وہ شوہر کے ساتھ دہلی میں نرس تھی۔ اللہ نے اسے چھ بچوں سے نوازا لیکن کسی موروثی مریض کی وجہ سے صرف میمونہ ہی زندہ رہی جسے اس زمانے میں مرحومہ وحیدن نے میٹرک تک تعلیم دلائی تھی۔ اس کی شادی راویہ کے سگے ماموں منصور احمد وکیل سے ہوئی۔ نیلی آنکھیں، لمبے بھورے بال اور چمپئی رنگت ہے جب میمونہ پٹیالہ میں آئی تو گھر کی رونق بڑھ گئی۔ اللہ تعالی میمونہ کو جس قدر حسن دیا تھا اسی قدر اعلیٰ سیرت بھی عطا کی تھی۔ اکیلے رہنے کی وجہ سے وحیدن بھی اپنی ملازمت چھوڑ کر واپس پٹیالہ آ گئی۔

لوگ منصور اور میمونہ کی جوڑی کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اللہ نے ان کو دو بچے دیئے جو ماں باپ کے ہم شکل تھے۔ لگتا تھا قدرت نے ان کو مکھن اور سندھور سے گوندھ کر بنایا تھا۔ بلوائیوں نے جب وکیل صاحب کے گھر کو آگ لگائی تو انہوں نے تمام دروازے باہر سے بند کر دیئے۔ وحیدن اس روز اتفاق سے اپنی بہن سے ملنے اس کے گاؤں گئی تھی۔ لیکن بہن سے ملاقات نہ ہو سکی اور جب وہ لوٹ کر آئی تو کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔ اس کے لواحقین اسے اپنے ساتھ پریڈ گراؤنڈ میں قائم کیے گئے کیمپ لے گئے جہاں سے وہ فوجی ٹرکوں پر بخیریت لاہور آئے۔ لیکن وحیدن اچانک گم ہو گئی۔

راویہ کے لواحقین کو وحیدن تو نہ ملی، البتہ اخبار میں چھپے اس کے فوٹو پر ان کی نظر پڑ گئی۔ اسے اس کی خواہش کے مطابق پاکستان میں قبر کی جگہ نصیب ہوئی تھی۔ پاکستان کی خاطر اس کا سارا کنبہ نذر آتش ہو گیا اور آج اس کے سینے کے داغ پاکستان کی پیشانی پر ستارے بن کر چمکتے ہیں۔

(2)

نومبر 1947ء کی ایک شام واہگہ ریلوے اسٹیشن پر اہل لاہور کا ایک جم غفیر اس گاڑی کے استقبال کے لیے موجود تھا جو مہاجرین کو لے کر کالکا سے چلی تھی اور براستہ امرتسر پاکستان پہنچ رہی تھی۔ خاصے انتظار کے بعد دھندلائے ہوئے افق پر ایک سیاہ دھبا منتظر لوگوں کی سمت بڑھتا ہوا نظر آیا۔ یہ ریل کا انجن تھا۔ خوشی کی ایک لہر ہجوم میں پھیل گئی۔ وہ پانی کے مٹکوں اور کھانے کے طباقوں کا جائزہ لینے لگے جو انہوں نے پاک وطن میں آنے والے مہاجر بھائیوں کے لیے تیار کر رکھے۔ جوں جوں گاڑی نزدیک آتی گئی لوگوں کا جوش وخروش بڑھتا گیا۔ انہوں نے نعرہ تکبیر، نعرہ رسالت اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے لیکن گاڑی سے ان کے نعروں کا کوئی جواب نہیں آیا۔ گاڑی اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی اور ہلکی رفتار سے چلتی ہوئی پلیٹ فارم پر آ رکی، مگر گاڑی کا کوئی دروازہ کھلا نہ اس میں سے کوئی ذی روح برآمد ہوئی۔ لوگوں کے دل انجانے اندیشے سے دھڑک اٹھے اور جب انہوں نے کھڑکیوں سے لوگوں کے اندر جھانکتے اور چیختے ہوئے پیچھے ہٹ جاتے۔ کرپانوں سے کٹے ہوئے گلے، گولیوں سے چھلنی سینے، جسم سے علیحدہ ہوئے بازو، پھٹے ہوئے پیٹ ظلم وتشدد کی المناک داستان سنا رہے تھے۔ پھر نوجوانوں نے گاڑی کے ڈبے آپس میں تقسیم کر لیے اور خون میں لت پت، کٹی پھٹی، اوپر نیچے پڑی لاشوں کو عزت واحترام کے ساتھ آبدیدہ آنکھوں سے ہدیہ عقیدت پیش کرتے اتارنے لگے۔ کچھ افراد زخمی حالت میں بھی ملے۔ ان کو فوراً طبی امداد کے لئے کیمپوں اور ہسپتالوں میں بھیجا گیا۔

ایک درمیانی ڈبے سے بہت سی لاشیں نکالی جا چکیں تو ایک لڑکے کے رونے کی آواز آئی۔ وہ نشستوں کے نیچے چھپا رو رہا تھا جب کہ اس کی آٹھ سالہ بہن اور چھ سالہ بھائی اس کے قریب ہی بے ہوش پڑے تھے۔ جب ان کو ہوش میں لایا گیا تو وہ امی ابو کو پکارنے لگے اور چیخنے لگے۔

انہوں نے اپنے ماں باپ کی لاشیں پہچان لیں اور ان سے لپٹ لپٹ کر رونے لگے۔ چار سالہ احسن اپنے انداز سے ماں باپ کا ماتم کر رہا تھا۔ وہ جس لاش سے لپٹ کر رو رہا تھا اسے ایک شخص نے پہچان لیا، وہ قاسم بابو کی لاش تھی جو سریاں والا بازار امرتسر کے رہنے والے تھے اور ریلوے کی ملازمت کے سلسلے میں ہوشیار پور میں مقیم تھے۔ وہ بڑے شریف الطبع، پابند صوم وصلوٰۃ اور پاکستان کے حامی تھے۔ وہ پاکستان کے لیے اپنی جان کا نظرانہ دے کر مقدس سرزمین میں تدفین کے لیے پہنچ گئے تھے۔

قاسم بابو کی بیوی بلقیس ہوشیار پور کی رہنے والی تھیں، اس لیے وہ فوری طور پر پاکستان آنے کا فیصلہ نہ کر سکے۔ جب مسلمان آبادیوں، محلوں اور کیمپوں پر سکھ جتھے حملے کرنے لگے تو بلقیس پاکستان پہنچنے کے لیے بے تاب ہوگئی۔ وہ ہر چیز کو اللہ کے سپرد کر کے صرف اپنی جانیں لے کر مہاجر کیمپ منتقل ہو گئے۔ کوئی تین ہفتوں کا صبر آزما عرصہ گزارنے کے بعد وہ خصوصی ریل گاڑی کے ذریعے پاکستان روانہ ہوئے لیکن امرتسر میں موت ان کی منتظر تھی۔ گواریوں اور کرپانوں کی تند و تیز آندھی نے ان کی زندگی کے چراغ ہمیشہ کے لیے گل کر دیے۔ نہ جانے ایسے کتنے اور گمنام مجاہد ہوں گے جن کو وطن کی خاک میں آسودگی تو نصیب ہوئی لیکن رہنا نصیب نہ ہوا۔

(3)

میں 1945ء میں اپنی ننھیالی ریاست پٹیالہ میں پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ میری نانی کے پڑوس کی لڑکی طاہرہ ہمارے اسکول میں آٹھویں میں پڑھتی تھی۔ ہم دونوں ہمیشہ اکٹھی اسکول جایا کرتی تھیں۔ طاہرہ بہت ذہین، خوش اخلاق اور خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ ہمدرد دوست اور باوفا سہیلی تھی۔

پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن طاہرہ سب سے چھوٹی تھی۔ سب سے بڑا بھائی کمال سوتیلا تھا جسے بچپن سے طاہرہ کی ماں نے پالا تھا۔ کمال ہسپتال میں بطور ڈسپنسر ملازم تھا۔ دو بھائی باپ کے ساتھ جنرل سٹور پر کام کرتے تھے۔ دو چھوٹے لڑکے پڑھتے تھے۔ مجھے ہوم ورک کے سلسلے میں طاہرہ کی ضرورت محسوس ہوتی تو میں ان کے گھر چلی جاتی تھی۔ طاہرہ کی ماں زینت بہت اچھی ملنسار اور نیک خاتون تھی۔ وہ لوگ ہمارے دکھ سکھ میں شریک ہوتے۔ میری نانی اور خالہ کی ان کے ساتھ پرانی دوستی تھی۔

اگلے سال میرے والد کا تبادلہ پاور ہاؤس کی تعمیر کے سلسلہ میں رسول ہیڈ ورکس پر ہوا۔ میں اور طاہرہ وقت رخصت اشکبار آنکھوں سے ایک دوسرے سے لپٹ کر ملیں۔

1947ء میں پاکستان وجود میں آیا۔ ہمارے گھر کے تقریباً 18 افراد میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ ظالموں نے تیغ سے میرے ماموں، خالہ، ممانی اور سب بچوں کے ٹکڑے کر دیئے۔ اس طرح طاہرہ اور اس کے گھر والوں کے بارے میں بتانے والا کوئی نہ رہا۔ بیس سال گزر گئے۔

ایک دن میں بازار سے گزر رہی تھی۔ ایک عورت پر نظر پڑی تو صورت کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ ذہن پر زور دیا تو یاد آیا کہ یہ تو صغیرن ہے جو میرے ساتھ پٹیالہ میں پڑھتی تھی۔ میں نے اس کا نام لے کر آواز دی۔ وہ جاتی جاتی رک گئی۔ لیکن وہ مجھے نہ پہچان سکی۔ میں نے اپنا نام وغیرہ بتایا تو اسے یاد آ گیا۔ سب جاننے والوں کا حال احوال پوچھا۔ طاہرہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے اداس الفاظ میں کہا،

”ان کے گھر سے صرف خالہ زینب زندہ رہ گئی ہیں۔ طاہرہ کے چاروں بھائیوں اور باپ کو سکھوں نے بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ طاہرہ نے اپنے صحن کے کنویں میں چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ ڈوب کر مر گئی۔“

میں نے صغیرن سے خالہ زینب کے گھر کا پتہ لے لیا۔ اگلے روز میں خالہ زینب کے گھر پہنچی تو وہ ایک بستر پر لیٹی یوں لگ رہی تھی جیسے ہڈیوں کے ڈھانچے پر کھال کا پردہ کھینچ دیا گیا ہو۔ آنکھیں لٹک کر بٹنوں کی طرح گول اور بے نور ہو چکی تھیں۔ آنسوؤں کے متواتر بہتے رہنے سے ان کے گالوں کا ابھار گلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے طاہرہ کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا اور خالہ کا حال احوال پوچھا انہوں نے کہا ”شکر خدا کا“ وہ جس حال میں رکھے۔“ پٹیالہ میں محلے کے لوگ مجھے یاد تھے ان کے بارے میں پوچھنے کے بعد میں نے خالہ سے پوچھا کہ جب سب ہی شہید ہو گئے تو وہ کیسے بچ گئیں؟ اس پر خالہ نے جواب دیا۔

”ریاست پٹیالہ میں اکا دکا مسلمانوں کا قتل قیام پاکستان کے بعد معمول بن گیا تھا۔ سب لوگ شام کو جلد سے جلد دروازے بند کر کے لیٹ جاتے۔ ایک دن بڑی تعداد میں سکھوں نے میرے گھر کے چاروں طرف گھیرا ڈال لیا۔ وہ خاصی دیر باہر کے دروازے کو توڑتے رہے۔ لیکن مضبوطی کی وجہ سے دروازہ نہ ٹوٹا تو باہر سے سیڑھی لگا کر کوٹھے پر چڑھ آئے اور پھر صحن میں آ گئے۔ تمہارے خالو نے کلہاڑی سے ان کا مقابلہ کیا۔ لیکن اتنے آدمیوں کے سامنے کلہاڑی کیا کر سکتی تھی۔ تمہارے خالو کو زمین پر لٹا کر انہوں نے کرپان سے بکرے کی طرح ذبح کیا۔ شہ رگ کٹ جانے سے خون فوارے کی صورت بہہ نکلا۔ میں دہشت زدہ ہو گئی۔ آنگن میں مرغیوں کا بڑا سا ٹوکرا پڑا تھا۔ میں اس کے نیچے گھس گئی۔ پھر باری باری انہوں نے چاروں لڑکوں کو قتل کیا۔ میں سب کچھ دیکھتی رہی۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ میں کچھ بول نہ سکی اور نہ کچھ کر سکی۔

”رات کے اندھیرے میں انہیں طاہرہ نظر نہ آئی۔ یہ ہولناک منظر وہ برداشت نہ کر سکی تو خدا جانے اس نے کیا سوچا۔ صحن کے اندر بنی کھوئی (کنواں) پر سے اس نے تختہ ہٹایا اور ”اللہ مدد“ کہتے ہوئے کنویں میں کود گئی۔ لڑکے جان کنی کے عالم میں صحن میں تڑپ رہے تھے۔ در و دیوار پر خون اندھیرے کے باوجود نظر آ رہا تھا۔ بلوائیوں نے گھر کو اس طرح لوٹا کہ کچھ بھی نہ چھوڑ کر گئے۔ میرے ہوش و حواس خطا ہو گئے اور نہ جانے میں کب تک سکتے کے عالم میں پڑی رہی۔ ہوش آیا تو مجھے نئے سرے سے احساس ہوا کہ میرے ساتھ اور میرے گھر والوں کے ساتھ کیا بیت چکی ہے۔

”میں ٹوکرے کے نیچے سے نکلی۔ تمہارے خالو کی خون میں نہائی ہوئی لاش کے پاس بیٹھ کر میں نے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگی۔ سب سے بڑی کوتاہی تو یہ تھی کہ میں اس کا ساتھ نہ نبھا سکی۔ میں نے اپنا حق مہر معاف کیا۔ بچوں کی لاشوں کو چوما اور انہیں دودھ بخشا۔ کھوئی میں جھانک کر طاہرہ کو آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اپنی ہی آوازیں واپس آ رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے طاہرہ مجھے آوازیں دے رہی ہے۔ میں نے دہائی دی۔ مدد طلب کی لیکن میرے گھر تو کیا' محلے میں بھی کوئی نہ تھا۔ اگر کوئی ہوگا بھی تو جان کے خوف سے کون آتا۔ اچانک میں گری اور بے ہوش ہو گئی۔ ایک فوجی نے جھنجھوڑ کر مجھے اٹھایا۔ مجھے ہوش آ چکا تو میں نے دیکھا کہ فوجی سکھ تھے۔ اور لاشوں کو سمیٹ رہے تھے۔ میرے احتجاج کے باوجود وہ سب لاشیں ٹرک میں ڈال کر لے گئے۔ مجھے بھی زبردستی ٹرک میں سوار کیا اور پریڈ گراؤنڈ کے کیمپ میں پھینک دیا۔

”خالہ' جب یہ سب کچھ ہوا تو کمال بھائی کہاں تھے۔“ میں نے پوچھا۔

"کمال اپنے بیوی بچوں کو لینے سرہند گیا ہوا تھا۔ تبھی بچ گیا۔"

ایک سرد آہ کے ساتھ خالہ نے روتے ہوئے اپنی حالت کا ذکر ان الفاظ میں کیا۔ "بیٹی" کچھ تو میں اپنے سہاگ اور بچوں کو روتی رہی لیکن زیادہ رونا میں پچھتاوے کا روتی رہی ہوں کہ کسی تلوار، کسی برچھی کسی گولی پر میرا نام نہیں لکھا تھا۔ شاید میرا وقت نہیں آیا تھا۔ یہ سوچ کر دل کو تسلی دیتی ہوں لیکن دل کہتا ہے۔ کہ سارا قصور تیرا ہے۔ تو نے کیوں اپنی جان کی خاطر اپنے آپ کو ٹوکرے کے نیچے چھپا لیا اور کس طرح پانچ مردوں کو ذبح ہوتے دیکھتی رہی۔ تمہیں تو اپنی جان کے مقابلے میں طاہرہ کا بھی خیال نہیں تھا۔ شاید خدا مجھے میری بے حسی کی سزا دے رہا ہے۔"

"خالہ! پچھتاوے سے کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "تم نے اپنے سہاگ اور بچوں کی جو قربانی دی ہے یہ اس کی قبولیت ہے۔ کہ ہم ادھر پاکستان میں امن وامان سے رہ رہے ہیں۔ طاہرہ جیسی تمہاری دوسری لاکھوں پاکستانی بیٹیاں عزت سے رہ رہی ہیں۔"

پھر میں نے موضوع بدلنے کی خاطر خالہ کو آنکھوں کا علاج کرانے کا مشورہ دیا تا کہ وہ کچھ نہیں تو کم از کم راستہ وغیرہ تو دیکھ سکے۔

"بیٹی" خالہ نے جواب دیا۔ "میں اب کچھ دیکھنا نہیں چاہتی۔ جب میرے نور نظر ہی نہیں رہے۔ تو آنکھوں کے نور کو لے کر کیا کروں گی۔ جو کچھ نہیں دیکھنا تھا، دیکھ چکی ہوں۔ ان آنکھوں کے اندھیرے میں ہر وقت اپنے شوہر اور بچوں کے چہرے نظر آتے رہتے ہیں۔

خالہ پھر رونے لگی۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ صغیرن بھی آ کر خالہ کو چپ کرانے لگی۔ طبیعت سنبھلنے پر اس نے کمال اور صغیرہ کی تعریف کی کہ ان دونوں نے اس کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس نے بچپن میں کمال کو سوتیلا نہیں سمجھا تھا۔ اور اس نے بھی اسے کبھی سوتیلی ماں خیال نہیں کیا۔ خدا اس کی نیکی کا پھل دے رہا ہے۔

بے نور آنکھوں کے اندھیرے میں بھٹکنے والی یہ نحیف و نزار عورت ان ہزاروں بلکہ لاکھوں عورتوں میں سے ایک ہے۔ جنہوں نے اپنی مانگ کا سندور پاکستان کی مانگ میں بھرا اور اپنی جھولی کے تمام مہکتے پھول آزادی پر قربان کر دیئے۔ پاکستان ایسے ہی لوگوں کا ہے۔ اے پاکستانیو! اپنے ان محسنوں کی تلاش کر کے ان پر عقیدت کے پھول نچھاور کرو۔ یہ نادر روزگار انسان اب ختم ہونے والے ہیں۔ اور یوں یہ داستان کبھی مکمل نہ ہو سکی۔

(راویہ مسز پاکیزہ رفیق)

قصّہ نصف صدی کا

لاکھوں دلوں کی دھڑکن **محی الدین نواب** کے جادُو قلم سے ایک خوبصورت ناول...... تقسیم ہند (قیامِ پاکستان) اور پاکستان کے حالات و واقعات کے تناظر میں لکھی گئی ایک پر اثر تحریر...... آزادی پاکستان سے شروع ہو کر آج تک کا سفر طے کرتی ہوئی داستان...... جہاں حالات اور مسائل ویسے ہی ہیں جیسے نصف صدی پہلے تھے۔ **کتاب گھر** کے ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

بیدر کا قتلِ عام

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

اس سے قبل کہ میں اصل داستان شروع کروں ''بیدر'' کی تاریخی حیثیت سے آپ کو متعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ''بیدر'' ریاست حیدر آباد دکن کا ایک ضلع ہے۔ یہ ضلع کسی زمانے میں بہمنی خاندان کا پایۂ تخت تھا۔ اس ضلع کے پایۂ تخت بنائے جانے سے متعلق بھی بڑا دلچسپ قصّہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ احمد شاہ ولی بہمنی گلبرگہ سے بیدر آئے۔ گھوڑوں پر سوار بیدر کے مضافات سے گزر رہے تھے کہ ایک لومڑی ان کے کتے پر جھپٹی۔ جب بادشاہ نے لومڑی کو کتے پر حملہ کرتے دیکھا تو اپنے مصاحبوں سے کہا: ہمارا خیال ہے لومڑی کی اس بہادری میں یہاں کی آب و ہوا کا بڑا دخل ہے لہٰذا مابدولت اپنا دارالسلطنت یہیں بنائیں گے: چنانچہ دارالسلطنت گلبرگہ سے بیدر منتقل کر دیا گیا۔

بیدر میں بہت سے بزرگانِ دین کے مزارات بھی ہیں۔ دورِ مغلیہ کا ایک وسیع قلعہ آج بھی یہاں موجود ہے۔ قلعے کے ایک حصے میں وہ یادگار توپ رکھی ہے جسے پہلی بار چلاتے ہوئے اس کا بنانے والا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ یہ توپ اتنی بڑی ہے کہ اس کے دہانے میں ایک آدمی کھڑا ہو سکتا ہے۔

اُس روز قائداعظمؒ کا سوئم تھا۔ سارے شہر پر عجیب اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ ایک طرف قائداعظم کی رحلت کا غم تھا اور دوسری طرف بھارت کے حملے کا خوف۔ ہر طرف اس قسم کی افواہیں اُڑ رہی تھیں کہ آج کل میں حملہ ہونے والا ہے۔ بھارت اور حیدر آباد کی بات چیت کی ناکامی کے بعد صورتِ حال بڑی نازک ہو گئی تھی۔ بھارت کے درمیان گھری ہوئی یہ اسلامی ریاست ایک انتہائی نازک موڑ پر پہنچ چکی تھی۔

صبح کے 9 بجے ہوں گے، بیدر کی سب سے بڑی جامع مسجد میں ہزاروں لوگ تلاوتِ قرآن میں مصروف تھے کہ اچانک ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ سے سارا شہر لرز اٹھا۔ ابھی لوگ صحیح صورتِ حال سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ ایک تیز رفتار فائیٹر تیزی سے مسجد کی طرف آتا دکھائی دیا۔ لوگوں میں ہلچل مچ گئی اور سب کے سب تلاوت چھوڑ کر مسجد کے صحن میں آ گئے۔ ابھی آسمان کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک تڑتڑ تڑ کی آواز سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ بیدر کے شہری، جنہیں ہوائی حملے سے بچاؤ کا طریقہ معلوم تھا نہ اس کی ہلاکت خیزیاں، اطمینان سے بمباری کا تماشا دیکھنے میں مصروف تھے۔ جب بے شمار گولیاں ان کے سروں پر سے گزر کر مسجد کے ستونوں میں پیوست ہو گئیں، تو انہیں خطرے کا احساس ہوا، پھر ہوائی اڈے پر بمباری کے دہشت انگیز دھماکوں سے لوگوں میں سراسیمگی پھیلنے لگی۔ جلدی جلدی فاتحہ خوانی کی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسجد خالی ہو گئی۔

13 ستمبر 48ء کو بھارت نے حیدر آباد دکن کے نہتے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی...... ایک شہری چشم دید واقعات بیان کرتا ہے۔

ہمارے محلے کے ''بانی کار'' صاحب نے فوری طور پر محلے والوں کو جمع کیا اور سب کو بھر مار بندوقیں تقسیم کر کے ہدایت کی ''درختوں اور چھتوں پر چڑھ کر ہوائی جہازوں کو گراؤ۔'' آج بھی جب میں ان مضحکہ خیز حرکتوں کو یاد کرتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ کہاں سینکڑوں دیو پیکر جنگی طیارے

اور کہاں پرندے مارنے والی بھرمار بندوقیں، لیکن ایک جوش تھا۔ جب بھی کوئی طیارہ ہمارے سروں پر سے گزرتا ہم ''بندوق چلا دیتے۔'' محلے کے ہم چند لڑکے آبادی کے قریب ایک باغ میں درختوں پر چڑھے ہوئے بھارتی طیاروں کو ''گرانے'' میں مصروف تھے۔ بھارتی طیارے بیدر کے ہوائی اڈے پر غوطے لگا لگا کر بم برسا رہے تھے۔ شہر کی ساری چھتیں اور فصلیں مردوں، عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان میں سے کسی نے اس قسم کا ''تماشا'' پہلے نہ دیکھا تھا۔ شہر کے بعض جوشیلے نوجوان بموں کے سائے میں سڑکوں پر بھارتی حکومت کے خلاف نعرے لگاتے پھرتے رہے تھے۔ صبح سے شام تک وقفے وقفے سے بمباری ہوتی رہی۔

دوسرے دن بھی بمباری کا سلسلہ جاری رہا۔ دو بجے کے قریب ہم دو تین دوست اپنی بندوقوں کے لیے بارُود لے کر آ رہے تھے کہ اچانک ایک فائیٹر نے ہمارے عین سر پر آ کر گولیاں برسانی شروع کیں۔ ہم سامنے ہی ایک ہندو درزی کی دکان میں گھس گئے۔ فائیٹر کی آواز اتنی خوفناک تھی کہ چھتیں ہلتی نظر آتی تھیں۔ درزی، اس کی بیوی اور لڑکیاں چیختی ہوئی ہم سے لپٹ گئیں۔ یہاں تک درزی مہاراج کی حالت غیر ہو گئی۔ ہم نے انہیں تسلی دی اور بڑی مشکل سے چھپتے چھپاتے اپنے مورچوں پر پہنچ گئے۔ شہر کے ہندو، جنہیں آج تک سر اٹھانے کی ہمت نہ تھی، آہستہ آہستہ شیر ہو رہے تھے۔ دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ ریڈیو حیدرآباد سے مسلسل جنگی خبریں اور رزمیہ نغمے نشر کیے جا رہے تھے ریڈیو کی خبروں کے مطابق ہر محاذ پر رضا کار اور حیدرآبادی فوجیں ڈٹ کر بھارتی حملے کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ عثمان آباد کے محاذ پر بہت سارے نوجوان بھارتی پیش قدمی روکنے کے لیے ٹینکوں کے آگے لیٹ گئے تھے۔ اس قسم کی خبروں سے لوگوں کے دلوں میں دہشت کے ساتھ ساتھ ایک جوش بھی پیدا ہو رہا تھا۔ تیسرے دن شہر پر ہزاروں پوسٹر گرائے گئے۔ ان میں مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ شہر خالی کر دیں۔ یہ دن سخت اضطراب میں گزرا شہر میں کشیدگی انتہا کو پہنچ گئی تھی، لیکن ابھی تک کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا تھا۔ شہر کے نوجوان شہر خالی کرنے کے حق میں نہ تھے بلکہ بھارتی فوجوں سے مقابلہ کرنے پر تلے ہوئے تھے، لیکن سنجیدہ قسم کے لوگ حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے شہر خالی کر دینا چاہتے تھے۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے، آخر شہر خالی کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ پھر کیا تھا، ایسی بھگدڑ مچی کہ دیکھتے ہی دیکھتے شہر خالی ہو گیا۔ ہمارے محلے سے تقریباً سارے مسلمان جا چکے تھے، لیکن ہمارا خاندان ابھی تک رُکا ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ والد صاحب گھر چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے بڑے بھائی صاحب اچانک گم ہو گئے تھے۔ موصوف چونکہ رضا کار تنظیم کے لیڈر بھی تھے، لہذا ہمارے دلوں میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ میں اپنے دو چچا زاد بھائیوں کو لے کر رات کے دس بجے شہر کی گلیوں میں انہیں ڈھونڈھتا پھر رہا تھا۔ اکثر مسلمان اتنی عجلت سے بھاگے کہ انہیں اپنے گھروں کے دروازے تک بند کرنے کا ہوش نہ تھا۔ کئی گھر ایسے تھے جن میں چولھوں پر کھانا پک رہا تھا۔ کسی گھر میں دستر خوان بھی بچھا ہوا تھا، لیکن گھر والے غائب تھے۔ ہم سے جہاں تک ہو سکا، گھروں کے دروازے بند کر دیے۔ گیارہ بجے تک ہم گلیوں میں پھرتے رہے، لیکن بھائی صاحب کا کوئی پتا نہ چلا۔ ادھر شہر کی صورت لحہ بہ لحہ نازک ہوتی جا رہی تھی۔ جگہ جگہ ہندو، ٹولیوں میں کھڑے کھسر پھسر کرتے نظر آ رہے تھے۔ رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے بھائی صاحب تشریف لائے۔ معلوم ہوا کہ ہتھیار لینے تشریف لے گئے تھے۔ (واضح رہے کہ بیدر میں مقیم فوجیوں کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ وہ ایک ایک روٹی کے بدلے ایک ایک رائفل دینے لگ گئے) بڑی مشکل سے والد صاحب کو چلنے کے لیے راضی کیا گیا۔ آخر بارہ بجے رات ہمارا مختصر سا قافلہ بے سر و سامانی کے

عالم میں شہر سے ایک مضافاتی گاؤں چلر گی کی طرف چل پڑا۔

چلر گی جانے والی سڑک پر چاندنی میں دُور دُور تک انسان ہی انسان نظر آ رہے تھے۔ آدھی رات کے وقت بھی بھارتی طیارے فضا میں چکر لگا رہے تھے۔ جب کوئی طیارہ نیچے آتا' تو سب لوگ سڑک کے آس پاس جھاڑیوں میں چھپ جاتے۔ اسی طرح قافلہ رات بھر چلتا رہا۔ صبح کے قریب ہم چلر گی پہنچ گئے۔ معلوم ہوا دوسرے دن دوپہر کے قریب بھارتی فوجیں بیدر میں داخل ہوئیں۔ فوجوں کی آمد کا آنکھوں دیکھا حال ایک ایسے دوست نے سنایا جو بھارتی فوجوں کی آمد کے وقت ہندوؤں کے استقبالیہ ہجوم میں موجود تھا۔ اس کا بیان ہے:

''سارے محلے میں میرے علاوہ چار چھ اور مسلمان رہ گئے تھے جن میں ولی اللہ نامی ایک جوشیلا نوجوان بھی شامل تھا۔ یہ شخص اپنی بیوی بچوں سمیت شہر میں موجود تھا۔ کوئی دس بجے کے قریب سارا شہر جے ہند کے نعروں سے گونج اٹھا۔ بھارتی فوجیں شہر سے ایک میل دور پہاڑی کے نزدیک پہنچ چکی تھیں اور ٹینکوں کے ذریعے اندھا دھند گولے پھینک رہی تھیں۔ سارے ہندو فوج کے استقبال کے لیے شہر سے باہر جمع ہو رہے تھے۔ میں اپنی جگہ اس لیے مطمئن تھا کہ شہر کے کسی ہندو سے میرا کوئی جھگڑا نہ تھا اور نہ کوئی میرا دشمن تھا۔ میں بھی ہجوم میں شامل ہو گیا۔ ولی اللہ نے رضا کاروں کی وردی پہن رکھی تھی میں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ وردی اتار دے' لیکن اس بندۂ خدا نے ایک نہ سنی کہتا تھا کہ مروں گا اِسی وردی میں...... سارے ہندو حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے' مگر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ ولی اللہ کو چھیڑے: البتہ چند ضعیف ہندوؤں نے اسے سمجھایا کہ یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں' لیکن وہ ضدی انسان وہیں ڈٹا رہا۔

آخر فوج کی چند جیپیں ترنگا لہراتی آن پہنچیں۔ پہلی جیپ میں فوجی افسروں کے ساتھ شہر کے دو تین ہندو لیڈر تھے جو مہینوں پہلے ہندوستان بھاگ گئے تھے۔ ان جیپوں کے پیچھے ٹینک تھے۔ جیسے ہی یہ جیپ گاڑیاں مجمع کے قریب پہنچیں ''جے ہند'' کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ ٹینک تیزی سے شہر کے سامنے مورچہ بند ہو گئے۔ فوجی افسر جیپ سے اترے اور انہوں نے اترتے ہی مجمع سے پوچھا: 'کیا یہاں کوئی رضا کار ہے؟'' سب کی نظریں ولی اللہ کی طرف اٹھ گئیں جو رضا کاروں کی وردی پہنے' سبز ٹوپی اوڑھے کھڑا تھا۔ فوجی افسر کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی' اس نے ولی اللہ کو ہاتھ سے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ ولی اللہ نے بے خوفی کے ساتھ اس کی طرف چلا گیا۔

''تم رضا کار ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں'' ولی اللہ نے بے خوف ہو کر جواب دیا۔

آنے والے لمحات کے خیال سے میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ کمانڈر نے اس سے کہا:

''جے ہند بولو''

اس کے جواب میں ولی اللہ نے نعرہ تکبیر اللہ اکبر بلند کیا۔

کمانڈر غصے میں کانپنے لگا۔ مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کمانڈر نے زور سے ولی اللہ کے منہ پر طمانچہ مارا۔ ولی اللہ نے بھی ہاتھ اٹھایا لیکن قریب کھڑے ہوئے فوجیوں نے بڑھ کر اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ کمانڈر نے ولی اللہ کو سامنے ٹیلے پر چڑھنے کا حکم دیا...... ولی اللہ نے صاف انکار

کر دیا' لیکن فوجیوں نے رائفلیں تان لیں' ولی اللہ نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں نفرت' غصّہ اور مجبوری کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ مجھے اس کے انجام کے متعلق اب کوئی شبہ نہ رہا۔ فوجیوں نے سنگینوں کے بل پر اُسے ٹیلے کی طرف دھکیل دیا۔ جیسے ہی وہ ٹیلے پر پہنچا' کمانڈر نے رومال ہلایا۔ اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے ٹینکوں سے اچانک گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور ولی اللہ کا جسم چھلنی ہو گیا۔

اس بہادر انسان کی موت سے مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ادھر کمانڈر پوچھ رہا تھا:

''یہاں کوئی اور رضا کار ہے؟''

اب مجھے اپنی قضا دکھائی دینے لگی۔ میں نے کھسک جانا چاہا' لیکن سوال یہ تھا کہ اتنے بڑے مجمع کی نظر بچا کر نکلوں کیونکر؟ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص بلند آواز سے بھارتی فوجیوں کو گالیاں دیتا چلا آ رہا ہے۔ یہ ایک پاگل شخص قطب الدّین تھا۔

اُس کی جرأت پر کمانڈر کو بڑا طیش آیا۔ اُس نے سوچے سمجھے بغیر فوجیوں کو اشارہ کیا۔ وہاں کھڑے ہوئے لوگ ابھی کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ تڑ تڑ تڑ کی آواز آئی اور قطب الدین خون میں لت پت زمین پر تڑپتا نظر آیا۔ ہندوؤں نے اس سے قبل ایسا خونی ڈرامانہ دیکھا تھا' اس لیے سب کا رنگ فق تھا۔ کمانڈر جیپ میں بیٹھ گیا۔ ہجوم نے ایک بار پھر جے ہند کا نعرہ لگایا اور منتشر ہونے لگا۔ میں بھی اس ہجوم کے ساتھ شہر کی طرف لوٹا' پھر آنکھ بچا کر ایک گلی میں گھس گیا اور گلیوں گلیوں ہوتا بڑی مشکل سے اپنے گھر پہنچا۔ اگرچہ اُس وقت تک شہر میں گڑبڑ شروع نہیں ہوئی تھی! تاہم اندھیرا ہونے سے پہلے گھر سے نکلتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ سورج غروب ہونے کے ایک گھنٹے بعد گھر سے نکلا۔ ہر طرف سے جے ہند کے نعروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مسلمانوں کے محلے ویران پڑے تھے۔ میں ایسے ہی ایک ویران محلے سے گزر رہا تھا کہ بچاؤ' بچاؤ کی آواز سنائی دی۔ میں چند لمحے اس کشمکش میں کھڑا رہا۔ آخر تیزی سے اُس طرف دوڑا جدھر سے بچاؤ بچاؤ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے جس کی وجہ سے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر اللہ کا نام لے کر گلی میں داخل ہو گیا۔ میں بالکل تنہا تھا۔ اگر حملہ آور مسلح ہوں تو پھر؟ میں نے سوچا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ قریب پہنچ کر میں نے بارُعب آواز میں کہا:

''ہٹ جاؤ' ورنہ گولی مار دوں گا۔''

میری یہ دھمکی کامیاب رہی۔ شاید وہ دونوں غنڈے غیر مسلح تھے۔ گولی کا نام سنتے ہی گرتے پڑتے بھاگے۔ نیچے پڑا ہوا شخص دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے اُسے تسلی دی اور ساتھ لے کر تیزی سے فصیلوں کی طرف بڑھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ہم خطرے کی زد سے باہر تھے۔ رات بھر بھٹکتے پھرتے آخر کسی نہ کسی طرح چلر گی پہنچ گئے۔''

چلر گی میں بیدر کے سارے مسلمان جمع ہو گئے تھے۔ دوسرے دن شام کے وقت اچانک دھماکے شروع ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بھارتی فوجیوں نے حیدر آبادی فوجوں کا بارُودی ذخیرہ تباہ کر دیا ہے۔ چلر گی میں تیسرا دن تھا۔ گاؤں کے قریب ہی مانجراندی بہتی تھی۔ تیسرے دن افواہ اُڑی کہ بھارتی فوجیں چلر گی کا رُخ کر رہی ہیں۔ یہ خبر پھیلتے ہی گاؤں میں بھونچال سا آ گیا۔ اِن خبروں کے مطابق ہزاروں مسلمان قتل کر دیے گئے تھے اور بھارتی فوج راستے کی ساری مسلم آبادیاں تباہ کرتی چلر گی آ رہی تھی۔ ان دنوں مانجراندی میں سیلاب کی سی کیفیت تھی' اسے پار کر کے آگے جانا

بڑا مشکل تھا، لیکن بعض لوگ جو زیادہ خوف زدہ تھے، اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر ندی میں اتر گئے۔ بعض بڑی دقتوں سے دوسرے کنارے پر پہنچے اور اکثر ندی کی نذر ہو گئے۔ باقی ہزاروں مسلمان اپنی قسمتوں کا فیصلہ سننے کے منتظر تھے۔ ہر چہرے پر موت کی زردی پھیلی ہوئی تھی۔ بارش کا زمانہ تھا۔ تین دن سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ چھوٹے سے گاؤں میں ہزاروں آدمیوں کی وجہ سے ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی تھی اور ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اتنے میں دو تین مسلمان بُری طرح گھبرائے ہوئے آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے بتایا بھارتی فوجیں مالی گاؤں تک آ گئی ہیں اور ہمارے سامنے کئی مسلمانوں کو قتل کر دیا ہے۔ اس خبر سے گاؤں میں ہر طرف دہشت پھیل گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ٹینکوں کے شور سے سارا گاؤں گونج اٹھا۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ بہت سے نوجوان لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے، لیکن حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے انہیں ٹھنڈا کیا گیا۔ سب سے بُرا حال نوجوان لڑکیوں کا تھا، کیونکہ یہ افواہ بھی اڑی ہوئی تھی کہ فوجی لڑکیوں کو پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ ہر جگہ لڑکیوں کو مردانے کپڑے پہنا کر پگڑیاں باندھی گئیں۔ کئی جگہ انہیں تاریک کمروں میں بند کر کے تالے لگا دیے گئے۔

اتنے میں گاؤں کے پٹواری کی آواز آئی جو گھنٹیاں بجا بجا کر اعلان کر رہا تھا کہ جس جس کے پاس ہتھیار ہیں وہ کچہری میں فوراً جمع کروا دے، بعد میں جس کے پاس ہتھیار نکلے گا اسے گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ یہ اعلان ہوتے ہی ہتھیاروں کا ایک انبار لگ گیا۔ ہمارے پاس کئی ہتھیاروں کا ذخیرہ تھا جنہیں زمین میں دفن کر دیا گیا، لیکن عورتوں اور بزرگوں کے اصرار پر یہ ہتھیار فوجیوں کے حوالے کر دیے گئے۔ تھوڑی دیر بعد فوجیوں کو گاؤں کی تلاشی لینے کا حکم ملا۔ بس پھر کیا تھا، بھارت کی یہ بہادر فوج نہتے مسلمانوں کے گھروں میں شیروں کی طرح گھسنے لگی۔ عورتوں کے زیور، کپڑے، گھٹڑیاں جو کچھ ہاتھ آیا، آدھ گھنٹے میں تلاشی کے بہانے سب چھین لیا مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ فوجیوں کے اس دستے میں سکھ یا گورکھا سپاہی نہیں تھے جس کی وجہ سے بات صرف مال پر ٹل گئی۔ شام ہوتے ہوتے فوجیوں کا یہ قافلہ واپس ہوا اور لوگوں کی جان میں جان آئی۔

دوسرے روز ہم چند آدمی مانجرا ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے کہ ”ندی میں دور سے کچھ گھٹڑیاں بہتی نظر آئیں جب یہ گھٹڑیاں قریب آئیں، تو انہیں دیکھ کر مارے دہشت کے سب کا برا حال ہو گیا۔ یہ دراصل لاشیں تھیں جو گل سڑ کر انتہائی بھیانک ہو گئی تھیں۔ کنارے پر بیٹھی ہوئی چند عورتیں اور بچے چیخیں مارتے ہوئے گاؤں کی طرف بھاگے۔ اُس دن کے بعد سے مسلسل دس گیارہ دن تک ندی میں لاشیں بہتی ہوئی نظر آتی رہیں۔ تقریباً آٹھ دس دن بعد شہر کے چند کانگریسی لیڈر آئے جن کے ہمراہ دو تین مسلمان رہنما بھی تھے۔ انہوں نے یقین دلایا شہر میں امن ہو گیا ہے، لہٰذا سب کو شہر واپس چلنا چاہیے، لیکن کوئی شخص واپس جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ آخر بڑی مشکلوں سے یہ طے پایا کہ تین چار نوجوان شہر جا کر اطمینان کر آئیں، اس کے بعد سارے مسلمان واپس ہو گئے۔ اس فیصلے کے مطابق تین نوجوانوں کو منتخب کیا گیا۔ وہ ان کانگریسی رہنماؤں کے ساتھ شہر گئے۔ شام تک واپس آ کر رپورٹ دی کہ امن تو ہو گیا ہے، لیکن سارے مسلمانوں کے گھر لوٹ لیے گئے ہیں، گاؤں میں گندگی کی وجہ سے ہیضہ پھیلنے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور بارش بھی مسلسل تھی، لہٰذا واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

چلرگی میں 14 دن قیام کے بعد ہم لوگ بیدر کی طرف واپس روانہ ہوئے۔ ہمارا قافلہ شہر کے قریب تاجلا پور نامی ایک گاؤں میں رُک گیا۔ یہاں ہمارے چند عزیزوں کے گھر تھے۔ شام کو یہیں قیام کرنا طے ہوا۔ ہم چار پانچ لڑکوں نے شہر جا کر اپنے گھر دیکھ آنے کا ارادہ ظاہر کیا جس کی

اجازت مل گئی: چنانچہ ہم لوگ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں ہر طرف ایک عجیب سناٹا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شہر نہیں قبرستان ہے۔ ہم چھپتے چھپاتے اپنے گھروں میں پہنچے۔ دروازے چوپٹ کھلے تھے۔ ہم ڈرتے ڈرتے گھر میں داخل ہوئے۔ مغرب کا وقت تھا' ہر طرف تاریکی پھیل رہی تھی۔ جیسے ہی گھر کے دالان میں پہنچے' ایک کمرے سے کھڑ بڑ کی آواز آئی۔ ہمارے دل بری طرح دھڑکنے لگے۔ میں نے ہمت کی اور کمرے میں جھانکا۔ اندھیرے میں ایک بہت بڑی سیاہ سی چیز پھنکارتی ہوئی ہماری طرف آتی نظر آئی..... (دلوں پر پہلے ہی دہشت طاری تھی' اس بلا کو دیکھ کر ہم بری طرح بھاگ کھڑے ہوئے۔ گھر سے خاصی دُور جا کر ہم رُکے ہم نے سوچا' آخر یہ بلا تھی کیا؟ ہم نے کہا شیر' چیتا ہو نہیں سکتا شیطان بھوت کے ہم قائل نہیں۔ ہم نے طے کیا ہو نہ ہو یہ کوئی جانور ہوگا۔ ہمیں اپنی بزدلی پر بڑا غصہ آیا۔ ہمارے پاس ٹارچ تھی' مگر گھبراہٹ میں وہیں کہیں گر گئی تھی: چنانچہ دوبارہ ٹارچ تلاش کی۔ دالان میں پہنچ کر میں نے اندھیرے کمرے کی طرف روشنی پھینکی۔ اندر ایک کالی سی بھینس کھڑی جگالی کر رہی تھی۔ ہمیں ہنسی آ گئی۔ اسے بڑی مشکلوں سے باہر بھگایا گیا۔ جب ہم نے کمروں کا جائزہ لیا' تو وہاں بھینسوں کی غلاظت کے سوا کچھ نہ تھا: البتہ دو تین کمروں کا فرش ضرور کھودا گیا تھا۔ اچھی طرح دیکھ بھال کے بعد چند پڑوسی ہندوؤں سے مل کر ہم واپس ہوئے۔ انہوں نے ہمیں یقین دلایا اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔

دوسرے دن ہمارا قافلہ روانہ ہوا۔ عورتوں اور بچوں کا برا حال تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم اپنے اپنے گھروں کو پہنچ گئے تھے۔ گھروں کے لٹ جانے کا سب کو افسوس تھا' لیکن جانیں بچ جانے کی خوشی بھی تھی۔ عورتیں گھروں کی صفائی میں لگ گئیں۔ ایک کمرے میں قرآن شریف کے اوراق بکھرے پڑے تھے جن پر بھینسوں کا گوبر پڑا تھا۔ والد صاحب کو کسی بات کا دکھ نہ تھا' لیکن انہیں آج تک قرآن شریف کی اس بے حرمتی کا بے حد افسوس ہے۔ ہم لوگ جب شہر سے باہر اپنے ہوٹل اور دکان دیکھنے نکلے' تو فصیلوں کے ساتھ خندق میں تین چار لاشیں تیرتی نظر آئیں۔ یہ لاشیں سڑ گل کر پھول گئی تھیں معلوم ہوا اس میں ایک لاش تو اس ولی اللہ کی ہے اور دوسری قطب الدین کی۔ باقی نہ معلوم کس کس کی تھیں۔ ہماری دکان اور ہوٹل سب تباہ ہو چکے تھے۔ کئی ماہ تک سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' آخر آہستہ آہستہ حالات سازگار ہوتے چلے گئے۔ ہمارے جانے سے پہلے شہر کے باہر جو خانہ بدوش چیتھڑوں میں لپٹے رہتے تھے' ان کے جسموں پر شاندار کپڑے نظر آ رہے تھے جو مسلم گھرانوں سے لوٹے گئے تھے۔ کچھ دن تک ان خانہ بدوشوں نے سونا۔ 25 روپے تولہ بیچا۔

تقریباً چھ ماہ بعد صورتِ حال یہ ہوئی کہ شہر میں مسلمانوں کا پھر پلہ بھاری تھا۔ ایک بار شر پسند ہندوؤں نے بقرعید پر ہنگامہ کرنا چاہا' لیکن مسلمانوں کو تیار دیکھ کر ان کی ہمت نہ ہوئی۔ بیدر شہر میں تو مسلمانوں کا جانی نقصان ہوا تھا' لیکن آس پاس دیہاتوں میں جس بیدردی سے مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا' اس کی مثال نہیں ملتی۔ قتل اور غارت گری کے یہ واقعات سن کر ہی دل دہل جاتا ہے۔ سینکڑوں کنویں مسلمانوں کی لاشوں سے پاٹ دیے گئے۔ جوان لڑکیوں کے ننگے جسموں سے نکالے گئے۔ ماؤں اور باپوں کے سامنے ان کے جوان لڑکوں کو درختوں سے لٹکا کر اُن کی کھالیں اتاری گئیں۔ غرض درندگی کے ایسے مظاہرے ہوئے کہ انسانیت کا دل لرز اٹھا' حتیٰ کہ بعض کانگریسی لیڈر واقعات کا ذکر کرتے ہوئے آج بھی رو پڑتے ہیں۔

(اردو ڈائجسٹ ستمبر 1967ء)

دلی کی بپتا

شاہد احمد دہلوی کے یادگار سفرنامے کی تلخیص......عبدالمجید قریشی

بڑے بوڑھوں سے ''جنگ آزادی'' انگریزوں کے بقول ''غدر'' کے واقعات اکثر سنے اور خواجہ حسن نظامی کے لکھے ہوئے افسانے بھی پڑھے اور سوچتے کہ ایسی تباہی دلّی پر کبھی آئی ہے نہ آئے گی لیکن ستمبر 1947ء کی غارت گری کے سامنے 1857ء کی بربادی ہیچ ہوگئی۔ اتنی بڑی تباہی تو دنیا کی تاریخ میں کبھی آئی ہی نہیں۔ لکھوکھا آدمی مارے گئے۔ اتنی خونریزی ہوئی کہ یہاں کی مٹی سرخ ہوگئی اور کوئی خاندان ایسا نہ رہا کہ جسے مالی یا جانی نقصان نہ پہنچا ہو۔

اگست کے شروع ہی سے دلّی میں بُری بُری خبریں آنے لگی تھیں پھر پنجاب اور سرحد کے شرنارتھی بھی آنے شروع ہوگئے اور ان کے لیے شہر کے اندر اور باہر کئی کیمپ کھل گئے۔ انہوں نے طرح طرح کی کہانیاں سنا کر دلّی کی فضا مکدر کرنا شروع کی۔ 12 اگست سے لاہور کی حالت بگڑی اور ایسی بگڑی کہ تین دن میں وہاں سکھ اور ہندو نام کو نہیں رہا۔ نہ امرتسر مسلمانوں سے خالی کرایا جاتا اور نہ لاہور پر آفت آتی۔ لاہور کے بعد سارے مشرقی پنجاب میں قتل و غارت گری وبا کی طرح پھیل گئی اس کا اثر مغربی پنجاب پر پڑنا ضرور تھا وہاں بھی کشت و خون شروع ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں دلّی میں شرنارتھیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ دم گھٹنے لگا۔ خنجر زنی کے واقعات شروع ہوگئے اور ریل گاڑیوں میں خون ہی خون دکھائی دینے لگا۔

دلّی والے مطمئن تھے کہ چاہے سارے ہندوستان میں لوٹ مار ہو' دلّی میں امن رہے گا کیونکہ یہ دارالحکومت ہے اور یہاں دنیا بھر کے سفیر رہتے ہیں۔ ہندوستانی حکومت یہاں ہر قیمت پر امن برقرار رکھے گی۔ 15 اگست کو بڑے زور و شور سے جشن آزادی منایا گیا۔ جس میں ہندو مسلمان سب شریک ہوئے مگر تیور اسی دن سے بدلنے لگے۔ مسلمانوں میں ہراس پیدا ہو چلا تھا لیکن سب اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں دیتے رہے ابتدا میں دلّی کی حکومت نے بڑی سختی سے انتظام کیا' باہر والوں نے چین سے نہ بیٹھنے کی قسم کھائی تھی۔ ذرا سکون ہوا کہ پھر چھوٹا سا ہنگامہ شروع کر دیا۔ اور کچھ نہیں تو رات کو نعرے لگائے جاتے اور گھنٹے بجائے جاتے۔ مسلمان سمجھتے کہ حملے کی تیاری ہے جواب میں وہ بھی نعرے لگاتے۔ اس صورتحال کے پیش نظر نعرے لگانا خلاف قانون قرار پایا اور اعلان کیا گیا کہ نعرے لگانے والوں کو گولی مار دی جائے گی۔ بیس بیس گھنٹوں کے کرفیو تو لگا ہی کرتے تھے اب چھیاسی چھیاسی گھنٹوں کے لگنے لگے۔ دو چار گھنٹوں کے لیے کبھی کرفیو کھل گیا تو کھل گیا ورنہ اپنے اپنے گھروں اور محلوں میں قید رہو۔ شہر پر عجیب بے رونقی چھا گئی اور جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر لگنے لگے۔ جب کرفیو کھلتا لوگ بدحواس ہو کر ضروری سامان خریدنے بازاروں میں نکل پڑتے۔ دکانوں پر وہ ریل پیل ہوتی کہ کمزور آدمی تو دکان دار تک بھی نہ پہنچ سکتا۔ سودا کم اور خریدار زیادہ' حد یہ کہ راشن ملنا بھی دشوار ہوگیا۔ دو ہفتے میں بہ مشکل ایک ہفتے کا راشن ملا وہ بھی اس ''خوبی'' کا کہ آٹا نہیں ہے۔ گیہوں لے لو۔ آٹا پیسنے کی چکیاں اول تو کھلی نہیں اور جو کبھی کھل گئی تو اس پر ایک میل لمبی

قطار کھڑی ہو جاتی۔ کرفیو چار گھنٹے کے لیے کھلتا اور کرفیو کے بعد کوئی باہر ٹھہرے تو اسے گولی مار دینے کا حکم' ناچار لوگوں نے خود چکیاں پیسیں مگر اتنی چکیاں بھی کہاں سے آتیں۔ لوگوں نے سل بٹے پر گیہوں پیسا اور جب اس طرح بھی کام نکلتے نہ دیکھا تو اُبال اُبال کر کھانے لگے۔

5 ستمبر جمعہ کے دن میں اپنے دفتر پہنچا۔ ضروری خطوں کے جواب لکھ کر محلے کی مسجد میں دو بجے نماز پڑھنے گیا۔ واپس آیا اور اپنے کمرے تک پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک زور کا دھما کا سنائی دیا اور اس کے بعد ایک دل ہلا دینے والا شور برپا ہوا۔ غور سے سننے پر معلوم ہوا کہ اللہ اکبر کے نعرے بلند ہو رہے ہیں کسی نے فتح پوری کی مسجد میں بم پھینکا تھا کچھ لوگ بھاگتے ہوئے ہماری گلی میں سے نکلے تو پتہ چلا کہ مسجد کی کیاری میں بم پھٹا ہے۔ ایک آدمی تو اسی وقت مر گیا آٹھ دس زخمی ہو گئے۔ نمازی جب نعرے لگا کر مسجد سے نکلے تو پولیس نے بندوقیں چھتیا کر انہیں منتشر کر دیا۔ سارے بازار چشم زدن میں بند ہو گئے اور خوف کے مارے سب اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے۔ ہمارے گھر سب سے زیادہ خطرے میں تھے کہ سارا محلّہ ہندوؤں کا تھا مگر محلے والوں نے کچھ نہیں کیا' تاہم جتنے آس پاس کے مسلمان تھے۔ سب مع بال بچوں کے ہمارے زنانہ گھر میں آ گئے۔ دروازہ بند کر لیا گیا تھا۔ میں اندر گیا تو عجیب منظر دیکھا۔ پچاس ساٹھ عورتیں دالانوں میں بھری ہوئی تھیں۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں' صحن اور چھوٹے دالان میں مرد کھڑے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں چھری تھی کسی کے ہاتھ میں لکڑی' ایک صاحب جو دروازے کے قریب تھے ان کے ہاتھ میں دو نالی خالی بندوق' غرض ہر شخص تیار کھڑا تھا کہ اب حملہ ہوا میں کوٹھے پر گیا اور چاروں طرف ہندوؤں کے مکانوں پر نظر ڈالی سب اپنے اپنے گھروں میں خاموش کھڑے تھے اور تیور حملہ کرنے کے نہیں تھے یہ دیکھ کر میں پھر اپنے دفتر میں آ گیا۔ میرا قیام ان دنوں جامع مسجد کے علاقے میں تھا۔ میرے دو منشی بھی ادھر ہی رہتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ کام بند کرو اور گھر چلو ورنہ کرفیو لگ جائے گا۔

ہم سب گلی میں نکلے تو ہندو کھڑے تھے مگر مسلمانوں کی آمدرفت ہو رہی تھی۔ ہم بھی نکلتے چلے گئے۔ سب دکانیں بند پڑی تھیں۔ ہمدرد کے دواخانے پر اشرف صبوحی کھڑے تھے انہیں گھر پہنچنے کی تاکید کر کے ہم آگے بڑھے ہی تھے کہ سامنے ایک رکشاء میں ایک موٹا سا ہندو آتا دکھائی دیا۔ دوبارہ جو ادھر نظر اٹھی تو دیکھا کہ رکشے والا خالی رکشا موڑ رہا ہے اور وہ موٹا ہندو نہایت تیزی سے بھاگا جا رہا ہے اس کے پیچھے چھریرے بدن کے دو لڑکے لگے ہوئے ہیں۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں اس کی پھٹی ہوئی قمیض کا پچھلا حصہ تھا اور دوسرا اس سے قریب ہو کر الگ ہو چکا تھا جب وہ موٹا ہندو ہمارے سامنے سے گزرا تو اس کی دھوتی اوپر سے سرخ ہو چکی تھی اور وہ اپنے بھاری بدن کے باوجود اتنا تیز دوڑ رہا تھا کہ چھریرے بدن والے لڑکے اسے دوبارہ نہ پا سکے۔ ہم گھبراہٹ میں پنڈت کے کوچے میں گھس گئے۔ سوچا کہ گلی شاہ تارا میں سے ہو کر قاضی حوض پر نکل جائیں گے اوپر سے کسی نے میرا نام لے کر دو تین آوازیں دیں۔ دیکھا کہ ''کہکشاں'' کا دفتر ہے اور کاظم صاحب آوازیں دے رہے ہیں۔ ''یہاں آ جایئے'' بیس منٹ ان کے پاس بیٹھ کر مشورہ کیا کہ کدھر سے جانا چاہیے۔ چنانچہ اُن کے بتائے ہوئے راستے سے حوض قاضی پہنچے۔ کچھ اور مسلمان بھی چاوڑی کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ لپک کر ان کے ساتھ ہو لیے وہاں چند ہندو غنڈے کھڑے تھے۔ اس علاقے میں اکثر خنجر زنی کے وقعات ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ تو ہم جھجکے لیکن رکنے کا موقع نہیں تھا۔ اور کوئی دوسرا راستہ بھی نہ تھا۔ اس لیے بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے بڑی بڑی نظروں سے ہمیں دیکھا لیکن کچھ بولے نہیں۔ مطبع مجتبائی سے مسلمانوں کی آبادی شروع ہو گئی اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا بس اس دن سے دوبارہ دفتر جانا نصیب نہیں ہوا۔

کرفیو پر کرفیو لگنے شروع ہو گئے تھے اور گھر سے باہر نکلنے کی نوبت نہ آئی۔

ہمارا محلّہ مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی کے قلب میں تھا۔ ہم نے منظّم ہو کر مختلف دفاعی جماعتیں تیار کر لیں۔ پیسے والوں نے پیسے سے مدد کی اور دو ہی دن میں سب کے پاس کچھ نہ کچھ ہتھیار جمع ہو گئے بھدے اور بھونڈے سہی لیکن دست بدست لڑائی میں خاصے کار آمد اور مہلک ثابت ہو سکتے تھے محلے میں چار پانچ بندوقیں بھی تھیں ان کی وجہ سے بڑی تقویت رہی۔ محلے میں داخل ہونے کے صرف دو راستے تھے جن پر ہم نے چندہ کر کے لوہے کے دروازے چڑھوا دیے تھے اور ان پر بندوق والوں کو مامور کر دیا تھا۔

6 ستمبر کو خبر آئی کہ سکھوں اور ہندوؤں نے قرول باغ میں مسلمانوں کے گھر لوٹ لیے اور بعض گھروں میں آگ لگا دی گئی دن پہلے سے مسلمانوں کے گھروں پر نشان لگائے جا رہے تھے یہ حملے کی علامت تھیں لیکن بیشتر مسلمان ہندو پڑوسیوں کے دم دلاسے میں جمے رہے اور اکثر کانگریسی مسلمان تھے جو خود بھی بیٹھے رہے اور دوسروں کو بھی روکے رہے چنانچہ جب حملہ ہوا تو سب برباد ہوئے۔ جامعہ طبیہ کی لائبریری اور اسکول کی عمارت سب جل گئی۔ مکتبہ برہان اور مکتبہ جامع کی لاکھوں کتابیں راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔ ایک اسکول میں میٹرک کا امتحان ہو رہا تھا جس میں پچاس مسلمان لڑکے بھی شریک تھے۔ امتحان شروع ہونے سے پہلے سپروائزر نے سب کی حاضری لے کر مسلمان لڑکوں کو علیحدہ کمرے میں بٹھا دیا اور جب انہوں نے پرچہ شروع کر دیا۔ تو ان بچوں پر سکھ تلواریں لے کر ٹوٹ پڑے اور صرف دو بچے کسی طرح جان بچا کر اپنے گھر پہنچ سکے باقی سب شہید کر دیے گئے۔

قرول باغ میں میرے ایک عزیز نے جنگ سے پہلے ایک کوٹھی آٹھ ہزار روپے میں بنوائی تھی جب دلّی میں شرنارتھی آنے لگے تو ان کی کوٹھی کے بھی خریدار لگنے لگے ان کا ارادہ تھا کہ پچیس ہزار مل جائیں تو اسے بیچ کر پاکستان چلے جائیں۔ لیکن بولی اتنی تیزی سے بڑھی کہ چالیس ہزار پر آ کر رکی۔ اب انہیں لالچ نے ستایا اور پچاس ہزار پر جمنے لگے جب پچاس ہزار ملنے لگے تو ساٹھ ہزار پر پہنچ گئے۔ یوں ہی بڑھتے بڑھتے یہ پیش کش پچھتر ہزار تک پہنچ گئی لیکن اب وہ اسی ہزار مانگ رہے تھے یکا یک قتل و غارت شروع ہو گئی جب انہوں نے شور سنا تو معلوم ہوا کئی گھروں میں آگ لگ چکی ہے اور لوٹ مار ہو رہی ہے۔ شہر تین میل دور اور سواری کوئی نہیں۔ عورتوں نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ اکبری دروازے ان کے ایک دوست رہتے تھے جن کے پاس موٹر تھی۔ ایک لڑکے کو سائیکل پر ان کے پاس دوڑایا کہ ہمیں کسی طرح بچاؤ۔ وہ اتفاق سے موجود تھے موٹر لے کر فوراً آ گئے۔ اس عرصے میں ان کا ایک پڑوسی بھی آ گیا جسے وہ اپنا گھر اور مال و متاع سونپ چکے تھے۔ جب وہ موٹر میں سوار ہوئے تو شرنارتھی بھی آ پہنچے اور گھر میں گھسنے کی کوشش کرنے لگے۔ نیا مالک ان سے جھگڑ رہا تھا کہ یہ مکان اس نے خریدا ہے لیکن شرنارتھی کہہ رہے تھے کہ تم نے خریدا ہو یا نہ خریدا ہو اس مکان پر ہم قبضہ کریں گے۔ اس جھگڑے میں انہیں موقع مل گیا کہ موٹر میں سوار ہو کر نکل جائیں یوں انہیں لالچ کی سزا ملی۔ غرض قرول باغ میں دن بھر لوٹ مار ہوتی رہی۔ ملٹری کے ٹرک آتے اور مسلمانوں کو بھر کر قلعہ لے جاتے۔ سامان اٹھانے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ کسی کے بچے بچھڑ گئے۔ کسی کی بیوی جاتی رہی، کسی کا شوہر غائب، کسی کا باپ ندارد، غرض کوئی کنبہ پورا نہیں پہنچا۔

سبزی منڈی مالدار رائیوں کی بستی تھی، شرنارتھیوں نے مارچ اپریل ہی سے یہاں آنا شروع کر دیا تھا اور ان کی جارحانہ کارروائیوں سے

یہاں کے مسلمان غافل نہ تھے۔ دلّی کے تمام مسلمان یہ طے کر چکے تھے۔ کہ ہم خود کسی پر حملہ نہیں کریں گے لیکن جب ہم پر حملہ ہوگا تو مقابلہ کریں گے۔ آخر ایک دن ان پر حملہ ہو ہی گیا۔ حملہ آوروں کے جسم پر خاکی وردیاں اور ان کی تحویل میں بندوقیں تھیں لیکن منڈی والوں نے ان کا ایسا گرما گرم خیر مقدم کیا کہ جل ٹھنڈے ہو گئے۔ تازہ دم ہو کر انہوں نے زیادہ تعداد میں حملہ کیا لیکن پھر بھی پسپا ہونا پڑا۔ روایت یہ ہے کہ حملہ آور یہاں ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے اور ایک گھر پر بھی قبضہ نہ کر سکے۔ مسلمانوں نے ایک رائے ہو کر طے کر لیا تھا کہ سبزی منڈی کا رہنے والا اپنا گھر ہرگز چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ بعض نے خائف ہو کر نکلنے کی کوشش کی تو انہیں زبردستی گھروں میں واپس بھیج دیا گیا۔ یہاں امیر غریب شانہ بشانہ کام کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے پاس کافی اسلحہ تھا اور وہ مطمئن تھے کہ حملہ آور کبھی ان پر غلبہ نہ پا سکیں گے۔ انہوں نے باقاعدہ مورچے بنا لیے تھے اور فوجی تنظیم کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے سبزی منڈی میں بعض بہت اچھے لوہے کے کاریگر بھی تھے جنہوں نے اپنی ہنرمندی سے برین گنیں اور اسٹین گنیں بنالی تھیں لیکن تیسرے دن قضائے مبرم کی طرح حکومت کی فوج نمودار ہوگئی۔ منڈی والے اسے بھی سنگھ والے سمجھے اور ان سے بھی مقابلہ کرتے رہے لیکن کہاں باقاعدہ سرکاری فوجیں اور کہاں عام شہری' تھوڑی ہی دیر میں منڈی والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور ان کے قدم اکھڑ گئے۔ ایک ہنگامہ رستخیز ہ برپا ہو گیا۔ بھاگتے ہوئے آدمی اس طرح بھن رہے تھے جیسے بھاڑ میں چنے' سینکڑوں مرکھپ گئے' لکھ پتی کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ جن عورتوں نے گھر سے قدم باہر نہ رکھا تھا در بدر خاک بسر ماری ماری پھر رہی تھیں' مال متاع' عزت آبرو سب گئی۔ سبزی منڈی میں مسلمان کا ایک بچہ باقی نہ رہا اور ان کے گھروں پر شرنارتھی قابض ہو گئے۔ شام کی خبروں میں بتایا گیا کہ سبزی منڈی کی شورش پر قابو پا لیا گیا اور وہاں اب امن ہو گیا۔

سبزی منڈی کے ختم ہوتے ہی پہاڑ گنج کی باری آئی یہاں کے مسلمان بڑے جی دار تھے اور اکثر ہندو مسلم فسادات میں اپنی برتری ثابت کر چکے تھے۔ پہاڑ گنج کے مسلمانوں نے دو دن اور دو رات تک مقابلہ کیا اور حملہ آوروں کو اس بری طرح مارا کہ کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ حملہ آور اس طرح یلغار کر کے آتے تھے جسے جوار بھاٹے میں موجیں' لیکن یہ موجیں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر پیچھے ہٹ جاتیں۔ دو دن تک ان کی یہی کیفیت رہی تیسرے دن جب پھر مقابلہ ہوا تو معلوم ہوا کہ اب کے حکومت کی فوج ملٹری جنگ کے جدید ترین ہتھیاروں سے لیس مار کرتی چلی آ رہی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں پہاڑ گنج میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ اور مسلمان ایک گھر سے دوسرے گھر میں دیواریں توڑ توڑ کر بھاگنے لگے۔ لیکن فوجی شکاری کتوں کی طرح ان کے پیچھے لگے رہے اور ان بے کسوں کو مارتے رہے۔ باہر گلی کوچوں اور بازاروں میں اگر نکلتے تو گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی۔ چھتوں پر چڑھتے تو گولی ماردی جاتی' غرض گولیاں گھر کے اندر اور گھر کے باہر یکساں طور پر اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔ چاروں طرف موت ہی موت تھی اس سے جو بچ کر نکل گیا گویا معجزہ ہی ہو گیا فوج کے ساتھ لٹیرے بھی بندوقیں اور تلواریں لیے گھروں میں گھس رہے تھے۔ مال کے ساتھ آبرو بھی لٹ رہی تھی۔ آبرو بچانے کی خاطر مسلمان اپنا روپیہ اور زیور پھینک پھینک کر بھاگ رہے تھے۔ جس کسی کے ہاتھ میں گٹھڑی یا پوٹلی دیکھی اسے گولی ماردی گئی۔ عورتوں کا زیور اس طرح چھینا کہ اگر کان میں بالیاں دیکھیں تو کان کاٹ لیے۔ عورتوں کی تلاشی لینے میں انہیں ننگا کر کے چھوڑا گیا ور اگر کسی نے مزاحمت کی تو اسے گولی ماردی۔ سینکڑوں عورتیں لاپتہ ہو گئیں۔ پہاڑ گنج سے جو مسلمان بچ کر نکلے وہ بالکل خالی ہاتھ تھے کوئی خاندان ایسا نہیں تھا جس کے دس پانچ آدمی نہ مارے گئے ہوں اکثر پورے خاندان ہی ختم ہو گئے۔ ہمارے محلے میں ایک عورت پہنچی جس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے

تھے۔ یہ غریب اپنے گود کے بچے کو لے کر پہاڑ گنج کے مکانوں میں چھپتی پھرتی لیکن ایک سکھ نے اسے دیکھ لیا اور تلوار سے وار کیا بچے کو بچانے کے لیے عورت نے وار کو ہاتھ پر روکا ہاتھ کٹ گیا۔ دوسرے وار کو دوسرے ہاتھ پر روکا وہ بھی کٹ گیا۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہوگئی۔ اس کا بچہ روتا رہا اور لاشوں میں اپنی ماں کو ٹٹولتا پھرا یہاں تک کہ کئی گھنٹے بعد بچے کے رونے کی آواز سن کر کسی بھلے مانس نے ادھر کا رخ کیا اور دونوں کو بہ ہزار دقت شہر پہنچایا۔ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو پہاڑ گنج کے مسلمانوں پر نہ توڑا گیا ہو اور کوئی ذلت ایسی نہ تھی جو ان پر پوری نہ کی گئی ہو۔ پھر سکون ہوگیا اور پہاڑ گنج کے مسمانوں کے گھروں اور مسجدوں میں شرنارتھی بس گئے۔

بارۂ ہندوراؤ‘ صدر بازار اور پل بنگش پر تو آئے دن آفت آتی رہتی تھی۔ آج یہ دکان لٹی اور کل وہ اب چاندنی چوک پر ہاتھ صاف ہونے لگا۔ پولیس اور ملٹری کھڑی تماشا دیکھا کرتی اور دن دہاڑے مسلمانوں کی بند دکانیں لوٹی جاتیں۔ اس کے عینی شاہد خود پنڈت نہرو تھے۔ جنہوں نے ایک سے زیادہ دفعہ ایسے واقعات دیکھے اور ملٹری کو حکم دیا کہ لوٹنے والوں پر گولی چلائے۔ اب صرف جامع مسجد کی دکانیں رہ گئی تھیں۔ اور ان میں دھرا بھی کیا تھا؟ مسلمان اپنے گھروں سے نکل کر صرف جامع مسجد تک سودا سلف خریدنے آسکتے تھے۔ آگے آئے اور لوٹ کر نہیں گئے۔ خنجر زنی شباب پر تھی۔ اور سڑک پر بیسیوں لاشیں پڑی تھیں۔ ڈاڑھی والا مسلمان تو بچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے ڈاڑھیاں منڈنی شروع ہوگئی تھیں اور لباس بھی ایسا ہو گیا تھا کہ مسلمان‘ مسلمان معلوم نہ ہوں۔ مسلمان کی پہچان کے لیے اب دشمنوں نے ایک نئی ترکیب نکالی۔ سڑکوں پر قرآن شریف کے اوراق پھیلا دیے اور جو ان سے بچ کر نکلتا اسے چھرا گھونپ دیا جاتا تھا۔

9 ستمبر کو گاندھی جی دلّی پہنچ گئے۔ ان کی پرارتھنا ریڈیو پر روزانہ نشر ہونے لگی۔ گاندھی جی کے آنے کے بعد شہر میں کوئی بڑا ہنگامہ نہیں ہوا لیکن چھرے بازی ہوتی رہی اور مسلمانوں کے مکان اور دکانیں لٹتی رہیں۔ گاندھی جی ہر پرارتھنا میں یہی کہتے‘ مسلمانوں نے مغربی پنجاب میں بڑے ظلم ڈھائے ہیں لیکن ہندوؤں اور سکھوں کو اس کا بدلہ نہیں لینا چاہیے۔ مسلمانوں نے تمہاری عورتیں چھین لی ہیں لیکن تم تو بہادر ہو ان کی عورتیں مت چھینو۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے سارے ہتھیار حکومت کو دے دیں اور وفادار بن کر رہیں۔ بے چارے مسلمانوں کے پاس اب رکھا ہی کیا تھا جو حکومت کے حوالے کرتے‘ رہی وفاداری سو آج تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ انہوں نے کب اور کہاں غداری کی۔ خیر گاندھی جی کے آنے سے مسلمانوں کو کچھ طمانیت ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کی کچھ پاسداری بھی کی۔ انہوں نے غیر معینہ عرصے کے لیے برت رکھا اور اعلان کیا کہ اسے اس وقت توڑیں گے جب امن ہو جائے گا۔ اس مہم میں بہر حال ان کو کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور ہوئی۔

مسلمانوں کے لیے ایک کیمپ عیدگاہ کے قریب کھولا گیا تھا جس میں بے گھرے بے درے مسلمان آ کر پڑ گئے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں چند سال پہلے ساری دلّی کی گندگی ڈالی جاتی تھی۔ بے وقت کی بارش نے اور بھی ان بے آسرا لوگوں کی مصیبت میں اضافہ کر ڈالا تھا اور مینہ بھی وہ دھونتال پڑ رہا تھا کہ الٰہی توبہ ناچار یہ غریب جامع مسجد میں آ پڑے۔ شہر والوں نے چندہ کر کر کے انہیں دیگیں پکوا کر بھیجیں مگر یہ اتنی بڑی تعداد میں تھے کہ یہ کھانا کفایت نہ کرتا تھا۔ بڑے بڑے اچھے آدمیوں کو دیکھا کہ وہ کئی وقت کے فاقے سے ہیں لیکن کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا تو کیسا‘ زبان سے کچھ کہنا تک عار سمجھتے تھے شہر والوں میں سے جو جس کی توفیق ہوتی ان خانماں بربادوں کو چپکے سے جامع مسجد میں پہنچا آتا رفتہ رفتہ یہ تعداد بڑھ کر

پچیس ہزار تک پہنچ گئی اور مسجد میں نماز پڑھنے کی گنجائش تک نہ رہی: چنانچہ اعلان کیا گیا کہ جامع مسجد خالی کر دی جائے اور مسلمان پرانا قلعہ چلے جائیں۔ پرانے قلعے میں راشن بھی ملے گا‘ چنانچہ جامع مسجد خالی ہوگئی اور بارش میں بھیگتے بھیگتے یہ مسلمان پرانا قلعہ پہنچ گئے۔ میوات سے آئے ہوئے جو لوگ اردو میدان میں پڑے ہوئے تھے وہ بھی وہاں سے ہٹا دیے گئے اور یہ سارا ٹکڑا سنسان ہوگیا۔ ان لوگوں کی موجودگی میں شہر والوں کو بڑی ڈھارس تھی کہ جب تک یہ پڑے ہوئے ہیں ہم پر کوئی حملہ نہیں ہوسکتا۔ یہ سہارا بھی جاتا رہا۔

اب کالی مسجد کی طرف سے حملہ آور بڑھ رہے تھے۔ ترکمان دروازے سے ان کے ریلے اندر آنے شروع ہوگئے تھے۔ دلّی دروازے اور فیض بازار سے مسلمان مکان چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے اور ہندو اور سکھ خالی مکانوں پر قبضہ کر رہے تھے۔ پائے والوں اور چاوڑی کا راستہ بھی ان کے لیے کھل گیا تھا۔ مسلمان چاروں طرف سے بری طرح سے گھر گئے تھے اور گھیرا روز بروز تنگ ہوتا جارہا تھا۔ اسی زمانے میں آصف علی جو امریکہ میں ہندوستان کے سفیر تھے چند روز کے لیے دلّی آئے۔ انہیں بعض مسلمان کوچہ چیلاں میں بھی لے آئے کہ ذرا چل کر دیکھئے دلّی کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ ان کے تصور میں بھی یہاں کی ابتری نہیں تھی وہ کوچہ چیلاں اور اپنے گھر کو دیکھ کر رونے لگے اور فورِ غم سے ان کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔

5 ستمبر کو میرے گھر میں سات سو روپے تھے ایک ہفتے ہی میں پانچ سو روپے ختم ہوگئے۔ مہنگائی‘ چندوں اور ضرورت مندوں نے دھڑ توڑ دیا تھا اور اب مزید رقم کہیں سے ملنے کی امید نہ تھی۔ بنک اور ڈاک خانہ دونوں نے روپیہ ادا کرنا روک دیا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دلّی سے لاہور کیسے پہنچیں گے۔ بس خدا پر بھروسہ تھا۔ 6 ستمبر کو ایک دوست کی بیوی برے حالوں ہانپتی کانپتی پہنچیں۔ یہ پہلے قرول باغ لٹیں۔ اب کوچہ چیلاں میں اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں مع بچوں کے پڑی تھیں اور راشن خریدنے تک کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ میں نے بیوی سے کہا۔ انہیں جو کچھ دے سکتی ہو دے دو۔ میری بیوی کے پاس سو روپے باقی تھے پچاس انہیں دے دیے۔ ان کی مصیبت دیکھ کر ہم اپنی پریشانیاں بھول گئے تھے۔

پرانا قلعہ کیا کھلا۔ دلّی والوں کے پاؤں اکھڑ گئے مگر قلعے میں اس قدر تکلیفیں تھیں کہ اکثر آدمی وہاں سے لوٹ آئے کہ اپنے گھر میں ہی مر جانا اچھا۔ میری ذاتی رائے بھی یہی تھی اور لوگوں کو بھی میں یہی تلقین کرتا رہتا تھا لیکن میرے ہم زلف عزیز صاحب جو ملٹری کے دفتر میں ملازم تھے اور پاکستان جارہے تھے ہم لوگوں کو بھی پاکستان لے جانے پر تلے ہوئے تھے۔ 15 ستمبر کو میں نماز ظہر کی تیاری کر رہا تھا کہ یکا یک عزیز صاحب نہایت پریشان حال پہنچے۔ انہوں نے آتے ہی کہا ”جلدی چلیے ٹرک آ گیا ہے۔ دس منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرے گا۔“ یہ سننا تھا کہ گھر میں جیسے بھونچال آ گیا۔ ہمارے سب آدمی جس کے ہاتھ میں جو چیز آئی‘ لے کر کھڑے ہوگئے۔ جو مہمان آئے ہوئے تھے شکوہ کرنے لگے کہ ہم کو چھوڑے جارہے ہو۔ میں عجب شش و پنج میں پڑ گیا کہ کیا کروں۔ جب سب تیار ہو کر جمع ہوگئے تو میں نے کہا ”تم چلو‘ میں بھی آ جاؤں گا۔“ اس پر میری بیوی اور بچے بولے ”تو ہم بھی جا کر کیا کریں گے ہم بھی نہیں جاتے۔“ اور وہ سب دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ اُدھر ٹرک والا چیختا ہوا آیا۔ ”چلتے ہو تو چلو ورنہ ہم جارہے ہیں۔“ میں اس صورتِ حال کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ ایک منٹ کے لیے سوچا کہ یہ بچے اور عورتیں کیا کریں گی کہاں جائیں گی ان سے علیحدہ ہونا تو پیچھا چھڑانا ہے اور اپنی ذمہ داریاں سے روگردانی۔ یہ تو بڑی بزدلی ہے کہ مصیبت کے وقت ان کا ساتھ چھوڑا جائے اور عزیز صاحب پر ساری ذمہ داری ڈال دی جائے۔ پھر لے دے کے کل پونجی پچاس روپے ہے خرچ کہاں سے آئے گا؟ اُدھر یہ خیال بھی آتا تھا کہ محلے والے میرے جانے پر

کیا کہیں گے۔ کہ ہم تو یہیں رہنے کی تلقین کرتے رہے اور خود چل دیے۔ پھر گھر کس پر چھوڑا جائے خود محلے والے ہی لوٹ لیں گے۔ غرض احمقوں کی طرح اٹھا اور الماری کھول کر چند نایاب کتابیں نکالیں اور ساتھ ہو گیا۔ محلے میں جنہوں نے دیکھا' کہا۔ ''لو بابو جی بھی چلے۔'' ''کیوں میاں آپ بھی جا رہے ہیں۔'' ''ہائیں آپ بھی'' اور میں سر جھکائے ملزموں کی طرح خاموش چلا جا رہا تھا۔ پھاٹک پر دو ٹرک کھڑے تھے جن کے ساتھ ایک کیپٹن اور دو رائفل والے تھے اور بھی چند سواریاں ان میں بیٹھی ہوئی تھیں ہم بھی سوار ہو گئے۔ فیض بازار میں ہندو اور سکھ مکانوں اور دکانوں پر کھڑے ہوئے گالیاں دے رہے تھے اور ہم سہم رہے تھے کہ کہیں چھتیں پر سے حسب معمول گولیاں نہ برسنے لگیں مگر اللہ نے خیر ہی رکھی۔

پرانے قلعے کے باہر اس قدر ہجوم تھا کہ ایک گھنٹے میں ہمارے ٹرک قلعے کے اندر داخل ہو سکے۔ صبح بارش خوب ہو چکی تھی اور جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ شام کا جھٹ پٹا ہو گیا تھا۔ ہم نے اپنا مختصر سا سامان اتارا اور عزیز صاحب کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔

پرانا قلعہ حشر کا میدان بنا ہوا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچتے ہیں۔ تو اس میں اسی ہزار آدمی موجود تھے۔ فصیلوں پر اور برجیوں میں بھی آدمی بھرے ہوئے تھے۔ قلعہ اتنا بھر گیا تھا کہ ایک اور کیمپ مقبرے میں کھول دیا گیا۔ یہ وہی ہمایوں کا مقبرہ تھا جہاں دلّی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے نوے سال پہلے بھاگ کر پناہ لی تھی۔ مقبرہ بھی بھر چکا تھا اور تیسرا کیمپ عرب سرا میں کھولنے کی تجویز تھی۔ بارش نے سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھا تھا۔ مشکل سے بیس پچیس خیمے کہیں کہیں لگے ہوئے دکھائی دیتے ان میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ لوگوں نے بانس گاڑ کر ان پر دریاں اور چادریں ڈال دی تھیں لیکن مینہ کب رکتا تھا۔ سب بھیگ بھیگ کر چوڑا ہوتے رہے بعد میں کئی سو خیمے حکومت پاکستان کی طرف سے آ گئے تھے اور یوں کچھ سہولت میسر آ گئی تھی۔ راشن پہلے پاکستان کے ذمے تھا جو بہت عمدہ اور اچھی مقدار میں ملتا تھا۔ دودھ کے ڈبے اور بسکٹ اکثر مقدار میں آئے لیکن منتظمین کے دلوں میں بے ایمانی سما گئی تھی وہ مہاجرین کو راشن مفت دینے کے بجائے بیچنا شروع کر دیا۔ قلعے میں پہرا ابھی پاکستانی فوج کا تھا۔ لیکن گاندھی جی کے معائنے کے بعد ہندوستان کے ذمے ہو گیا اور پہرا بھی ہندوستانی فوج کا رہنے لگا۔ راشن کی بدنظمی اس قدر تھی کہ اگر مہاجرین کے پاس ان کا اپنا راشن نہ ہوتا تو آدھے پونے آدمی تو بھوکوں ہی مر جاتے۔ قلعے میں روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ رات کے اندھیرے میں اٹھائی گیرے ستاتے۔ سارے قلعے میں صرف ایک نل تھا جس کی دھار بھی پتلی تھی اور اس پر چوبیس گھنٹے دو لمبی قطاریں لگی رہتیں اور ایک مردوں کی؛ دوسری عورتوں کی۔ آٹھ آٹھ گھنٹے قطار میں کھڑے رہنے کے بعد ایک بالٹی پانی بھرنے کی نوبت آتی۔ اس سے زیادہ پانی کوئی نہیں لے سکتا تھا۔ اس پانی پر ہر وقت سر پھٹول ہوتی رہتی۔ عورتوں میں تو وہ مار پیٹ ہوتی کہ سب خونم خون ہو جاتیں۔

قلعے میں چپہ بھر زمین ہمیں بھی مل گئی۔ زمین دن بھر کی بارش سے تر بتر ہو رہی تھی۔ اسی پر بستر پھیلا دیے اور خانہ خرابوں کی طرح بیٹھ گئے۔

سامنے جو کسی بچے نے دیکھا تو بولا ''اے لو! چچا جان بیٹھے ہیں۔'' اب جو ہم نے غور سے ادھر دیکھا تو میرے چھوٹے بھائی اور ان کے بچے بھی بیٹھے دکھائی دیے۔ دوڑ کر ان کے پاس پہنچے۔ ''ارے میاں! تم یہاں کہاں؟''

انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ''تمہارا محلّہ تو محفوظ تھا تم کیوں یہاں آ گئے؟''

وہ سول لائنز میں رہتے تھے۔ آدھی کوٹھی میں یہ تھے اور آدھے میں بڑے بھائی۔ اتنے میں بڑے بھائی بھی آ گئے اور ان کے بیوی بچے

بھی دکھائی دیے۔ دل بھر آیا اور سب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ کل ایک فوجی دستے نے آ کر کوٹھی کو گھیر لیا اور بندوقیں چھتیا لیں کہ خبردار کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے ورنہ گولی مار دی جائے گی اور تلاشی لینی شروع کر دی۔ ساری کوٹھی کو کھود مارا اور پانچوں بندوقیں اور کارتوس ساتھ لے گئے۔ ہم نے کہا بھی کہ ان کا لائسنس موجود ہے مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور چلتے بنے۔ ان کے جانے کے بعد بھائی ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے اور شکایت کی مگر اس نے بے پروائی سے کہا:

”منذر صاحب! اسے غنیمت سمجھیے کہ آپ کے ساتھ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوا۔ پاکستان جا کر دیکھیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟“

ناچار مختصر سا سامان لے کر دونوں بھائی نکل کھڑے ہوئے اور کوٹھی ایک ہندو پڑوسی کے حوالے کر دی۔ یہ پڑوسی بہت عزیز دوست تھا لیکن ایک مہینے بعد معلوم ہوا کہ ساری قیمتی چیزیں کوٹھی سے غائب ہو گئیں اور اس میں شرنارتھی بسا دیے گئے۔

رات بھیگ رہی تھی اس لیے سب سے پہلے کھانے کا انتظام کرنا تھا۔ بیوی نے غالباً آنے والی مصیبت کا اندازہ لگا لیا تھا اور انہوں نے پہلے ہی سے چند روز کا راشن، نمک، مرچ، گھی وغیرہ ایک بوری میں رکھ لیا تھا۔ بھائی کے پاس انگیٹھی اور کوئلہ موجود تھا۔ انگیٹھی سلگ گئی اور کھچڑی چڑھا دی گئی۔ بھائیوں سے معلوم ہوا کہ ان کے ٹکٹ بن چکے ہیں اور کل صبح کی سپیشل ٹرین سے وہ لوگ لاہور جا رہے ہیں۔ ٹکٹوں میں دو آدمیوں کی گنجائش تھی۔ اس لیے میں نے اپنی دو بچیوں کو ان کے ساتھ کر دیا۔ میرے پاس گنتی کے چند روپے رہ گئے تھے۔ احتیاطاً میں نے ان سے چھ سو روپے لے لیے اور یوں پیسوں کا مسئلہ حل ہوا۔ اگلے روز صبح سویرے وہ لوگ لاہور روانہ ہو گئے اور تیسرے دن اطلاع آ گئی کہ وہ گاڑی بخیریت لاہور پہنچ گئی۔ میں نے صبح اٹھ کر قلعے کا چکر لگایا کہ اس کی آبادی کا اندازہ ہو جائے۔ دوسرے سرے پر کچھ جھاڑیاں تھیں جن میں رفع حاجت کے لیے قلعے کے اسی ہزار آدمی جاتے تھے۔ یہ ایک بڑا عبرت کا مقام تھا۔ پیچش کا مرض عام تھا اور ہیضہ بھی پھیل رہا تھا۔ قدم قدم پر نجاست تھی اور اس درجہ مجبوری تھی کہ ستر اور پردے کا ہوش نہ تھا۔ دلّی کے شریف گھروں کی وہ عورتیں جو بارہ برس کے لڑکے تک سے پردہ کرتی تھیں اور رات کو کسی وقت انہی غلیظ جھاڑیوں میں جاتیں۔

اس زمانے میں مُردوں کی بڑی مٹی پلید ہوئی۔ دہلی دروازے یا ترکمان دروازے سے باہر نکلنا مسلمانوں کے لیے ناممکن ہو گیا تھا اس لیے لوگوں نے محلوں اور گھروں میں ہی مردے گاڑنے شروع کر دیے تھے۔ جب ان میں جگہ نہ رہی تو جامع مسجد کے سامنے والے میدان میں مردے دبائے جانے لگے۔ پرانے قلعے میں پہلے تو قلعے کے باہر قبریں بنائی جاتی تھیں۔ پھر اندر ہی بننے لگیں۔ شاید ہی کسی مردے کو پورا کفن ملا ہو ورنہ کسی کپڑے چادر یا دری میں لپیٹا اور قبر میں اُتار دیا۔ بعض لوگوں کو اس کی بھی توفیق نہ ہوئی اور ان کے مردے بے گور و کفن پڑے رہے۔

قلعے میں شہر سے سودا لا لا کر بیچنے لگے اور ہمارے چلے آنے کے بعد باقاعدہ دکانیں لگ گئی تھیں۔ سودا مہنگا ملتا مگر مل جاتا تھا۔ بیکاری کی وجہ سے لوگوں کے پاس پیسہ نہ رہا تو وہ سامان بیچ بیچ کر گزارہ کرنے لگے۔ تانبے کے برتن چھ آنے سیر تک بک گئے۔ سلائی کی مشین بیس روپے اور سائیکل دس روپے میں بک رہی تھی۔ سونا بیس روپے تولہ تک بکا۔ مہاجرین کی تکلیفوں سے فائدہ اٹھانے والوں کی کمی نہیں تھی۔ ایک بڈھا سکھ قلعے کے باہر دروازے پر کھڑا ہو جاتا اور زیور خریدا کرتا تھا۔ ایک عورت نے اسے اپنا جھومر دیا۔ اس نے کسوٹی پر گس کر دیکھا، تولا اور کہنے لگا۔ ”چار تولے کا ہے۔“ پھر بیس روپے کے حساب سے اسی روپے نکال کر دینے لگا۔ عورت نے بڑی عاجزی سے کہا ”بھائی! یہ جھومر سو روپے تولہ کی خرید کا ہے کچھ تو

نرخ بڑھائیں۔'' بڑی حجت کے بعد اس شخص نے سو روپے کی پیش کش کی اور عورت کو ناچار یہ سو روپے لینے پڑے۔ مسلمانوں نے بھی یہی حرکت شروع کر دی تھی۔ قلعے میں کوڑیوں کے مول زیور اور چیزیں خریدتے اور شہر جا کر اچھے داموں بیچتے۔

18 ستمبر کی رات گیارہ بجے معلوم ہوا کہ کل پہلی گاڑی سے ہمیں لاہور جانا ہے جو صبح سات بجے روانہ ہوگی۔ یہ ساری رات جاگ کر گزاری اور علی الصبح نظام الدین ریلوے اسٹیشن کی سمت ہو لیے۔ اسٹیشن کے باہر کئی ہزار آدمی پڑے تھے۔ ہم ٹرکوں میں سے اترتے ہی رہے اور انہوں نے جھٹ پٹ اپنا سامان ریل میں بھر خود بھی پھیل پھیل کر بیٹھ گئے۔ آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد ہم بھی ایک ڈبے میں زبردستی گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ لوگ برابر آتے رہے اور اپنا سامان کھڑکیوں میں سے اندر پھینکتے رہے۔ کسی کا مغز پھٹا۔ کسی کا ہاتھ ٹوٹا مگر یہ سلسلہ اس وقت تک بند نہیں ہوا جب تک کسی ڈبے میں اتنی جگہ بھی باقی نہ رہی کہ کوئی کہیں کھڑا ہی ہو جائے۔ ہمارا ڈبہ بتیس مسافروں کے لیے تھا لیکن اس میں سوا سو آدمی تھے۔ گرمی کے مارے دم گھٹا جاتا تھا۔ یہ معلوم ہی تھا کہ راستے میں پانی نہیں ملے گا۔ اس لیے ہم نے صراحی اور لوٹے بھر لیے تھے۔ کھانے کے لیے بیوی نے گھی کی روٹیاں پکا لی تھیں۔ دس بجے گاڑی چلی اور نظام الدین سے چل کر نئی دلّی ٹھہری۔ ہم بڑی حسرت سے راستے کی عمارتوں کو تکتے آئے۔ نئی دلّی پر بے شمار سکھ کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر مسافر سہمنے لگے اور بعض نے ڈر کر کھڑکیاں چڑھا لیں۔ پندرہ منٹ کے بعد گاڑی یہاں سے چھوٹی تو دلّی کے اسٹیشن سے گزرتی ہوئی چلی گئی۔ اسٹیشن سنسان پڑا تھا اور جا بجا فوجی پہرے لگے تھے۔ گاڑی شاہدرہ پر بھی نہیں رکی۔ غازی آباد پہنچی تو وہاں بھی الو بول رہے تھے۔ یہاں دس منٹ دم لے کر آگے بڑھی اور خوب تیز رفتار سے چلتی رہی۔ ہم نے سوچا اگر قیام اتنا ہی مختصر اور رفتار اتنی ہی تیز رہی تو مغرب کے وقت لاہور پہنچ جائیں گے۔

ریل گاڑی میرٹھ پہنچی تو اسٹیشن پر تھوڑے سے آدمی چلتے پھرتے دکھائی دیے۔ سودا بیچنے والے دوسرے پلیٹ فارم پر جنگلے کی دوسری طرف تھے۔ ریل سے اترنے کا کسی کو حکم نہیں تھا۔ اسٹیشن پر دو چار مسلمان بھی نظر آئے مگر ڈرے ڈرے سہمے سہمے ریل گاڑی کے قریب آنا چاہتے لیکن پولیس اور ملٹری کے خوف سے ہمت نہ کر پاتے...... ہم دو چار نے جرأت سے کام لے کر ملٹری والوں سے پوچھا کہ اتر کر کچھ سودا خرید لائیں تو پہرے دار نے جھڑک دیا۔ پانی تک لینے کی اجازت نہیں ملی۔ تھوڑی دیر کے بعد اللہ کا ایک نیک بندہ موقعہ پا کر پانچ سات درجن کیلے ہمارے ڈبے میں دے گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ گیا راستے کے لیے جہاں بھی ملے پانی بھر لینا۔ مظفر نگر جب گاڑی ٹھہری تو دیکھ کر تعجب ہوا کہ نوجوان بالٹیاں اٹھائے پھر رہے ہیں۔ اور سب کو پانی پلا رہے ہیں۔ ان کے بعد ایک اور ٹولی آئی جس نے گاڑی کے تمام مسافروں کو بھنے ہوئے چنے تقسیم کیے۔ ان کا لباس کانگریسیوں جیسا تھا مگر دراصل یہ مقامی مسلم لیگ کے کارکن تھے۔ بس یہ آخری آسائش تھی جو ہمیں ملی۔ دیوبند پر بھی کوئی مسلمان دکھائی نہ دیا۔ سہارن پور اکثر مسلمان ریل کے نزدیک سے گزرتے اور کہتے جاتے۔ ''یہاں چھ ہزار مسلمان ریلوے اسٹاف کے پڑے ہوئے ہیں۔ لاہور جا کر ریلوے والوں سے کہنا کہ انہیں جلد سے جلد نکال لیں۔''

راجپورہ جب گاڑی پہنچی تو شام ہونے لگی۔ گاڑی یہاں ایسی جمی کہ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پلیٹ فارم اور پل پر سکھ بے چین پھر رہے تھے۔ ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے گاڑی چلی تو مسافر خانے سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ پے در پے چھ فائر ہوئے مگر گاڑی چلتی رہی۔

اگلے اسٹیشن پر سکھ کپتان نے اتر کر ہر ڈبے پر دریافت کیا کہ کوئی زخمی تو نہیں ہوا۔ جب ہمارے ڈبے کے نزدیک آیا تو معلوم ہوا کہ برابر کے ڈبے میں ایک بچہ مر گیا ہے اور ایک عورت زخمی ہوگئی ہے۔ ایک گولی ہمارے ڈبے پر بھی لگی تھی مگر کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔ کپتان صرف پوچھ کر چلا گیا۔ مرہم پٹی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ عورت کا خون یونہی بہتا رہا۔

اس وقت رات کے دو بج رہے تھے گاڑی خوب تیز چل رہی تھی اچانک زور کا جھٹکا محسوس ہوا۔ پورے ڈبے میں کھلبلی مچ گئی اور لوگ بدحواس ہوگئے۔ گاڑی رک گئی تھی اور لوگوں کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا ہوا۔ کسی نے کہا ”ٹکر ہوگئی۔“ کسی نے کہا ”بم مارا گیا ہے۔“ باہر سے ایک فوجی کی آواز آئی ”کھڑکیاں بند کردو۔“ آواز کے ساتھ تمام کھڑکیاں بند کردی گئیں‘ بعض نے اپنے ٹرنک اور بستر ان میں اڑا دیے۔ اتنے میں فوجی موٹروں اور جیپوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اب تو سب جان گئے کہ گاڑی پر حملہ ہونے والا ہے۔ عورتیں چیخیں تو مرد ان سے زیادہ چیختے کہ خاموش رہو ورنہ سب مارے جائیں گے۔ وہ سہم کر چپکی ہو جاتیں مگر بچے کیسے چپ ہوتے۔ انہیں تو گرمی اور اندھیرے نے بوکھلا دیا تھا۔ چنانچہ بچوں کی پٹائی ہونے لگی۔ وہ زور سے روئے تو ان کے گلے گھونٹے گئے۔ دور سے گولیاں چلنے کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ نزدیک تر ہوتی جا رہی تھیں۔ ہمارے محافظ دستے نے بھی اتر کر گولیاں چلانی شروع کردیں۔ ہم سب اپنی موت کے منتظر تھے کہ اب گولی لگی اور اب دروازے اور کھڑکیاں توڑ کر سکھ داخل ہوئے۔ ایک گھنٹہ تک دونوں طرف سے گولیاں چلتی رہیں اور شور بڑھتا رہا۔ یہ ایک گھنٹہ قیامت کا دن بن گیا تھا آخر گولیاں کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئیں اور موٹروں کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر کسی فوجی کی آواز سنائی دی۔ ”بھاگ گئے حرامزادے۔“

گاڑی چل پڑی۔ لدھیانہ آیا اور چلا گیا۔ چار بجے جالندھر پہنچے گاڑی کھڑی ہوئی تو کپتان نے اعلان کیا کہ اب گاڑی صبح چلے گی جو شخص پلیٹ فارم پر اترنا چاہے اتر سکتا ہے اور پانی لے سکتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے پاؤں جڑ گئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم سب برسوں کے بیمار ہیں۔ ہم میں سکت باقی نہ تھی دروازے تو کیا کھل سکتے تھے کہ چھت تک سامان اٹا ہوا تھا البتہ کھڑکیوں میں سے کود کود کر ہم سب مرد باہر نکلے اور پانی پر ٹوٹ پڑے۔ عورتوں اور بچوں کو پلایا۔ منہ ہاتھ دھوئے اور جب اوسان ٹھیک ہوئے تو آگے کے ڈبے دیکھنے چلے کہ ان پر کیا گزری ہے۔ راستے میں سکھ کپتان ملا۔ یہ کوئی بھلا آدمی تھا اس نے بتایا کہ لائن پر پتھر ڈال دیے گئے تھے لیکن انجن ڈرائیور نے گاڑی کو الٹنے سے بچالیا‘ حملہ آور ہزاروں کی تعداد میں آئے تھے اور بڑی باقاعدگی سے لوٹ مار کر کے چلے گئے۔ کپتان کا اندازہ تھا کہ حملہ آوروں میں سے پانچ سو آدمی ضرور مارے گئے ہیں مگر یہ مبالغہ تھا۔ ہم سے دو ڈبے آگے حملے کا پورا زور رہا اور تین ڈبے بالکل خالی ہوگئے تھے۔ ان میں بے شمار لاشیں پڑی تھیں اور کتنے ہی زخمی مرد عورتیں اور بچے تڑپ رہے تھے۔ بہت سے لوگ گھبراہٹ میں اتر کر بھاگ گئے اور واپس نہ آسکے انہیں بھی مردہ ہی سمجھنا چاہیے وہ کیا بچے ہوں گے۔ زخمیوں کی مرہم پٹی بالکل نہیں ہوسکی۔ وہ یوں ہی تڑپتے سسکتے لاہور تک لائے گئے۔

جالندھر پر گاڑی دس بجے تک کھڑی رہی۔ عذر یہی تھا لائن صاف نہیں ہے۔ دس بجے جالندھر سے روانہ ہوئے اور مانوالہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی رکی اور رکی رہ گئی۔ معلوم ہوا کہ انجن بارہ گھنٹے سے زیادہ کام کر چکا ہے اور آگے نہیں جا سکتا۔ اب دوسرا انجن منگایا ہے جو اسے آ کر لے جائے گا۔ اتنی اجازت مل گئی کہ جو اترنا چاہے اتر سکتا ہے۔ پانی پھر ختم تھا۔ اسٹیشن کے پاس ایک کنواں نظر آیا لیکن سب کو اندیشہ یہی تھا کہ

اس میں زہر نہ ڈال دیا گیا ہو۔ اس لیے کسی نے اس میں سے پانی لینے کی ہمت نہ کی۔ جب پیاس نے بہت بے چین کیا تو ہم سامنے جوہڑ کی طرف لپکے۔ اس میں برسات کا پانی بھرا ہوا تھا اسے چند آدمیوں نے سونگھا' چکھا اور پینے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی سارے مسافروں نے وہی مٹیالا پانی پیا۔ میں نے بھی ایک گلاس بھر کے پیا۔ مزے میں کوئی فرق نہ تھا۔ چار گھنٹے بعد ایک چھوٹا سا انجن آیا اور گاڑی مریل رفتار سے روانہ ہوئی۔

امرتسر پر خوب گہما گہمی تھی۔ ہزاروں شرنارتھی پڑے ہوئے تھے۔ ان کی گاڑیاں بھر بھر کے جا رہی تھیں۔ ہماری گاڑی پلیٹ فارم پر تھوڑی دیر ٹھہری لیکن آگے یارڈ میں آ کر پھر کھڑی ہو گئی۔ سامنے نل کھلے ہوئے بہہ رہے تھے اور دھوپ میں ان کی موٹی موٹی دھاریں بلور کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ کئی بار ارادہ ہوا کہ ہمت کر کے پانی لے آئیں مگر دو چار خوفناک شکلیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ آخر ایک صاحب سے رہا نہ گیا اور انہوں نے سکھ گارڈ سے پوچھ ہی لیا۔ ''کیوں صاحب؟ ہم سامنے نل سے پانی لے لیں۔'' اس نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''یہ امرتسر ہے جانتے نہیں؟'' گاڑی کھڑی رہی پانی بہتا رہا اور پیاسے سسکتے رہے معلوم ہوا کہ بریک خراب ہو گئے ہیں۔ اس لیے مستری کی تلاش ہو رہی ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد امرتسر سے نجات ملی۔ بیاس کے اسٹیشن پر بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ نل بھی بہہ رہے تھے اور کورے کورے مٹکے بھی رکھے تھے لیکن ان مسافروں کے لیے جو مشرقی پنجاب جا رہے تھے۔ سکھ ہر جگہ تلواریں لیے پھر رہے تھے۔ مگر دن کا وقت تھا اور پہرے دار مستعد تھے اس لیے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

اٹاری ہندوستان کا آخری اسٹیشن تھا۔ یہاں حفاظتی دستہ ہمیں اللہ کے سپرد کر کے رخصت ہو گیا۔ آدھ گھنٹے بعد یہاں سے گاڑی روانہ ہوئی تو مردوں میں جان پڑ گئی۔ ''پاکستان زندہ باد'' اور ''قائداعظم زندہ باد'' کے نعرے لگنے شروع ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ ہم پاکستان کی سرحد میں داخل ہو چکے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پاکستان کا پہلا اسٹیشن جلو آ گیا۔ یہاں سینکڑوں آدمی ریل کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ریل کے رکتے ہی ہر ڈبے میں کئی آدمی آ گئے اور سب کو روٹیاں دال اور اچار تقسیم کرنے لگے۔ دو دن کے بھوکے لوگ ان روٹیوں پر اس طرح گرے جیسے کبھی روٹی دیکھی ہی نہ تھی۔ ایک ایک آدمی دس دس روٹیاں ہو کے میں دبا کر بیٹھ گیا۔ عورتیں اور بچے جو دوسری طرف تھے مانگتے ہی رہ گئے وہ تو کیسے کھانے کا انتظام اس قدر وافر تھا کہ سب کو حصہ پہنچ گیا ورنہ لوگوں نے تو حرص کی انتہا ہی کر دی تھی۔

میں نے 18 ستمبر کی رات کو کھانا کھایا تھا۔ اور اب بیس کی رات کو پورے اڑتالیس گھنٹے کے بعد آدھی روٹی کھائی۔ میرا پہلا روزہ آٹھ یا نو برس کی عمر میں رکھوایا گیا تھا جب روزہ کھلا تو میری اتنی بری حالت ہو گئی تھی کہ نہ تو کچھ کھایا گیا اور نہ کچھ پیا گیا۔ بالکل وہی کیفیت اس وقت بھی ہوئی۔ بڑی مشکل سے آدھی روٹی آم کے آچار سے کھائی اور ایک گلاس پانی پیا۔ منہ کا مزا بدلا ہوا تھا۔ نبض دیکھی تو بخار تھا۔ جہاں تک نظر کام کرتی آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے جو ریل سے اترتا یہیں رہ پڑتا۔ تعفن کے مارے دماغ پھٹا جا رہا تھا ریل سے اترنے بھی نہ پائے تھے کہ کئی آدمی پوچھتے ہوئے آئے کہ حملہ کہاں ہوا ہے اور کتنے آدمی مارے گئے اور پھر یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔ ''ٹھہر جاؤ ابھی تمہارے سامنے بدلے لیے لیتے ہیں۔'' چنانچہ رات کو کوئی گاڑی مشرقی پنجاب جانے والوں کی باغبانپورہ پر روک لی گئی اور سارا قرض مع سود چکا دیا گیا۔

لاہور میں گیارہ بجے کرفیو لگ جاتا تھا۔ اس لیے ہم نے ایک درخت کے نیچے سامان اٹھا کر رکھ دیا اور بچوں سے کہا کہ رات یہیں گزارو۔ تھکے ہارے تو سبھی تھے یوں ہی پڑ کر سب سو گئے۔ سب سے تعجب خیز بچوں کا بدلا ہوا طرز عمل تھا۔ یہ ناز و نعم میں پلے ہوئے تھے اور عادتیں ان کی

بگڑی ہوئی تھیں لیکن شاید مصیبت نے ان پر اپنا اثر کیا تھا۔ کسی بچے نے نہ تو دودھ مانگا' نہ مٹھائی' بلکہ سرے سے کچھ مانگا ہی نہیں۔ سوائے پانی کے۔ لاہور میں اسٹیشن سے خرید کر انہیں بسکٹ دیے مگر انہوں نے وہ بھی نہ کھائے۔ چائے کو پوچھا تو چائے سے بھی انکار کر دیا' حالانکہ گھر میں ایک وقت میں دو پیالیوں سے کم کوئی نہ پیتا تھا۔ یہ سو گئے تو عزیز صاحب کے ساتھ سارے اسٹیشن کا ایک چکر کاٹا اور دو جگہ چائے پی۔ پھر ہم بھی آ کر لیٹ گئے۔ مانانوالہ کے جوہڑ کا پانی اب رنگ لایا وہ شدت کی پیچش ہوئی کہ صبح کرنی مشکل ہوگئی۔ اتفاق سے کچھ گولیاں میرے اٹیچی کیس میں موجود تھیں رات بھر کھاتا رہا۔ صبح اٹھا تو طبیعت قدرے بہتر تھی۔ میرے اٹھنے کی سب جاگ گئے اور چلنے کی تیاری کرنے لگے۔

لاہور اسٹیشن پر قلی بڑی مشکل سے ملے اور منہ مانگے دام لے کر انہوں نے تانگوں تک پہنچایا۔ اب تانگے والوں کی باری تھی کہ جو جی چاہے ہم سے طلب کر لیں۔ اردو سنتے ہی ان کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اور ریٹ چوگنے ہو جاتے۔ بہر حال ان کا مطالبہ بھی پورا کیا اور ہم بارود خانے میاں ایم اسلم کے ہاں پہنچے جن سے قلمی و قلبی تعلقات کم و بیش بیس سال سے تھے۔

میں جب ان کے گھر پہنچا تو ڈیوڑھی میں ڈاکٹر تاثیر اور چند اور لوگ بیٹھے تھے۔ تاثیر صاحب پہلے تو حیرانی سے دیکھتے رہے پھر پہچان کر بولے: آپ! آپ تو دس سال زیادہ بوڑھے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے جلدی سے اندر اسلم صاحب کو اطلاع کرائی اور تسلی دینے لگے۔ اتنے میں اسلم صاحب بھی آ گئے۔ سب کو گھر میں پہنچایا اور ناشتہ کرایا جب میں غسل سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو اسلم صاحب میرے منتظر تھے۔ گھنٹوں ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے اتنی دلجوئی کی کہ میں اپنے غم بہت حد تک بھول گیا۔ میرے لیے مکان کا فوراً انتظام کر دیا مگر جانے نہ دیا اور بیس دن اپنے ہاں مہمان رکھا۔

کئی عزیز جو 21ء ستمبر کی اسپیشل سے دلّی سے چلے تھے مارے گئے۔ اس پوری گاڑی میں صرف دو سو آدمی زندہ بچے تھے۔ ایک دوست کی جو اس گاڑی سے لاہور پہنچے تھے حالت یہ تھی کہ سارے کپڑے خون میں لت پت تھے اور وہ پاگلوں کی طرح چیختے تھے کہ میں نے مردوں کا پاؤ بھر خون چاٹا ہے۔ یہ لاشوں کے نیچے دبے رہ گئے تھے اور پیاس بجھانے کے لیے خون چاٹتے رہے تھے۔ ان کی خون آشامی کی کیفیت سن کر بہار کی وہ پاگل عورت یاد آ جاتی تھی جو سب سے کہتی پھرتی کہ میں نے اپنے سات بچوں کا خون پیا ہے۔ اس کے سات بچے ان کی آنکھوں کے سامنے ذبح کیے گئے اور سب کا خون اسے زبردستی پلایا گیا۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں اس قسم کے عبرت ناک واقعات سے محفوظ رکھا اور ہم اتنے بڑے آشوب میں سے زندہ سلامت نکل آئے۔ مالی نقصان کا کیا ہے؟ زندہ رہے تو بہت کچھ کما لیں گے البتہ دلّی چھٹنے کا داغ دل پر ہمیشہ رہے گا۔ دلّی اب بھی باقی ہے اور وہاں مسلمان بھی بستے ہیں لیکن وہ دلّی اب کہاں! وہ دلّی تو کبھی کی مر گئی!!

(شاہد احمد دہلوی کے سفرنامے کی تلخیص عبدالمجید قریشی سیارہ ڈائجسٹ اگست 84)

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

دہلی سے لاہور

برطانوی دور حکومت میں دہلی ہندوستان کا دارالسلطنت ہونے کی حیثیت سے سیاسی مرکز تھا اور ہندستان کی جتنی بھی سیاسی جماعتیں تھیں ان کا ہیڈ کواٹر دہلی ہی تھا۔ 3 جون 1947ء سے قبل مسلمانانِ ہند ایک عجیب ذہنی کشمکش کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ مسلم لیگ ان کی واحد پسندیدہ اور ہر دلعزیز سیاسی جماعت تھی اور سب ہی مسلمان ہند اس کے معتقد تھے اور اس کے ایک ہی اشارے پر اپنی جانیں تک قربان کرنے کو تیار تھے۔ مسلمانوں کے خیالات اور احساسات کی ترجمانی کرنے کے لیے دہلی سے چار مشہور روزنامے شائع ہوتے تھے۔ ایک انگریزی کا ڈان اور دوسرا اردو کا اخبار منشور اس کے علاوہ روزنامہ جنگ اور ''انجام'' بھی تھے۔ لیکن افواہیں ہر روز اڑتی تھیں کہ پاکستان کا اعلان ہونے ہی والا ہے' لیکن مسلم عوام جب تک یہ الفاظ اپنے محبوب اور ہر دلعزیز قائد حضرت محمد علی جناح کے دہن مبارک سے نہ سن لیں۔ ان کو تسکین نہ ہوسکتی تھی۔ خدا خدا کر کے یہ خبر اخبارات کی شہہ سرخی بنی کہ تین جون کو آل انڈیا ریڈیو سے شام کو پاکستان کا اعلان کر دیا جائے گا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن' پنڈت نہرو' قائد اعظم محمد علی جناح اور سکھوں کی جانب سے سردار بلدیو سنگھ تقاریر کریں گے۔ جو اس بات کا اعلان ہوگا کہ مسلمانانِ ہند کا یہ مطالبہ کہ پاکستان کا قیام عمل میں آئے گا تسلیم کیا جا چکا ہے اور جلدی ہی ان کے خوابوں کی تعبیر عملی صورت میں نظر آ جائے گی۔

3 جون کی شام کا جس بے چینی سے انتظار تھا۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ہر مسلمان نے اپنے اپنے گھروں میں ریڈیو سیٹ ٹھیک کرائے۔ ان کی خاطر خواہ مرمت کرائی ریڈیو کے ایریل درست کئے اور جن لوگوں کے گھر ریڈیو نہ تھے انہوں نے اپنے دوست احباب کے گھر ریڈیو پر پاکستان کے اعلان اور حضرت قائد اعظم کی جاں افروز آواز سننے کے لیے انتظام کیا۔ بہت سی مسلم ایجنسیوں اور اداروں نے لائبریریوں اور بازاروں میں ریڈیو لگا دیئے۔ تاکہ کوئی مسلمان یہ اعلان سننے سے محروم نہ ہو۔ مسلمانوں نے دن بھر مٹھائیاں تقسیم کیں۔ کھانے کی دیگیں پکائیں جو مستحق لوگوں میں بانٹی گئیں اور ایک دوسرے کو گلے مل کر مبارکباد دی۔ غرضیکہ عید کا سماں تھا۔

ہم چند دوستوں نے بھی تین جون کو یہ اعلان سننے کے لیے اپنے ایک متمول دوست کے گھر بیٹھ کر پاکستان کے اعلان سننے کا پروگرام بنایا اور وقت مقررہ سے پہلے ہی اپنے دوست کے گھر جمع ہو گئے۔ کیونکہ اپنے گھر بیٹھ کر علیحدہ علیحدہ سننے سے وہ خوشی حاصل نہ ہوتی جو سب احباب کے ساتھ مل کر سننے سے نصیب ہوتی۔ چنانچہ سب اس نیک ساعت کا انتظار بے تابی سے کرنے لگے۔

خدا خدا کر کے وہ گھڑی آئی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریریں شروع ہوئیں۔ سب لوگ خاموش تھے اور کسی کے سانس لینے کی آواز بھی نہ آرہی تھی۔ پنڈت نہرو نے اپنی تقریر کے بعد جے ہند کا نعرہ لگایا اور اب وہ سعد لمحہ آنے والا تھا جب مسلمانوں کے سیاسی اور محبوب ترین رہنما حضرت قائد اعظم کی تقریر کا وقت تھا۔ آخر کار حضرت قائد اعظم کی آواز گونجی اور لوگوں کے دل بلیوں اچھلنے لگے۔ ہر شخص ایک

ایک لفظ غور اور انہماک سے سن رہا تھا اور سب کان ریڈیو کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ گو کہ قائداعظم کی تقریر انگریزی میں تھی لیکن ہر مسلمان خواہ وہ انگریزی جانتا تھا یا نہیں لیکن اس کے دل کے ہر گوشے میں یہ الفاظ پیوست ہوتے جا رہے تھے۔ کیونکہ یہ الفاظ ان کے دل کی آواز اور ان کے قلبی احساسات کے ترجمان تھے۔ قائداعظم نے اپنی ایمان افروز تقریر کے بعد ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ بلند کیا۔ تو مجمع میں ہر مسلمان نے ان کی ہم نوائی کی اور ''پاکستان زندہ باد' کے نعرے ہر مکان اور بازار میں گونجنے لگے۔ مسلمان نوجوان مسرت بے پایاں سے رقص کرنے لگے۔ آخر کار سات سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد ایک خواب کی تکمیل ہوئی تھی۔ اس کے بعد سردار بلدیو سنگھ نے تقریر کی۔ موضوع وہی ہندوستان کی تقسیم اور قیام پاکستان کے معرض وجود میں آنے کا اعلان تھا۔ یہ تقاریر کیونکہ انگریزی میں ہوئی تھیں اس لیے ان کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ جن کو لوگوں نے اسی شوق اور جذبے وانہماک کے ساتھ سنا اور قائداعظم کی دانش وفراست اور سیاسی بصیرت کو داد دی اور ان کی صحت اور طویل زندگی کے لیے دعائیں کیں۔ جن کی قیادت میں مسلمانانِ ہند کو یہ دن نصیب ہوا کہ انہوں نے پاکستان کے قیام کی خبر سنی۔ مسلمانوں نے اپنی اس کامیابی پر بارگاہ رب العزت میں سجدۂ شکر ادا کیا اور اس سے مزید برکات اور رحمتوں کے لیے دعائیں کیں۔

4 جون کو شہر میں مکمل امن وسکون رہا۔ سکول' کالج دفاتر اور تعلیمی درسگاہیں وقت مقررہ پر کھلے اور بند ہوئے۔ مسلمان اپنی اس کامرانی پر شاداں وفرحاں تھے اور خوشی سے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر مبارکباد دیتے اور ہر مسلمان قائداعظم کی تعریف وتوصیف میں رطبُ اللّسان رہا۔ جگہ جگہ ٹولیاں جمتیں اور پاکستان اور اس کے مستقبل کے بارے میں تجویزیں اور زمزمے ہوتے۔ مسلمانوں نے اپنے اپنے گھروں میں مسلم لیگ کے بڑے بڑے جھنڈے لہرائے تھے۔

جون کا مہینہ کسی خاص ہنگامے کے بغیر خاموشی سے گذر گیا۔ ماہ جولائی میں پنجاب اور سرحد کے علاقوں سے فسادات کی خبریں آنے لگیں۔ دہلی میں پنجاب کے اخبارات ''زمیندار'' ''احسان'' بہت پسند کیے جاتے تھے۔ یہ مسلم لیگ کے خیر خواہ اور پاکستان کے حامی تھے اور ہندو اخبارات کی تنگ دلی اور غلط خبروں پر بے لاگ تبصرے کرتے تھے۔ دہلی سے ہندو اخبار ''تیج'' اردو میں شائع ہوتا تھا۔ جو مہاسبھائی ذہنیت رکھتا تھا۔ اس کو بدقسمتی سے مسلمانوں کی کوئی ادا پسند نہ تھی اور اپنی اس زہریلی فطرت کی وجہ سے وہ تنگ نظر ہندو اکثریت میں کافی مقبول تھا۔ پنجاب کے مشہور اردو میں شائع ہونے والے ہندو اخبارات ''ملاپ'' اور ''ویر بھارت'' بھی اسی ذہنیت کے حامی تھے' لیکن ہندو گھرانوں میں خوب پڑھے جاتے تھے ان اخباروں نے پاکستان اور اس کے حامیوں کے خلاف خوب خوب زہر افشانی کی اور ہندو ذہنوں میں مسلمانوں کے خلاف ایک ختم نہ ہونے والا زہر بھر کے ایک ایسا آتش فشاں پہاڑ کھڑا کر دیا جس کو بس ذرا پھٹنے کی دیر تھی کہ پھر جو کچھ اس کے سامنے آتا جل کر خاکستر ہو جاتا۔

پنجاب کے فسادات کی خبروں نے ہندوؤں میں ایک خاموش اشتعال برپا کر دیا' لیکن وہ اس کے عملی ردعمل کے لیے کسی مناسب موقع اور لمحے کے منتظر تھے۔ ان خبروں کی وجہ سے ہندوؤں اور سکھوں کے رویہ میں کچھ کچھ تبدیلی رونما ہوتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ کالج اور یونیورسٹی میں آپس میں پنجاب کے فسادات کے چپکے چپکے مل بیٹھ کر ذکر کرتے اور مسلمان دوست آتے تو خاموش ہو جاتے یا پھر بے تکلفی سے کہتے کہ دیکھو پنجاب میں مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ کیا ظلم کر رہے ہیں۔ ہم ان سے یہی کہتے ہیں کہ اخبارات کی مبالغہ آمیز خبروں پر نہ جاؤ۔ اخباروں کا کام تو ایسی

مبالغہ آمیز خبریں دے کر اپنا اخبار بیچنا اور لوگوں کو مشتعل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن وہ لوگ یقین سے اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ پاکستان کی حد بندی کے بعد وہاں ہندوؤں اور سکھوں کا قیام مشکل ہو جائے گا اور مسلمان ان کی جان و مال اور عزت کو محفوظ نہ رکھ سکیں گے۔ اس قسم کے دبے دبے خیالات ان طلبا اور طالبات کے تھے جو زیر تعلیم تھے اور اپنے آپ کو فراخدل اور دانشمند کہلاتے تھے اور لامذہب حکومت کے داعی اور طرفدار تھے' لیکن مسلمان قوم کے بارے میں ان کے خیالات اور احساسات زہر آلود اور تعصبانہ تھے۔

جولائی کے مہینہ میں فسادات کی خبریں زیادہ سے زیادہ آتی رہیں اور اس کے ساتھ ہی دلّی میں پنجاب سے ہندو اور سکھ شرنارتھی داخل ہونا شروع ہو گئے۔ یہ شرنارتھی زیادہ تر تو اپنے عزیزوں' رشتہ داروں اور دوستوں کے پاس ٹھہرتے رہے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ پنجاب کی دہشت ناک اور مبالغہ آمیز خبر لاتے اور وہ جگہ جگہ بیٹھ کر سناتے اور ہندوؤں اور سکھوں کو مشتعل کرتے کہ مسلمانوں نے پنجاب اور سرحد میں کیا کیا ظلم کیے ہیں۔ عورتوں کو بے عزت کرنا' اغواء کرنا' مکانوں کو جلانا اور مال و اسباب لوٹنا تو عام خبریں سمجھی جاتی تھیں' لیکن یہ لوگ اپنے ساتھ ہونے والے واقعات کو اس طرح نمک مرچ لگا کر بیان کرتے کہ سخت دل انسان بھی نرم پڑ جاتا۔ اخبارات کے نمائندے یہ خبریں ان سے لکھ کر اخبارات کو دیتے جو دوسرے دن شائع ہوتیں اور غیر مسلم مشتعل اور چراغ پا ہو جاتے شرنارتھی ہر طرف نعرے لگاتے کہ ہم انتقام لیں گے۔ تعصب کی یہ نفرت پروان چڑھتی رہی اور ہندو پروپیگنڈے نے سکھوں کو مسلمانوں کا جانی دشمن بنا دیا۔

دلّی کے مسلمان یہ سب کچھ سنتے اور دیکھتے رہے جا رہے تھے کہ دہلی حکومت برطانیہ کا دارالحکومت ہے۔ وہاں امن و امان ہی رہے گا۔ کیونکہ یہاں دنیا بھر کے سفیر رہتے ہیں اگر دہلی میں فساد ہوا تو ہندو کہیں اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ یوں بھی دلّی کے مسلمان اور ہندو صدیوں سے ایک ساتھ رہتے آئے ہیں۔ اور ان کے تعلقات آباؤ اجداد سے ہی بڑے مخلصانہ اور ہمدردانہ رہے ہیں۔ وہ آپس میں کبھی نہیں لڑے۔ بلکہ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا شادی غمی اور تقریبات میں سب مل کر شریک ہوتے تھے سب ایک دوسرے کا احترام کرتے اور ہمیشہ آڑے وقت میں کام آتے۔ تعصب اور دشمنی نے کبھی ان کے دلوں میں جگہ نہ پائی تھی اور حقیقت ہے بھی یہی کہ دلّی کے پرانے باشندے ہندو مسلمان 1947ء میں بھی آپس میں نہیں لڑے۔ دل میں خواہ کچھ بھی ہو لیکن زبان پر کبھی ناراضگی یا برہمی کا اظہار نہ ہونے دیا۔

جولائی کے آخر میں شرنارتھیوں کی ریل گاڑیاں جب روزانہ پنجاب سے دلی میں آنے لگیں تو حکومت کو فکر ہوئی کہ ان لوگوں کو بسانے اور رہنے کا کیا انتظام کیا جائے۔ دلّی میں تین جگہیں ایسی تھیں جہاں پھیلاؤ کی گنجائش تھی اور وہ علاقے سبزی منڈی' قرول باغ اور پہاڑ گنج تھے۔ جہاں کیمپ لگا کر میدانوں میں ان شرنارتھیوں کو عارضی طور پر بسایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ انہی پلان کے مطابق ہندوؤں اور سکھ شرنارتھیوں کے خیمے سبزی منڈی' قرول باغ اور پہاڑ گنج میں لگا دیئے گئے جہاں آ کر پنجاب کے شرنارتھی ٹھہرتے تھے۔ ان شرنارتھیوں کو ہندو سیٹھوں' مل مالکوں' تاجروں اور ہندو سکھ تنظیموں کی سرپرستی حاصل تھی۔ جو ان کے خوردنوش کے علاوہ ان کو اسلحہ بھی مہیا کرتے اور اس کی تربیت بھی دیتے۔ تا کہ دلّی کے پرامن شہریوں سے پنجاب میں ہونے والے واقعات کا بدلہ لے سکیں ان شرنارتھیوں کو اور بہت سی غیر مسلم تنظیموں کی امداد بھی حاصل ہوئی جو در پردہ مسلمانوں کے خلاف تھے لیکن خود سامنے آنا مصلحتاً مناسب خیال نہ کرتے تھے۔

مسلمانانِ دہلی نے جو بڑے مطمئن بیٹھے تھے۔ جب یہ حالات دیکھے تو کچھ جھرجھری لی اور نیند سے جاگے تو کارواں بہت آگے نکل چکا تھا۔ تاہم خطرے کے پیشِ نظر ہر گلی اور محلے میں میٹنگیں ہونے لگیں کہ اس ناگہانی افتاد سے کیسے نبٹا جائے۔ نہ زر ہے نہ مال اور نہ ہتھیار کہ مسلم ہندو اور سکھ شرناتھیوں سے لڑ سکیں۔ جلدی جلدی میں محلوں کے استاد لاٹھی چلانا۔ شمشیر زنی کرنا یا اپنے بچاؤ کے لیے پہلوانی اور کشتی کے گُر جانتے تھے ان سے درخواست کی گئی کہ وہ نوجوانوں کو جتنی جلد ہو سکے کچھ نہ کچھ سکھا دیں تا کہ بوقت ضرورت اپنا دفاع کر سکیں۔ یہ کام مسلمان لڑکے چھپ کر راتوں کو کرتے تا کہ ہر آنے جانے والا دیکھ نہ سکے، لیکن مسلمانوں کی مصروفیات بھلا چھپی رہ سکتی تھی۔ ایک دو دن کے بعد ہی سب ہندو اخباروں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مسلمان لڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں جو کسی وقت بھی ہندوؤں کے لیے خطرے کا باعث بن سکتی ہیں۔ چنانچہ تھانوں اور پولیس کو مطلع کر دیا گیا اور اپنے دفاع میں جو مسلمان نوجوان اور جوان کشتی اور شمشیر زنی کا فن سیکھ رہے تھے۔ ان کے اور ان کے بزرگوں اور سرپرستوں کے نام علاقے کے تھانوں میں پہنچا دیئے گئے اور ان کو تھانوں میں بلا کر ڈرایا دھمکایا گیا۔ غرضیکہ مسلمانوں کے اپنے بچاؤ کے سلسلہ میں کیے گئے تمام اقدامات مسدود کر دیئے گئے۔ اب وہ صرف نعرے ہی لگا سکتے تھے اور اللہ کی مدد پر بھروسہ کر سکتے تھے۔ کوئی ہتھیار تلوار آتشیں اسلحہ ان کے پاس نہ تھا۔ جو وہ ایک جمِ غفیر کی یلغار کے حملوں کو روک سکتے۔ یقین کریں کہ بعض گھروں میں تو لاٹھیاں تک نہ تھیں۔ یہ مسلمانوں کی روایتی سستی اور تن آسانی کا نتیجہ تھا۔ جو ہمیشہ سے اس بات پر ایمان رکھتے آئے ہیں کہ جب سر پر پڑے گی تو دیکھا جائے گا، لیکن اب کفِ افسوس مل رہے تھے لیکن پھر بھی جلدی میں ہر گھر میں ایک یا دو لاٹھیوں کا انتظام کر دیا گیا۔

ماہ اگست میں حالات اور خراب ہوتے گئے دہلی سے بہت سے مسلمان سرکاری افسر جنہوں نے حکومت پاکستان کے لیے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں وہ روزانہ پاکستان جا رہے تھے اور ان کی گاڑیاں معہ دفتری کاغذات کے پاکستان جا رہی تھیں۔ مسلمان کے اس متوسط طبقہ کے انخلاء سے شہر میں ایک عجیب بدرونقی پیدا ہو گئی تھی جس سے کافی حوصلہ شکنی ہوتی تھی، لیکن مسلمان یہ سب کچھ خوش دلی سے برداشت کر رہے تھے کہ اپنی محبوب حکومت پاکستان کی فلاح و بہبود اور استحکام کے لیے دفتری لوگوں کو پاکستان ضرور جانا چاہیے تھا۔ کوئی گھر ہی شاید ایسا ہو جہاں سے دفتری احکامات کے مطابق کوئی نفس پاکستان منتقل نہ ہو گیا ہو۔ یہ کام چودہ اگست سے پہلے مکمل ہونا تھا۔ تا کہ یومِ آزادی کے موقعہ پر چودہ اگست کو دفاتر اور فرمیں قرینہ میں بند ہو گئیں۔

(عبدالباسط سیارہ ڈائجسٹ اگست 1984ء)

جزیرے پر دھماکہ

ابن صفی کے دوست اور شاگرد ایچ اقبال کے تخلیق کردہ کردار میجر پرمود کا جاسوسی کارنامہ۔ ایک سنسان جزیرے پر ملک دُشمن عناصر کی قائم کردہ، اسلحہ فیکٹری کو تباہ کرنے کا مشن۔ یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مہاجر کیمپ کی پیپتا

تقریباً وسط جولائی 47ء کی بات ہے‘ میں دیال سنگھ کالج لاہور سے انٹر کر چکا تھا۔ مشرقی پنجاب میں سکھوں نے مار دھاڑ اور مسلمانوں کو جور وستم کا نشانہ بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ مشرقی پنجاب کے ہندو‘ سکھ اکثریت کے علاقوں کا بھارت میں شامل ہونا ایک طرح سے طے شدہ امر تھا۔ اس لیے وہاں کے مسلمان خوف وہراس کی فضا میں اپنے گھربار چھوڑ کر فیروز پور سے براستہ گنڈا سنگھ والا اور ضلع امرتسر سے براستہ کھیم کرن‘ قصور وارد ہونا شروع ہو گئے تھے‘ چنانچہ میں اور میرے نوجوان ساتھیوں نے ان کے قیام وطعام کی ذمے داری اپنے سر لے لی۔

قصور میں ہندو‘ سکھ ابھی مقیم تھے گو ان میں سے بعض خاندانوں نے اپنے بیوی بچے اور بوڑھوں کو ستلج پار فیروز پور یا امرتسر بھیجنا شروع کر دیا۔ جولائی میں اسکول موسم گرما کی تعطیلات کے لیے بند تھے۔ سو مشرقی پنجاب سے آنے والے خانماں برباد مسلمانوں کو موری گیٹ پرائمری اسکول قصور میں ٹھہرانے کا بندوبست کیا گیا اور ایک محدود علاقے میں منادی کرا دی گئی کہ مشرقی پنجاب سے مہاجر آنا شروع ہو گئے ہیں‘ لہٰذا ہر صاحب استطاعت گھرانا دوپہر وشام کچھ کھانے کا انتظام بھی رکھا کرے۔ ہم لوگ مہاجرین کے لیے سالن اور روٹیاں جمع کرتے اور اس کا آغاز میرے اپنے گھر سے ہوتا۔ یوں ہم اشیائے خورونوش مہاجروں میں تقسیم کرنے لگے۔

روز بروز مہاجرین کی آمد بڑھتی چلی گئی۔ اب ان میں تہی دست اور زخمیوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ مہاجرین کا دوسرا کیمپ حنیفہ اسلامیہ اسکول میں بنایا گیا۔ زخمی گورنمنٹ سول اسپتال منتقل کر دیے جاتے۔ اسلامی اخوت کے جذبے سے سرشار شہر کے دوسرے لوگوں نے بھی دست تعاون بڑھانا شروع کر دیا۔ حافظ غلام جیلانی اور ملک محمد اصغر میرے ساتھ امدادی خدمات انجام دینے میں پیش پیش تھے۔

اگست شروع ہوا تو قصور میں کرفیو کا نفاذ ہونے لگا کیونکہ ہندو مسلم فساد کا خطرہ تھا۔ ان دنوں میرے ایک سکھ دوست نریندر سنگھ نے مجھے اپنے گھر بلا کر کہا: ”میاں فیاض! سنا ہے تم حنیفہ اسلامیہ اسکول میں پناہ گیروں کی خدمت میں دن رات لگے رہتے ہو۔ آج رات وہاں نہ جانا‘ اس پر سکھ حملہ کرنے والے ہیں اور وہ لالہ بلے شاہ کی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“ یاد رہے بلے شاہ قصور کا ایک ہندو رئیس تاجر تھا جس کا روئی بیلنے کا ذاتی کارخانہ بھی تھا۔ اس نے اسٹیشن کے قریب سرائے بنوا رکھی تھی جس میں ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کی رہائش کا علیحدہ علیحدہ انتظام تھا۔

میں نے واپس آ کر تھانہ سٹی کے ایس ایچ او آغا خادم حسین کو اطلاع کر دی۔ انہوں نے سرائے پر چھاپہ مار کر مشکوک سکھ ہتھیاروں سمیت گرفتار کر لیے۔ جب آغا صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو یہ اطلاع کس نے دی تھی تو میں نے معذرت کر لی کہ نام ظاہر نہیں کر سکتا۔ اور نریندر سنگھ کے احسان کا بدلہ میں نے یوں چکایا کہ 15 اگست کے بعد اسے اصرار کر کے اسٹیشن لے گیا اور گاڑی پر سوار کرا دیا اگرچہ وہ قصور سے نہیں جانا چاہتا تھا۔

17 اگست کو یہ معلوم ہو گیا کہ شہر قصور پاکستان کا حصہ قرار پایا ہے، ستلج کے اس پار کا علاقہ بھارت کو دے دیا گیا اور کھیم کرن، ترن تارن، ولٹوہا، گھریالہ وغیرہ تحصیل قصور سے الگ کر کے بھارت میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد قصور کی طرف مہاجرین کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔ قصور کے شہری ہندو، سکھ نقدی اور زیورات سمیٹ بیل گاڑیوں پر ضروری سامان اور بیوی بچوں کو لادے دریائے ستلج کا پل عبور کرنے یا کھیم کرن جانے لگے۔ قصور میں کریانے اور تھوک کا کاروبار کرنے والے زیادہ تر ہندو تھے۔ وہ گھروں، دکانوں اور گوداموں پر تالے ڈال کر چلے گئے۔ ادھر مسلمان مہاجر بکثرت آنے لگے تو حکومت نے ان کے قیام وخوراک کا بندوبست اپنے ہاتھ میں لیا اور پریڈ گراؤنڈ میں مہاجر کیمپ بنا دیا گیا۔ کیپٹن محمد سعید مجسٹریٹ نے ہندوؤں کے گوداموں اور دکانوں کے تالے تڑوا کر مہاجرین کی خوراک کی ضروریات پوری کیں۔ راجہ حامد مختار مجسٹریٹ مہاجر کیمپ کے انچارج مقرر ہوئے۔ مہاجرین کو عارضی طور پر آباد کرنے کے لیے ہندوؤں اور سکھوں کی دکانیں اور مکان دیے جانے لگے۔ اگست کے اواخر اور ستمبر میں برسات شروع ہو گئی تو ہیضہ پھوٹ پڑا۔ اس نئی افتاد نے مہاجرین ہی کو نہیں، بہت سے اہل شہر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مہاجرین میں سے ہیضے کے مریض شہر سے قدرے باہر لالہ دینا ناتھ کے متروکہ روئی بیلنے کے کارخانے میں منتقل کیے جاتے رہے جو بعد میں ستلج رینجرز کا ہیڈ کوارٹر بنا۔

قصور سول ہسپتال زخمیوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہاں مریضوں کی دیکھ بھال اور مطلوبہ ادویات اور خوراک بہم پہنچانے کی اشد ضرورت تھی، مگر اس قدر فنڈ نہیں تھے کہ یہ سب انتظام ہو سکتا، لہٰذا اب سول ہسپتال میری توجہ کا مرکز بن گیا۔

پریڈ گراؤنڈ کیمپ میں حالت یہ تھی کہ عورتوں کو کھلے آسمان تلے زچگی کے مراحل سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ اس سلسلے میں میں قصور کے امریکی عیسائی مشن سے رابطہ قائم کیا گیا کیونکہ انہوں نے گرجا گھر کے علاوہ رہائش اور دوسری ضروریات کے لیے کئی عمارتیں بنوا رکھی تھیں۔ ان دنوں مسٹر لوٹملسن پادری تھے۔ ان کی بیگم نے زچگان کے لیے ایک اسٹور خالی کروایا جو دراصل گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ پھر اس میں سفیدی کرا کے صاف ستھرا بنا دیا اور مجھ سے کہا: ''ویل مسٹر گورا! ضروری سامان آپ کو لانا مانگتا۔ مشن سے اجازت ملنے پر ہم سامان منگوا لے گا!'' انہوں نے آنے والے بچوں کے لیے لباس مہیا کرنے کو بھی کہا۔ میں نے وہ سارا سامان جیب خرچ اور والد صاحب سے رقم لے کر خریدا۔ اس میں لالٹینیں بھی تھیں کیونکہ اصطبل میں بجلی نہیں تھی۔ نومولود پاکستانی بچوں کے لیے میں نے اپنے رشتے داروں اور عزیزوں کے ہاں سے استعمال شدہ صاف ستھرے کپڑے اکٹھے کیے۔ لیڈی ڈاکٹر نذیر جان مرحومہ نے جو امرتسر سے یہاں آئی تھیں یہ کار خیر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اس دوران مسٹر لوٹملسن نے اپنے مشن کے ذریعے بہت سا ضروری سامان منگوا لیا اور یوں اس نازک مرحلے پر بھرپور ساتھ دیا۔ بعد میں وہ ''تحفتہً'' دینے لگے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مہاجرین میں دین مسیحی کی تبلیغ بھی شروع کر دی جو ان لوگوں میں کیا کامیاب ہوتی جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے نام پر آگ اور خون کا دریا عبور کر کے ساحل مراد پر آ پہنچے تھے۔

قصور میں ہیضے کی وبا پھوٹ نکلی تو یہ طے پایا کہ ستلج پار سے آنے والے مہاجرین کو گنڈا سکھ والا ہی میں ہیضے کے ٹیکے لگا دیے جائیں اور وہیں اندراج کر کے راشن کارڈ بنا دیا جائے تا کہ انہیں پریڈ گراؤنڈ کیمپ میں آتے ہی راشن مل جایا کرے، چنانچہ وہاں بھی میری ڈیوٹی لگی تو بعض دلچسپ مشاہدات ہوئے۔ ایک مہاجر سے نام پوچھا تو اس نے کہا چھتر خاں۔ اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ وہ پریشان ہوا مگر میں نے بات آگے نہ

بڑھائی اور اسی نام سے راشن کارڈ بنا دیا۔

اس طرح ایک نیک لڑکی سے نام پوچھا تو اس نے بتایا: ''کانی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا' اس کی دونوں آنکھیں سلامت تھیں۔ مزید کریدا تو راز کھلا کہ جب یہ پیدا ہوئی' بہت دبلی تھی' چنانچہ گھر والوں نے ''کانی'' نام رکھ دیا کہ سرکنڈے کو پنجابی میں ''کانا'' کہتے ہیں اور کانی اس کی مونث ٹھہری۔ اب ہسپتال کے چند زخمیوں کے دردناک واقعات سنئے:

زخمیوں میں ایک جوان لڑکی زینب تھی' اس کا جسم زخموں سے چور تھا مگر اس کی معمولی مرہم پٹی ہو رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ اگر فوری توجہ نہ دی گئی تو اس کے زخم خراب ہو جائیں گے اور وہ بچ نہیں سکے گی۔ ڈاکٹر مظہر' جسٹس دین محمد کے داماد تھے' میں نے بار بار ان سے کہا کہ زینب کے زخموں کو ٹانکے لگا دیں مگر وہ کہتے جتنی دیر اس کے زخم صاف کرنے اور سینے میں لگے گی اتنی دیر میں کئی اور زخمیوں کو بچا لوں گا۔ میں نے کہا: ''ڈاکٹر صاحب! زندگی اور صحت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اس شدید زخمی کے لیے ذرا سا وقت ضرور نکالیں!'' چنانچہ ایک طرح سے زبردستی میں اسے اسٹریچر پر ڈلوا کر آپریشن روم میں لے گیا۔ ڈاکٹر مظہر نے زخم اچھی طرح صاف کر کے سی دیے۔ دوسرے زخمیوں کے ساتھ ساتھ زینب کے لیے بھی دودھ دلیے وغیرہ کا مناسب انتظام کر دیا گیا اور اس کے زخم چند روز میں بھر گئے تو اس نے بتایا کہ اس کا خاوند بدر راستے میں سکھوں کے حملے میں شہید ہو گیا تھا۔ اب میں کہاں جاؤں؟ آپ مجھے اپنے گھر لے چلیں میں کام کاج کر دیا کروں گی۔

میں نے کہا ابھی تم چند روز ہسپتال میں رہو۔ جب پوری صحت یاب ہو جاؤ گی تو دیکھیں گے کہ تمہارے لیے کیا بندوبست مناسب رہے گا۔

ان ہی دنوں ایک جوان شخص زینب کو تلاش کرتا آیا۔ وہ لنگڑا رہا تھا۔ عورتوں کے وارڈ میں غیر مردوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس نے مجھ سے زینب کا پوچھا۔ میں نے اس بنا پر نفی میں جواب دیا کہ زینب نے کہا تھا کہ اس کا خاوند راستے میں شہید کر دیا گیا ہے۔

وہ مایوس ہو کر لوٹا ہی تھا کہ مجھے یاد آیا یہ جوان اپنا نام بدر بتا رہا تھا اور زینب نے بھی اپنے خاوند کا نام بدر ہی بتایا تھا۔ میں نے ایک آدمی کو دوڑایا اور وہ اسے واپس لے آیا۔ میں نے بدر کو ہسپتال کے برآمدے کے باہر اپنے پاس بٹھایا۔ کچھ دیر بعد میں اٹھا اور زنانہ وارڈ میں جا کر زینب کو بلایا اور برآمدے کی جالی میں سے باہر دیکھنے کو کہا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کا خاوند واقعی زندہ ہے۔ میں زینب کو دلاسا دے کر واپس زنانہ وارڈ میں لے گیا۔ میں یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ بدر بھی زینب کو پہچانتا ہے یا نہیں۔

جب وارڈ میں دوپہر کا کھانا دینے کا وقت آیا تو میں نے سالن کی بالٹی بدر کے ہاتھ پکڑا دی اور ساتھ ہو لیا۔ جب وہ زینب کو سالن دینے لگا تو اس کا ہاتھ گویا وہیں تھم سا گیا اور وہ لپک کر اس کی طرف بڑھا۔ بدر نے بتایا کہ سکھوں کے حملے میں یہ تو زخم کھا کر بھاگ اٹھی تھی اور میں ٹانگ میں گولی لگنے سے گر پڑا تھا۔ میرے اوپر اور زخمی آن گرے تھے۔ کچھ دیر بعد میں زخمیوں اور مرنے والوں کے نیچے سے نکلا اور کسی نہ کسی طرح قصور آن پہنچا۔ یہاں میرے گاؤں والوں میں سے ایک نے بتایا کہ زینب ان کے ساتھ بھاگی تھی' وہ زخمی تھی اس لیے ضرور ہسپتال میں ہو گی' چنانچہ میں یہاں اس کی تلاش میں چلا آیا۔ ہم نے انہیں کھلایا پلایا اور کچھ زادراہ بھی دیا۔ وہ بورے والا چلے گئے جہاں ان کے رشتے دار تھے۔ چند برس تک وہ مجھ سے ملنے قصور آتے رہے۔

ایک اور واقعہ تقریباً دس برس کی لڑکی کا ہے جو والدین سے بچھڑ گئی تھی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا مگر عادات و اطوار ایسے تھے جیسے وہ مال دار گھرانے کی ہو۔ وہ اسہال میں مبتلا تھی اور اسے موری گیٹ پرائمری اسکول میں رکھا گیا تھا۔ پریڈ گراؤنڈ کا مہاجر کیمپ کھل جانے کے بعد یہ جگہ والدین سے بچھڑے بچوں کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ اس کا علاج ہونے لگا اور وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئی کہ ہمارے گھر میں رہنے پر ضد کرنے لگی تھی اور مجبوراً میں اسے گھر لے آیا۔

گھر میں والدہ اور بچیوں نے اسے محبت سے نہلایا دھلایا اور کپڑے وغیرہ پہنائے۔ جب اماں نے من پسند کھانے کا پوچھا تو اس نے کہا: ''بیٹر کھاؤں گی''۔ فسادات اور افراتفری کے ان دنوں بیٹر کہاں سے آتے۔ اماں نے اس کے لیے مرغی کا سالن بنایا۔ پھر چند روز اس نے جو تقاضا کیا' اس کے لیے پکوایا گیا۔ ایک دن اس کا والد تلاش کرتا ہوا میرے پاس پہنچا۔ ہم نے ضروری تصدیق کی۔ پھر لڑکی نے بھی اپنے والد کو پہچان لیا۔ معلوم ہوا کہ لڑکی کا والد نہر کا پٹواری ہے۔ اسی لیے اس کی بیٹی کی فرمائش سیب کے مربے اور بیٹر سے کم کی نہیں ہوتی تھی۔

تیسرا واقعہ بھائی بہن کا ہے۔ لڑکی تقریباً سات برس کی تھی اور لڑکا ڈیڑھ دو برس کا۔ کسی شقی القلب سکھ نے لڑکے کا بازو کہنی سے کاٹ دیا تھا۔ اس کی مرہم پٹی ہوتی رہتی تھی' مگر وہ ایسا ہراساں اور ضدی ہو گیا تھا کہ بہن کی گود سے اترتا ہی نہ تھا' وہ بیچاری سارا سارا دن اسے گود میں اٹھائے رہتی۔ اس کم عمر لڑکی کا نام سکینہ تھا۔ بھائی کے لیے اس کا ایثار قابل تعریف تھا' مگر اس کم عمری میں اس کی یہ مشقت مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ میں سکینہ کو سمجھا بجھا کر اپنے گھر لے آیا۔ گھر والوں نے لڑکے کو کھلونے دیے اور اس طرح اس کا دل بہلایا تو وہ بہل گیا۔ سکینہ کے بقول اس کی ماں نے بتایا تھا کہ اس کے نانا نانی قصور کے آس پاس کسی گاؤں میں رہتے تھے مگر اس کا نام اسے یاد نہیں رہا تھا۔ دو چار دن بعد ان کا نانا خود ہی انہیں تلاش کرتا آن پہنچا۔ نانا سے نواسی کی شناخت پوچھی گئی جو اس نے ٹھیک بتا دی۔ لڑکی نے بھی نانا کو پہچان لیا۔ وہ قصور سے دو ڈھائی میل دور موضع کھارا کا رہنے والا تھا۔ دونوں بہن بھائی خوبصورت تھے۔ افسوس! بچہ ایک بازو سے محروم ہو چکا تھا۔

(اردو ڈائجسٹ اگست 1996ء)

روایت: میاں فیاض احمد گورا

عشق کا عین

عشق کا عین...... علیم الحق حقی کے حساس قلم سے، عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے سفر کی داستان، ع...... ش...... ق کے حروف کی آگاہی کا درجہ بہ درجہ احوال۔ دورِ حاضر کا مقبول ترین ناول...... ایک ایسا ناول جو آپ کے سوچنے کا انداز بدل کر آپ کی زندگی میں مثبت تبدیلی لے آئے گا۔ **کتاب گھر کے معاشرتی اصلاحی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔**

آزادی کے چراغ خون سے جلتے ہیں

کون کہتا ہے کہ ہم ۱۹۴۷ء کے واقعات فراموش کر چکے ہیں۔ جو لوگ اس قیامتِ صغریٰ سے گزر کر آئے ہیں' ذرا ان سے پوچھیے' وہ آج بھی اسی طرح دلگیر نظر آئیں گے جس طرح ۴۷ء میں آپ نے انہیں دیکھا تھا۔ کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں جن کا لہو مال وقت بھی نہیں کر سکتا۔ حصولِ آزادی کے لیے ہم نے اسی نوع کے زخم کھائے تھے۔ تمام سال اِن زخموں کی ٹیسیں قدرے دبی چھپی رہتی ہیں' لیکن اگست کے مہینے میں تو یہ زخم بالکل ہرے ہو جاتے ہیں' یوں لگتا ہے جیسے وہ تمام دردناک واقعات ہم پر پھر سے وارد ہو رہے ہیں۔

میرے ساتھ ہر سال اگست کے مہینے میں صرف یہی نہیں ہوتا کہ ۴۷ء کے دردناک واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے' بلکہ مجھ پر یہ مہینہ امتحان کا مہینہ بن کر گزرتا ہے۔ اس مہینے میں نام نہاد امن پسند ہندو دھرم کے ظلم وستم کا شکار ہونے والا میرا ایک ایک عزیز میرے روبرو ہو کر مجھ سے سوال کرتا ہے۔ کبھی یہ کر گزریں کہ بھائی میرے سامنے ٹکڑے ٹکڑے پڑا پوچھ رہا ہوتا ہے کیوں بھائی جان آپ نے ظلم وستم کے خلاف کیا آواز اٹھائی۔ ''اپنے عزیز وطن پاکستان کے لیے کیا کچھ کیا؟ اے بھائی جان ہم تو اپنے وطن کی پاک سرزمین تک پہنچ نہ سکے۔ ہمیں اس کی مٹی آنکھوں سے لگانے کی سعادت نصیب نہ ہوئی' لیکن آپ کو وہاں پہنچے ایک عرصہ گزر چکا ہے' ذرا بتایئے تو سہی آپ نے اس کی عزت وحرمت اور شان وشوکت کو فروغ دینے کے لیے کیا کیا فرائض سرانجام دیے؟'' ابھی میرے کانوں میں بھائی کی یہ آواز گونج رہی ہوتی ہے کہ اتنے میں میری والدہ اپنے زخمی کلیجے کو سنبھالے ہوئے میرے سامنے آ جاتی ہیں اور پوچھنے لگتی ہیں: ''کیوں بیٹا'' تم نے مجھ کو کھ جلی کا نام روشن کرنے کے لیے کون کون سے کام کیے ہیں؟ دیکھنا بیٹا' بے عمل زندگی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ ایسا نہ ہو قیامت کے دن میں خدا اور رسول ؐ کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں۔ اگر تمہارا چھوٹا بھائی زندہ رہتا' تب کوئی بات نہ تھی۔ اب تو ساری ذمے داری تم ہی پر عائد ہوتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں اپنی نیک آرزوؤں اور خوابوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے پاک سرزمین عطا فرمائی ہے۔ اگر تم اس کے باشندے بن کر بھی کوئی کام نہیں کر سکتے' تو بیٹا معاف کرنا بڑے افسوس اور حیرت کا مقام ہے۔ ہم لوگ تو غلامی کی زندگی بسر کرتے تھے' لیکن پھر بھی اللہ کا نام لینے سے باز نہ آتے تھے۔ تمہیں ایک اچھا انسان بننے اور غیور قوم کا ایک فرد ہونے میں کونسی مشکل درپیش آ سکتی ہے؟'' ابھی میں اپنی ماں کی آوازیں سن رہا ہوں کہ میرے سامنے میری معصوم بچی اپنا زخمی حلق لیے آ جاتی ہے۔ تیرہ چودہ مہینے کی بچی...... مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس بے زبان کو بھی زبان مل گئی ہے اور وہ مجھ سے سوال کر رہی ہے: ''کیوں بابا جان' آپ نے میرے معصوم خون کی قربانی سے کیا سبق حاصل کیا' یقیناً میرا خون رائیگاں نہ گیا ہوگا' لیکن بابا جان' میرے اس سیدھے سادھے سوال پر آپ کی نظریں جھک کیوں گئی ہیں؟ آپ اپنی ننھی منی شہید بیٹی کی طرف سر اٹھا کر کیوں نہیں دیکھتے؟ اچھے ابو' میں تو اس وقت بھی مسکرا رہی تھی جب ایک ظالم نے میرے ننھے حلقوم پر وار کیا تھا۔ میرے معصوم لبوں پر تو اس وقت بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جب

آپ اگلی صبح گھبراہٹ میں میری ننھی منی سی نعش کو روندتے ہوئے گزر گئے تھے۔ میرے پیارے ابا جان میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے تو نہایت بہادری سے جان دی تھی، پھر آپ کی نظریں کیوں جھکی ہوئی ہیں؟''

غرض اسی طرح باری باری میری آنکھوں کے سامنے میرا ہر ایک مرحوم عزیز آتا ہے اور مجھ سے اپنی نوعیت کا سوال کرتا ہے۔ کس کس کا ذکر کروں۔

میں ضلع حصار (مشرقی پنجاب) میں ایک نیم سرکاری ہفتہ وار ''پکار'' کا مدیر تھا۔ جب یہ اخبار بند ہونے لگا اور اس ضلع میں وشٹنگ کا محکمہ قائم ہوا، تو جناب شیخ انوار الحق ڈپٹی کمشنر مجھے اس محکمے میں لے آئے (انوار الحق صاحب آجکل عدالت عالیہ مغربی پاکستان میں جسٹس کے عہدے پر فائز ہیں) ایک تو میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا، دوسرے یہ محکمہ میرے مزاج کے مطابق نہ تھا، اس لیے میں نے جلد ہی یہاں سے نکل کر ڈسٹرکٹ بورڈ کے ہائی سکول میں مدرسی اختیار کر لی۔ میرے اس اقدام پر احباب واقربا نے خاصا مذاق اڑایا۔ بہر حال انگریزی زبان کے مدرس کی حیثیت سے میری تقرری منڈی ڈبوالی کے ایک سکول میں ہوئی۔ یہ جون ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے۔ میں نے سکول میں چند ہی روز پڑھایا ہوگا کہ گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئیں، میں پھر واپس حصار آ گیا، کیونکہ میرے والدین اور اہل عیال وہیں تھے۔ سکول ۲۰ اگست کو کھلنے والا تھا۔ اس عرصے میں حالات خاصے نازک ہوگئے۔ والدین نے مجھے روکنے کی بڑی کوشش کی، لیکن میں بصد اصرار ۲۰ اگست کو منڈی ڈبوالی پہنچ گیا۔ دو روز بعد ہی ہیڈ ماسٹر نے مسلمان ماسٹروں کو بلا کر کہا:

''میں آپ حضرات کی حفاظت کا ذمے دار نہیں، اس لیے آپ لوگ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔''

راستے نہایت خطرناک ہو چکے تھے۔ کہیں آنے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار فارسی کی اس ضرب المثل کے معنی سمجھ میں آئے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ فارسی پڑھانے والے ایک ماسٹر صاحب نے جانے میں عجلت دکھائی، تو غریب اگلے سٹیشن ہی پر ختم کر دیے گئے۔ منڈی ڈبوالی میں مسلمانوں کا ایک ہی محلّہ تھا۔ ہر وقت نعرے لگتے رہتے اور راتیں آنکھوں میں کٹ جاتیں۔ مجھے اپنی بیوقوفی پر رہ رہ کر غصہ آتا۔ آخر میں نے والدین کا کہا کیوں نہ مانا۔ اب میں ہر وقت نکل بھاگنے کے موقعے کی تلاش میں رہتا۔

۲۴ اگست کی صبح موٹروں کے اڈے پر پہنچا۔ معلوم ہوا ایک لاری سے سید اختر حسین نائب تحصیلدار کسی کام سے صدر مقام کو جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا موقع بہت اچھا ہے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی تھا اور ایک مسلح ملازم بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔ اسی وقت ٹریفک پولیس کے ایک واقف اہلکار مل گئے۔ انہوں نے بھی یہ موقع غنیمت جانا، چنانچہ میں اور وہ لاری میں اختر حسین صاحب کی سیٹ کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ لاری چلنے کو ہوئی، تو اڈے کے ایک سکھ منیجر نے مجھے اور میرے ساتھی کو یہ کہہ کر اتار دیا کہ اس لاری میں جگہ نہیں ہے، دوسری لاری سے چلے جانا۔ ہم جانے کے لیے مصر ہوئے، تو اس نے سختی سے کہا: ''میں جو کہہ رہا ہوں، آپ اس لاری سے نہ جائیں۔ ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں۔ فوراً اتر جائیے۔'' ہم بادل نخواستہ لاری سے اترے اور دوسری کا انتظار کرنے لگے کہ کب وہ سواریوں سے بھرے اور کب اس کے چلنے کا وقت آئے۔ ابھی ہمیں انتظار کرتے کچھ دیر ہوئی تھی کہ وہی لاری جس میں اختر حسین نائب تحصیلدار گئے تھے، واپس آتی نظر آئی۔ معلوم ہوا اختر صاحب کو شہر سے نکلے ہی چند فرلانگ

کے فاصلے پر قتل کر دیا گیا اور لاری کے تمام مسافر بھاگ نکلے۔ اس قتل کی خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ اختر حسین اگرچہ نوجوان افسر تھے، تاہم بڑے متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ تمام شہر میں ان کا دبدبہ تھا (واضح رہے کہ منڈی ڈبوالی ضلع حصار کی سب تحصیل تھی اور سب تحصیل میں نائب تحصیلدار ہی سب سے بڑا افسر سمجھا جاتا ہے) مسلمان اس خبر سے نہایت ہراساں ہوئے اور ان کا ہراساں ہونا حق بجانب تھا، کیونکہ اس خبر کے کچھ ہی دیر بعد شہر میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ میری والدہ کے ماموں سید عنایت حسین منڈی ڈبوالی کی پولیس چوکی کے انچارج تھے اور وہاں عرصے سے تعینات تھے۔ ان کا اخلاق بہت اچھا تھا، اس لیے ہر مذہب وملت کے لوگ ان کا بہت لحاظ کرتے۔ حملہ ہوا، تو ہم لوگ ایک گھر میں جمع ہو گئے۔ ہمارے ساتھ مسلمان پولیس کے دو تین گھرانے بھی شامل ہو گئے۔ محلے کے کچھ اور لوگ بھی اپنے بچوں اور عورتوں کو ہمارے ہاں چھوڑ گئے تھے۔ ہم اپنے مکان کی چھت پر کھڑے تھے اور چاروں طرف لرزہ خیز چیخیں اٹھ رہی تھیں۔ جیسے ہی کوئی بچہ یا آدمی ہمارے گھر کی طرف پناہ لینے کے لیے بڑھتا، ظالم اسے برچھیوں اور بلموں سے ہلاک کر دیتے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو نیزے کی نوک میں پرو کرنا چتے تھے۔ نیزے ان معصوموں کے خون سے رنگین ہو جاتے۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ جاتا تھا اور میں دل ہی دل میں اپنی بزدلی پر لعنت بھیج رہا تھا۔ پھر خیال آتا کہ میں چپ رہنے کے سوا کر بھی کیا سکتا ہوں۔

جب مسلمانوں کا اچھی طرح صفایا ہو چکا، تو ہندو پولیس کی مسلح گارڈ ہمارے گھر آئی اور سید عنایت حسین اور دوسرے دو پولیس والوں سے مخاطب ہو کر انھوں نے کہا: ''آپ صرف اپنے آدمی اس گھر سے نکال لیں، کوئی دوسرا آدمی آپ کے ساتھ نہ ہو۔ ہم آپ کو محفوظ مقام پر پہنچا دیتے ہیں، لیکن اس بات کا خیال رہے کہ کوئی دوسرا آدمی نکلنے نہ پائے، ورنہ آپ اپنی بھی خیر نہ سمجھیں۔''

میں آج تک وہ منظر کسی نہیں بھول سکا جب ہم اس گھر سے نکل رہے تھے اور چھوٹے چھوٹے بچے، گھبرائی ہوئی عورتیں اور چند ہراساں مرد ہمیں حسرت سے الوداع کہہ رہے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ جیسے ہی ہم لوگ گھر سے نکلیں گے، ظالم ہندو گھر میں گھس کر ان کا خاتمہ کر دیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ ادھر ہم گھر سے نکلے، ادھر قاتلوں کی منتظر ٹولی ان پر بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑی۔ معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کی چیخیں دور تک ہمارا پیچھا کرتی رہیں۔

ہم دو دن تک ڈبوالی کے تھانے میں پڑے رہے۔ ۱۷ اگست کی شام ایک پولیس آفیسر کی مدد سے موٹر کے ذریعے حصار پہنچے۔ والدہ مجھے صحیح سلامت دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ میری بیوی خدیجہ نے بھی اپنی خاص مسکراہٹ سے میرا خیر مقدم کیا۔ ہم نے حصار میں ریلوے اسٹیشن کے پاس محلہ جوتی پورہ میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس محلے میں ایک دو گھروں کو چھوڑ کر باقی تمام آبادی ہندوؤں کی تھی، لیکن تعلیم یافتہ لوگ مثلاً وکلا، فوجی افسر، انجینیر وغیرہ زیادہ تھے، اس لیے حالات مخدوش ہونے کے باوجود ہم اسی گھر میں ٹھہرے رہے۔ پندرہ بیس عزیز تو میرے ساتھ ڈبوالی ہی سے آئے تھے۔ اگلے روز دوپہر کو میری خالہ کا گھرانا بھی آ گیا۔ یہ گھرانا کل چھ افراد پر مشتمل تھا۔ خالہ، خالو اور ان کا ایک بیٹا، ایک بیٹی۔ ایک میری خالہ کی بھتیجی اور ایک ان کی ملازمہ...... میرے خالو سید صغیر حسین پولیس میں سب انسپکٹر تھے۔ انہیں باہر تھانے سے پولیس لائن میں بلا لیا گیا تھا۔ خالہ نے کہیں سے یہ سن لیا تھا کہ میں ڈبوالی منڈی کے فسادات میں مارا گیا ہوں۔ مجھے دیکھ کر وہ بے انتہا خوش ہوئیں۔ خالہ زاد بھائی

ظہیر، جو میرے بچپن کے دوست بھی تھے اور خالہ زاد بہن، نفیس بانو کی خوشی کی بھی انتہا نہ تھی۔ میری ماموں زاد بہن حسنہ نہایت خاموش طبع تھی، لیکن اس کی خاموشی سے بھی اس غیر متوقع مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں تیس پینتیس افراد جمع ہو گئے تھے۔ ۲۹ اگست کی صبح ہی سے حالات خراب نظر آ رہے تھے، لیکن مشکل یہ تھی کہ کسی کے گھر اتنے زیادہ افراد کیسے جا دھمکیں۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے کوئی مکان کرائے پر لیں اور پھر وہاں جایا جائے۔ ہمارے قریب کے ایک دو مسلم گھرانے پہلے ہی سے شہر جا چکے تھے۔ تین بجے کے قریب حصار کے مشہور بیرسٹر جلال الدین قریشی پر ان کی کوٹھی میں گولی چلائی گئی، مگر وہ بال بال بچ گئے۔ فوراً کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ ہمارے گھر میں پانی ختم ہو چکا تھا۔ میرا حقیقی بھائی اظفر حسین اور خالہ زاد بھائی ظہیر کہنے لگے کہ ہم کنوئیں سے پانی لے آتے ہیں۔ کنواں ہمارے مکان کے پچھواڑے میں تھا اور وہاں کچھ اجنبی ہندو آئے ہوئے تھے۔ میں نے مشورہ دیا کہ فی الحال پانی لانا خطرے سے خالی نہیں، اس لیے یہ ارادہ ترک کر دیا جائے، تو بہتر ہے۔ ظہیر اور اظفر میرا مذاق اڑانے لگے۔ ''مشکور بھائی بزدل ہیں...... ہندوؤں سے ڈرتے ہیں، ہم پانی ضرور لے کر آئیں گے، ہم سے چھوٹے بھائیوں کی پیاس نہیں دیکھی جاتی۔'' یہ دونوں جوان پانی کے لیے گئے اور چند لمحوں بعد ہی ان کی چیخ پکار سنائی دی۔ خالو صغیر حسین پہلے ہی سے وردی پہنے بیٹھے تھے، پستول ہاتھ میں لے کر ان کی مدد کو گئے اور جلد ہی چھڑا کر لے آئے۔ اظفر کا سر زخمی ہو چکا تھا اور ظہیر اپنا بازو سنبھالے آ رہا تھا۔ ہندو ہمارے گھر کی چھتوں پر چڑھ آئے تھے اور آگ لگانا چاہتے تھے۔ خالو صغیر نے مجھ سے کہا کہ میں بندوق کا ایک ہوائی فائر کر دوں تا کہ پولیس ہماری مدد کو آ جائے۔ فائر کی آواز سنتے ہی پولیس والے آ تو گئے، لیکن برابر والے دو منزلہ مکان پر چڑھ کر ہماری ہی گھر پر گولیاں برسانے لگے۔ خالو صغیر حسین مسلسل چلا رہے تھے: ''پولیس، میں صغیر حسین سب انسپکٹر بول رہا ہوں، میرے گھر پر کیوں گولی چلا رہے ہو۔ ہمارا کوئی قصور نہیں۔'' گولیوں کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ ادھر ظہیر اور اظفر کے زخموں سے بری طرح خون بہہ رہا تھا۔ نفیس بانو نے مجھ سے کہا: مشکور بھائی، باہر سماوار میں تھوڑا سا پانی ہے، اگر وہ آ جائے، تو میں ان لوگوں کے پٹی باندھ دوں۔'' میں سوچ رہا تھا باہر صحن میں سے پانی کیسے لایا جائے۔ گولیوں کی لگاتار بارش ہو رہی ہے۔ نفیس بانو مجھے تذبذب میں دیکھ کر بھانپ گئی کہ میں باہر جانے سے کترا رہا ہوں، چنانچہ کچھ کہے بغیر وہ اٹھی اور گولیوں کی بارش میں سماوار اٹھا لائی۔ جیسے ہی وہ برآمدے میں داخل ہوئی، ایک گولی سماوار پر آ کر لگی۔ میں اپنی بزدلی پر سخت نادم تھا۔ اظفر اور ظہیر خون بہہ جانے سے خاصے نڈھال ہو گئے تھے۔ نفیس بانو ان دونوں بھائیوں کی پٹی کرتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی: ''واہ بھئی واہ، آپ اچھے جوان ہیں، ایک ایک زخم کھا کر نڈھال ہوئے جا رہے ہیں۔ ہم نے آزادی حاصل کی ہے، آخر اس کی کوئی قیمت بھی تو ادا کرنی چاہیے...... اور وہ بھی حوصلے کے ساتھ۔'' میں نے دیکھا کہ نفیس بانو کے ان الفاظ نے دونوں زخمیوں کو خاصا ہوشیار کر دیا تھا۔ نفس بانو ان چند پڑھی لکھی لڑکیوں میں سے ایک تھی جو مغربی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اپنی مشرقی روایات کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں اور وقت پڑے، تو ہر کڑی سے کڑی مصیبت خندہ پیشانی اور بے جگری سے جھیل جاتی ہیں۔

پولیس کی مدد سے بلوائی ہمارے گھر کی چھتوں کو کھود کر آگ لگا رہے تھے۔ اب ہم سب کے سب برآمدے میں آ گئے۔ دھوئیں سے ہمارا دم گھٹا جا رہا تھا۔ کمروں کے بعد جب برآمدے کی چھت کو کھودا جانے لگا، تو ظہیر یکا یک اٹھ کر باہر صحن میں آ گیا۔ اس کا صحن میں آنا تھا کہ ایک گولی اس کے چوڑے چکلے سینے کے وسط میں آ کر لگی۔ میں نے دیکھا کہ میرا خالہ زاد بھائی عجیب انداز سے سینہ پکڑے بل کھاتے ہوئے زمین پر گر رہا ہے۔

نفیس بانو چیختی ہوئی نکلی: ’’بھیا میرے پیارے بھیا۔‘‘ اس نے اپنے بھائی کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ ظہیر اپنی بہن سے کہہ رہا تھا: ’’نفیس، تمہارا کیا بنے گا...... یہ ظالم...... یہ ظالم...... تمہاری عصمت......‘‘ نفیس بانو نے نہایت اطمینان اور خوداعتمادی سے جواب دیا:

’’بھیا، آپ اطمینان سے خدا کے حضور میں جائیں۔ اس سے قبل کہ کوئی میری طرف اپنے ناپاک ہاتھ اٹھائے، میں اپنا خاتمہ کر چکی ہوں گی۔‘‘ بہن کے یہ الفاظ سن کر ظہیر نے صرف ’’اچھا‘‘ کہا اور پھر ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ میں سمجھتا ہوں جس طرح ظہیر نے اطمینان کے ساتھ جان دی، اس طرح شاید ہی کوئی داعی اجل کو لبیک کہتا ہے۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نہ تھے۔ نفیس بانو کے ساتھ ہی میری خالہ بھی باہر نکل آئی تھیں، لیکن اپنے کڑیل جوان بیٹے کی لاش پر بین کرنے کے بجائے وہ بار بار ہندو سپاہیوں کو مخاطب کر کے یہی فریاد کرتی رہیں:

’’اے بھائیو، جہاں تم نے میرے لال کا خاتمہ کیا ہے، وہاں مجھے بھی گولی مار کر ختم کر دو...... اے بھائیو، خدا تمہارا بھلا کرے...... کیوں دیر کر رہے ہو...... اس وقت مجھ دکھیاری پر یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا......‘‘ خالو صغیر حسین برآمدے میں میرے پاس چپ چاپ کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کسی گہری سوچ میں کھوئے ہوئے ہیں۔ حسنہ کی شادی ظہیر سے چند ہی روز بعد ہونے والی تھی۔ خالو صغیر اچانک سوچ سے بیدار ہوئے جیسے انہوں کوئی فیصلہ کر لیا ہو اور پھر حسنہ کو سینے سے لگا کر کہنے لگے:

’’میری بیٹی، میری حسنہ، میرے گھر کی رونق، چلو، ظہیر کے پاس چلو، میں آخری بار تمہیں دلہن بنا لوں۔‘‘

حسنہ خاموشی سے ظہیر کی لاش کے قریب آئی اور خالو صغیر نے اس پر پستول کا فائر کر دیا۔ گولی اس کی دائیں کنپٹی پر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ گولی لگنے سے خون کی ایک لکیر اس کے ماتھے پر تیر گئی۔ خالو صغیر مجھ سے کہنے لگے: ’’دیکھا مشکور، حسینہ میری بیٹی کے سر پر پھولوں کی لڑی بندھ گئی ہے، وہ دلہن بن رہی ہے۔ لو بھئی، میں ایک بڑے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔‘‘ حسنہ کے بعد نفیس بانو نے سینہ تان دیا۔ خالو صغیر نے اس پر لگاتار تین فائر کیے، لیکن نفیس بانو اب بھی اس طرح سینہ تانے بیٹھی تھی۔ اس نے صرف اس قدر کہا:

’’پیارے ابا، ذرا ہمت سے کام لیجیے، آپ کے تمام فائر میرے بازوؤں پر لگے ہیں، نشانہ باندھ کر ایک فائر میرے سینے یا سر پر کر دیجیے تاکہ میرا خاتمہ جلدی ہو۔‘‘

خالو نے پستول دوبارہ بھرا۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے تمام گولیاں چلائیں۔ نفیس بانو زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی اور کہہ رہی تھی: ’’ابا، آپ نے میرا تمام جسم چھلنی کر دیا ہے، لیکن ایک گولی بھی ایسی جگہ نہ لگی کہ میں ختم ہو جاتی۔‘‘

خالو صغیر نے فریاد کرتے ہوئے جواب دیا۔ ’’کیا کروں بیٹی، مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ معاف کر دو میری لال...... میں آخری وقت بھی تمہارے کام نہ آ سکا۔‘‘ اس کے بعد خالو مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

’’مشکور بیٹا، تم ہی میری کچھ مدد کرو۔ یہ لو پستول اور نفیس بانو کا خاتمہ کر دو۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’خالو، مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔‘‘ انہوں نے کہا۔ ’’اچھا بیٹا، تمہاری مرضی۔‘‘

اگرچہ خالو کے پستول سے خالہ بھی زخمی ہو چکی تھیں: تاہم وہ ابھی تک ہندو سپاہیوں سے یہ کہے جا رہی تھیں: ’’اے بھائیو، تم نے میرے

لال کو مار ڈالا، مجھ پر بھی ایک گولی چلا دو۔'' اتنے میں پولیس کی طرف سے کسی نے کہا۔ '' اگر تم لوگ اپنا پستول اور بندوق ہمیں دے دو، تو ہم تمہیں کچھ نہ کہیں گے اور تمہاری جانیں بچ جائیں گی۔''

خالہ یہ آواز سن کر ایک دم میری والدہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں: '' بانو میرا گھرانا تو تباہ ہو گیا۔ تو ہی اپنے بچوں کو بچا لے، ان سے کہہ دے ہم اسلحہ واپس کرتے ہیں۔'' اسی اثنا میں خالو صغیر پستول میرے حوالے کر کے نہایت ملتجیانہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔ '' مشکور بیٹا، انکار نہ کرنا، بس ایک گولی میرے سینے کے پار کر دو، دیکھو میرے بیٹے، یہ آخری التجا ہے۔''

میں نے کہا: '' خالو ابا، میں یہ کیسے کر سکتا ہوں، یقین کیجیے مجھ میں قطعی ہمت نہیں ہے۔'' میرے یہ الفاظ سن کر خالو نے ایک لمبا سانس لیا اور کہنے لگے۔ '' اچھا بیٹا، تمہاری مرضی، تو پھر یہ پستول اور بندوق ان لوگوں کے حوالے کر دو۔ شاید تم لوگوں کی جانیں بچ جائیں۔ مجھے تو یہ لوگ پھر بھی نہیں چھوڑیں گے۔'' میں نے کہا۔ '' یہ لوگ ہمیں دھوکا دے رہے ہیں، چھوڑیں گے کسی کو بھی نہیں۔''

'' پھر بھی تم بندوق اور پستول انہیں دے آؤ۔'' خالو نے جواب دیا۔

'' میں سمجھتا ہوں اس سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔'' میں نے پھر کہا۔

'' میں جو کہتا ہوں، اسلحہ ان لوگوں کے سپرد کر دو۔'' خالو ذرا سخت لہجے میں بولے۔

'' کون دے کر آئے۔'' میں نے اپنی کمزوری کا صاف صاف اظہار کر دیا۔

'' تم سخت بزدل ہو۔'' خالو نے ناراض ہوتے ہوئے کہا اور مرحوم کی یہ آخری ناراضی تھی۔

ہماری گفتگو سن کر میرے چھوٹے بھائی اظفر نے جواب دیا:

'' لائیے خالو ابا، میں اسلحہ ان لوگوں کو دے آتا ہوں۔'' میری والدہ نے اسی اثنا میں ہندو سپاہیوں سے قسمیں لیں کہ وہ اسلحہ لینے کے بعد ہمیں کچھ نہ کہیں گے۔ اظفر بندوق اور پستول لے کر باہر گیا، لیکن چند ثانیے بعد ہی ہمیں اظفر کی آواز سنائی دی: '' دیکھو، تم لوگ وعدہ خلافی کر رہے ہو۔'' اور پھر یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ فائر کی آواز سنتے ہی میری والدہ بے قرار ہو کر دوڑیں۔ '' ارے ظالموں نے میرے بچے کو مار ڈالا۔'' جب میں والدہ کے پیچھے چلنے کو تیار ہوا، تو خدیجہ نے مجھ سے پوچھا: '' فرمایئے، میرے لیے کیا حکم ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ '' تم بھی باہر چلو......'' میری سوا سالہ بچی مسرور بانو اس وقت اس کی گود میں تھی، میں ظہیر کی لاش کے قریب آیا اور دروازے سے باہر دیکھا کہ بلوائی نیزے برچھیاں لیے ہمارے گھر سے نکلنے والوں پر حملہ کر رہے ہیں، میں اپنی دانست میں عقل مندی سے کام لیتے ہوئے وہیں ظہیر کی لاش کے قریب لیٹ گیا: البتہ اس وقت مجھے ایک دھماکا ضرور سنائی دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ مجھ پر فائر کیا گیا تھا۔ میں اس سے زخمی بھی ہوا، لیکن اس وقت مجھے گولی کے زخم کا ذرا سا بھی احساس نہ ہوا اور میں یہی سمجھا کہ ہوشیاری سے اپنی جان بچا رہا ہوں۔ میں زمین پر ظہیر اور نفیس بانو کے خون میں ڈوبا ہوا پڑا تھا اور سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ خالہ ابھی تک پکارے جا رہی تھیں:

'' اے بھائیو، ایک گولی میرے سینے میں بھی مار دو، میرا لال کیا کہتا ہوگا کہ ماں نے اس کے ساتھ آنے میں اتنی دیر کر دی۔'' چھت پر

چڑھے ہوئے، بلوائی ہم پر اینٹ پتھر اور کانچ کی ٹوٹی ہوئی بوتلیں برسا رہے تھے۔ اتنے میں مجھے محسوس ہوا کہ کوئی ٹھنڈی چیز ہم پر پھینکی جا رہی ہے۔ چند ثانیے بعد ہمارے جسموں میں آگ لگ گئی۔ خالہ نے اللہ کے حضور ایک دم احتجاج کیا: ''یا اللہ! اب ہم کافروں کی طرح جلائے بھی جائیں گے۔'' دیر سے نفیس بانو کی کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ میں نے سمجھا وہ مر چکی ہے، لیکن آگ لگتے ہی اس کے لبوں پر آیت جاری ہو گئی۔ یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ گھر اور لاشوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ مجھے لمحہ بھر کے لیے خیال آیا یہ سب کچھ حقیقت نہیں، بلکہ خواب ہے، لیکن خالو صغیر کے بلند نعرۂ تکبیر نے مجھے چونکا دیا۔ وہ جیسے ہی باہر نکلے ان پر پے در پے تھری ناٹ تھری کے تین چار فائر ہوئے، وہ ہر گولی پر ''اللہ اکبر'' کہہ رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا:

''مشکور، تم خواب تو نہیں دیکھ رہے، یہ سب کچھ حقیقت ہے۔'' میں سخت جان ان تمام ہولناک واقعات سے کس طرح زندہ بچ کر نکل آیا، یہ کسی اور وقت کے لیے چھوڑتا ہوں...... آج اس بیان کو یہیں تک رہنے دیجیے اور میرا شعر سن کر مجھے اجازت دیجیے جو میں نے پاکستان آ کر کہا تھا

مجھے ہے جان سے پیاری یہ صبح جس کے لیے
بہا ہے میرے ستاروں کی انجمن کا لہو

(مشکور حسین اردو ڈائجسٹ اگست 1967ء)

اردو ادب کے مشہور افسانے

کتاب **اردو ادب کے مشہور افسانے** بھی کتاب گھر پر دستیاب ہے جس میں درج ذیل افسانے شامل ہیں۔ (آخری آدمی، پسماندگان، انتظار حسین)؛ (آپا، ممتاز مفتی)؛ (آنندی، غلام عباس)؛ (اپنے دُکھ مجھے دے دو، وہ بڈھا، راجندر سنگھ بیدی)؛ (بلاؤز، کالی شلوار، سعادت حسن منٹو)؛ (عیدگاہ، کفن، شکوہ شکایت، منشی پریم چند)؛ (گڈریا، اشفاق احمد)؛ (توبہ شکن، بانو قدسیہ)، (گنڈاسا، احمد ندیم قاسمی)؛ (حرام جادی، محمد حسن عسکری)؛ (جینی، شفیق الرحمٰن)؛ (لحاف، عصمت چغتائی)؛ (لوہے کا کمربند، رام لعل)؛ (ماں جی، قدرت اللہ شہاب)؛ (مٹی کی مونا لیزا، اے۔ حمید)؛ (اوورکوٹ، غلام عبّاس)؛ (مہالکشمی کا پُل، کرشن چندر)؛ (ٹیلی گرام، جوگندر پال)؛ (تیسرا آدمی، شوکت صدیقی) اور (ستاروں سے آگے، قراۃ العین حیدر)۔

یہ کتاب **افسانے** سیکشن میں پڑھی جا سکتی ہے۔

وہ جو کٹ گئے تیری راہ میں

پاکستان کی خاطر خاک وخون سے لوٹنے والوں کی زہرہ گداز داستان جو میری بزرگ نے بیان کی ہے

حلیمہ سعدیہ

’’آج میری زندگی کا ایک سال اور بیت گیا۔‘‘ اپنی ڈائری میں یہ جملہ لکھتے ہوئے میں ماضی کی تلخ اور حسین یادوں میں الجھ کر رہ گیا۔ پھر اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کسی نے مجھ ان الجھنوں سے آزاد کرا دیا ہو۔ یہ میری تین سالہ پوتی نمرہ تھی جو باہر کچھ دکھانے کے لیے دروازے میں کھڑی بار بار مجھے پکار رہی تھی۔ میں اس کا ہاتھ تھام کر باہر لان میں آ گیا جہاں گھر کے تمام بچے اور بڑے پاکستانی پرچم اور چھوٹی چھوٹی جھنڈیوں سے لان سجا رہے تھے‘ مگر جو چیز نمرہ مجھے بڑی بے تابی سے دکھانا چاہ رہی تھی وہ چھت پر لہراتا پاکستانی پرچم تھا۔ وہ اپنے ننھے سے ہاتھ کے ساتھ بار بار پرچم کی طرف اشارہ کرتی تھی‘ لیکن جیسے ہی میری نظر اس لہراتے پرچم پر پڑی میں پھر انہی یادوں میں الجھ گیا جن سے کچھ دیر پہلے نمرہ نے مجھے آزاد کرایا تھا۔ اس پرچم کی طرح ان یادوں کے سائے بھی میرے ذہن میں لہرانے لگے۔

میرا نام امیر علی ہے‘ مگر اب مجھے سیٹھ امیر علی کہتے ہیں۔ یہاں لاہور میں‘ میں اور میرے بچے خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں‘ لیکن میری زندگی کا سفر یہیں سے شروع نہیں ہوا۔ اس کٹھن سفر کا آغاز آج سے ۷۹ سال پہلے امرتسر سے ہوا تھا جو لاہور پہنچ کر ختم ہوا۔

یہ 26-1925ء کا زمانہ تھا‘ میں امرتسر کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا جہاں میرے آباؤاجداد مدت سے آباد تھے۔ چھوٹے چچا محسن کے سوا باقی سارا خاندان اسی گاؤں میں رہائش پذیر تھا جبکہ چچا محسن علی گڑھ کے ایک مدرسے میں پڑھاتے تھے۔ میری والدہ کا خاندان دہلی میں مقیم تھا۔ والد صاحب کا انتقال اس وقت ہو گیا جب میں صرف دو سال کا تھا۔ میں چاروں بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ مجھ سے بڑی ایک بہن آمنہ دو بڑے بھائی اختر اور شکیل تھے۔

میری عمر اس وقت آٹھ نو سال تھی جب میں اور میرا ہندو دوست رام داس عرف رامو اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ رامو کو پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہ تھی‘ وہ سارا دن کھیل کود کر گزار دیتا یا کبھی کبھار مندر جا کر اپنے بھگوان کا نظارہ کر لیا کرتا تھا‘ لیکن وہ بھی اس وقت جب اسے اپنی شرارتوں کی وجہ سے گھر والوں سے ڈانٹ پڑنے کا ڈر ہوتا۔ رامو کی شرارتیں اس وقت عروج پر ہوتیں جب گاؤں میں کوئی خاص تہوار منایا جاتا۔

اماں بی کی خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر شہر میں کلرک لگ جاؤں اس دور میں کلرک کو بھی شہنشاہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۲۹ء میں چچا محسن علی گاؤں آئے تو اماں بی نے مجھے بھی ان کے ساتھ علی گڑھ بھجوا دیا۔ چچا نے مجھے ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ علی گڑھ میں ایک بات مجھے عجیب

لگی وہ یہ ہے کہ میں جب کبھی چچا محسن کے سامنے رام داس اور اس کے گھر والوں کا ذکر کرتا تو وہ چڑنے لگتے۔ پھر علی گڑھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے آپس میں تعلقات نہ تھے جیسے ہمارے گاؤں میں تھے۔ شروع شروع میں تو میں اس کشیدگی کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی۔ اور ۱۹۳۰ء میں علامہ محمد اقبال کے خطبہ آلہ آباد نے مجھ پر یہ بات واضح کر دی کہ مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں۔ دراصل محسن چچا کا تعلق مسلمانوں کی جماعت مسلم لیگ سے تھا، وہ ہندوؤں کی ذہنیت کو مجھ سے بہتر جانتے تھے۔

چند سال بعد میں چچا کے ہمراہ واپس گاؤں آیا تو وہاں کے حالات بھی کشیدہ محسوس ہوئے اور اس بات کا احساس مجھے اس وقت اور شدت سے ہوا جب میرے بچپن کے پیارے دوست رامو نے مجھے امیر علی کے بجائے ”امیر مسلا“ کہہ کر پکارا۔ ایک شام میں نماز مغرب ادا کر کے مسجد سے واپس گھر آ رہا تھا، راستے میں مدرسے کے قریب پہنچا، رام داس نے مجھے دیکھ کر طنزیہ لہجے میں کہا: ”کیا حال چال ہے امیر مسلا صاحب؟“

میں تو ٹھیک ہوں رامو! تم سناؤ آج کل کیا کر رہے ہو؟“ میں نے کہا اگرچہ مجھے رام داس کے لہجے سے اس کی دلی نفرت کا احساس ہو گیا تھا۔

”کل کی تو بھگوان جانے، مگر آج میں اپنی دھرتی ماتا کو تم مسلموں سے پاک کر رہا ہوں۔“ رام داس نے طیش میں کہا۔ اسی اثنا میں ایک ہندو لڑکا آگے بڑھا اور میرا گریبان پکڑ کر درشت لہجے میں بولا: ارے مسلے! تم لوگوں کے لیے یہاں کیا رکھا ہے، جاؤ نکلو یہاں سے، کیوں ہماری ”دھرتی ماتا“ کو گندا کرتے ہو؟“

اگر بڑے تایا اور چچا گل زمان وہاں نہ آتے تو شاید گاؤں میں ہندو مسلم فسادات کا باقاعدہ آغاز ہو جاتا۔ یاد رہے گل زمان گاؤں کے چوکیدار تھے جنہیں ہم احترام سے چچا کہتے تھے۔

اس واقعے نے میرے ذہن پر شدت سے اثر کیا اور ہندو ذہنیت کھل کر میرے سامنے آ گئی کہ یہ قوم کبھی کسی کی دوست نہیں بن سکتی۔ اماں بی نے اس خیال سے کہیں جھگڑا مزید نہ بڑھ جائے مجھے چچا کے ساتھ واپس علی گڑھ بھیج دیا۔

میں اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا اور چچا محسن علی کے ساتھ تحریک پاکستان کے جلسوں میں بھی جاتا تھا، لیکن ساتھ ساتھ ملازمت کی تلاش بھی جاری رکھے ہوئے تھا، چنانچہ ۱۹۴۵ء میں مجھے ایک ادارے میں نوکری مل گئی مگر یہ ملازمت ایک ماہ سے زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ دراصل اس ادارے میں ہندو چھائے ہوئے تھے جن کے سخت معاندانہ رویے کے باعث میں استعفا دینے پر مجبور ہو گیا۔

یہ وہ دن تھے جب پورے ہندوستان میں تحریک پاکستان زوروں پر تھی اور حالات سنگین ہوتے جا رہے تھے۔ مخدوش حالات کے پیش نظر اماں بی نے مجھے اور چچا محسن کو گاؤں واپس بلا لیا۔ چند ہفتے بعد چچا محسن کو اپنے ایک دوست کے ساتھ دہلی جانا پڑ گیا۔ انہیں گئے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے، ہم سب کو بڑی تشویش تھی کہ اتنے دنوں سے علی گڑھ سے چچا محسن، واپس آئے ہیں یا نہیں۔ اماں بی نے مجھے بھی علی گڑھ جانے سے روک دیا کیونکہ ملک میں کئی جگہ ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے تھے انتہائی تشویش ناک خبریں آ رہی تھیں۔

آخر کار ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب قیام پاکستان کا اعلان کر دیا گیا جسے مسلمانوں نے مسرت و انبساط کے ساتھ سنا مگر ہندوؤں اور سکھوں کے دلوں میں نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی، اسی لیے مسلمان اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ اماں بی نے ہمیں بلوائیوں کے ڈر

سے باہر جانے سے منع کر دیا تھا۔ لیکن جب اچانک گاؤں سے دردناک چیخوں کی آواز سنائی دی تو اماں کے روکنے کے باوجود میں اور اختر بھائی تیزی سے باہر آئے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک دردناک منظر تھا۔ ہندو اور سکھ بلوائی مسلمان لڑکیوں اور عورتوں کو بالوں سے گھسیٹ کر باہر لا رہے تھے۔ مسلمان مردوں کو وحشیانہ انداز میں قتل کیا جا رہا تھا' ان کے گھر نذر آتش کیے جا رہے تھے ماؤں کے سامنے ان کے معصوم اور کم سن بچوں کو سنگینوں میں پرو دیا گیا تھا۔ ایک مسلمان لڑکی کو ان درندوں کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے میں جیسے ہی آگے بڑھا اور ایک سنگین کی تیز نوک میرا بازو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ ایک بلوائی نے پیچھے سے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ اختر بھائی مجھے بچانے کے لیے آگے بڑھے تو اسی بلوائی نے وہی سنگین ان کے سینے میں گھونپ دی۔ میرے پیارے بھائی نے تڑپ تڑپ کر جان آفرین کے سپرد کر دی۔ جس مسلمان لڑکی کو بلوائیوں سے بچانا چاہتا تھا وہ بھی اس دنیا سے جا چکی تھی اور اس کی نعش ایسی حالت میں پڑی تھی کہ میں زیادہ دیر تک اسے نہ دیکھ سکا۔

اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ اس دوران میرے اپنے گھر پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔

یہ خیال آتے ہی میں اختر بھائی کی لاش وہیں چھوڑ کر گھر کی طرف دوڑا لیکن وہاں پہنچا تو اسے مکمل طور پر شعلوں کی لپیٹ میں پایا۔ شکیل بھیا' ان کا بیٹا' دونوں بھاوجیں اور اماں بی کہاں گئے؟ وہ گھر کے اندر شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے تھے یا گھر چھوڑ کر چلے گئے یا بلوائیوں نے انہیں بھی اپنے ظلم کا شکار بنا دیا؟ میں انہی سوچوں میں گم بت بنا کھڑا اپنے جلتے گھر کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس وقت بوکھلایا ہوا تھا۔ اچانک مجھے بڑے تایا کا خیال آیا کہ شاید اماں اور باقی گھر والے ان کے ہاں چلے گئے ہوں' چنانچہ میں تیزی سے ان کے گھر کی طرف بھاگا' لیکن وہاں تایا کی میت کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے اور ساتھ ہی ان کے اکلوتے بیٹے کا سر تن سے جدا کر دیا گیا تھا۔ اور تایا جان کی بہو گھر میں موجود نہ تھی۔ شاید بلوائی اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

گاؤں کے بچے کھچے مسلمان اپنے بچوں کو لیے اسٹیشن کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میں بھی انہی میں شامل ہو گیا۔ خوش قسمتی سے ایک ریل گاڑی وہاں پہنچ گئی' چنانچہ لٹے پٹے مسلمان تیزی سے اس میں سوار ہونے لگے۔ ڈبوں کے دروازے اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند کر لیے گئے جو بدنصیب گاڑی کے اندر یا چھت پر سوار نہ ہو سکے' وہ ظلم سہنے کے لیے وہیں رہ گئے۔ ریل گاڑی لاہور کی طرف روانہ ہوئی لیکن اس منزل تک پہنچتے پہنچتے اس میں سوار مسلمانوں کی تعداد آدھی رہ گئی کیونکہ راستے میں دو مرتبہ بلوائیوں نے ٹرین رکوا کر حملہ کر دیا تھا۔

گاڑی پر سوار ہونے کے کچھ دیر بعد میں بے ہوش ہو گیا تھا کیونکہ سنگین لگنے سے میرا خاصا خون بہہ چکا تھا۔ لاہور پہنچ کر جب ٹرین کے دروازے اور کھڑکیاں کھولے گئے تو ڈبوں کے اندر سے بند خون سیلاب کے مانند باہر نکلا جس میں انسانی جسموں کے ٹکڑے بھی موجود تھے۔ اسٹیشن پر چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ میں اس وقت ہوش میں آ چکا تھا لیکن مجھے اپنا جسم کھوکھلا محسوس ہو رہا تھا۔ اوروں کے ساتھ میں بھی ایک مہاجر کیمپ میں پہنچ گیا جہاں طبی امداد ملی۔

اس وقت نوزائیدہ مملکت پاکستان انتظامی و سیاسی مسائل سے دوچار تھی' لیکن پاکستان کے شہریوں نے حکومت کا بھرپور ساتھ دیا۔ صحت یاب ہونے کے بعد میں ایک دکان پر کام کرنے لگا۔ اس دوران میں لگاتار کئی ہفتوں تک اپنے گھر والوں اور عزیزوں کی تلاش میں لگا رہا کہ شاید وہ بھی پاکستان آ گئے ہوں۔ میں جب سنتا کہ آج ایک اور قافلہ بھارت سے پاکستان آیا ہے تو بھاگتا ہوا اسٹیشن پہنچ جاتا لیکن شاید ان کا اور میرا ملاپ

زندگی میں ممکن نہیں تھا۔

میں نے مختلف اداروں میں ملازمت کے لیے درخواستیں دے رکھی تھیں۔ ایک ادارے نے مجھے ملازمت کے لیے بلایا' اور یہیں سے میری کامیابیوں کا دور شروع ہوا مگر مجھے یہ سب کچھ ادھورا محسوس ہوتا ہے اور میری محرومیاں آج تک ختم نہیں ہو سکیں۔

آج میری آنکھوں سے تشکر کے آنسو رواں تھے۔ رب کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمیں آزاد وطن میں آزادی سے رہنا نصیب ہوا۔ یہ آنسو تمام لوگوں کی یاد میں بھی ہیں جنھوں نے اپنی جانوں اور آبروؤں کا نذرانہ دے کر یہ وطن بنایا اور جو ہم سب سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے اس لہراتے ہوئے سبز و سفید پرچم کے گرد ان معصوم لوگوں نے ایک ہالہ بنا رکھا ہے جو اس آزاد وطن پر نثار ہو گئے۔ ان میں وہ تمام عزیز بھی تھے جو مجھ سے پاکستان آتے ہوئے بچھڑ گئے تھے۔

اچانک پاکستان ٹیلی ویژن پر یہ نغمہ گونج اٹھا' لیکن مجھے اس کے بول اپنے دل کی گہرائیوں سے نکلتے محسوس ہو رہے تھے۔

چاند روشن چمکتا ستارہ رہے
سب سے اونچا یہ جھنڈا ہمارا رہے

(حلیمہ سعدیہ اردو ڈائجسٹ۔ اگست 1996ء)

اردو ادب کے مشہور افسانے ۲

اردو ادب کے مشہور افسانے (جلد دوم) بھی کتاب گھر پر دستیاب ہے جس میں شامل افسانے ہیں:

(کالی بلا شوکت صدیقی)؛ (قیدی، ابراہیم جلیس)؛ (اخروٹ جھاچوہا بھیس، ممتاز مفتی)؛ (سیب کا درخت، بوتل کا جن اے۔ حمید)؛ (فاصلہ، واجدہ تبسم)؛ (ادھا، گلزار)؛ (مجید کا ماضی، پوجا پھڈے باز، سعادت حسن منٹو)؛ (مادرزاد، خواجہ احمد عباس) (بدام رنگی، بلونت سنگھ)؛ (بیہودہ خاوند، کنہیالال کپور)؛ (عجیب قتل، ش۔ م۔ جمیل)؛ (اوپر گوری کا مکان، آغا بابر)؛ (لاٹری، منشی پریم چند)؛ (صاحباں مرزا، علی حیدر ملک)؛ (دل ہی تو ہے، بھنور، گوندنی، غلام عباس)؛ (مولوی مہرباں علی، ابن انشاء) (لیمن جوس، چتر سین)؛ (غیر قانونی مشورہ، لوحِ مزار، موپاساں)؛ (سوتی سالگرہ، اشفاق احمد)؛ (ایک تھی فاختہ، محمد منشا یاد)۔

یہ کتاب افسانے سیکشن میں پڑھی جا سکتی ہے۔

آزادی کی مٹی

ماں بیٹی کی دکھ بھری داستان جنہوں نے پاکستان کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیا اور اس خداداد مملکت سے ٹوٹ کر پیار کیا۔

صغیرہ بانو شیریں

آزادی کا چراغ لہو سے جلایا گیا تھا' یہی لہو جب رنگ لایا تو پاکستان بنا۔ بھرے پرے خاندان لٹ پٹ کر آئے اور صعوبتیں اٹھائیں' اس کے باوجود ان کے چہروں پر ایک خاص چمک ہوتی تھی۔ آزادی کی خاطر انہوں نے قربانی دی' قربانی دیے بغیر وہ کیسے پاکستان آ گئے تھے۔ پاکستان بنے تین مہینے ہوئے تھے' دہلی سے ان کے ہاتھ ایک خط آیا۔ خط فاروقی صاحب کا تھا ایک رسالے کے مدیر تھے۔ اس میں ایک خاتون کے بارے میں لکھا تھا' اس خاتون کو میں کوثر کہوں گی۔ بیس برس کی خوبصورت پڑھی لکھی لڑکی تھی' شادی شدہ اور اوپر تلے دو بچے بھی اللہ نے دیے۔ پاکستان آنے کے لئے لڑکی بھی شہر کے کیمپ میں بچوں اور ماں کے ساتھ چلی آئی۔

کیمپ میں افراتفری کا سماں تھا' ماں بوڑھی تھی۔ لڑکی جمع پونجی' گھر بار' جائیداد چھوڑ کر آنے کا غم' جوان بچی' اس کے چھوٹے چھوٹے بچے' خود سے لاچار' ہاتھ اٹھا کر باری تعالیٰ سے دعا مانگتی کہ اتنی مہلت زندگی کی مل جائے کہ پاکستان کی دہلیز کو سجدہ کر لوں اور آزادی کی مٹی نصیب ہو جائے۔ داماد ضدی اور جاہل تھا۔ تمام عمر کمیوں پر حکومت کی۔ سال بھر میں زمین کی جو آمدنی ہوتی وہ طوائفوں پر لٹا دیتا۔ موت کے ڈر سے بیوی اور ساس کے ساتھ آ گیا تھا ورنہ اپنا عیش آرام چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ کوثر نے افراتفری میں بچوں کے لیے بھنے ہوئے چنے اور مرمرے تھیلے میں رکھ لیے تھے' وہ کہاں تک چلتے۔ ایک بڑا سا توا کیمپ کے آخری کونے میں لگا تھا' عورتیں آٹا گوندھ کر لے جاتیں اور روٹیاں پکا لاتیں۔ نمکین سوکھی روٹی پانی کے ساتھ کھا لی جاتی۔ کوثر کے ہاتھ میں بارہ چوڑیاں تھیں اور چار انگوٹھیاں۔ میاں سے چوری اس نے ایک انگوٹھی دے کر آٹا لیا۔ اس میں مٹھی بھر نمک ڈلوایا۔ چھٹانک بھر گھی کاغذ میں لے کر آئی۔ مٹی کی کنالی مانگ کر آٹا گوندھا اور دس بارہ روٹیاں پکا' چیڑ کے لیے آئی۔ بچے صبح سے بھوکے تھے' انہیں کھلایا' میاں کو کھانا دیا۔ اتنے میں ان کے محلے کے دو آدمی کیمپ میں پوچھتے پاچھتے ان کے پاس آئے اور کہنے لگے بلوائیوں کا خطرہ تو ٹل چکا ہے' آ کر گھر بار سنبھالو' ٹرین کے انتظار میں کب تک رہو گے؟ پھر جان کی خیر تو ٹرین میں بھی نہیں۔ آئے دن ریل گاڑی روک کر خون بہایا جاتا ہے۔ آدھے لوگ تو کٹ جاتے ہیں اور آدھوں کا بھی پتہ نہیں پاکستان جاتے جاتے کیا حشر ہو گا۔ ماں باپ کی جائیداد چھوڑ کر جانے کا فائدہ کیا؟ اپنے گھر بیٹھو' روزی رزق تو خدا دینے والا ہے۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شور مچا۔ شام کو ٹرین چلے گی۔ اپنا اپنا سامان باندھ لو۔ راستے کے لیے روٹی پانی ساتھ رکھو۔ لوگ باگ تیاری کرنے لگے۔ کوثر بے چاری خاموش بیٹھی تھی۔ میاں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگے ہم پاکستان نہیں جائیں گے' یہیں رہیں گے۔ کوثر کی ماں بولیں:

''بیٹا! مجھے تو گاڑی پر چڑھا دو' میرا کیا ہے آج مری کل دوسرا دن۔ وہاں کی مٹی مل جائے بہت ہے۔ کفن میرے ساتھ ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ دفنا دے گا۔''

کوثر پریشان تھی کیا کرے۔ میاں کو چھوڑتی ہے تو بچے تمام عمر کے لیے بچھڑ جائیں گے۔ چاہنے والی ماں کو بے یار و مددگار کہاں چھوڑے۔ ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ میاں نے دونوں بچوں کو اٹھا کر کندھوں پر بٹھا لیا۔ گٹھڑی ہاتھ میں پکڑی اور باہر کا رخ کیا۔ ماں نے اٹھ کر کوثر کو پیار کیا۔ کہنے لگی زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی ورنہ حشر کے دن ملیں گے۔

کوثر کا برا حال تھا۔ روتی بلکتی میاں کے پیچھے چلی۔ بار بار مڑ کر ماں کو دیکھتی۔ جان سے عزیز ماں کو چھوڑنا آسان نہ تھا۔ اپنے گھر پہنچی' سارا گھر ویران اور گلیاں سنسان دیکھ کر کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ کس کا کھانا اور کس کا پینا۔ وضو کر کے جانماز بچھائی اور نفل پڑھنے لگی۔ اتنے میں کسی نے مخبری کر دی۔ تین ہندو چھرے لے کر گھر میں گھس آئے۔ شوہر تو پچھلے دروازے سے نکل کر بھاگ گیا۔ کوثر کو ہندوؤں نے پکڑ لیا۔ دھان پان عورت کہاں تک مقابلہ کرتی۔ اس کے کپڑے پھاڑ کر درندہ صفت ہندوؤں نے ہوس کی آگ بجھائی۔ اتنا رحم کیا کہ اس کا زیور نہ اتارا۔ بچے دوسرے کمرے میں چارپائی کے نیچے چھپے بیٹھے تھے۔ ان کی جان بھی بچ گئی۔ شام گئے شوہر گھر آیا۔ کوثر کا حال زار دیکھ کر اس پر رحم کھانے کے بجائے اس نے ڈنڈا اٹھا کر مارنا شروع کر دیا کہ تو مر جاتی' مگر اپنے آپ کو ان کے حوالے نہ کرتی۔

ایک ڈنڈا اس کے سر پر لگا' خون بہا اور وہ بالکل ہی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ موت تو نہیں آئی' مگر دکھوں نے اس کا دماغ سلب کر لیا۔ اگلے دن بچوں نے باپ کے جانے کے بعد اسے پانی پلایا۔ ننھے ننھے ہاتھوں سے پانی کے کٹورے بھر بھر کر اس کا چہرہ صاف کیا۔ کوثر اب صرف بچوں کو تھوڑا بہت پہچان لیتی تھی اور سب کچھ بھول چکی تھی۔ برابر والا گھر خالی تھا۔ خود ہی وہاں جا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ چند روز ایسے ہی گزر گئے۔ محلے کے چند لوگ جو ادھر ادھر چھپے تھے' آئے۔ انسانی ہمدردی کے تحت اس کو کھانا دیا' سب نے مل کر سوچا' اسے کسی طرح پاکستان ماں کے پاس' بھیج دیا جائے کیونکہ شوہر اب اسے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہ تھا۔ مشکل یہ تھی کہ کوثر کو پاکستان کون لے کر جاتا اور کون اس کی ماں کو تلاش کرتا۔

محلے والوں کو بس اتنا علم تھا کہ کوثر کی ماں لاہور میں ہے اور ماڈل ٹاؤن میں کہیں رہتی ہے کیونکہ اس کی خالہ زاد بہن پاکستان بننے سے پہلے وہاں رہتی تھی۔

یہ ساری باتیں فاروقی صاحب نے خط میں لکھ دیں تھیں واضح طور پر سرخ پنسل سے حاشیہ لگا کر تحریر کیا تھا۔ ''کوثر بے ضرر ہے' وہ کسی کو مارتی پیٹتی نہیں' اس کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ کوئی فیملی اگلے ماہ آ ہی ہے' اس کے ساتھ کوثر کو بھیج رہا ہوں۔ شاید یہ ٹھیک ہو جائے اور اپنی ماں سے مل لے۔''

اس وقت زمانہ اچھا تھا' لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ ایک انجان لڑکی کے لیے سب پریشان ہو گئے۔ ہمارا مالی بابا ماڈل ٹاؤن میں جاتا تھا' اس نے وہاں جا کر نوکروں اور مالیوں سے ذکر کیا۔ کوثر کی والدہ کو سب نے تلاش کرنے کا وعدہ کیا۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ کوثر ہمارے گھر آئی تو اس نے ریشمی شلوار قمیض پہنا تھا اور اس کے چہرے پر بے حد معصومیت تھی۔ خوبصورت گھنے

بالوں والی لڑکی کا سب نے خوشی سے خیر مقدم کیا۔ وہ خاموش رہتی۔ کبھی کبھار حضرت امیر خسرو کے دوہے گنگناتی۔ اس کی آواز بھی دلکش تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دو بچوں کی ماں ہے اور اس کے دماغ کی چولیں دکھ نے ہلا دیں ہیں۔ بڑے سلیقے سے کپڑے پہنتی۔ چھوٹے بچوں کو دیکھ کر خوشی سے انہیں اٹھاتی۔ شروع شروع میں تو سب کو ڈر لگا کہیں وہ بچوں کو پٹخ نہ دے۔ پھر محلے والیاں اطمینان سے اپنا بچہ اس کی گود میں دینے لگیں۔

محلے میں ایک ہی بوڑھی خاتون تھیں، بڑی اللہ والی، وہ صبح ہی صبح سورت یاسین کا پانی دم کر کے دے جاتیں۔ کوثر کو خوب پیار کرتیں۔ ایک بزرگ ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے، وہ باقاعدگی سے اسے آ کر دوا کھلاتے۔ ایسا لگتا تھا کہ کوثر محلے کی مہمان ہے۔ سب لوگ اسے دل سے پیار کرتے اسی طرح تین ماہ گزر گئے۔ کوثر آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہی تھی۔ سب کی محبت، شفقت نے اسے اپنا لیا تھا۔ اب وہ اپنے بچوں کے نام بھی بتانے لگی تھی۔

ایک دن مالی بابا تانگے میں ایک بوڑھی خاتون کو لے کر آیا۔ سفید ساڑھی پہنے معزز خاتون اندر آئیں سب نے ان کا استقبال کیا۔ پہلے یہ نہیں پوچھا جاتا تھا آپ کون ہیں، کہاں سے آئی ہیں بلکہ آنے والے مہمان کو بڑی عزت سے بٹھایا جاتا۔ چائے پانی کے بعد بات کی جاتی۔ مالی بابا نے چپکے سے امی کو بتایا، یہ کوثر کی والدہ ہیں۔ آج اتنے دن بعد پتہ چلا تو میں انہیں ساتھ لے آیا ہوں۔ ابھی وہ چائے پی رہی تھیں کہ کوثر برآمدے میں آئی۔

ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹھک گئی۔ کچھ نہیں بولی۔ اس کی آنکھیں جیسے جم کر رہ گئیں۔ بغیر پلک جھپکائے وہ دیکھتی رہی۔ ماں بیقرار ہو کر اٹھی اور جا کر بیٹی سے لپٹ کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد کوثر کو ہوش آیا۔ اور وہ ''اماں'' کہہ کر بری طرح چیخیں مارنے لگی۔ اس کی چیخیں سن کر سارا محلّہ اکٹھا ہوگیا۔ وہ بوڑھے ڈاکٹر بھی آ گئے جو اس کا علاج کر رہے تھے۔ انہوں نے عورتوں کو پرے ہٹایا اور کہنے لگے: ''کوثر کو رونے دو، چیخنے دو۔ اس کی بھڑاس نکل جائے گی اور ٹھیک ہو جائے گی۔ اسی میں اس کی بھلائی ہے۔''

دس پندرہ منٹ تک کوثر چیخیں مارتی رہی، پھر وہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کوئی دوا دی۔ کوثر کو ہوش آیا تو وہ نڈھال ہو چکی تھی۔ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ اسے تمام باتیں یاد آ گئیں تھیں۔

ہمارے گھر میں عورتوں کی بھیڑ لگی تھی۔ وہ سب خوش تھیں۔ اپنے اپنے کام چھوڑ کر آتی تھیں۔ پھر وہ گئیں اور اپنے اپنے گھروں سے مٹھائی، اور بسکٹ لے آئیں۔ ایک دوسرے کا منہ میٹھا کرانے لگیں۔ رات کوثر کی امی ہمارے گھر رہیں۔ اگلے دن ان کو تحفے تحائف دے کر رخصت کیا گیا۔

کوثر چند ہفتے بعد اپنی والدہ کے ساتھ بھارت چلی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے شوہر کو ظلم کی سزا دی تھی۔ اسے فالج ہوگیا تھا۔ اب وہ چل پھر سکتا تھا نہ بول سکتا تھا۔

کوثر نے اپنے بچے سنبھالے اور گھر بار دیکھا بھالا۔ اس کے خط باقاعدگی سے آتے تھے۔ شوہر کی خدمت کی۔ ایک سال بعد اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ کوثر نے مکان جائداد بیچ کر بچوں اور اپنی والدہ کے ساتھ پاکستان کا رخ کیا۔ پاکستان آتے ہی اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ ان کی یہ خواہش بھی پوری ہوگئی کہ پاکستان کی مٹی میں دفن ہوں۔ آزاد وطن کی تمنا رکھنے والی یہ خاتون بڑی عظیم تھیں۔ کوثر بتاتی بھارت میں وہ روزانہ صبح کی نماز پڑھ کر رو رو کر دعا مانگتیں: ''اے باری تعالیٰ تو مجھے اتنی زندگی دے دے کہ میں غلام ملک میں نہ مروں۔ میری مٹی یہاں نہ ہو بلکہ پاکستان میں دفن ہوں۔'' اللہ نے اس کی دعا بھی سن لی۔

کوثر سے آخری ملاقات اس کی والدہ کی وفات کے بعد ہوئی۔ وہ ہم سے ملنے آئی تھی۔ وہ بار بار یہی کہتی میری ماں کی تمنا پوری ہوگئی۔ مرنا تو برحق ہے۔ اگر وہ بھارت میں مر جاتیں تو ساری عمر مجھے قلق رہتا۔ پھر اس نے بتایا کہ بھارت جاتے وقت وہ ایک چھوٹا سا تھیلا مٹی بھر کے لے گئی تھیں کہ اگر میں یہاں مر جاؤں تو پاکستان کی مٹی سب سے پہلے میری قبر پر ڈالنا۔

کوثر اب نجانے کہاں ہوگی۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک نصب العین بنا لیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو اس مقدس وطن کا رکھوالا بنانا چاہتی تھی۔ وہ کہتی تھی اللہ تعالیٰ مجھے اتنی زندگی دے کہ میں دونوں بچوں کو فوجی وردی میں دیکھ کر پیار کرسکوں مجھے کسی چیز کا غم نہیں۔ میں نے قربانی دی ہے اپنی عزت وعصمت کی، اپنے گھر بار کی۔ اب میرا دل چاہتا ہے یہ کہانی کبھی نہ دہرائی جائے جو کوئی اس مقدس سرزمین کی طرف دیکھے اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا جائے۔ میرے بچے جب اپنے وطن کی حفاظت کریں گے تو مرنے کے بعد بھی میری روح کو قرار آجائے گا۔

(اردو ڈائجسٹ، اگست 1996ء)

کاغذی قیامت

ہماری دنیا میں ایک ایسا کاغذ بھی موجود ہے جس کے گرد اس وقت پوری دنیا گھوم رہی ہے۔ اس کاغذ نے پوری دنیا کو پاگل بنا رکھا ہے۔ دیوانہ کر رکھا ہے۔ اس کاغذ کے لئے قتل ہوتے ہیں۔ عزتیں نیلام ہوتی ہیں۔ معصوم بچے دودھ کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں۔ اور یہ کاغذ ہے کرنسی نوٹ...... یہ ایسا کاغذ ہے جس پر حکومت کے اعتماد کی مہر لگی ہے۔ لیکن اگر یہ اعتماد ختم ہوجائے یا کردیا جائے تو پھر کیا ہوگا؟ اس کاغذ کی اہمیت یکلخت ختم ہوجائیگی اور یقین کیجئے پھر کاغذی قیامت برپا ہوجائے گی۔ جی ہاں! کاغذی قیامت......

اور اس بار مجرموں نے اس اعتماد کو ختم کرنے کا مشن اپنا لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کاغذی قیامت پوری دنیا پر برپا ہوگئی۔ اس قیامت نے کیا کیا رخ اختیار کیا۔ پوری دنیا کی حکومتوں اور افراد کا کیا حشر ہوا؟ اسے روکنے کے لئے کیا کیا حربے اختیار کیے گئے۔ کیا مجرم اپنے اس خوفناک مشن میں کامیاب ہوگئے...... یا......؟

اس کہانی کی ہر ہر سطر میں خوفناک ایکشن اور اس کے لفظ لفظ میں اعصاب شکن سسپنس موجود ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جو یقیناً اس سے پہلے صفحہ قرطاس پر نہیں ابھری۔ اس کہانی کا پلاٹ اس قدر منفرد ہے کہ پہلے دنیا بھر کے جاسوسی ادب میں کہیں نظر نہیں آیا۔ عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس نے اس کہانی میں کیا کردار ادا کیا ہے جہاں دنیا بھر کی حکومتیں اور سیکرٹ سروسز خوف ودہشت سے کانپ رہی ہوں جہاں موت کے بھیانک جبڑوں نے دنیا میں بسنے والے ہر فرد کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہو وہاں عمران اور سیکرٹ سروس کے جیالوں نے کیا رنگ دکھائے۔ یہ عمران کی زندگی کا وہ لافانی اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے کہ جس پر آج بھی عمران کو فخر ہے اور کیوں نہ ہو، یہ کارنامہ ہے ہی ایسا......

کاغذی قیامت کتاب گھر کے **جاسوسی ناول سیکشن** میں دیکھا جاسکتا ہے۔

لہو کی پہلی بارِش

گوڑگانوہ سے جنوب کی طرف ایک چھوٹی سی بستی نورنگ پور آباد ہے۔ جس زمانے کی یہ داستان ہے۔ ان دنوں اس کی آبادی کوئی ڈیڑھ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ نورنگ پور سے مغرب کی سمت تقریباً آٹھ کوس کے فاصلے پر فرخ نگر کا مشہور قصبہ ہے۔ ۱۸۵۷ء میں یہ قصبہ ضلع بھر کے مجاہدین آزادی کا مرکز رہا تھا۔ نواب احمد علی خان ان مجاہدین کے سردار تھے۔ نواب کے پرچم تلے علاقے کے سرفروشوں نے پروانہ وار جانیں دیں۔ جنگِ آزادی ناکامی سے دوچار ہوئی، تو نواب اور ان کے ساتھی پھانسیوں پر لٹکا دیے گئے۔ نورنگ پور کے بہادر بھی ان پروانوں کی صف میں شامل تھے۔ اس علاقے میں بلوچوں کی بھاری تعداد آباد تھی۔ فرخ نگر، نورنگ پور، مہنہ اور بادشاہ پور تو انہی کی بستیاں تھیں جن میں فرخ نگر کے بعد نورنگ پور کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

ان بلوچ بستیوں کے گردونواح میں اکثریت ہندوؤں کی تھی جو زیادہ تر بڑھ گوجر اور جاٹ تھے۔ ان کے ساتھ نورنگ پور اور فرخ نگر والوں کی بہت ٹھنتی تھی۔ ہر وقت کشمکش جاری رہتی۔ تصادم اور ٹکراؤ آئے دن رہتا۔ ذرا سی کوئی بات ہوتی طبلِ جنگ بجنے لگتا، برچھیاں اور تلواریں نکل آتیں۔

انگریزوں نے ملک پر قبضہ کیا، تو یہ بڑے پیمانے پر معرکہ آرائیاں تو ختم ہو گئیں! تاہم دونوں قوموں کے درمیان چپقلش پھر بھی جاری رہی اور مقامی سطح پر لڑائی جھگڑے ہوتے رہے۔ کانگرس اور ہندو مہا بھا کی تحریکوں نے ہندوؤں میں زندگی کی نئی رو دوڑا دی۔ اب ان کا رویہ زیادہ جارحانہ ہو گیا۔ ادھر مُسلم لیگ نے مُسلمانوں کو تحریک پاکستان کے پرچم تلے منظّم کیا۔ اس طرح دونوں قومیں پورے سیاسی شعور اور قوت کے ساتھ آمنے سامنے آ کھڑی ہوئیں......اور پھر ایک روز ایک چنگاری بھڑک اٹھی۔

یہ ستمبر ۱۹۴۴ کا ذکر ہے۔ ان دنوں تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ فرخ نگر کی ایک ہندو خاتون نے اسلام قبول کر لیا۔ اُس کا نکاح منا نامی ایک مسلمان کے ساتھ ہو گیا۔ پھر کیا تھا غیظ وغضب کی لہر پوری ہندو آبادی میں دوڑ گئی۔ ہندو آبادیوں میں قاصد شب و روز دوڑنے لگے۔ سازشیں اور ریشہ دوانیاں ہونے لگیں۔ قلعہ فوجدار خاں میں ہندو پنچایت ہوئی جس میں فیصلہ ہوا کہ مسلمانوں کا سوشل بائیکاٹ کیا جائے۔ تجارت ساری ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ دیہات میں چھوٹی بڑی دکانیں اور ساہوکار انہی کے تھے۔ بائیکاٹ کا مطلب تھا کہ انہیں ضروریات زندگی سے محروم کر دیا جائے۔ ہندو کوئی چیز مسلمانوں کے ہاتھ فروخت نہ کرنا ادھر داد تھی نہ فریاد۔ گوڑگانوہ کا ڈپٹی کمشنر کپور سنگھ سخت متعصب اور مسلم دشمن تھا۔ فرخ نگر کا ایس ایچ او عبدالوہاب مسلمان تھا تو انچارج، لیکن تھانے کے محرر مول چند کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ اس نے کسی قسم کی کوئی کاروائی نہ کی۔ پولیس

کے اس طرزِ عمل سے ہندوؤں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ تین دن کے بعد وہ نومسلم خاتون اپنے شوہر کے ساتھ دہلی جا رہی تھی کہ ہندوؤں نے اسے راستے ہی میں اغوا کر لیا۔ کامیابی کے نشے نے انہیں اور سرکش بنا دیا اور وہ فساد پر آمادہ ہو گئے۔ قصبے کی فضا روز بروز بگڑتی چلی گئی۔ تھانے میں نفری کم تھی اور مُول چند کے ہاتھوں میں۔ مسلمانوں نے تھانیدار سے کمک منگوانے کو بار بار کہا' لیکن مُول چند نے ساری کوششیں ناکام بنا دیں۔ عبدالوہاب اس کے اشارہ ابرو پر رقص کر رہا تھا۔ فرخ نگر پر فسادات کے گھٹا ٹوپ بادل چھا گئے۔ آخر خونریز تصادم ہوا۔ چھ مسلمان شہید ہو گئے۔ مسلمانوں کے خون کی یہ پہلی قسط تھی جو اس سرزمین نے وصول کی۔ لیکن یہ تو ابتدا تھی' خون کا سیلاب تو ابھی اُمڈنے کی تیاری کر رہا تھا۔

(۲)

اور پھر جیسے بادل پھٹ پڑے۔ گنگا کے کنارے گڑھ مکتیشر میں ہزاروں ہندو ملک کے گوشے گوشے سے یاترا اور اشنان کے لیے آئے ہوئے تھے۔ صدیوں کے رواج کے مطابق مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد میلہ دیکھنے آئی تھی۔ میلے میں مسلمانوں نے دکانیں بھی لگا رکھی تھیں۔ سازش تو پہلے ہی کی جا چکی تھی۔ میلے ہی میں فساد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ہندو' مسلمان دکانداروں اور تماشائیوں پر پل پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے صفایا کر دیا اور ان کی دکانیں لوٹ لیں۔ اب گڑھ مکتیشر کے مسلمانوں کی باری آئی۔ مرد' عورت بچے اور بوڑھے کا امتیاز کیے بغیر وہ مظالم ڈھائے کہ جن کے تصور سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اکثر مارے گئے اور جو زندہ بچے وہ زخموں سے چور اور مُردوں سے بدتر۔

اس خونیں سانحے کی خبر پھیلی' تو ہندو اکثریت میں گھرے ہوئے مسلمان لرز اٹھے۔ ہندو ہر جگہ تیاری کر رہے تھے۔ جہاں وہ بہت زیادہ اکثریت میں تھے وہاں کھلم کھلا اور جہاں مسلمانوں کی بھی خاصی تعداد تھی وہاں چھپ چھپا کر منصوبے بنائے جا رہے تھے۔

وہ ۲۸/ مارچ ۱۹۴۷ کی خاموش رات تھی۔ دنیا خواب نوشیں کے مزے لے رہی تھی۔ دفعتہً طبلِ جنگ کی گرج سے نورنگ پور جاگ اُٹھا اور خطرے کا الارم بجنے لگا۔ مسلمان جو حالات کے پیش نظر پہلے ہی مدافعانہ جنگ کی منصوبہ بندی کر چکے تھے۔ چشم زدن میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر اپنے اپنے محاذ پر پہنچ گئے۔ لیکن رات بھر کوئی واقعہ رونما نہ ہوا۔ صبح گرد و پیش کے میدانی دیہات میں آدمی دوڑائے۔ پتہ چلا ہندو لاؤ لشکر جمع کر رہے ہیں۔ جو کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتا ہے۔ ادھر سے بھی خاطر خواہ استقبال کی تیاری کر لی گئی۔ گاؤں کی حفاظت کے لیے نوجوانوں کے مختلف گروپ بنا دیے گئے اور ہر گروپ کا ایک سردار مقرر کر دیا گیا۔ اسلحہ اور بارُود ہمارے پاس وافر مقدار میں تھا۔ ہندو' موقع کے منتظر ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ یہاں دال نہ گلتی دیکھ کر انہوں نے حملے کا ہدف بدل دیا۔ نورنگ پور کے بجائے میواتیوں کے گاؤں سکت پور پر چڑھ دوڑے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مختصر سی میو آبادی ٹڈی دل خونخواروں کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ میواتی جان پر کھیل گئے اور ایک ایک کر کے شہید ہو گئے اور دو پہر تک سکت پور فضا میں دھوئیں کے مرغولے اُٹھ رہے تھے۔ زندہ جلنے والی عورتوں اور بچوں کی چیخیں آہستہ آہستہ دم توڑ گئیں۔ اب صرف فضا میں چراند باقی رہ گئی تھی۔

اس عظیم فتح پر ہندوؤں نے زبردست جشن منایا اور پھر چار بجے کے قریب نورنگ پور کے شمالی جانب پڑاؤ ڈال دیا۔ جنگی نقارے کی ہیبت ناک آواز سے دل دہل رہے تھے' مگر ہندو مہابیر آگے قدم اٹھانے سے گریز کر رہے تھے۔ شاید وہ مزید کمک کے منتظر تھے۔ ان کا ایک سوار برق رفتار

گھوڑے پر سوار ہو کر گاؤں کی مغربی سمت میں گیا جہاں ایک بڑا ہجوم لاٹھیاں، بندوقیں اور برچھے لیے کھڑا تھا۔ ان سے کچھ کہا اور واپس آ گیا۔ راستے میں لہلہاتی فصل کو آگ لگا دی۔

نورنگ پور کے مسلمانوں نے میدانِ جنگ کا نقشہ پوری مہارت سے بنایا۔ دائیں بازو پر سرکنڈے اور جھاڑیاں تھیں جہاں سے گھات لگائی جا سکتی تھی۔ دشمن کی ساری توجہ سامنے کی طرف مرکوز تھی۔ چند جانباز بندوقیں لیے جھاڑیوں میں چھپتے چھپاتے دبے پاؤں بڑھے اور اس کے سر پر پہنچ گئے اور یکدم باڑھ ماری۔ اس بلائے ناگہانی سے دشمن لپٹ گیا اُس کا دایاں بازو، کئی لاشیں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ادھر مسلمانوں کا قلب بگولے کی طرح دشمن پر جھپٹا۔ اس دہری مار سے ہندو حواس باختہ ہو گئے اور میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

شمالی محاذ پر حملہ تو پسپا ہو گیا تھا............ مغرب کی طرف سے ابھی خطرہ باقی تھا............ جہاں ایک ہندو کمک لینے گیا تھا۔ ایک دو آدمی اس طرف بھیجے گئے۔ پھر فائر کی آواز گونجی اور تمام گاؤں اس طرف دوڑ پڑا۔ نوجوان مانیسر تک پہنچ گئے، مگر ہندوؤں کے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ جوشیلے نوجوانوں نے مانیسر کو آگ لگانے کا ارادہ کیا۔ مگر بڑے بوڑھوں نے انہیں باز رکھا اور واپس آ گئے۔ غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے گشتی پولیس کا ایک مسلح دستہ بھی نورنگ پور پہنچ گیا، مگر یہ محض رسمی روند تھی۔ دستہ تھوڑی دیر وہاں ٹھہرا اور رخصت ہو گیا۔

۱۸/ مارچ کو میواتیوں اور ہندوؤں کے درمیان صلح نامہ طے ہو گیا تھا، لیکن ہندوؤں نے جلد ہی اسے بالائے طاق رکھ دیا اور گنگانی کے پھول خاں نامی ایک میو کو قتل کر ڈالا۔ اس طرح حالات اور کشیدہ ہو گئے۔ مسلمانوں میں غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ ہندوؤں کو سب سے زیادہ خوف نورنگ پور سے تھا، چنانچہ وہ پنچایت لے کر بار بار آ رہے تھے۔ امن و سلامتی اور بھائی چارے کی زندگی بسر کرنے کی طرف ہاتھ بڑھائے، مگر در پردہ قصبے کی کڑی نظر رکھتے۔

۲/ مئی کی صبح نمودار ہوئی۔ تو فضا میں خطرے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ خبر ملی تھی کہ ہندوؤں نورنگپور پر حملہ آور ہونے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ قصبے کو انہوں نے پہلے ہی ضلعی صدر مقام گوڑ گانوہ سے کاٹ رکھا تھا کھانے پینے کی چیزیں تک نایاب ہو رہی تھیں۔ دو آدمی جان پر کھیل کر گوڑ گانوہ پہنچے اور انگریز ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دی، لیکن وہ علاقے کی ہندو اکثریت کے آگے بے بس تھا، چنانچہ بے نیل مرام واپس آ ئے۔ کھانڈسہ کے ہندوان کے منتظر بیٹھے تھے۔ مگر وہ راستہ بدل کر نورنگ پور پہنچ گئے۔

اس کے بعد حالات بڑی تیزی سے بدلنے لگے۔ ہندوؤں کے غول کے غول برچھوں، تلواروں اور بندوقوں سے مسلح نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی پشت پر ہندو راجا اور افسر تھے۔ پولیس اور فوج کے ہندو جوان بھی ان کے حامی تھے۔ ۴/ مئی کو پولیس نے رنگ پور پر چھاپہ مارا، بچوں اور مردوں کو باہر کھیت میں جمع کر لیا اور اونٹ سوار فوجیوں نے گاؤں کو محاصرے میں لے لیا۔ گاؤں بھر کی تلاشی شروع ہو گئی اور غروب آفتاب تک رہی، مگر بندوق وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا برچھی تک نہ ملی۔ گوڑ گانوہ کے تھانیدار کرپال سنگھ کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ اس کا خیال تھا نورنگ پور میں بڑا اسلحہ ہاتھ آئے گا اور وہ پوری آبادی پر ہاتھ ڈال سکے گا۔ دراصل پہرے پر متعین نوجوان نے فوج اور پولیس کو آتا دیکھ کر گاؤں میں خبر کر دی تھی اور ہم نے سارے ہتھیار چھپا دیے تھے۔ صرف ایک بندوق اور بارود ایک نوجوان کے پاس سے ملا تھانیدار نے لائسنس دار بندوقیں سب قبضے میں کر

لیں۔ صرف ایک بندوق کسی طرح بچ گئی۔

وقت آہستہ آہستہ دیکھتے ہوئے بڑھ رہا تھا۔ علاقے میں خاموشی سی طاری تھی، خاموشی جو کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ ہندو درحقیقت کسی لمبے اور ہمہ پہلو منصوبے پر کام کر رہے تھے۔ مسلمان ساری رات دُور دُور تک گشت کرتے رہے اور دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے۔ ہندو تیاری مکمل کر چکے تو وہ مسلمانوں کے پاس آئے دونوں قوموں کی پنچایت بیٹھی اور طے پایا کہ فریقین ایک دوسرے پر حملہ نہیں کریں گے، جنگی تیاریاں موقوف کر دیں گے اور پرامن سازگار ماحول پیدا کریں گے۔ پنچایت برخاست ہونے سے پہلے فریقین نے حلف اٹھایا۔ ایسی ہی پنچایتیں دوسرے دیہات میں ہوئیں۔ مسلمان ہر جگہ مطمئن ہو گئے اور گاؤں کا پہرہ اور گشت وغیرہ سب چھوڑ دیا۔

ہندو اپنی چال میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ۲۴/اور ۲۵ مئی کی شب انہوں نے اپنے منصوبے کو آخری شکل دی اور رات تین بجے حملہ کر دیا۔ نورنگ پور اس وقت رات کی تاریکی میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اتفاق سے ایک نوجوان اپنے گم شدہ اونٹ کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا انسانوں کا متلاطم سمندر بڑھا چلا آتا ہے۔ دُور ہی سے للکارا۔ پچھلی رات کی گھمبیر خاموشی ٹوٹ گئی۔ ہندو گڑبڑا سے گئے اور ایک سورما نے اسی گھبراہٹ میں بندوق کا فائر کر دیا۔ فائر کا ہونا تھا کہ لوگ جگ اٹھے اور کھلبلی سی مچ گئی۔ عورتوں بچوں اور بوڑھوں نے ایک قلعہ نما حویلی میں پناہ لی۔ پناہ گاہ پر بندوق بردار محافظ متعین کر دیے گئے۔ باقی نوجوان اپنی پہلے سے طے شدہ چوکیوں اور محاذوں پر پہنچ گئے۔

ہندوؤں نے دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کو گھیر لیا۔ طبل اور دنامے زور شور سے گرج رہے تھے فضا بڑی ہی ہیبت ناک ہو گئی تھی۔ خونریز تصادم شروع ہو گیا۔ دیسی ساخت کی توپیں آگ اگلنے لگیں بندوقوں سے گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ ہندوؤں کے جے کاروں کی صدا گونج رہی تھی جس پر مسلمانوں کی صدائے اللہ اکبر غالب آئے جاتی تھی...... دست بدست لڑائی جاری تھی کہ شمالی محاذ پر دشمن آگے بڑھ آیا اور چند مکانوں کو آگ لگا دی۔ ادھر مشرقی اور جنوبی محاذ میں بھی شگاف پڑ گئے۔ ان محاذوں پر چھ آدمی شہید ہو چکے تھے، البتہ مغربی محاذ پر مسلمان پوری قوت سے ڈٹے ہوئے تھے وہ زخم پر زخم کھا رہے تھے ایک کے دائیں ہاتھ کی کلائی اڑ گئی تھی۔ کچھ جوان دشمن کے گھیرے میں آ گئے جسے انہوں نے تابڑ توڑ حملے کر کے توڑ ڈالا۔ دشمن کے کئی آدمی کھیت ہو چکے تھے اور پھر اس کے قدم اکھڑ گئے۔ مسلمان اپنی لاشوں کی طرف متوجہ ہوئے، تو اچانک گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ یہ گولیاں اسٹین گن اور ۳۰۳ رائفل سے برسائی جا رہی تھیں۔ مسلمان گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے پناہ گاہ کی طرف بڑھے۔ اچانک نورنگ پور سے دھوئیں کے مرغولے اٹھنے لگے اور پھر شعلوں کی زبانیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ مسلمان پیچھے ہٹتے ہوئے گولیوں کا شکار ہو رہے تھے آخر وہ ایک حویلی میں پناہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔

گاؤں کے ارد گرد کے چاروں محاذ ٹوٹ چکے تھے۔ مسلمان درویشوں میں محصور تھے۔ ایک میں جوان تھے اور دوسری میں عورتیں اور بچے...... ہندوؤں نے اول الذکر حویلی پر یلغار کر دی مسلمانوں نے بڑے گیٹ کے سامنے آگ جلا کر انہیں دو گھنٹے تک روکے رکھا، مگر پھر وہ دیوار میں شگاف کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مسلمانوں نے انہیں جانیں دے دے کر اندر داخل ہونے سے روکا۔ دیسی ساخت کی توپ بہت کام آئی اور مسلمان نوجوان موقع پا کر حویلی میں سے نکل آئے اور اس حویلی سے دوسری حویلی میں پہنچ گئے۔

یہ حویلی گاؤں کے وسط میں تھی۔ تمام گاؤں بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں تھا اس لیے دشمن یہاں تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ مسلمان نوجوان بھی یہاں بڑی دقت سے جھلستے جھلساتے ہوئے پہنچے تھے۔ ان لوگوں کے آنے سے محصورین کی ہمت بندھ گئی۔ دشمن نے ایک پختہ مکان کی چھت پر مورچے بنا لیے اور فائرنگ شروع کر دی۔ مسلمانوں نے حویلی کے مورچوں سے جواب دیا اور اتنے زور سے گولیاں برسائیں کہ دشمن اپنے مورچے خالی کر کے چلے گئے۔

اب مسلمان زخمیوں اور شہیدوں کی طرف متوجہ دیجئے۔ ان کا بھاری نقصان ہوا تھا۔ اٹھارہ آدمی شہید ہو چکے تھے اور بیسیوں زخمی تھے۔ پولیس کو رپورٹ کرنے دو آدمی گوڑ کانوہ گئے لیکن یہ محض رسمی کاروائی تھی۔ پولیس گارد نورنگ پور پہنچی' تو گاؤں کو خاکستر اور اجڑا پایا۔ گارڈ میں ایک تہائی مسلمان سپاہی تھے۔ وہ سخت مشتعل ہو گئے گارڈ کے انچارج نے انہیں بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔ زخمیوں کو مرہم پٹی کی گئی۔ جو بہت زخمی تھے انہیں گوڑ کانوہ ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔

نورنگ پور دم توڑ چکا تھا۔ جو لوگ بچ گئے تھے انہیں حویلی کے کیمپوں میں پناہ لینی پڑی۔ دہلی والوں نے دل کھول کر مدد کی۔ یہ سلسلہ جون سے ستمبر تک رہا۔ یہاں تک کہ خود دہلی پر قیامت ٹوٹ پڑی اور پھر وہ خونریزی ہوئی کہ الامان الحفیظ۔ دہلی کی مسلمان آبادیاں چند ایک چھوڑ کر تباہ ہو گئیں وہ مسلمان ہندو آبادیوں میں گھرے ہوئے تھے وہ تو بہت کم زندہ بچ سکے۔ نورنگ پور تباہی کے اس سمندر میں محض ایک نقطہ بن گیا تھا۔

(روایت: محمد خاں رند۔ تحریر آبادشاہ پوری'

اردو ڈائجسٹ)

سلگتے چہرے

ضوباریہ ساحر کے جذبات نگار قلم سے ایک خوبصورت ناول...... اُن سُلگتے چہروں کی کہانی جن پر سجی آنکھوں میں انتظار کا عذاب لو دے رہا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کی داستان حیات جسے اپنے خوابوں کو کچل کر میدانِ عمل میں آنا پڑا۔ اس کے نرمل سجل جذبوں پر فرض کا ناگ پھن کاڑھے بیٹھا تھا۔ اس لئے محبت کو جانچنے پرکھنے کے فن سے وہ ناواقف تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود دل کے ویرانے میں کہیں ہلکی ہلکی آنچ دیتا محبت کا جذبہ ضرور موجود تھا۔ وہ جو سائے کی طرح قدم قدم اسکے ساتھ رہا اس پر بیتنے والی ہر اذیت کو اُس نے بھوگا۔ وہ ادھوری لڑکی اُسے جاننے اور پہچاننے کی کوشش میں لگی رہی۔ مگر وہ عکس کبھی پیکر بن کر اسکے سامنے نہیں آیا اور جب وہ سامنے آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی؟؟

یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

داستانِ ہجرت

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہوشیار پور میں تقسیم کے وقت صورت حال نہایت کٹھن ہو چکی تھی انگریز ہندو اور سکھ سب مل کر ہوشیار پور کے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رہے تھے۔ راقم والد صاحب کے ساتھ پروفیسر ظفر حسین آزاد (شعبہ عربی ادبیات ڈھاکہ یونیورسٹی) سے ملنے گیا تو راستے میں اُن کے گھر تک پہنچتے پہنچتے غیر معمولی صورت حال دیکھی۔ پروفیسر صاحب مرحوم و مغفور تحریک پاکستان کے نہایت فعال کارکن تھے۔ ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو انہی نے کھولا...... دیکھتے ہی ابا جی سے کہنے لگے ایسی خطرناک حالت میں خالی ہاتھ آئے ہو؟ والد صاحب نے فرمایا نہیں خالی ہاتھ ہرگز نہیں آیا۔ یہ کہہ کر جب پستول نکال کر دکھایا تو پروفیسر صاحب مطمئن ہو گئے۔ کہنے لگے بچوں کو قافلے کے ساتھ نہ بھیجنا' ورنہ شام چوراسی عبور نہ کر سکی لاہور جا کر کانوائے کا انتظام کرنا۔ پھر ابا جان سے کہا سردار ہماری تاریخ کا بے حد کٹھن مرحلہ ہے' ہم قائداعظم کا ہرگز ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ جس نے قائداعظمؒ کا اس مرحلے پر ساتھ چھوڑا۔ اس نے اسلامی تاریخ سے وفا کی۔ ابا جی نے اتنا کہا پروفیسر صاحب: پاکستان انشاء اللہ بن کر رہے گا۔ ہم لوگ واپس آئے تو محلے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ہوشیار پور کے ایک مسلمان نوجوان کو سکھوں نے قتل کر کے ہمارے محلے کی طرف پھینک دیا تھا۔ ہر روز ہوشیار پور کی جامع مسجد کے عقب سے' جہاں کوتوالی تھانہ جس کا انسپکٹر پولیس سکھ تھا' تحریک پاکستان کے لیے مسلم لیگ کی قیادت میں بڑا ہی منظّم جلوس نکلا' والد صاحب قبلہ نماز پڑھنے کے بعد اس جلوس میں چلے گئے مجھ سے کہہ گئے اگر گرفتار ہوا سیدھے گھر جا کر والدہ کو اطمینان دلانا اور آخری دم تک لڑنا چھوٹے ہو' لیکن گھبرانا نہیں۔ جلوس بھیم سین لیچڑ اور خضر حیات ٹوانہ کے خلاف بڑے پرجوش نعرے لگا رہا تھا...... پولیس نے پہلے ہوائی فائرنگ کی اور پھر لاٹھی چارج کر دیا۔ ابا جی گرفتار ہو گئے' میری ٹانگ پر لاٹھی لگی اور مجھے کسی نے سہارا دیا اور میں لنگڑاتا ہوا گھر پہنچا' والدہ کو بتایا' انہیں پہلے تو یقین ہی نہ آیا' پھر ہمیں انہوں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا آپ کے ابو انشاء اللہ واپس آ جائیں گے۔ ہوشیار پور کی کایا پلٹ گئی۔ ہر جگہ ہر روز مسلح تصادم ہونے لگے۔ اسلحہ نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان قتل ہو رہے تھے' انگریز بہادر کی سکھوں اور ہندوؤں سے ملی بھگت کے ہولناک نتائج سامنے آ رہے تھے۔ والد صاحب قبلہ چوتھے روز بمشکل کوتوالی سے نکلے اور گھر پہنچے۔ زخموں سے چور تھے۔ ظالموں نے لوہے کے راڈ سے والد صاحب پر حملہ کیا تھا۔ انہوں نے مزید بتایا کہ انگریز ہندو سکھ پولیس نے مسلمانوں کے ساتھ انتہائی انسانیت سوز سلوک کیا ہے۔ ایک انگریز نے کوتوالی میں آ کر مسلمانوں کے منہ پر تھوکا اور کہا پاکستان میری جوتی کے نیچے ہے۔

مجھے یاد ہے ہم لوگ اکثر شاہ نور جمال کے راستوں پر آم لینے جایا کرتے تھے۔ جاتے یا آتے ہوئے تازہ گنے کا رس بھی پیتے۔ اس جگہ پر ہندوؤں نے گھات لگانا شروع کر دی اور ایک روز ایک مسلمان کو قتل کر کے وہیں پھینک دیا۔ والد صاحب آگ بگولا ہو گئے' کہنے لگے مسلمانوں کو

اب پوری تیاری کر لینی چاہیے۔ ‘‘چو’’ ایک جگہ تھی جہاں ہندو صبح صبح پوجا پاٹ کیا کرتے تھے۔ وہاں سے گزرنے والے مسلمانوں کا قتل کرنا ان کا روز کا شیوہ بن گیا تھا۔

ایک روز صبح کے قریب چوک سراجاں میں جہاں ہم رہتے تھے' یہ اطلاع آئی کہ حملہ ہوگا: چنانچہ وہاں کے نوجوانوں نے شیخ رزاق کی حویلی کے نیچے جمع ہو کر لاٹھیوں' تلواروں اور پستولوں سے تیاری کی۔ وہ دن بڑا سخت تھا۔ تین سو سکھوں اور ہندوؤں نے بندوقوں سے چوک سراجاں پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کی طرف سے مشکل نوے پچانوے نوجوان تھے۔ پاکستان زندہ باد لے کے رہیں گے پاکستان کے نعروں کے سائے میں وہ نوجوان سر دے رہے تھے۔ ایک گرتا تو دوسرا میدان میں آ جاتا' ان کے نعروں کی بلندی ان کی دفاعی پھرتی کسی طرح بیان نہیں کی جا سکتی' ایک زخمی نوجوان کو چارپائی پر ہمارے مکان کے سامنے سے لے جایا جا رہا تو ابا جان مرحوم نے نکل کر اسے چوما اور کہا بیٹا! اب پاکستان بن جائے گا۔ تیرے خون کی قسم! پاکستان بن کر رہے گا وہ نوجوان کہنے لگا: ‘‘یہ انگریز ہندو اور سکھ یہ سمجھتے ہیں کہ نہتے ہونے کی وجہ سے ہم قائداعظمؒ کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور تحریک پاکستان ناکام ہوگی۔ ہرگز نہیں: خاندان کا بچہ بچہ کٹے گا اور پاکستان بنے گا۔’’ چوک سراجاں کی یہ جنگ تین چار روز تک طول کھینچ گئی۔ اسے ہوشیار پور کے مسلمانوں کی طرف سے کسی اسلحے کے بغیر ایک فیصلہ کن دفاعی جنگ کہا جا سکتا ہے۔ قوموں کے لیے وہ تجدید نو کا دن ہوتا ہے جب اس کے نوجوان ایثار و قربانی کی بلندیوں کو چھو جائیں۔ دوآبے کے نوجوانوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ تحریک پاکستان میں ہر طرح کی قربانیاں پیش کر سکتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ہوشیار پور میں فسادات سے پہلے ایک روز میں ابا جان (مرحوم) کے ساتھ کمپنی باغ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ غالباً ڈاکٹر کے پاس جا رہے تھے۔ راستے میں کوئلے کا ایک ہندو تاجر ملا۔ اُس کا نام شاید موتی لال تھا کہنے لگا شیخ صاحب! کہاں کا رُخ ہے؟ ابا جان نے کہا ڈاکٹر کے پاس...... کہنے لگا اپنا بندوبست کر لیں۔ ابا جان نے پوچھا اس سے تمہارا کیا مطلب؟ اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ آپ کو شنکر اچاریہ کے الفاظ یاد نہیں؟ ‘‘ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے۔ مسلمان یہاں مہمان ہیں۔ بہتر ہے وہ اب کوچ کر جائیں۔’’

وہ رات بے حد طویل تھی۔ چوک سراجاں پر حملے کی دوسری رات...... حملہ آوروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پہلے روز پچاس نوجوان شہید ہوئے۔ دوسرے روز ساٹھ شام ہونے سے پہلے دو چار ایسے دلدوز واقعات ہوئے کہ مسلمان کی غیرت اور جوش میں زبردست اضافہ ہوا۔ بزرگ اور نوعمر بھی میں میدان میں اترنے لگے عصر کے وقت سے دست بدست لڑائی ہو رہی تھی۔ ایک مسلمان نوجوان گرا' خون کے فوارے نکل رہے تھے اس نوجوان کا گھر لڑائی کے میدان کے بالکل سامنے تھا...... گھر کا ایک چھوٹا بچہ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ خواتین کو ہوش نہ رہا اور بچہ ابا ابا کہتے ہوئے دروازے سے نکل کر ہندوؤں اور سکھوں کی طرف بھاگا۔ سکھوں نے بچے کو پکڑ لیا اور چلا چلا کر اعلان کیا دیکھو ہم آج مُسلے کے بچے کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ مسلمان دم بخود تھے کہ یہ بچہ وہاں کیسے پہنچ گیا۔ سکھوں نے بچے کو اوپر اچھالا اور نیچے سے نیزے پر اسے لے لیا بچے کی چیخ اس قدر دلدوز تھی کہ آسمان تک لرز اٹھا۔ اس نے تڑپ تڑپ کر وہیں جان دے دی۔ ابھی مسلمان اس رنج و غم میں غلطاں و پیچاں تھے کہ یکا یک ایک نوجوان بجلی کے مانند جا نکلا اور جس سکھ نے بچے کو پکڑ کر اچھالا تھا' اسے گرایا ٹانگوں سے پکڑ۔ پوری قوت سے اپنے سر کے اوپر چاروں طرف گھمانا شروع کیا۔ چوتھے راؤنڈ پر اس نوجوان نے اللہ اکبر' پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا کر اس سکھ کو ایک دیوار پر دے مارا اس کا سر پھٹ گیا۔ اس نوجوان نے ایک بڑا پتھر

لیا' اس پردے مارا اور برق رفتاری سے مسلمانوں میں آ شامل ہوا۔ مسلمانوں کے جوش کی انتہا نہ تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نوجوان وسوہہ سے اپنی بہن کو لینے آیا تھا۔ یہ وہ بستی تھی جہاں مسلمانوں نے سب سے زیادہ قربانیاں دی تھیں۔ وہ نوجوان اس گلی میں پھنس گیا جس کی ہندو سکھوں نے ناکہ بندی کی تھی۔ دوسرا واقعہ اور زیادہ جگر خراش تھا۔ مغرب کی نماز سے ذرا پہلے مسلمانوں کے مورچوں میں زبردست ہلچل ہوئی۔ بڑے زور شور سے ''اللہ اکبر'' اور ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگ رہے تھے۔ والد صاحب قبلہ رائفل لے کر نکلے اور مورچوں پر پہنچ گئے۔ کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ والدہ ماجدہ مصلے پر تھیں۔ محلے کی بعض خواتین ہمارے ہاں جمع تھیں۔ نوعمر لڑکوں نے چھتوں پر ایئر گنوں' بڑے بڑے پتھروں' غلیلوں اور گرم پانی سے مورچہ بنا رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پھر نعرے لگنے شروع ہوئے۔ پورا محلہ 'اللہ اکبر' اور 'پاکستان زندہ باد' کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اتنے میں والد صاحب قبلہ کے ساتھ دو بزرگ اور تین نوجوان ایک چارپائی پر خون میں لت پت انتہائی خستہ حالت میں ایک مسلمان نوجوان خاتون کو لیے گھر پہنچے۔ یہ خاتون اپنے بھائیوں کے ساتھ لدھیانے سے ہوشیار پور آئی تھی اور اپنی نانی سے ملنے چوک سراجاں آ رہی تھی۔ یہ نوجوان لڑکی ابھی نئی نئی لاہور سے بی اے کر کے لدھیانے آئی تھی۔ سکھوں اور ہندوؤں نے اس کے بھائی اس کے سامنے قتل کیے۔ پھر اس کا سینہ کاٹ لیا اور چوک سراجاں کی طرف پھینک دیا۔ والدہ ماجدہ نے لڑکی کو سنبھالا وہ زندگی کے آخری دموں پر تھی۔ والد صاحب قبلہ فوراً سجدے میں گرے اور رو رو کر اللہ سے دعا کی مسلمان خواتین کی عزت کسی طرح محفوظ فرما! محلے کے بزرگ بھی آ گئے تھے۔ والدہ ماجدہ نے لڑکی کی سرعت سے مرہم پٹی کی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھیں کھلیں۔ اپنے بھائیوں کے نام پکارتی رہی اور پھر بے ہوش ہو گئی اور آدھی رات تک بے ہوش رہی جب وہ دوبارہ ہوش میں آئی' والدہ ماجدہ نے اسے پانی پلایا' قرآن مجید پڑھا وہ سنتی رہی۔

پھر......اُسے ہچکی آئی اور ہمیشہ کے لیے سو گئی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سبھی نے اس کے لیے دعا کی۔ اُس لڑکی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا' اُس نے مسلمانوں کی غیرت کو للکارا تھا۔ تھوڑی دیر بعد والد صاحب آئے اور کہا کہ اب سارے گھر مورچے ہوں گے' خواتین بھی اب پوری طرح تیاری کر لیں۔ والد صاحب قبلہ نے دوسرے بزرگوں کے ساتھ مل کر ساری رات مختلف مورچوں پر نوجوانوں کا ساتھ دیا۔ رات بھر کھڑے ہو کر سکھوں اور ہندوؤں پر فائرنگ کی مزاحمت کی اس رات' والد صاحب فائرنگ کرتے تھک جاتے تو سجدے میں چلے جاتے۔ محلے کے دوسرے بزرگوں نے ایک دوسرے سے تعاون کا ایک نظام قائم کر دیا تھا۔ گھر گھر جا کر انہیں پوچھتے رہے۔ ایک انگریز افسر بعد میں چوک سراجاں کا معائینہ کرنے آیا تو وہ مسلمانوں کی باہمی اخوت اور قربانی دیکھ کر کہنے لگا:

> ماؤنٹ بیٹن نے مسلمانوں کا غلط اندازہ لگایا ہے اور یہی اندازہ پاکستان بنا کر رہے گا!''

خاندان کے خاندان شہید ہوئے جو بچے' ویران و خستہ حال میں پاکستان پہنچے۔ بے شمار لوگ حواس کھو بیٹھے اور جو برداشت کر گئے' انہیں دوسری آفات لے بیٹھیں' لیکن پھر بھی پاکستان کا مطالبہ پورے شعور سے جاری رہا۔

چوک سراجاں جب خالی ہونا شروع ہوا تو ہم لوگ جامع مسجد کے قریب شیخ جان محمد کی حویلی سے ملحق ایک مکان میں منتقل کر گئے' لیکن وہاں پہنچنے کے لیے ایک لمبے دوراہے کو' جس کا توڑ تھا عبور کرنا ضروری تھا۔ انتہا پر ایک مندر تھا جس سے ہندو غنڈے فائرنگ کرتے اور سرکاری

پولیس ان کی مدد چنانچہ اس لمبے دوراہے توڑ کر عبور کرتے ہوئے بے شمار شہید ہوئے پھر...... یوں بھی ہوا کہ مسلمان نوجوان چھتوں سے ہوتے ہوئے مندر کے قریب پہنچ گئے اور انہوں نے آگ کے شعلے اس طرف پھینکے۔ ہندوؤں کو اس طرف موڑ کر بے شمار مسلمان خاندان توڑ عبور کر گئے۔ قافلوں کی صورت میں جلدی جلدی نکلنے لگے اور ہم لوگ آخری خاندان طور پر اباجی کا انتظار کرتے رہے' وہ کانوائے لینے لاہور چلے گئے تھے۔

ایک ہفتے سے اوپر ہو گیا۔ لیکن والد صاحب نہ آئے۔ اس عرصے میں ہمارے پرانے نوکر محمود نے خبر دی کہ ہندوؤں اور سکھوں نے سارے ہوشیار پور کی مساجد سے قرآن مجید لے کر سڑکوں پر پھینک دیے ہیں۔ اور بدمست ہو کر اغوا شدہ مسلمان خواتین کی بے حرمتی سڑکوں پر کر رہے ہیں۔ اس موقع پر مرہٹی فوج کا ایک دستہ جامع مسجد کے قریب آن پہنچا۔ محمود بٹولا پور کا تھا' مرہٹی جانتا تھا' اُس نے اُس دستے کے افسر سے بات کی اور سڑکوں پر قرآن مجید کی بے حرمتی کا ذکر چھیڑا۔ اُس افسر نے کہا جب تک تمہارے لیے کانوائے لاہور سے نہیں آجاتا' تمہیں کوئی نہ ستائے گا! البتہ دوسروں کے ہم ذمے دار نہیں۔

والد صاحب قبلہ گیارہویں روز کانوائے لے کر پہنچے۔ معلوم ہوا دریائے بیاس چڑھا ہوا تھا' اس لیے آنے میں رکاوٹ ہوئی۔ ہم لوگوں کے سوا پورے علاقے میں کوئی بھی نہ رہا تھا۔ والدہ ماجدہ اس دوران میں راتوں کو تہجد کی نماز پڑھ کر مسلسل دعا کرتیں۔ اُن کی دعاؤں اور اُن کی عزیمت نے اتنے دن ہمیں زندہ رکھا۔ ورنہ چاروں طرف موت کے سائے بڑھ رہے تھے۔ ابا جان کو قرآن مجید کی بے حرمتی کا واقعہ سنایا تو بے حد متاثر ہوئے۔ بڑی دیر تک روتے رہے' پھر اٹھے اور انہوں نے اپنی رائفل سنبھال کر بلوچ رجمنٹ کے سربراہ سے بات کی۔ اس رجمنٹ کے کچھ نوجوان کانوائے لے کر آئے تھے۔ تاریخ میں اُن کی شجاعت اور بہادری کی مثالیں لکھی جائیں گی۔ ابا جان نے کہا میں جا کر سڑکوں سے قرآن مجید اٹھاتا ہوں اور کانوائے کے ساتھ آجائیں گے۔ اس پر بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے کہا شیخ صاحب! پاکستان بنا ہی قرآن مجید کی وجہ سے ہے۔ ہم اسے سڑکوں پر کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ ادھر والدہ نے بھی یہی کہا' چنانچہ دوسرے اور تیسرے روز بلوچ رجمنٹ کے جوانوں کے ساتھ مل کر ہم سب سڑکوں اور گلیوں سے قرآن مجید اٹھاتے رہے۔ مرہٹہ فوج نے اس مرحلے پر اتنا ساتھ دیا کہ ہم پر حملہ نہ ہوا کوئی پچاس بوریاں بھری گئیں جنہیں ایک کنوئیں میں دفن کر دیا گیا' کچھ ساتھ لے آئے۔ قرآن مجید کی جس طرح بے حرمتی کی گئی تھی' اُس کا بڑا ہی المناک اثر سب پر ہوا تھا۔ قرآن مجید اُٹھاتے وقت مختلف محلوں اور گلیوں میں ہمیں مسلمان عورتیں بڑی دردناک حالت میں ملیں ان بلوچی مجاہدین نے انہیں احترام سے ایک جگہ دفن کر دیا۔ بعض محلوں میں مجھے یاد ہے کہ خون ہی خون تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی لاشیں بھی دیکھیں' انہیں بھی دفن کیا۔ بلوچ رجمنٹ کے خلوص اور لگن نے اس ظلمت میں روشنی کی اور چوتھے روز ہوشیار پور سے ہم وہاں کے بزرگوں کو یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔

تجھے اہل دل کی خبر نہیں کہ جہاں میں گنج اُلٹا گئے
یہ گداگران دیار غم' یہ قلندر انِ تہی کدو

(فراق)

راستے میں اکا دکا مسلمان عورتیں ملتی گئیں' انہیں بھی ساتھ لیتے آئے۔ سکھوں اور ہندوؤں نے اپنی درندگی کا جی بھر مظاہرہ کیا تھا۔ ہوشیار

پور سے نکلتے وقت ایک عورت زخمی حالت میں پڑی ملی۔ والد صاحب نے اٹھایا تو اُس کی ٹانگیں اور سینہ کٹے ہوئے تھے۔ ایک مشہور خاندان کی نوجوان خاتون تھی۔ اباجی کو معلوم ہوا تو ضبط نہ کر سکے۔ اُس خاتون نے صرف اتنا کہا: ''آپ جایئے چاچا جی! غم نہ کریں۔ اتنا سب کچھ ہو جانے پر پاکستان تو بن گیا۔ مجھے خوشی ہے میں امت کے کسی کام تو آئی......'' اُس خاتون کے کلمات نے بلوچ رجمنٹ کے جوانوں کو رُلا دیا۔ 1947ء کی خون ریزی جنہوں نے دیکھی ہے، وہی بتا سکتے ہیں اس قدر بہت پیمانے پر قتل و غارت اور اجتماعی ہجرت کسی مجبوری، ڈر یا گھبراہٹ کے نتیجے میں ہرگز نہ تھی، بلکہ سادہ سے سادہ ترین مسلمان خواتین سے بھی پورے شعور اور حواس کے ساتھ پاکستان کے حق میں فیصلہ کر کے قربانیوں کی عظیم مثالیں پیش کی تھیں۔

کانوائے پر بلوچ نوجوانوں نے سٹین گن اور تھری ناٹ تھری رائفلوں کی حفاظت لے کر تیزی سے ہوشیار پور کو خیر باد کہا۔

شام چوراسی پہنچے تو دجلۂ خوں بنا ہوا تھا۔ معلوم ہوا یہاں کے نوجوانوں نے مسلسل چار دن تک پندرہ ہزار سکھوں اور ہندوؤں غنڈوں کو روکے رکھا اور اس دوران میں مسلمان گھرانوں کو قافلوں کی صورت میں روانہ کیا۔ نہر چڑھی ہوئی تھی، ہم عبور نہ کر سکتے تھے ہزاروں مسلمان شہیداں کے سر بہتے دیکھے......!

ہم سب نے اُتر کر دعا کی۔ بلوچی جوانوں نے فوجی روایات کا پاس کرتے ہوئے کنارے پر کھڑے ہو کر اُن گزرتے سروں کو سلیوٹ کیا، کانوائے کے فوجی قائد نے کہا ہم صبح کسی وقت اسے عبور کر سکیں گے، اب یہیں ڈیرہ ڈالتے ہیں: البتہ شبخون کا خطرہ شدید ہے۔ رات کو بلوچی فوج کے ایک جوان نے والد صاحب کو بتایا کہ ہوشیار پور میں مرہٹہ فوج کے لوگوں نے انہیں بتایا تھا کہ وہاں پندرہ روز میں ساڑھے تین ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ اغوا ہونے والی مسلمان خواتین کی تعداد کا علم نہ ہو سکا: البتہ بعض جگہوں پر مسلمان خواتین نے شدید مزاحمت کی یہاں تک کہ جلتے ہوئے کوئلوں اور ابلتے ہوئے پانی کا استعمال بھی اپنے دفاع میں کیا تھا۔

ہم سب جاگتے رہے۔ کوئی ڈیڑھ دو بجے کے قریب چاند کی روشنی میں شمال و جنوب سے یکا یک بڑی تعداد میں سکھ نسبت سری اکال، کے نعرے لگاتے قریب آ گئے۔ بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ آس پاس چھپ گئے تھے اور کانوائے کے کچھ مردوں کے پاس رائفلیں پہلے سے تھیں، کچھ کو تھما دی گئیں۔ جب وہ قریب آئے تو ان پر سامنے سے فائرنگ کی گئی۔ وہ سمجھے کانوائے کے لوگ گہری نیند میں ہیں۔ ابھی اس بوکھلاہٹ سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ چاروں طرف سے بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے سٹین گنوں سے انہیں بھون کر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ غنڈے ایسے بھاگے کہ صبح تک کوئی خبر نہ ملی، تہجد کی نماز کے ساتھ نہر میں پانی اترنا شروع ہو گیا تھا، نہر عبور کی...... پانی کم ہونے کے باوجود اس قدر سرخ تھا کہ رات کو بھی اس کی سرخی دن کی سرخی کی طرح تھی۔ یہ تحریک پاکستان پر قربان ہونے والے شہیدوں کا خون تھا۔

نہر عبور کر کے ہم سب شدت تاثر سے کانپ رہے تھے کہ ایک طرف سے کراہنے کی آواز آئی۔ ایک بزرگ ڈاکٹر نصیر الدین آگے بڑھے۔ انہوں نے پوچھا کون ہے؟ نسوانی آواز تھی۔ وہ فوراً لپکے۔ ایک خاتون خون میں لت پت پڑی تھی۔ پانی پلا کر مرہم پٹی کرنے کی کوشش کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس خاتون نے مرتے وقت صرف اتنا کہا:

''شام چوراسی کی جنگ میں میرے والد سات بھائی، چچا اور ان کے چار لڑکے شہید ہو گئے، تین بہنیں لڑتے لڑتے نہر میں ڈوب گئیں۔

والدہ کو انہوں نے قتل کر دیا۔ میں چھپ گئی' لیکن انہوں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔ جب قریب آئے تو میں نے چھرے اور ٹوکے سے دو کو زخمی کر دیا...... انہوں نے جلا کر میرا یہ حشر کیا ہے۔''

آخری سانس لینے سے پہلے کہا:

''پاکستان کو میرا اسلام پہنچا دیجیے!''

خاتون کو دفن کر کے ہم تیزی سے جالندھر پہنچے یہاں کا کیمپ قیامت کا منظر پیش کر رہا تھا...... تایا جی کو تلاش کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ لاہور روانہ ہو گئے۔ ابا جی' پیر صاحب بستی شریف کے ہاں جانے کا ارادہ رکھتے تھے' لیکن بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے منع کیا۔ جالندھر کے مسلمانوں نے جس بے جگری' دردمندی اور زبردست قربانی سے تحریک پاکستان کے لیے کام کیا' وہ تاریخ پاکستان کا روشن باب ہے۔ انہوں نے پاکستان کے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے تحریک پاکستان کو تاریخی قربانیوں سے ہمکنار کیا۔ جالندھر کیمپ کے واقعات بڑے دلدوز تھے۔ مجھے یاد ہے ایک خاتون آخری دموں پر تھی' اُسے معلوم ہوا ہم لوگ کانوائے پر پاکستان جا رہے ہیں تو اُس نے ابا جی کو بُلا کر کہا:

''یہ میرے زیورات ہیں۔ خاندان کے سارے مرد شہید ہو چکے ہیں۔ ان زیورات کو قائداعظمؒ تک پہنچا دیں۔ شاید پاکستان کے لیے کام آئیں!''

اس سفر میں والدہ ماجدہ نے خواتین کی بڑی خدمت کی۔ بڑی ہمت دلاتی تھیں۔ ہجرت کا مسئلہ تھا۔ ایک بزرگ شیخ نواز نے دوائیں اپنے ساتھ لے لی تھیں جنہیں وہ بڑی لگن سے تقسیم کرتے۔ اُن کے اس جذبے کا سب پر بہت اچھا اثر پڑا۔

واہگہ پہنچ کر ہم سب نے نماز پڑھی۔ خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کیا...... مل کر شہیدوں پر سلام بھیجا۔ یہ بڑا دل فگار منظر تھا۔ مجھے یاد ہے مجھ پر سانس کی تکلیف کا پہلا حملہ ہو چکا تھا اور میں اس آرزو کے ساتھ پاکستان میں داخل ہوا کہ ہندو بھیڑیوں اور سکھ غنڈوں نے برطانوی آقاؤں کی خاطر جس درندگی کا کھیل مسلمانوں کے ساتھ کھیلا تھا' تاریخ ہمیں ایک ایسا موقع دے کہ ہم اپنا حساب بے باقی کر سکیں۔ جنگ تمنا کرنے کی چیز نہیں' لیکن ۱۹۴۷ء کی خون ریزی آشامیوں کو یاد کر کے سینۂ افلاک سے آہِ سوزناک اُٹھتی ہے۔

(محمد اقبال سہیل۔ اردو ڈائجسٹ اگست 1983ء)

کریک ڈاؤن

طارق اسماعیل ساگر کا ایک بہترین ولولہ انگیز، خون گرما دینے والا ناول۔ کشمیر حریت پسندوں اور سیاچن گلیشئرز پر لڑی جانے والی جنگوں کے پس منظر میں لکھا گیا بہترین ناول۔ جلد کتاب گھر پر آ رہا ہے، جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکے گا۔

نشانِ پاکستان

وہ پاک سرزمین کی طرف دوسری بار ہجرت کرنا چاہتا تھا‘ مگر پھر اس کے سابق کانگرسی پروفیسر نے سعی و عمل کی ایک نئی دنیا اس کے سامنے وا کر دی۔

لبیک اللھم لبیک کی فلک شگاف صدائیں تھم چکی تھیں۔ کیونکہ لاکھوں حجاج کرام حج کے سب سے اہم فریضے وقوف سے فارغ ہو چکے تھے۔ ظہر اور عصر کی نمازیں ایک ساتھ پڑھ چکے تھے اور اب ہر ایک کو شب بھر کے قیام کے لیے مزدلفہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو معلم کے لگائے ہوئے بڑے شامیانے تلے دوسری خواتین کے ساتھ دعاؤں اور مناجاتوں میں مصروف چھوڑا اور تازہ ہوا کھانے اور یہ دیکھنے کے لیے باہر نکل کر اپنے گروپ کیمپ کی طرف چلا کہ معلم کی گاڑیاں ہمیں لینے آ گئی ہیں یا نہیں۔ دروازے کے قریب سڑک کی دوسری جانب اپنی عمر کے اس شخص کو کھڑے دیکھا تو میرے منہ سے بے ساختگی میں نکلا:

”نشانِ پاکستان...... انور!“

میں لپک کر اس کے پاس گیا۔ وہ نشان بائیں گال پر کان سے ناک کے وسط تک چار انچ کے گھاؤ کا تھا جو چالیس برس بعد بھی مجھے یقین دلا رہا تھا کہ تمہارا ہائی اسکول اور کالج کا دوست محمد انور تمہارے سامنے کھڑا ہے۔

”محمد انور؟“ میں نے یقین ہونے کے باوجود سوال کر ڈالا۔

”جی ہاں...... مگر آپ......؟“

اس سے پہلے وہ کچھ اور کہتا‘ میں نے اپنا نام اور پرانا حوالہ دیا تو ہم دونوں کے احراموں سے نصف ڈھکے ہوئے بدن ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہو گئے۔ دونوں کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

میرے اور شاید اس کے بھی ذہن میں چالیس برس پہلے کے منظر گھومنے لگے۔ پھر جلد ہی دونوں کو یاد آ گیا کہ ہمیں تو اپنی اپنی شریک حیات کو لے کر مزدلفہ جانا ہے۔ گاڑیاں ہمارے کیمپوں کے صدر دروازوں پر پہنچ گئی تھیں۔ انور کا کیمپ ہمارے مقابل سڑک ہی پر تھا۔ ہم نے طے کیا کہ مزدلفہ اور منیٰ کے مناسک پورے ہو جائیں تو جتنے دن مدینہ منورہ کو روانگی کے انتظار میں یہاں ٹھہرنا پڑے گا‘ ان کے دوران خوب ملاقات اور تفصیلی باتیں کریں گے۔ دونوں نے اپنی اپنی قیام گاہوں کے پتے ایک دوسرے کو سمجھا دیے۔

محمد انور چوتھی جماعت سے کالج میں ایف کام کا امتحان دینے تک میرا بڑا قریبی دوست رہا تھا۔ اسکول میں ساتھ ساتھ ڈیسک تھے۔ کھیل

کوئی لڑائی بڑائی میں بھی ہر وقت ایک دوسرے کے حمایتی۔ مضامین بھی ایک۔ شرارتیں، مہم جوئیاں اور اچھے برے تجربات بھی مشترک......۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کالج کے وہ دو سال برصغیر کی سیاسی تاریخ کا نقطہ عروج تھے۔ ہم دونوں باقی تمام باتوں میں ذوق و ہم آہنگ تھے، لیکن سیاسی نظریات میں کچھ کچھ اختلافات رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ مجھ پر ہندو و ہم جماعتوں سے زیادہ ترنیشنلسٹ مسلمان لڑکوں کے خیالات کا اثر رہا تھا اور میں برٹش انڈیا کے بٹوارے کے مطالبے سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ اس کے برعکس میرا جگری دوست انور لفظ ''پاکستان'' کے ایک ایک حرف پر فدا تھا۔ کالج میں ہم لوگ، ہندو، مسلمان، سکھ جب سیاسی بحث و مباحثہ کرتے تو تہذیب اور شائستگی کے دائرے سے باہر نہ نکلتے۔ سیاست کے موضوع سے تھک جاتے تو پھر اچھے دوستوں کی طرح ہنسی مذاق اور تفریحی مشاغل اختیار کر لیتے۔

مگر بدقسمتی سے ایک دن ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ ایک بڑا سرکاری افسر جو سکھ تھا، تبادلے کے سبب ہمارے شہر میں تعینات ہوا۔ اس کا ایک بیٹا اکتوبر ۱۹۴۶ء میں داخلہ لے کر ہمارے ساتھ ای کام سیکنڈ ائیر میں شریک ہوا۔ اس پر تصور پاکستان کے کٹر مخالف سکھ سیاست کار ماسٹر تارا سنگھ کی پاکستان اور قائداعظم کے خلاف بدزبانی اور دریدہ دہنی کا شدید اثر تھا۔ وہ سیاسی بحث میں آداب محفل اکثر نظرانداز کر دیتا جسے ہم نووارد سمجھ کر معاف کر دیتے، لیکن ایک دن اس متعصب لڑکے نے حد سے تجاوز کر کے پاکستان اور قائداعظم کی شان میں مغلظ اور نازیبا الفاظ استعمال کیے تو محمد انور غصے سے بے قابو ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ دیگر لڑکے انہیں چھڑانے کی کوشش میں تھے کہ موقع پا کر سکھ ہم جماعت نے جیب سے بڑے پھل والا چاقو نکالا اور محمد انور کے پیٹ میں گھونپنے کے لیے آگے بڑھا۔ انور بھی خاصا جاندار تھا۔ اس نے حملہ روک لیا، مگر حریف نے اس کی گردن پر وار کرنا چاہا تو وہ پڑا اس کے بائیں گال پر...... یہی وہ گہرا زخم تھا جسے ہم نے مذاق میں ''پاکستان کا نشان'' کہنا شروع کر دیا تھا...... یہ نہ جانتے ہوئے کہ آگے چل کر ''نشان پاکستان'' ایک بڑا شہری اعزاز کہلائے گا۔

بڑے افسر کا اثر و رسوخ، کالج کے نیک دل بنگالی ہندو پرنسپل کی دانائی، ہم جماعتوں کے مشورے، یہ سب کام دے گئے۔ بات کالج سے باہر نکلی نہ آگے بڑھی بلکہ چند روز بعد محمد انور اور اس سکھ لڑکے میں صلح صفائی ہو گئی...... پھر پاکستان بن گیا۔ میں اپنے خاندان کے ساتھ پاک وطن میں آ کر بس گیا۔ پچھلا دور، پچھلی باتیں، پچھلے دوست سب ایک ایک کر کے بھولتے گئے۔

اور آج...... یہاں، میدان عرفات میں، چالیس برس بعد انور کے ملنے سے حج کی خوشی میں اضافہ ہو گیا۔

مکہ معظمہ میں قیام کے دوران جب بھی فراغت کا تھوڑا سا وقت ملتا، ہم آپس میں بات چیت کر لیتے۔ پہلے اس کے اصرار پر میں نے کالج کے بعد کی اپنی داستان حیات سنائی۔ وہ یہ جان کر خوش ہوا کہ میں اپنے آبائی وطن لاہور آ کر کسی پریشانی کا شکار ہوا نہ مجھے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں نے بتایا کہ ان چالیس برسوں میں وطن سے باہر بہت سے ملکوں کی سیر کی، کچھ عرصہ یہاں سعودی مملکت میں ملازمت کر کے رزق بھی کمایا اور یہ کہ سینتیس برس بعد میں دوبارہ حج کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اس دن زیادہ گفتگو کے لیے وقت نہیں تھا، سو اس کی کہانی اسی کی زبانی سننے کے لیے دوسری ملاقات طے پا گئی۔

اور اس روز وہ تھا بھی بڑے اچھے موڈ میں۔ بے چارہ کوشش بسیار کے باوجود ابھی تک دوران طواف حجر اسود کو چوم نہیں سکا تھا کیونکہ بیت

اللہ کے گرد ہمہ وقت خلقت کا اژدہام رہتا تھا اور ہٹے کٹے حاجی اس مقدس پتھر پر ہر وقت یلغار کیے رہتے تھے۔ اس روز نماز فجر کا سلام پھیرتے ہی انور بقول خود بھاگا اور طواف شروع کیے بغیر اس سعادت سے جی بھر کر سیر ہو گیا...... یہ اچھی خبر سن کر ہم دونوں حرم کعبہ کے نزدیک ایک پاکستانی مطعم میں جا بیٹھے اور چائے کی چسکیوں کے ساتھ محمد انور نے اپنا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ ظہر کی نماز میں خاصی دیر تھی' اس لیے ہم دونوں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔

محمد انور' جو ۱۹۴۷ء میں پاکستان پر دل و جان سے فدا تھا' ابھی تک بھارتی اور بھارت کا پابند قانون شہری تھا! میں نے حیرانی کا اظہار کیا کہ ایسا کیوں؟ اس نے بتایا کہ بٹوارے کے فوراً بعد میرے بڑے چھوٹے بہن بھائی ہمارے ایک تایا کے ساتھ کراچی ہجرت کر گئے اور آج بھی اپنے اپنے کنبوں کے ساتھ پاکستان کے مختلف شہروں میں رہتے ہیں۔ میرے والد شہر کا چھوٹا سا ذاتی مکان اور قریبی موضع میں ایک بیگہ زرعی زمین بیچ کر کراچی جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں چونکہ بی کام کا تیسرا سال شروع کر چکا تھا' اس لیے چاہتا تھا کہ اب کامرس گریجوایٹ کی ڈگری لے کر ہی پاکستان جاؤں تاکہ نئے اور پاک وطن میں جا کر اچھی ملازمت مل جائے...... مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ والد صاحب مکان اور زمین بیچنے سے پہلے اللہ کو پیارے ہو گئے اور ماں جی نے میاں مرحوم کی قبر سے اتنا پیار بڑھایا کہ بہن بھائیوں' عزیزوں حتیٰ کہ میرے کہنے پر بھی ہجرت پر رضامند نہ ہوئیں۔ میں نے بی کام کر لیا' تو ماں سے پوچھا کہ اب چلو گی؟ لیکن وہ نہ مانیں۔ یہ سعادت شاید میرے نصیب میں لکھی تھی کہ پہلے باپ کو پھر ماں کو کاندھا دے کر ان کی آخری منزل تک پہنچایا۔

انور نے بتایا کہ میں نے ۱۹۴۹ء میں بی کام کیا تھا اور ملازمت کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔ چھوٹے بڑے اور ہندو' سکھ شرنارتھیوں کی وجہ سے مقابلہ سخت تھا۔ کبھی کسی بنک یا ادارے میں چھوٹی موٹی نوکری کر لی۔ کچھ پیسے زمین سے آ جاتے۔ ان دنوں بھی پاکستان سے والہانہ الفت تھی۔ دل میں ہوک سی اٹھتی کہ جس اسلامی دیس کی محبت کا نشان میں چہرے پر سجائے پھرتا ہوں' اس کی فضاؤں میں سانس لینے کی خواہش نصیبی سے ابھی تک محروم ہوں۔ بہر حال ماں ہر طرح میں مقدم تھی...... اور جب ۱۹۵۲ء میں اس کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا تو میں نے جلد ہی آبائی مکان میں تالا لگایا اور پاکستان پہنچ گیا۔

یہاں تک پہنچ کر انور رکا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں نے کہا: ''کیا بات ہے؟ کن خیالوں میں کھو گئے؟'' وہ کہنے لگا چھوڑو یار...... اس سے آگے کی باتیں کہیں تمہیں ٹھیس نہ پہنچا دیں...... بس یہ سمجھ لو کہ میں ابھی تک بھارتی ہوں اور اس بات پر قانع و مطمئن ہوں۔ میں نے بہت اصرار کیا' لیکن وہ مزید بات کرنے پہ راضی نہ ہوا...... تاہم وعدہ کیا کہ اگلی بیٹھک میں باقی احوال بتائے گا۔

ہم دونوں خوش قسمت تھے کہ مدینہ منورہ میں ایک ہی دن پہنچے' گو الگ الگ بسوں میں۔ پھر ہماری ملاقاتیں اور باتیں روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سائے میں ہوتی رہیں۔ ایک روح پرور شام جب ہم سنہری جالیوں کے قرب کی لذت آگیں سعادتیں حاصل کر کے مسجد نبویؐ سے باہر آئے تو خواتین سامنے کی دوکان میں شوپنگ کرنے چلی گئیں اور میں نے انور کے ساتھ مل کر چائے سے بھرا تھرماس خالی کرنا شروع کر دیا۔ تب اس نے وعدے کے مطابق اپنا بقیہ قصہ سنایا۔ اس کا بیان کچھ یوں تھا:

میں 1952ء میں پاکستان گیا تو وہاں سڑکوں پر ''ہائے آٹا'' کے جلوس نکلتے دیکھ کر دل بہت دکھی ہوا۔ بٹوارے سے پہلے ہم کہا کرتے تھے کہ پنجاب کا صوبہ ہندوستان کی ''بریڈ باسکٹ''، یعنی روٹیوں کی چنگیر ہے جو اناج اگا کر سارے ملک کا پیٹ بھرتا ہے۔ اب بیشک پورا پنجاب نہیں، مگر آدھے سے زیادہ تو ہے، پھر بھی ایک چھوٹے ملک میں ہائے آٹا کا شور کیوں؟...... میں یہ سوچ کر اداس ہو جاتا۔ اب تک بھارت میں رہ کر اپنے سپنوں کے دیس، نوزائیدہ اسلامی مملکت، کے بارے میں جو ناگوار باتیں سنی تھیں، حالات یہاں آ کر دیکھے تو کہیں زیادہ خراب تھے۔ ہر طرف آپا دھاپی لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی تھی۔ میں سوچا کرتا وہاں عزت میں اہل اقتدار نام تو رام اور کرشن جیسی پاکیزہ کردار والی ہستیوں کا لیتے ہیں، لیکن حکمرانی چانکیہ اور میکیاولی کے بتائے ہوئے گروں کے مطابق کرتے ہیں، مگر یہاں کا نقشہ کون سا مختلف ہے؟ اللہ اور رسولؐ کا نام سبھی لیتے ہیں، لیکن عمل ان کی مخالف سمت میں کیے جا رہے ہیں...... تو پھر فرق کیا ہوا؟

بزرگوں نے سمجھایا کہ برخوردار بھول جاؤ اپنے آدرشوں کو۔ جس یوٹوپیا کا تم خواب دیکھا کرتے تھے اس کا کوئی وجود نہیں...... بس حقیقتوں سے سمجھوتا کرو۔ بی کام کی ڈگری لے کر گھومو اور ملازمت ڈھونڈو...... کوئی ''پیدا'' والی جگہ مل گئی تو سمجھو پو بارہ......!!

میں نے ہتھیار ڈال دیے مگر محض اس حد تک کہ چاہے آگے خاردار جھاڑیاں ہیں، کانٹوں سے بچ کر چلنے کی پالیسی پر عمل کروں گا۔

مجھے ایک بڑے ادارے کے اکاؤنٹس سیکشن میں ملازمت مل گئی، وہ بھی اس لیے کہ میرا تایا زاد بھائی جو میرا بہنوئی بھی تھا، اس ادارے کا ڈائریکٹر تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ جس چیلنج کا مقابلہ کرنے کی نیت باندھی تھی، پہلے ہی موقع پر سامنے آ گیا۔ یہاں بل پاس کرنے اور ان کی ادائیگی تک ہر مرحلے میں ٹھیکیداروں سے رشوت لی جاتی تھی...... اور مجھے چند روز ہی میں پتہ چل گیا کہ رشوت کی رقمیں نیچے سے اوپر تک درجہ بدرجہ تقسیم ہوتی ہیں اور سربراہ ادارہ، یعنی میرے بہنوئی صاحب کو ''شیر کا حصہ'' پہنچ جاتا ہے...... اب مجھے کوئی تعجب نہیں تھا کہ تقسیم سے پہلے تایا جی کے یہ صاحبزادے جو ایک معمولی سے مکان میں رہتے تھے، یہاں شہر کے پوش علاقے میں اتنی عالی شان کوٹھی کے مالک کیونکر بن گئے ہیں۔

پہلا مہینہ پورا ہونے پر جب رشوت کا حساب کتاب ہونے لگا تو...... تین سو روپے ماہوار تنخواہ پانے والے اس گناہگار کی میز پر سپرنٹنڈنٹ صاحب پانچ سو روپے ''پیدا'' کے رکھ گئے...... میں نے احتجاج کیا اور رقم لوٹانا چاہی تو پوتے پوتیوں والے وہ صاحب کہنے لگے میاں، اتنے پارسا نہ بنو۔ چند مہینے اور نوٹوں کی خوشبو سونگھو گے تو ساری پارسائی نکل جائے گی...... رشوت گھر نہیں لے جانا چاہتے تو کسی درگاہ کی صندوقچی میں ڈال دینا۔ ہم عذاب کماتے ہیں، تم ثواب کما لینا۔

انور یہیں تک پہنچا تھا کہ ہماری بیویاں ہاتھوں میں شاپنگ بیگ پکڑے لوٹ آئیں۔ اسی لمحے مسجد نبویؐ کے موذن کی مستی ء اذان نے ہمیں بے خود کر دیا...... لوگ دیوانہ وار نماز عشاء کے لیے چاروں سمتوں سے لپکے آ رہے تھے...... نماز کے بعد خواتین کے ساتھ ایک پاکستانی مطعم میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ پھر انہیں گھر بھیج دیا کہ میں آج انور سے باقی داستان سننا چاہتا تھا۔ پھر وہی گرم چائے اور میرے دوست کا قصہ...... انور بتانے لگا کہ میں نے سپرنٹنڈنٹ سے بہتیرا کہا کہ آپ لوگ میرے حصے کی رقم آپس میں بانٹ لیں تو اس کا جواب تھا...... نہیں یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے۔ ہر ایک کا ''جائز'' حصہ اسے ملتا ہے۔ چاہے رکھے چاہے یا نالی میں پھینک دے۔ غرض وہ چھ سات ماہ میرے لیے بڑے یہ کربناک

تھے۔ میں مجبور ہو کر اپنے حصے کی رشوت کی رقم پکڑ لیتا اور کبھی کسی خیراتی ادارے اور کبھی کسی ہسپتال کے عطیہ باکس میں چپکے سے ڈال آتا۔ ایک اور مشکل یہ تھی کہ میرے بہنوئی ہی مجھ سے ناراض نہیں تھے بلکہ سگی بہن تک نے سیدھے منہ بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ دونوں کو یہ شکایت تھی کہ میں بڑا نیک پاک بنا ہوا تھا' دفتر میں الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا تھا۔

اور آگے جو کچھ ہوا' اس نے میرا دل پاش پاش کر دیا۔ میں اب تک حسن گماں رکھتا تھا کہ اس ادارے میں رشوت ضرور لیتے ہیں' لیکن ٹھیکیدار سے کام اور سامان ٹھوک بجا کر لیا جاتا ہوگا۔ مگر جب گہرائی میں اتر کر جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ پانچ روپے کی چیز کے دس روپے ادا کیے جا رہے ہیں۔ سامان غیر معیاری ہو تو بھی قبول کر لیا جاتا ہے۔ کام ناقص ہو وہ بھی او کے ہو جاتا ہے۔ میرے اضطراب کی انتہا نہ رہی۔ غصے میں آؤ دیکھا نہ تاؤ' ایک لمبی چٹھی ادارے کے سب سے بڑے افسر یعنی پروجیکٹ ڈائریکٹر کو لکھ دی اور ادارے والوں کا کچا چٹھا کھول دیا۔ اپنی طرف سے مطمئن ہو گیا کہ ضرور کوئی کاروائی ہوگی...... لیکن ہوا یہ کہ چند ہی دنوں میں بہنوئی اور بہن نے اپنے گھر آنے کی ممانعت کر دی۔ دوسرے قریبی اور دور کے سب رشتے داروں نے منہ پھیر لیا۔ مجھے ایک کلرک کی زبانی علم ہوا کہ بڑے افسر نے ایکشن لینے کے بجائے میرے بہنوئی سے کہا کہ یہ کون گدھا ہے تمہارے محکمے میں' نکالو اسے!

اور پھر میرے بہنوئی کے ایما پر پولیس والے کرائے کے میرے چھوٹے سے کمرے میں آ دھمکے۔ کہنے لگے کہ ہمیں شک ہے تمہاری سرگرمیاں خلاف پاکستان ہیں۔ میں نے گال کا نشان دکھایا اور اس کا پس منظر بتا کر کہا کہ یہ ہے پاکستان سے میری محبت کا نشان تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو تمہارے جھگڑالو اور غنڈہ ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ میں صفائی پیش کرتا رہا۔ وہ لوگ میرے کمرے کی چیزیں اتھل پتھل کرتے رہے۔ میری شامت اعمال کہ چھوٹی سی میز پر انہیں بھارت کے پتے والے دو لفافے مل گئے جنہیں ٹکٹیں لگا کر ابھی پوسٹ کرنا تھا۔ مزید ستم یہ تھا کہ ایک لفافے کا مکتوب الیہ ہندو تھا۔ انہوں نے بڑی ڈھٹائی سے پھوپھا کے نام والا خط کھول ڈالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ اس خط میں صغریٰ کا بھی ذکر تھا جو میری پھوپھی زاد...... مجھ سے منسوب اور میرے خوابوں میں بسنے والی تھی۔ پاکستان جانے لگا تو پھوپھی نے کہا تھا کہ اپنی امانت چار کلمے پڑھوا کر ساتھ لے جاؤ' مگر میں پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا' سو وہ ابھی تک وہیں بھارت میں تھی اور میرے آئے دن کے خطوط دراصل اسی کے نام ہوتے تھے۔ پولیس والے بڑی مشکل سے میری وضاحتوں کو مانے' مگر جب دوسرا لفافہ کھولا تو مجھے گھورنا شروع کر دیا...... خط ہندی میں تھا جو میں اچھی طرح سیکھا ہوا تھا۔ ان سے خط کیا پڑھا جانا تھا۔ وہ مجھے اور خط دونوں کو اپنے ساتھ تھانے لے گئے۔ وہاں کون تھا جو ہندی تحریر پڑھتا۔ ادھر ادھر آدمی دوڑائے گئے۔ آخر کار ریڈیو پاکستان کے ایک بزرگوار آئے اور فرفر میرا خط پڑھنے لگے۔

دراصل کالج کے دور میں ایک ہندو میرا مخلص دوست بن گیا۔ میں پاکستان آ کر کبھی کبھار اسے خیر و عافیت لکھ دیتا تھا اور بجائے اردو یا انگریزی کے محض مذاقاً ہندی میں لکھتا تھا۔ اس خط میں کچھ اس قسم کے فقرے سن کر کہ ابھی صحیح جگہ نہیں ملی...... مناسب لوگ نہیں ملے......" پولیس والوں نے مجھے بھارتی جاسوس ہی سمجھ لیا تھا' لیکن شکر ہے انہوں نے فی الحال کوئی سخت قدم اٹھانے سے پہلے محض "کڑی نگرانی رکھی جائے" کی ہدایت پر مجھے چھوڑ دیا' مگر میرا خط مزید تفتیش کے لیے رکھ لیا...... مجھ پر انتہائی سخت ایام سایہ فگن ہو گئے۔ نوکری سے جواب' تھانے میں روزانہ

رپورٹ کرنے کی پابندی، اپنوں کی مکمل بے اعتنائی...... میں اسی پریشانی کے عالم میں ایک بڑی درگاہ کے قریب سے گزر رہا تھا کہ ایک عجب تماشا دیکھا۔ خلقت خدا کا ہجوم...... اس لیے کہ ملک کی ایک مشہور فلم اسٹار ایک فلم پروڈیوسر ڈائریکٹر کے ہمراہ درگاہ شریف پر دیگیں چڑھانے آئی ہوئی تھی کہ فلم کی شوٹنگ شروع کرتے وقت یعنی مہورت سے پہلے وہ اور اس کا ساتھی درگاہ میں جو دعا مانگ کر گئے تھے وہ قبول ہوگئی اور فلم سپرہٹ ہوئی تھی!

مجھے یہ منظر دیکھ کر عجیب سی گھن محسوس ہوئی، یعنی ہدایت پانے کے بجائے اب صوفیائے کرام سے عریاں رقصوں اور مناظر فلموں کی کامیابی کے لیے اللہ پاک کے حضور سفارشیں کرائی جا رہی ہیں! میں صورت حال سے دل برداشتہ تو تھا ہی اس شرک کو دیکھ کر سیدھا مسجد میں پہنچا اور سجدے میں گر کر رونے لگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری یہ کیفیت کتنی دیر رہی۔ اتنا جانتا ہوں کہ دو مہربان نگاہیں مجھے پیار سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ پاکستان کے ایک مشہور عالم و دانشور تھے۔ نماز باجماعت کے بعد مجھے اپنے گھر لے گئے۔ میری پریشانی کا حال سن کر وہ بولے کہ جہاں تک تمہاری ذاتی مشکلات کا تعلق ہے تو یاد رکھو، خوشی و غم، نشیب و فراز اور مقابلوں کی بھٹی سے گزر کر ہی آدمی کندن بنتا ہے۔ رہی تمہاری ناامیدی، مایوسی اور شکوے کہ تمہارا پاکستان تمہارے خوابوں اور تصورات کے عین مطابق کیوں نہیں نکلا...... تو عزیزم! یہ تو سوچو کہ یہ "مسجد" ہے تو سہی...... اگر آج اس کے زیر سایہ خرابات ہے تو کل انشاء اللہ اس میں اللہ کے بندے نمازیں بھی پڑھنے لگیں گے...... خرابات کی وجہ سے مسجد کے وجود سے متنفر نہیں ہونا چاہیے۔ آج اس سائبان کے نیچے برائیاں پروان چڑھ رہی ہیں تو کل یہاں نیکیاں بھی ہو سکتی ہیں...... مگر سائبان تو ہر حال میں سر پر رہنا چاہیے۔ وہ دو گھنٹوں کا ساتھ...... اس دانشور کا...... میرے خیالات پر حاوی قنوطیت کی ساری میل دھو گیا اور رجائیت کا درس دے گیا۔ ہاں، میں ان بزرگوار سے متفق ہو گیا کہ پاکستان سلامت رہے، قائم و دائم رہے۔ مکین اچھے ہیں یا برے، مکان کو گزند سے بچانے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ میں نے حقیقتوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ملازمت کے لیے از سر نو کوشش شروع کر دی۔ دو ماہ بعد پولیس والوں کی تفتیش نے مجھے بے ضرر قرار دے دیا۔ میری جان چھوٹ گئی...... لیکن حقائق سے لڑا جا سکتا ہے، تقدیر سے نہیں۔

چھ سات ماہ کچھ تجارتی فرموں میں جز وقتی حساب اور کھاتوں کا کام کر کے پیٹ پالتا رہا۔ اچھی ملازمت ملنے کی امید ہوگئی تھی کہ......

بھارت سے صغریٰ کا خط ملا۔ پھوپھی جان، میرے والد کی اکلوتی اور چہیتی بہن کا سہاگ اجڑ گیا۔ پھوپھا کے محلے باڑہ ہندو راؤ میں بلوائی پہنچ گئے۔ ان کا ایک نیک دل ہندو دوست بلوائیوں سے پہلے آ کر پھوپھی، صغریٰ اور دوسرے چھوٹے بچوں کو لے گیا اور اپنے گھر میں حالات ٹھیک ہونے تک پناہ دے دی۔ وہ برسوں کے جگری دوست کو تلاش کرتا رہا، مگر پھوپھا جو حملے کے وقت گھر سے باہر تھے، بلوائیوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے!

صغریٰ کا خط پا کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ یہاں پاکستان میں عزیزوں نے خبر سن کر کسی صدمے کا اظہار نہ کیا۔ روپے کی ریل پیل نے جذبے سرد کر دیے تھے اور احساسات منجمد۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ صغریٰ ہی پھوپھا کی اولاد میں سب سے بڑی تھی۔ پھوپھی بھارت میں اکیلی رہ گئی ہیں اور صغریٰ کو بھی سہارا درکار ہے تو کیا میں یہاں بیٹھا رہوں؟ ان لوگوں کو بے سہارا چھوڑ دوں؟ صغریٰ کو بھول جاؤں؟ ان سب سوالوں کا میں نے ایک ہی جواب دیا......

ان دنوں ابھی سندھ راجستھان کے راستے لوگ بلا روک ٹوک آ جا رہے تھے، چنانچہ میں دلی پہنچ گیا۔ پتہ چلا کہ ہمارا چھوٹا سا آبائی مکان

متروکہ املاک والوں نے ہتھیا لیا ہے۔ ایک بیگہ زمین پر وہی چمار قابض ہو گئے ہیں جو اس پر موسموں کے مطابق ساگ سبزیاں اگا کر کچھ رقم ہمیں پہنچا جاتے تھے۔ میں نے واپس اس شہر میں جانا مناسب نہ سمجھا۔ دلی میں حالات نارمل ہو گئے تو صغریٰ سے نکاح پڑھوالیا...... وہی صغریٰ جو اس وقت تمہاری بیگم کے پاس بیٹھی گپیں لگا رہی ہوگی۔ پھر بڑے دنوں تک میرے اور پھوپھی جان کے درمیان کش مکش جاری رہی۔ میں چاہتا تھا کہ سسرال والوں کو لے کر پاکستان چلا جاؤں' حالانکہ یہ اب خاصا مشکل کام تھا کیونکہ بلا روک ٹوک سرحدیں عبور کرنا اب ممکن نہیں تھا۔ پھوپھی کہتی کہ تم میرے مرحوم بھائی کی نشانی...... میری بیٹی کے مجازی خدا ہو۔ تمہارے پھوپھا کا دلی کی قطب روڈ پر سوت دھاگے کا اچھا خاصا نفع بخش کاروبار ہے تم اسے سنبھال لو۔

میں شاید آخر کار انکار کر دیتا' مگر ان ہی دنوں...... یاد ہے نا کمرشل جیوگرافی کے پروفیسر صبغت اللہ خان؟ وہی کٹر کانگرسی' گاندھی بھگت!...... وہ دو برس سے کانگرسی نیشنلسٹ مسلمانوں کے گڑھ جامعہ ملیہ دہلی میں پڑھا رہے تھے۔ وہی پروفیسر صاحب مجھے مل گئے۔ باتیں ہوئیں تو پتہ چلا کہ دوقومی نظریے کی مخالفت سے نہ صرف تائب ہو چکے ہیں بلکہ اس بات کے بھی قائل ہو گئے ہیں کہ پاکستان نہ بنتا تو اس جغرافیائی خطے میں بسنے والے مسلمان بھی بھارتی مسلمانوں کی طرح خوار و زبوں حال ہوتے اور آج بھارت کے مسلمانوں کو جو بھی تقویت پہنچتی ہے وہ پاکستان کی مضبوطی اور ترقی ہی سے پہنچتی ہے۔ بظاہر مجھے جلد از جلد پاکستان لوٹ جانے کا جواز اس سابق کانگرسی مسلمان عالم کی باتوں سے مل رہا تھا' مگر میں نے اس وقت بھارت ہی میں رہ جانے کا فیصلہ کر لیا جب انہوں نے میری ساری کتھا سن کر یہ کہا: ''محمد انور! مجھے پچھلے دنوں بھارتی پنجاب کے دورے میں بے شمار چھوٹی بڑی مسجدیں بتکدے بنی ہوئی یا ٹوٹے میناروں اور شکستہ پاروں کے ساتھ اپنی بے سروسامانی اور بے حرمتی کا نوحہ پڑھتی نظر آئیں...... سوچو اگر بھارتی پنجاب کے مانند پورے بھارت کے مسلمان یہاں سے کوچ کر گئے تو...... دلی کی جامع مسجد' بنارس اور متھرا کی عالمگیری مسجدوں اور فیض آباد کی بابری مسجد کا کیا حشر ہوگا...... اس لیے پاکستان کو اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھ کر پاکستانیوں پر چھوڑ دو۔ آؤ! تم' میں اور بارہ کروڑ بھارتی مسلمان...... یہاں اس کفرستان میں ایک نیا پاکستان بنائیں...... نعروں سے نہیں' حسن تدبر اور اسلامی اخلاق سے!

جدہ سے بمبئی کی فلائٹ پر سوار ہوتے وقت محمد انور اور بھی خوبرو دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے گال کا نشان ایک نئے پاکستان کا نشان لگ رہا تھا۔

(محمد علی۔ اردو ڈائجسٹ اگست 1996ء)

داستان مجاہد

عظیم اسلامی ناول نگار نسیم حجازی کا ایک ایمان افروز ناول۔ مجاہدوں کی زندگی کی ایک مختصر سی جھلک۔ نسیم حجازی کے اسلامی ناولوں کی پہلی کڑی۔ یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

آزاد کشمیر کا ایک زندۂ جاوید مجاہد

آزاد کشمیر کے مشہور گاؤں تھروچی کے ریٹائرڈ لیفٹیننٹ کرنل محمود خاں صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو خاموشی کے ساتھ قوم کی خدمت میں مصروف ہیں۔ پینسٹھ اور ستر کے پیٹے میں ہیں۔ دوہرا بدن، سر اور ڈاڑھی کے بال چاندی کے تار، پیشانی کشادہ اور روشن، آنکھوں میں بلا کی چمک، ان کی بزرگی اور عظمت کا منہ بولتا ثبوت۔ ان کی عظمت کردار کی بابت تھروچی اور پنجن کی وسیع عریض وادیوں میں آباد عوام سے پوچھیے۔

مجھے ان کی ذات سے عقیدت اس وقت پیدا ہوئی تھی جب 47-1946ء کے پرآشوب زمانے میں کفر و اسلام کی قوتیں باہم متصادم تھیں۔ یہ حریفانہ کشمکش انڈین آرمی میں بھی پھیل چکی تھی۔ ہندو آفیسر اور سردار کانگریس کے ترجمان بن کر مسلمان فوجیوں کے ذہنوں کو اکھنڈ بھارت کے لیے تیار کر رہے تھے۔ ایسے نامساعد حالات میں کرنل محمود خاں نے (جو اس وقت فرنٹیئر فورس رجمنٹ کی ایک بٹالین میں آنریری کپتان تھے) غیر معمولی جرأت سے کام لے کر مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان سے مسلمان فوجیوں کو لذت شناس کیا اور اس وجہ سے وہ متعصب ہندو افسروں کی نظر میں خار بن کر کھٹکنے لگے۔

وسط 1946ء میں محمود خاں صاحب فوج سے ریٹائرڈ ہو کر اپنے گاؤں پہنچے۔ تقسیم برصغیر کے بعد جب ریاست کے مسلمان اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے منظم ہونے لگے، تو غاصب ڈوگرہ حکمران نے احتیاطی تدابیر زیادہ سخت کر دیں۔

انہی دنوں مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست کا طوفانی دورہ کیا اور خاص خاص مقامات پر فوجی چھاؤنیاں قائم کر دیں۔ جب ڈوگر حکمران کوٹلی میں وارد ہوا تو مقامی ہندوؤں نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ وہ کوٹلی میں ایک روز ٹھہرا۔ اسی روز کرنل محمود خاں بھی کوٹلی پہنچ گئے۔ فوجی وفد کو لے کر مہاراجا سے جا ملے اور مہاراجا کو مسلمان کوٹلی پر ڈوگرہ فوج، پولیس اور حصول حکام کے مظالم سناتے ہوئے الحاق کے بارے میں مسلمانوں کی خواہش بھی بیان کر دی۔ یہ ایک ایسی جسارت تھی جسے مہاراجا برداشت نہ کر سکا۔ وہ بپھرا اور پھر غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اس نے ملاقات ختم کر دی۔ اس کے چند روز بعد جامع مسجد کوٹلی میں مسلمانوں کا جلسۂ عام ہوا اور ریاست کے الحاق کے بارے میں چند اکابرین نے اظہار خیال کیا، مگر واضح طور پر کوئی بھی الحاق پاکستان پر زور نہ دے سکا۔ اس موقع پر کرنل صاحب سٹیج پر آئے اور واشگاف الفاظ میں مطالبہ کیا:

”مہاراجا کو چاہیے کہ ریاست کی اکثریت کے مطالبے کا احترام کرتے ہوئے پاکستان سے الحاق کا اعلان کرے۔ اگر وہ اس کے برعکس کوئی اور فیصلہ کرے گا، تو مسلمانان کوٹلی مسلح جدوجہد کریں گے۔“

انتظامیہ جلسہ ختم ہوتے ہی کرنل صاحب کو گرفتار کر لینا چاہتی تھی، مگر وہ باہر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب ان کے لیے خاموش

تماشائی بنے رہنا ناممکن ہو گیا۔ حالات کا سنجیدگی سے جائزہ لینا شروع کیا۔ اس وقت ڈوگرہ حکومت کے فوجی استحکامات یہ تھے:

(الف) ایک ڈوگرہ بٹالین کوٹلی میں مقیم تھی اور اس کے چند دستے سرحد ریاست پر موجود تھے۔

(ب) دوسری بٹالین میرپور میں مقیم تھی۔

(ج) تیسری بٹالین اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر جھنگڑ دھرسال میں موجود تھا۔

(د) کوٹلی میں دس ہزار سے زائد سنگھی غنڈے موجود تھے جن کو مسلح کیا گیا تھا۔

ایسے حالات میں کسی قسم کی مسلح جدوجہد بظاہر ناممکن نظر آتی تھی۔ انہی دنوں جھنگڑ میں مقیم سیکنڈ کشمیر انفنٹری بٹالین قلعہ تھروچی کی حفاظت کے لیے بھیجی گئی۔ کرنل صاحب نے اس ڈوگرہ بٹالین کے مسلمان کمانڈنگ افسر کو قلعہ کے آس پاس مسلح مجاہدین کی موجودگی سے خائف کر کے مشورہ دیا کہ خیریت اسی میں ہے کہ قلعہ خالی کر کے واپس جھنگڑ دھرسال چلے جائیں۔ چنانچہ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور بٹالین قلعہ خالی کر کے چلی گئی۔ کرنل صاحب نے قلعہ خالی پا کر پاکستان کا ہلالی پرچم لہرا دیا اور اس کی حفاظت کے لیے اپنے کنبے کے چند نوجوانوں کو ذاتی اسلحہ دے کر قلعے میں بٹھا دیا۔ ساتھ ہی مجاہدین سے کمک طلب کی۔ ادھر جب سیکنڈ کشمیر جھنگڑ کیمپ میں پہنچی، تو اس پر بریگیڈیئر عتاب نازل ہوا۔ بٹالین کو دوبارہ قلعہ تھروچی پر قابض ہونے کے لیے احکام دیے گئے۔ اس سے پہلے کہ قلعے پر مجاہدین کو کوئی کمک پہنچتی، سیکنڈ کشمیر بٹالین واپس آ گئی اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس دفعہ بٹالین کی کمان کرنل حمید کی جگہ کیپٹن رحمت اللہ خان کے سپرد تھی۔ رحمت اللہ خاں ایک دردمند مسلمان تھے۔ انہوں نے از خود کرنل محمود خاں سے رابطہ قائم کیا اور دونوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ طے پایا۔ پروگرام کے مطابق اس بٹالین کو دوسری بار قلعہ خالی کر کے جھنگڑ کیمپ کی طرف روانہ کیا گیا اور جب راستے میں موضع جونہ کے ریسٹ ہاؤس کے علاقے میں مجاہدین نے ہراول دستے پر فائر کیا، تو بٹالین نے سٹ کرڈ بریاں کے ہائی گراؤنڈ پر پوزیشن سنبھال لی۔ دو غیر مسلم کمپنیاں فرنٹ پر متعین ہوئیں اور عقب میں دو مسلمان کمپنیاں۔ رات کو مجاہدین نے زوردار حملہ کیا۔ بزدل ڈوگرے اور گورکھے بوکھلا گئے، زیادہ دیر مزاحمت نہ کر سکے۔ بیشتر مارے گئے جو موت کے خوف سے بھاگے، وہ محاصرین کی گولیوں کا شکار ہو گئے۔ یوں اس معرکے میں مجاہدین کو واضح فتح ہوئی۔ لاتعداد اسلحہ اور گولہ بارود غنیمت میں ہاتھ آیا۔

وسط ماہ اکتوبر میں کرنل محمود خاں نے ان غیر منظم جتھوں کو سپاہی علاقہ سہنہ کے مقام پر جمع کیا اور کوٹلی بٹالین کی تشکیل کر کے باقاعدہ ٹریننگ شروع کر دی اور جب بٹالین بقدر ضرورت اسلحے سے لیس ہو گئی، تو اسے محاذ جھنگڑ پر لے آئے۔

24 دسمبر 1947ء کو سدھن بریگیڈ نے ٹائیں پہاڑی پر، ریاست دیر کے لشکر نے متلاشی پہاڑی پر اور کوٹلی بٹالین نے وادی میں سے ہو کر جھنگڑ پر حملہ کیا۔ ایک مختصر، مگر خونریز جنگ کے بعد مجاہدین نے بھارتی کیمپ پر قبضہ کر لیا۔ دشمن بے شمار لاشیں، قیمتی سامان جنگ اور لاتعداد فوجی گاڑیاں چھوڑ کر ایسا بھاگا کہ نوشہرہ کیمپ میں جا کر دم لیا۔ مجاہدین نے تعاقب کر کے دشمن کو محصور کر لیا۔

اسکے بعد حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ مجاہدین نے دیوی گڑھ کی پہاڑی پر پوزیشنیں جمالیں۔ دُشمن کی کمک ہر روز پہنچتی رہی۔ اسلحہ اور تعداد کی برتری اور ہوائی چھتری کے بل پر دُشمن نے ہر روز تازہ دم نفری میدان میں جھونکی، مگر مجاہدین کی سرفروشانہ یلغار کے سامنے دُشمن کی کچھ پیش نہ گئی۔

ایک روز ان کے کردار کی ایک ایسی جھلک دیکھی جسے میں کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ وسط ماہ اکتوبر 1948ء میں کرنل صاحب کا منجھلا لڑکا عظمت اللہ خاں سخت بیماری کی حالت میں گھر سے ہیڈ کوارٹر میں لایا گیا۔ کرنل صاحب محاذ کی ذمہ داریوں کی وجہ سے بہت عدیم الفرصت تھے‘ اس لیے بیمار بیٹے کی عیادت یا علاج کا انہیں کچھ کم موقع ملا۔

اکتوبر 1947ء کے آخری ہفتے کی ایک طوفانی رات کو جبکہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی‘ رعد کی کڑک اور بجلی کی چمک سے دل دہل رہے تھے‘ مرحوم عظمت اللہ کی حالت خراب ہونے لگی۔ کرنل صاحب‘ میں اور چند دوسرے مجاہدین چارپائی کے پاس بصد حسرت و یاس کھڑے تھے۔ مریض پر سکرات کا عالم تھا۔ کرنل صاحب کے چہرے پر کرب کی ہلکی سی جھلک صاف پڑھی جاسکتی تھی۔ اسی اثنا میں دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور پھر دروازے میں صوبیدار فیض طلب خاں زخمی حالت میں نمودار ہوئے۔ کہنے لگے: ’’کرنل صاحب‘ عظمت اللہ کی چارپائی اور ہیڈ کوارٹر فوراً کہیں پیچھے محفوظ جگہ پر منتقل کردو‘ دشمن نے کیری کی پہاڑی پر قبصہ کرلیا ہے اور میری نفری منتشر ہوگئی ہے۔‘‘

اس ناخوشگوار صورت حال سے ہم سب تھوڑی دیر کے لیے فکرمند ہوئے۔ اتنی تیز بارش اور اتنی تاریک رات میں ہیڈ کوارٹر کا انخلا کیسے عمل میں لایا جاسکے گا۔ میں نے کرنل صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ پرسکون تھے‘ کسی خوف یا دہشت کے آثار ان کے چہرے پر نہ پائے جلد ہی انہوں نے مختصر احکام جاری کیے: ’’ہیڈ کوارٹر کے تمام جوان فوراً جمع کرو‘ ہم کیری پر فوری جوابی حملہ کریں گے۔‘‘

’’اور ہیڈ کوارٹر کہاں منتقل کیا جائے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’کہیں نہیں۔‘‘ کرنل صاحب نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ میں نے باہر نکل کر ہیڈ کوارٹر کے جوانوں کو جمع کرنا شروع کیا۔ جب سب لوگ تیار ہوگئے‘ تو میں نے کرنل صاحب کو رپورٹ دے دی: ’’جناب‘ ہم تیار ہیں۔‘‘ کرنل صاحب جاں بہ لب عظمت اللہ کی طرف جھکے‘ مرحوم کے سر پر دست شفقت پھیرا اور پھر تن کر کھڑے ہوگئے۔ چارپائی سے اپنی سٹین گن اٹھائی اور دروازے سے باہر نکل گئے۔ حاضر نفری کو ہمراہ لیا۔ تیز بارش اور انتہائی تاریک رات میں طغیانی میں آئے ہوئے نالے کو عبور کر کے دشمن پر بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑے۔ دشمن اس غیر متوقع حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ وہ لاتعداد لاشیں چھوڑ کر کیری سے پسپا ہوا اور کیری پر دوبارہ ہمارا قبضہ ہوگیا۔ رات کے بقیہ حصے میں ہم کیری پر اپنی پوزیشن مستحکم کرنے میں مصروف رہے۔ صبح ہوئی تو کرنل صاحب نے مورچوں کا معائنہ کیا اور ہیڈ کوارٹر کی طرف چل پڑے۔ قریب پہنچے تو عظمت اللہ کے کمرے سے کسی کے رونے کی آواز سنی۔ ہم دھڑکتے دل سے کمرے میں داخل ہوئے‘ عظمت کی نعش کے گرد اشکبار لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ ہم سب اس بے بسی کی موت پر روئے‘ مگر کرنل صاحب خاموشی سے لاش کو تکتے رہے۔ نہ کوئی آہ نہ آنسو۔ ہم سب نے کرنل صاحب کو مجبور کیا کہ وہ میت کے ساتھ گھر چلے جائیں اور تدفین کے بعد آجائیں‘ مگر انہوں نے اس تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا: ’’عظمت تو مر گیا‘ ایک لاش کی تدفین کے لیے چند روز محاذ سے غیر حاضر رہنا ہمارے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ اسے گھر بھجوا دو۔‘‘ میں نے جلد جلد نعش کو گھر بھیجوانے کا انتظام کیا۔ میت کی روانگی کے بعد کرنل صاحب محاذ کی ذمہ داریوں میں حسب معمول مصروف ہوگئے۔

(میجر محمد اقبال کوٹلوی ڈائجسٹ)

آزادی کے سائے میں

1947ء میں مسلمانانِ دلی پر ڈھائے جانے والے مظالم کی چشم دید روداد ڈاکٹر عبارت بریلوی

18 اگست 1947ء کو ہندو کالج کے پروفیسر اور میرے دیرینہ دوست راجندر ناتھ شیدا مجھ سے ملنے اور حال احوال معلوم کرنے عربک کالج میں آئے اور دیر تک اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتے اور مشورے دیتے رہے، ریڈیو ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ پانچ بجے کے قریب ریڈیو پر اعلان کیا گیا کہ دلی کی فضا خراب ہے۔ اس لیے شہر میں 72 گھنٹے کا کرفیو لگا دیا گیا ہے۔

دلی کی انتظامیہ ان دنوں مفلوج ہو چکی تھی۔ حکومت نے صاحبزادہ خورشید احمد خاں کو دلی کا چیف کمشنر بنا رکھا تھا، لیکن وہ بہت کمزور آدمی ثابت ہوئے۔ وہ ہندوؤں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ انتظامیہ کی قوت کا سرچشمہ ڈپٹی کمشنر رندھاوا تھا۔ اس کی شہرت پہلے بہت اچھی تھی اور تعصب اس میں نام کو نہ تھا، لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ بالکل بدل گیا اور اس نے شرپسندوں کی سرپرستی شروع کر دی۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ اس کے بعض عزیز مغربی پنجاب کے ہنگاموں میں مارے گئے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ اس کا بدلہ دلی کے مسلمانوں سے لینے لگا۔ اس تعصب نے دلی کی سرزمین پر خون کے دریا بہا دیے۔

اب دلی میں مسلمانوں کا باقاعدہ قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ حملہ آور ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ کے باوردی سپاہی اور اکالی دل کے جنگ جو سکھ تھے جو خودکار ہتھیاروں سے لیس تھے۔ وہ مختلف محلوں میں خوف و ہراس پھیلا کر مسلمانوں کو گھروں سے باہر نکالنے اور انہیں موت کے گھاٹ اتارنے لگے۔ ان لوگوں نے ایک منصوبے کے تحت دلی کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ ریلوے اسٹیشن اور ہوائی اڈے کو مقتل بنا دیا گیا تھا جو مسلمان بھی وہاں گیا، اسے قتل کر دیا گیا۔ ریل گاڑیوں میں لاشوں کے انبار ہوتے اور خون ہی خون نظر آتا۔ ہندو انتہا پسندوں نے پولیس اور فوج کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے محلوں پر حملوں کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔ جن محلوں میں مسلمان کم تھے، وہ بیچارے پہلے ہی اپنے گھروں کو چھوڑ کر محفوظ مقامات کی تلاش میں چلے گئے تھے، لیکن جہاں وہ اکثریت میں تھے وہاں ان پہ رات گئے حملے کا سلسلہ جاری رہتا۔ مسلمان اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے۔ ان پر ہر طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی۔ اس طرح نہتے مسلمان قتل ہوتے رہے۔ صبح اخبارات میں معمولی سی یہ خبر شائع ہو جاتی تھی کہ شہر میں صرف ایک واردات ہوئی اور اس کے ذمے دار مسلمان تھے۔

سب سے پہلے قرول باغ میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری شروع ہوئی۔ یہ علاقہ شہر کے باہر تھا۔ مسلمانوں کی آبادی اچھی خاصی تھی۔ مسلمانوں کے گھروں پر نشان لگا دیے گئے تھے۔ ان مکانوں پر حملے ہوئے، سامان لوٹ لیا گیا اور بے شمار مسلمان یہاں قتل ہوئے۔ قرول باغ میں

جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم تھا جس کے ساتھ بہت بڑا مکتبہ اور لائبریری تھی۔ جامعہ کے لوگ بیشتر قوم پرست تھے اور کانگرس کا دم بھرتے تھے‘ لیکن انہیں بھی نہیں بخشا گیا اور لائبریری کو آگ لگا دی گئی۔ ایک اسکول میں امتحان ہو رہا تھا جہاں مسلمان بچوں کو ایک کمرے میں جمع کر کے قتل کر دیا گیا۔

پھر لودھی کالونی کی باری آ گئی۔ مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لی گئی اور ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے اپنے مکانوں میں اسلحہ جمع کر رکھا ہے۔ اس آبادی میں زیادہ تر سرکاری ملازمین رہتے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ کہاں سے آتا۔ کسی کے گھر سے ترکاری کاٹنے والی چھری‘ کھرپا یا پھاوڑا برآمد ہوا تو ان چیزوں کو اسلحہ تصور کیا گیا اور اسی بنا پر پولیس کے سپاہی گولیاں چلاتے رہے اور سکھ کرپانیں اور تلواریں لے کر آ گئے۔ انہوں نے نہتے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور آبادی کے بیشتر لوگ مقابلے میں کام آئے۔

اگلے روز خبر آئی کہ سبزی منڈی میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ یہاں آباد مسلمان اچھے دولت مند تھے اور ان کے پاس اسلحہ بھی تھا‘ اس لیے جب ان پر حملے شروع ہوئے تو انہوں نے دشمن کو منہ توڑ جواب دیا۔ انہوں نے مورچے بنا لیے اور ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جب ان کے مقابل فوج آ گئی تو ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ وہ پسپا ہو گئے اور اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ یہاں بھی مسلمانوں کا بری طرح قتل عام ہوا اور عورتوں کی زبردست بے حرمتی ہوئی۔ دو تین دنوں کی اس معرکہ آرائی میں اس آبادی میں مسلمانوں کا نام بھی باقی نہ رہا۔ شرنارتھی ان کے مکانوں میں داخل ہو گئے‘ مال و اسباب پر قبضہ کیا اور اپنی آبادکاری کی اسکیم مکمل کر ڈالی۔

اب پہاڑ گنج کی بھاری بھر کم مسلم آبادی میں قتل و غارت شروع ہوئی۔ یہاں بھی خاصے متمول مسلمان رہتے تھے۔ انہوں نے بڑی دلیری اور جی داری سے مقامی ہندوؤں اور سکھوں کا مقابلہ کیا لیکن جب یہاں بھی پولیس اور فوجی جدید اسلحے کے ساتھ آ گئی تو پہاڑ گنج کی سڑکوں پر بھی مسلمانوں کا خون بہنے لگا۔ بے شمار مسلمان یہاں مارے گئے۔ عورتیں بڑی تعداد میں اغوا ہو گئیں‘ سینکڑوں خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔ ہندو غنڈوں نے گھروں کا سامان لوٹ لیا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ جو گھر سے باہر نکل کر بھاگا‘ وہ راستے ہی میں مارا گیا۔ کسی کے ہاتھ کاٹ کر اسے تڑپتا چھوڑ دیا گیا‘ کسی کے پاؤں کاٹ دیے گئے‘ کسی کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ لاشیں کئی دن تک سڑتی رہیں۔ ہوا کے ساتھ ان کی بو اینگلو عربک کالج تک آتی رہی اور ہم لوگ یہاں دبکے ہوئے اپنی موت کا انتظار کرتے رہے۔

دلی کے دوسرے محلوں میں بھی کم و بیش یہی حال ہوا۔ کئی دنوں تک جگہ جگہ حملے ہوتے رہے اور مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہا جو تقریباً تین ہفتے جاری رہا۔ مسلمانوں پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے گئے جو چشم فلک نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بلاشبہ انسانی تاریخ میں ایسی سفاکی کا مظاہرہ شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ دلی تباہ ہو گئی اور اس شہر بے مثال کے اندر اور باہر ایک قلزم خون موج زن نظر آنے لگا۔

ہمارا کالج ابھی تک ظالموں کی دست برد سے محفوظ تھا‘ لیکن اس کے آس پاس خون کے سمندر موجزن تھے۔ ہر وقت گولیوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں‘ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک دن میں یہ گولیاں ہمارے سینوں پر چلیں گی۔ ان دنوں ایک الو کالج کے اونچے اونچے درختوں پر رات بھر بولا کرتا تھا اور اس کی تیز آواز ہمارے سینوں میں کٹار بن کر اترتی تھی۔

اس پریشان کن فضا میں ہم نے کئی دن شدید کرب کے عالم میں گزارے۔ آخر کار 7 ستمبر کو جب کالج کے اردگرد بھی گولیوں کی آوازیں

آنے لگیں تو ہم لوگوں نے انخلا کا فیصلہ کرلیا اور پاکستان ہائی کمیشن سے امداد کے لیے رابطہ قائم کیا۔ اس زمانے میں سید زاہد حسین پاکستان کے ہائی کمشنر تھے۔ انہوں نے بڑا کرم فرمایا اور تین بڑی گاڑیاں ہمیں ہائی کمیشن لے جانے کے لیے بھجوا دیں جبکہ دو گاڑیاں ہمارے پاس پہلے ہی سے موجود تھیں۔

ہم لوگوں نے ایک ایک سوٹ کیس اپنے ساتھ لیا اور باقی چیزیں وہیں چھوڑ دیں۔ خیال تھا کہ چند روز بعد حالات معمول پر آ جائیں گے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ دلی میں قیامت برپا تھی اور ہندو فرقہ پرستوں کا منصوبہ تھا کہ وہ کالج پر قبضہ کرلیں گے۔ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ سامان جلا دیں گے اور کالج شرنارتھیوں کا کیمپ بن جائے گا یا پھر لاہور کے کسی ہندو کالج کو الاٹ کر دیا جائے گا۔

ہم یہ سوچ سوچ کر سخت پریشان تھے کہ مسلمانوں کا یہ تاریخی کالج اب انہیں کبھی واپس نہ مل سکے گا۔ اس کی سنگ سرخ کی خوبصورت مسجد مندر میں تبدیل کر دی جائے گی۔ مسجد کے برابر بانی کالج نواب اعتماد الدولہ کا مقبرہ کھود ڈالا جائے گا۔ وہ کمرے جن میں کبھی حالی‘ نذیر احمد اور محمد حسین آزاد رہا کرتے تھے ان میں جٹا دھاری پنڈت بسیرا لینے لگیں گے۔ کالج میں آئندہ صرف ہندو اور سکھ طالب علم تعلیم حاصل کریں گے اور مسلمانوں کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔

میں نے کالج ہوسٹل کے ہیڈ باورچی استاد سبطی سے کہا کہ تمہارے پاس راشن کا جو بھی سامان ہے وہ بھی گاڑیوں میں رکھ لو۔ خدا جانے کب اور کس حال میں اس کی ضرورت پڑ جائے‘ چنانچہ سبطی نے کالج کے ملازمین میں یاسین‘ حسن اور شیر خاں کی مدد سے یہ سارا سامان گندم‘ چاول اور شکر وغیرہ گاڑیوں میں رکھ لیا جو بعد میں ہمارے بہت کام آیا۔

پاکستان ہائی کمیشن کا راستہ کچھ کم پر خطر نہ تھا۔ جگہ جگہ ہندو اور سکھ شرپسند اور فوجی پوزیشنیں سنبھالے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان لوگوں نے ہماری گاڑیوں پر بھی فائرنگ کی لیکن نشانے ٹھیک نہ لگے اور ہم بخیریت پاکستان ہائی کمیشن پہنچ گئے۔

پاکستان ہائی کمیشن پر قیامت کا سماں تھا۔ لٹے پٹے اور پریشان حال مسلمانوں کا وہ ہجوم کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ایسے میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پوچھا: ’’آپ پر کیا گزری؟ آپ تو یونیورسٹی میں تھے جو بظاہر محفوظ جگہ تھی۔‘‘ فرمانے لگے: ’’خیال تو ہمارا بھی یہی تھا کہ یہاں کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا‘ لیکن علی الصبح ہمارے گھروں پر حملہ ہوگیا۔ حیرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ وہ ہندو اور سکھ لڑکے بھی اس میں شریک تھے جو ہمارے شاگرد تھے‘ لیکن وہ اب ہم لوگوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے اور لوٹ مار کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے ہمیں ایک لمحے کی بھی مہلت نہیں دی اور ہم سب اپنے گھروں کو چھوڑ چھاڑ کر یہاں آ گئے۔ غنیمت ہے کہ ہماری جانیں بچ گئیں ورنہ اس ماحول میں سب کچھ ہو سکتا تھا۔‘‘

پاکستان ہائی کمیشن میں ہم صرف چوبیس گھنٹے ٹھہرے اس دوران معلوم ہوا کہ پرانے قلعے میں لٹے پٹے مسلمانوں کے لیے فوجی کیمپ کھول دیا گیا ہے۔ پاکستانی ہائی کمیشن نواب زادہ لیاقت علی خاں کی کوٹھی ’’گل رعنا‘‘ میں قائم کیا گیا تھا۔ نواب زادہ صاحب نے پاکستان جانے سے قبل حکومت ہند سے یہ طے کروا لیا تھا کہ اس میں ہمیشہ پاکستان ہائی کمیشن کا دفتر قائم رہے گا۔ یہ نواب زادہ صاحب کا ایثار تھا اور اس کے عوض انہوں نے پاکستان سے کچھ حاصل نہیں کیا۔

ہم نے سید زاہد حسین صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ پاکستان ہائی کمیشن کو الوداع کہا اور پرانے قلعے روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچے تو مغرب کا وقت

ہو چکا تھا۔ قلعے میں ہزاروں لٹے پٹے خاندان آ گئے تھے۔ یہ قلعہ کیا تھا' اچھا خاصا کھنڈر تھا جس کے میلوں پھیلے ہوئے رقبے کو صدیوں پرانے پتھروں کی اونچی اونچی فصیلوں نے گھیر رکھا تھا۔ اندر سوائے ہمایوں کے کتب خانے اور شیر شاہ کی تعمیر کردہ مسجد کے کوئی قابل ذکر عمارت نہیں رہ گئی تھی۔ قلعے میں جگہ جگہ خاردار جھاڑیاں اور ببول کے درخت تھے یا پھر خودرو گھاس تھی۔

نام نہاد آزادی ہند کے بعد جن سنگھ کے ہندو شرپسندوں اور اکالی دل کے ظالم سکھوں نے دلی میں ہزاروں مسلمانوں کو قتل کیا' ہزاروں کو زخمی اور اب لاکھوں بے سروسامان انسانوں کو اس قلعے کے اندر دھکیل دیا تھا جہاں سر چھپانے کے لیے کوئی چھت تھی' نہ بارش اور دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی اور صورت! سایہ دیوار تک ان کے نصیب میں نہیں تھا۔

اینگلو عربک کالج کے پروفیسر' طالب علم اور ملازمین وغیرہ سب ملا کر کوئی پچاس ساٹھ آدمی تھے۔ ہم سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں پرانے قلعے کا چکر لگانا چاہیے' چنانچہ ہم لوگ اپنے مشن پر نکلے۔ ہم ایک ایک خاندان کے پاس گئے۔ ان کی بپتا سنی جس کو سن کر ہمارے سینے شق ہو گئے۔ ہم نے لوگوں سے کہا کہ اب آپ کو کچھ عرصے یہیں رہنا ہے۔ جب پاکستان اور بھارت کی حکومتیں باہم فیصلہ کریں گے تب آپ لوگ پاکستان جائیں گے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ درختوں کی شاخیں کاٹ لیں اور انہیں زمین میں گاڑ کر چادریں تان لیں تاکہ رات کی شبنم اور دن کی دھوپ سے کچھ تو محفوظ رہیں۔ ہمارے مشورے کا یہ اثر ہوا کہ تھوڑی دیر میں لوگوں نے درختوں کی شاخیں کاٹ ڈالیں اور انہیں زمین میں گاڑ کر چادریں یا عورتوں کے دوپٹے تان لیے۔ یہاں بڑی سخت بے آرامی تھی' لیکن یہ اطمینان ضرور تھا کہ اب یہاں ہندوؤں اور سکھوں کے ان پر حملے نہیں ہوں گے کیونکہ بلوچ رجمنٹ کے مسلح جوانوں نے کیمپ کی حفاظت کا کام سنبھال لیا تھا۔

بہر حال یہ رات قیامت کی رات تھی۔ لاکھوں آدمی عالم کسمپرسی میں قلعے کے اندر اور باہر پڑے تھے۔ یہاں کھانے کے لیے کوئی چیز تھی نہ پینے کے لیے پانی۔ قلعے کے باہر سڑک کے کنارے صرف ایک نل تھا جس سے لوگ لمبی لمبی قطاروں میں پانی لینے کے لیے کھڑے تھے۔ یہ نل اس وقت لگایا گیا تھا جب دوسری جنگ عظیم کے جاپانی قیدی یہاں رکھے گئے تھے۔ اس منظر نے کربلا کی یاد زندہ کر دی تھی۔ کسی کو پانی ملا' کسی کو نہ ملا۔ کیمپ میں مردوں اور عورتوں کے علاوہ بچے بھی موجود تھے۔ یہ بیچارے بھوک اور پیاس کے مارے روتے اور چلاتے تھے' لیکن ان کی آہ و زاری کا کوئی علاج نہ تھا۔ جہاں پانی نہ ملتا ہو وہاں دودھ کہاں۔ غرض قلعے میں حشر کا سماں تھا۔

اہل قلعہ پر یہ مصیبتیں تو تھیں ہی کہ رات گئے بارش ہونے لگی اور بارش بھی ایسی موسلا دھار کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ وہ چادریں اور عورتوں کے دوپٹے جو انہوں نے شبنم اور دھوپ سے بچنے کے لیے ٹانگ لیے تھے' وہ سب کے سب بارش کے پانی میں بہہ گئے۔ قلعے کے وسیع و عریض صحن میں پانی جمع ہو گیا۔ یہ بارش آسمانی آفت تھی' آخر چند گھنٹوں کے بعد بحکم الٰہی خود ہی بند ہو گئی۔

رات بھر کی بارش کا یہ اثر ہوا کہ بھیگنے سے لوگ نزلہ' زکام اور بخار میں مبتلا ہو گئے اور پھر سانپ نکلنے لگے۔ قسم قسم کے سانپ نہ جانے کہاں سے آ گئے تھے' وہ پانی میں تیر رہے تھے۔ بعض لوگوں کو سانپوں نے ڈس بھی لیا تھا۔ کچھ لوگ ڈر اور خوف سے بھی مرنے لگے۔ صبح ہوئی تو جنازے اٹھتے نظر آئے۔ جو لوگ جاں بحق ہو جاتے انہیں بے سروسامانی کے عالم میں قلعے کی شمالی دیوار کے ساتھ دفن کر دیا جاتا تھا۔ ان حالات میں کفن کہاں سے

آتا' بس لاشوں کو ہاتھوں میں اٹھا کر فصیل کے پاس لے جاتے اور گڑھوں میں پھینک آتے تھے یا پھر بارش میں بھیگی مٹی ان پر ڈال کر چھپا دیتے تھے۔

بھارتی حکومت کو مسلمانوں کی اس بپتا کا بخوبی علم تھا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ راشن کا کوئی انتظام نہ تھا وہ تو یہ چاہتی تھی کہ دلی کے سب مسلمان ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں' چنانچہ یہی ہوا خاصی تعداد میں لوگ مر گئے اور جو زندہ رہے ان کا حال مرنے والوں سے بدتر تھا۔ دو روز بعد جامعہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب قلعے میں آئے اور ہم لوگوں سے بھی ملے۔ میں نے اس دن پہلی مرتبہ انہیں پریشان دیکھا ورنہ وہ بڑے حوصلے اور ہمت والے آدمی تھے۔ مجھے ان کی آنکھوں میں آنسو بھی نظر آئے۔ ہم نے انہیں کیمپ کی ابتر حالت سے آگاہ کیا۔ انہوں نے ہمدردی اور افسوس کا اظہار کیا' لیکن باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ دیا کہ حکومت بے بس ہے۔ ایک شخص (پٹیل) کے جذبہ انتقام نے یہ سب کچھ کیا ہے۔

اس عرصے میں بی او اے سی کے جہاز دلی سے کراچی اور کراچی سے دلی آنے جانے لگے۔ کراچی کے لوگوں کو جب اہل قلعہ کی حالت زار کا علم ہوا تو انہوں نے ان جہازوں کو کھانے پینے کی چیزوں سے بھر دیا۔ ان میں خمیری روٹیاں' نان' ڈبل روٹیاں' انڈے' کباب اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ یہ جہاز ان چیزوں کو لے کر دلی پہنچتے تھے۔ جیسے ہی ٹرک قلعے کے اندر پہنچتے لوگ ان پر حملہ کر دیتے اور لوٹ لیتے۔ جس کے جو کچھ ہاتھ آیا لے اڑا۔ کئی کئی دن کے بھوکے لوگ اس معاملے میں باقاعدگی کا اظہار کیسے کر سکتے تھے۔ میرے حصے میں ایک شامی کباب آیا تھا جو کسی نے لوٹ کر مجھے دیا تھا۔ پیٹ تو اس سے کیا بھرتا' البتہ اس کا ذائقہ اب تک یاد ہے۔

ایک بات کو دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ لوگ لوٹ کے اس مال کو بیچ بھی رہے تھے۔ میرے کانوں میں کئی بار یہ آواز آئی: ''دو روپے کی ڈبل روٹی صاحب! دو روپے کی ڈبل روٹی۔'' مجبوراً لوگ خرید لیتے تھے ہم لوگوں کو ان کی اس حرکت پر غصہ بھی آتا تھا کہ موت سروں پر ناچ رہی ہے اور یہ اس ماحول میں بھی منافع خوری پر اتر آئے ہیں' حالانکہ ڈبل روٹی کی قیمت اس زمانے میں دو تین آنے تھی۔ میرا خیال غلط نہیں کہ ایسے ہی لوگوں نے بعدازاں پاکستان کے پاکیزہ ماحول کو خراب کیا ہوگا۔

غرض پانچ چھ دنوں کے اندر قلعے میں لاکھوں مسلمان جمع ہو چکے تھے۔ لوگوں نے یہاں اپنی جانیں بچالی تھیں اور اپنی عزتوں کو محفوظ کر لیا تھا' لیکن اپنے مستقبل سے پریشان تھے۔ اب صرف پاکستان کی طرف اسپیشل ٹرینوں کے چلنے کا انتظار تھا پھر بعد از خرابی بسیار وہ مرحلہ آیا اور مہینوں رواں دواں رہا۔ کچھ گاڑیاں بخیریت پہنچ گئیں اور کچھ قتل و غارت کا نشانہ بنیں۔ بہرحال پاکستان کی منزل آخر کار آن پہنچی۔ پاکستان زندہ باد! پاکستان پائندہ باد!

(تلخیص: عبدالمجید قریشی اردو ڈائجسٹ۔ اگست 1996ء)

میں نے پاکستان بنتے دیکھا

ان زندہ لمحوں کی ولولہ خیز داستان جب مجاہد اول کی نوجوان قیادت میں باغ آزاد کشمیر پر آزادی کا پرچم لہرایا تھا

میں جولائی 1947ء میں موجودہ آزاد کشمیر کے قصبے باغ میں تھا جہاں میرے والد سٹیٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ میں لاہور میں ایم اے انگریزی کر رہا تھا اور میرا چھوٹا بھائی علی گڑھ میں تھا۔ لاہور میں ان دنوں حالات بڑے خراب تھے۔ جون کے آخری ہفتے میں شاہ عالمی میں قیامت خیز آگ لگی تھی۔ دن رات کرفیو لگا رہتا تھا۔ زندگی کا حال ابتر ہو چکا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی نے حالات کے پیش نظر ایم اے کا امتحان جو مئی میں ہونا تھا، ملتوی کر دیا۔ اور نئی تاریخ نومبر میں دی گئی۔ میں امتحان کی تیاری کے لیے باغ کو بہتر خیال کرتا تھا اور جیسے ہی میرا چھوٹا بھائی ربانی علی گڑھ سے لاہور پہنچا، ہم دونوں پونچھ کے لیے روانہ ہوئے۔ تین چار دن، ٹرین، بس اور پیدل سفر کے بعد جولائی کی چار تاریخ کو باغ پہنچے جہاں اسکول ہنوز کھلا تھا اور طالب علموں کی وجہ سے ہر جانب گہما گہمی تھی۔

اس اسکول میں ہندو، مسلمان اور سکھ طلبہ زیر تعلیم تھے۔ اسٹاف بھی ہندو، مسلمان اور سکھ اساتذہ پر مشتمل تھا جس میں شہر پونچھ کے مشہور شاعر دینا ناتھ رفیق بھی تھے۔ یہ وہی شاعر تھے جنہیں انجمن اسلامیہ پونچھ نے عید میلاد النبیؐ کے موقع پر ان کی سیرت رسولؐ پر لکھی نظم پر پہلا انعام دیا تھا۔ دینا ناتھ رفیق نے یہ نظم ایک ایسے وقت لکھی تھی جب ان کی اپنی بیٹی بیمار تھی اور نظم کی تحریر کے دوران ہی اس کا انتقال ہوا تھا۔ اس قصبے میں قیام کے دوران میری ملاقات قیوم سے ہوئی جنہیں اب ہم سردار عبدالقیوم خاں کے نام نامی سے پہچانتے ہیں۔ قیوم فوج سے فارغ ہو کر کچھ ہی دن قبل باغ میں وارد ہوا تھا۔ ہم دونوں کلاس فیلو تھے اور ایک ہی ڈیسک پر بیٹھتے تھے۔ قیوم سے میری ملاقات کوئی چار برس کے بعد ہوئی تھی۔ انہی دنوں باغ میں تیجا سنگھ بھی تھا، وہ لکھنو سے ایم اے انگریزی کرنے کے بعد کچھ دنوں کے لیے باغ آیا ہوا تھا جہاں اس کا سسرال تھا۔ آزادی کے بعد تیجا سنگھ مقبوضہ کشمیر کے چیف سیکرٹری ہوئے۔ اسکول کے دوران وہ پنڈت نہرو کو انگریزی میں خط لکھا کرتے تھے۔ تیجا سنگھ، سردار قیوم اور میں ہم جماعت تھے۔

آزاد کشمیر کا یہ قصبہ، جو اب چھوٹا سا گاؤں بن چکا ہے، دو پہاڑی ندیوں کے درمیان واقع ہے جنہیں اہل اور مالوانی کہتے ہیں۔ اس کے شمال میں گنگا چوٹی ہے اور مشرقی سلسلہ کوہ میں نیزہ گلی کا درہ ہے جس سے گزر کر جہلم ویلی روڈ تک پہنچا جا سکتا تھا۔ پہاڑی سلسلہ کوہ کا نام اتولی پیر ہے جو پیر پنجال کی کوہستانی توسیع ہے۔ جب میرا قیام باغ میں تھا، اس زمانے میں پانی بہت دور نیچے اتر کر ایک مالوانی نالے کے چشموں سے بھر کر لایا جاتا تھا۔ قصبے میں تازہ پانی کا کوئی چشمہ نہ تھا۔ باغ کا صرف ایک بازار تھا اور جہاں یہ بازار ختم ہوتا تھا وہاں شریف رنگریز کا چوبارہ ہوا کرتا تھا جو

سرِ شام گراموفون پر نور جہان کا یہ گیت سننے کا عادی تھا۔

آواز دے کہاں ہے......

چائے کی دکانیں عام تھیں جن کے کیک بے حد لذیذ تھے۔ انہی چائے کی دکانوں پر لوگ پاکستان کی باتیں کرتے تھے۔ ریاست کے الحاق کے بارے میں رائے دی جاتی تھی اور مہاراجہ کشمیر کے عزائم کو تشویش کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

☆☆☆

قصبے کی زندگی پرسکون تھی اور گوردوارے میں سکھ شبد کیرتن بڑی باقاعدگی سے کرتے تھے۔ باغ کے علاقے میں سکھوں کی اکثریت تھی جنہیں سکھ حکومت نے زمین دے کر یہاں آباد کیا تھا۔ باغ سے سکھ ملازمت کی تلاش میں پونچھ شہر میں وارد ہوئے تھے جو یہاں سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر تھا۔ زندگی کے پرسکون ہونے کی ایک ضمانت طلبہ کی تفریحی مہم تھی جو ان دنوں گنگا چوٹی کی ڈھلانوں پر منائی گئی تھی۔ میں بھی اس تفریحی سفر میں شامل تھا۔ اتفاق سے ایک پگڈنڈی پر میں اپنی دھوپ کی عینک بھول گیا۔ چار روز بعد جب ہم واپس آئے تو عینک وہیں پڑی تھی جہاں میں رکھ کر بھول گیا تھا۔ اس زمانے میں یہ علاقہ چوری چکاری سے نا آشنا تھا۔

اسی دوران دفاتر میں ایک گشتی مراسلہ موصول ہوا جس میں ریاست کے اہلکاروں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ ریاست جموں و کشمیر کے الحاق کے بارے میں محتاط رہیں کہ اس مسئلے پر باتیں ممنوع قرار دی گئی ہیں۔ مناسب وقت پر دربار کشمیر کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔ اس مراسلے نے اسکول پر بھی خاموشی مسلط کر دی اور بلاوجہ خوف کی فضا پیدا ہونے لگی۔ الحاق کا لفظ خطرے کی گھنٹی بن گیا اور دبے الفاظ میں ہر طرف یہ سوال سرگوشی بن کر سنائی دینے لگا کہ اگر پاکستان کے ساتھ ریاست کا الحاق نہ ہوا تو کیا ہوگا؟ اس جواب کے ظاہر ہونے سے بہت پہلے ریاست میں ڈوگرہ فوجیوں کی نقل و حرکت شروع ہوگئی اور ان کی ایک بڑی جمعیت باغ کے قصبے کو کیمپ بنا کر یہاں رک گئی۔ انہوں نے اردگرد کی پہاڑیوں پر مورچے سنبھال لیے۔ ان فوجیوں میں گورکھوں کی ایک بٹالین بھی شامل تھی جن کا صوبیدار چھوٹے قد کا ایک ہنس مکھ شخص تھا جسے سب روشن جی کہتے تھے۔ روشن جی، روزانہ اسکول گراؤنڈ میں والی بال کھیلنے آتا تھا اور اس طرح وہ میرے والد صاحب کا دوست بھی بن گیا تھا...... گو گشتی مراسلے کا اثر بھی فضا میں تھا، تاہم حالات پرسکون تھے۔ اور زندگی، فوجیوں کے آجانے کے باوجود، معمول کے مطابق گزر رہی تھی۔ پنجاب سے اخبار باقاعدگی سے آتے تھے اور ڈاک کا نظام بھی باقاعدگی سے چل رہا تھا۔ انہی دنوں اسکول میں طلبہ کا سہ ماہی امتحان بھی ہوا اور طالب علموں نے بڑی دیانت داری سے پرچے حل کیے۔ ان دنوں کوئی لڑکا نقل کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اپنے ایم اے کے امتحان کی تیاری میں مصروف رہا اور رومانی شاعروں کو باغ کے کوہستانی ماحول میں پڑھتے ہوئے مجھے بے حد مزہ آتا۔

☆☆☆

اسی دوران برصغیر کی آزادی کے مراحل طے ہوتے گئے اور دہلی میں قائداعظم سے ملاقات کے بعد چودھری حمید اللہ خاں 18 جولائی کو سری نگر پہنچے۔ 19 جولائی کو سری نگر میں مسلم کانفرنس کا ایک کنونشن منعقد ہوا، اس کنونشن میں عبدالرحیم درانی کی قرارداد اتفاق رائے سے منظور ہوئی

جس میں کہا گیا تھا:

''جغرافیائی حالات، مجموعی آبادی کی اسی فیصد مسلم اکثریت، پنجاب کے اہم دریاؤں کی ریاست میں سے گزرگاہیں، لسانی، ثقافتی، نسلی اور معاشی تعلقات اور ریاست کی سرحدوں کا پاکستان کی سرحدوں سے اشتراک...... یہ سب حقائق اس امر کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر پاکستان کے ساتھ الحاق کرے......''

19 جولائی کو ابھی باؤنڈری کمیشن نے مملکت پاکستان کی سرحدوں کا حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا اور گورداسپور کا ضلع پاکستان میں شامل گردانا جاتا تھا۔ اگر ریڈکلف گورداسپور کو تقسیم نہ کرتا اور اس طرح انڈین یونین کو کشمیر میں داخل ہونے کا راستہ فراہم نہ کرتا تو ریاست جموں و کشمیر کے سامنے پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کے سوا اور کوئی راہ نہ ہوتی، تاہم جونہی مسلم کانفرنس کی قرارداد منظور ہوئی، حکومت جموں و کشمیر کی فوجی کارگزاریوں میں اضافہ ہونے لگا اور یہ ریاست کسی ممکنہ آرمی ایکشن کی آماجگاہ بن گئی۔ باغ میں بھی ڈوگرہ فوجیوں کے مزید دستے آتے گئے جن کو آس پاس کی پہاڑیوں پر مورچہ بند کر دیا گیا۔ بازار میں بھی ڈوگرہ فوجی دکھائی دینے لگے۔ باغ آرمی کیمپ کے انچارج کرنل کمندلال نے قصبے کے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ الحاق کا فیصلہ مہاراجہ خود کریں گے اور جب تک وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچتے، ہمیں پرسکون رہنا ہے۔ نظم و نسق ہر صورت میں برقرار رکھا جائے گا۔

ان حالات میں چائے کی دکانوں کو خبر اخبار کا مرکز بنا دیا۔ سری نگر میں مسلم کانفرنس کی لیڈرشپ کو حراست میں لے لیا گیا اور الحاق کے بارے میں زبان بندی سخت تر کر دی گئی۔ باغ میں لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھنا چاہا کیا پونچھ کی اپنی کوئی مرضی نہیں؟ کیا پونچھ دربار کشمیر کا محتاج ہے؟ کیا پونچھ پر ڈوگروں نے قبضہ نہیں کیا تھا۔ کیا سو برس کے بعد عہد نامہ امرتسر (1846ء) زائد المعیاد نہیں ہوگا؟ اور کیا عہد نامہ امرتسر کالعدم ہو جانے کے بعد پونچھ آزاد نہیں ہے؟ اگر یہ امر درست ہے تو ہمیں مہاراجے کے فیصلے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم اپنا فیصلہ خود کر سکتے ہیں۔

لیکن...... ہمارے لیے، ایسا فیصلہ کون کر سکتا ہے؟

انہی دنوں باغ میں سردار قیوم نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ عنقریب دو مملکتیں معرض وجود میں آ جائیں گی۔ انگریز برصغیر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ پاکستان قائم ہوگا، مگر چھ گز چوڑی پانی کی لکیر جہلم کا دریا ہمارے اور پاکستان کے درمیان حد فاصل کھینچ دے گا۔ اس طرح ہمارے بھائی آزاد ہوں گے، مگر دریا کے اس طرف ہم بدستور مہاراجہ کی غلامی میں دن کاٹتے رہیں گے...... ہم ایسی غلامی کو برداشت نہیں کر سکتے......

☆☆☆

جولائی کے آخری دن ماہ رمضان کے تھے۔ نماز تراویح کے بعد باغ کی مسجد میں پاکستان کے لیے دعائیں کی گئیں اور کشمیر کے الحاق کے لیے خشوع و خضوع سے بارگاہ الٰہی میں التجا کی گئی۔ جمعے کے روز مسجد میں میاں بشیر احمد کی نظم ''ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح'' بڑے التزام کے ساتھ سنی گئی۔ ایک ایک کر کے دن گزرتے گئے اور چودہ اگست کی تاریخ نزدیک تر آتی گئی۔ 14 اگست کو رمضان کی 27 تاریخ تھی۔ اس رات آزاد کشمیر کی پہاڑیاں روشن ہو گئیں۔ لوگوں نے چیل کی ''دیئیاں'' جلا کر پہاڑیوں پر روشنی کی اور قیام پاکستان کا خیر مقدم کیا۔ کوئی بلند مقام ایسا نہ تھا جہاں

آگ نہ جلائی گئی ہو۔ گنگا چوٹی سے نیزہ گلی تک' باغ سے ہاڑی گہل تک اور سامنے کی ہر پہاڑی پر روشنی کے الاؤ تھے اور دلوں میں ایک ہی صدا تھی:

"پاکستان زندہ باد!" میرے لیے پاکستان آزاد کشمیر کی روشنیوں کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ روشنی کا استعارہ نور کا مجازی تصور...... آزاد کشمیر نے اپنی صورت حال میں پاکستان کو روشنی کا نام دیا۔ ریاست کا الحاق اس روشن مملکت کے ساتھ کیا جائے جس کا نام پاکستان ہے۔ آزاد کشمیر کے ساتھ الحاق کے لیے بے تاب تھا۔

لیکن لوگوں کی خوشیوں کے برعکس دربار کشمیر کا ردعمل مختلف تھا۔ مہاراجہ کے وزیراعظم کاک نے علاقے کو بغاوت زدہ قرار دے دیا اور فوج کی تعداد بڑھا دی گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے باغ کے قصبے میں کوئی قابض فوج اتری ہوئی ہو لیکن ریاست کے فوجیوں کے لیے شاید یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا اور وہ گھبرائے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ایسی ذہنی حالت میں انہیں مورچوں میں بٹھایا گیا تھا اور وہ برین گن کے ساتھ دور پہاڑیوں پر آتے جاتے لوگوں کو نشانہ بنا کر اپنی گھبراہٹ کا ازالہ کرتے تھے۔ اسی دوران کرنل نے فوجیوں کو رات کے وقت بازار میں گشت کرنے کا حکم بھی دیا۔ باغ ویسے بھی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں تیل کے لیمپ جلتے تھے۔ کرنل کے حکم کے ساتھ بازار وقت سے پہلے بند ہونے لگا اور سارا قصبہ ویران اور سنسان ہو گیا۔ ریاستی فوجوں کے قدموں کی چاپ ایسے ویرانے میں گونجنے لگی۔

27 رمضان کو قیام پاکستان کی خوشیاں منائی گئیں جو شاید ریاستی فوجیوں کو ناگوار گزری تھی۔ اس لیے دوسرے ہی دن بازار کے چائے خانوں کے مالکوں کو کرنل کے پاس پیش کیا گیا اور ان سے اس امر کی ضمانت لی گئی کہ ان کے چائے خانوں میں کوئی شخص الحاق کا ذکر نہیں کرے گا۔ ابھی ایسے حکم کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہاڑی گہل کی جانب سے ایک جلوس باغ کی جانب آتا دکھائی دیا۔ باغ کا قصبہ ایک ٹیلے پر واقع ہے' جہاں نشیب میں دونوں پہاڑی نالے بہتے ہیں اور ان پہاڑی نالوں سے گزرتا راستہ سامنے کی ہموار زمین سے ہوتا ہوا ہاڑی گہل کو جاتا ہے۔ جلوس اس راستے سے نالہ کاٹ کر ہڈاہ واڑی جا رہا تھا جو باغ کے مشرق میں دو میل کے فاصلے پر ایک میدان تھا جہاں جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہڈاواڑی کے پاس ہی ایک اور پہاڑی نالے کی گزرگاہ تھی۔ اس گزرگاہ کے قریب ایک پہاڑی پر ڈوگرہ فوجیوں کا مورچہ تھا جہاں ان کی برین گن کی نالی ہڈاواڑی کے جلسہ گاہ کو اپنے نشانے میں لیے ہوئے تھی۔

جب یہ جلوس ماہل نالے کی گزرگاہ میں اترا تو میں نے پہلی بار پاکستان کے سفید اور سبز پرچم دیکھے جسے اہل جلوس بڑے احترام سے اٹھائے ہوئے تھے۔ جلوس کے نعرے تھے: "پاکستان زندہ باد...... قائداعظم زندہ باد...... ہم پاکستان کے ساتھ ریاست کا الحاق چاہتے ہیں۔ اس جلوس کی قیادت قیوم کر رہا تھا۔ میں جلوس کو دیکھتا رہا بلکہ پاکستان کے پرچموں کو جی بھر کر دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ میرا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ ایک سو برس بعد ہمارا پرچم فضا میں لہرایا تھا۔ کس قدر خوشی کا مقام تھا۔ میں نے ہوا ہی میں پرچم کو چوم لیا۔ میں نے پاکستان کے پرچم کو باغ کے اس چھوٹے سے قصبے میں پہلی بار دیکھا۔

☆☆☆

جلوس اور پاکستان کے پرچم کی کشش ایسی تھی کہ میں اسکول کی عمارت سے گزر کر پہاڑی راستے سے ہڈاواڑی کی جلسہ گاہ کو چل دیا۔

جلسہ گاہ مسلح رضا کاروں نے اپنے گھیرے میں لے رکھی تھی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور جلسہ گاہ میں داخل ہوا سردار قیوم تقریر کر رہے تھے کہ ہماری غلامی کے دن اب ختم ہونے چاہئیں۔ ہمیں بھی اپنے بھائیوں کی طرح جو دریائے جہلم کے اس پار رہتے ہیں آزادی چاہیے۔ الحاق پاکستان ہمارا مقصد ہے...... ایسے مواقع صدیوں کے بعد آتے ہیں جب وطن آزاد ہوتا ہے۔ سردار قیوم کو میں نے پہلی بار تقریر کرتے سنا تھا۔ جذبات اور خلوص سے لبریز تقریر دل کو گداز کرتی تھی۔ ان کی تقریر سن کر میں جلسہ گاہ سے واپس آ گیا۔ ابھی میں اسکول کے قریب پہنچا ہی تھا کہ فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ اور ہر پہاڑی مورچے سے برین گن ہڈاواڑی کی جانب آگ اگلنے لگی...... ایک آدھ گھنٹے بعد ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ جلوس کہاں گیا ہے؟ قیوم کہاں ہے؟ کیا کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟ ان سوالوں کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

ہڈاواڑی کے واقعے کے بعد ڈوگرہ فوجیوں کے دستے علاقے میں پھیل گئے' انہوں نے گھروں کو نذر آتش کر دیا۔ لوگوں کو پکڑ کر مقامی قلعے میں محبوس کر دیا اور ایک مقامی لیڈر خادم حسین کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ افواہ تھی کہ اسے ڈوگرہ فوجیوں نے ہلاک کر دیا ہے۔ ایک خبر یہ تھی کہ سردار قیوم کو ہر قیمت پر گرفتار کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا ہے اور ان کے سر کی قیمت بھی مقرر کر دی گئی ہے۔ ان کی گرفتاری کی مخبری کرنے کے لیے بھی انعام دیے جانے کا اعلان ہوا...... پہاڑیوں پر لوگوں کے آنے جانے کا علم سفید کپڑوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے جب کبھی دور پہاڑی پر سفید سا دھبہ ظاہر ہوتا ڈوگرہ سپاہی فائرنگ کرتے۔ یوں سارا دن باغ کا قصبہ ڈوگرہ فوجیوں کی فائرنگ اور اس کی صدائے بازگشت سے گونجتا رہتا۔ زندگی میں خوف اور دہشت کا اضافہ ہوا اور ایک ایسی خاموشی ہر جانب مسلط ہوئی جو کسی بڑے معرکے کا پیش خیمہ دکھائی دیتی تھی۔

باغ کے علاقے میں مقیم ڈوگرہ فوجی دستوں کی سپلائی لائن ہاڑی گہل' دھیر کوٹ اور چمل کوٹ سے ہوتی ہوئی کوہالہ کے راستے مظفر آباد سے منسلک تھی۔ ہاڑی گہل کے کچھ اوپر ایک گھنا جنگل تھا جہاں گھوڑے اور ٹٹوؤں کی کچی سڑک ایک نشیب میں اترتی اور پھر چڑھائی بن کر ظاہر ہوتی تھی۔ اس دوران جب سپلائی کا نوائے اس جنگل سے گزرتے ہوئے نشیب میں اترا تو اس پر ہر جانب سے شدید فائرنگ ہونے لگی۔ ڈوگرہ فوجیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ خچر گولیوں کا نشانہ بنے اور فوجی بدحواسی کے عالم میں بھاگنے لگے۔ جب شام کے وقت یہ فوجی قافلہ باغ پہنچا تو اس کی شکل قابل رحم تھی۔ فوجی بے حد خوفزدہ تھے۔ انہوں نے کہا کہ جنگل میں توپیں نصب ہیں اور معلوم نہیں کتنے افراد ہوں گے جنہوں نے سپلائی پر حملہ کیا تھا۔

سردار قیوم کا کہنا ہے کہ ان کے تین دوست اور وہ خود ہاڑی گہل کے اس معرکے کے اصل افراد تھے۔ اور چاروں کے پاس صرف ایک ایک رائفل تھی۔ اسٹراٹجی یہ تھی کہ چاروں رائفلوں کو ایک ساتھ فائر کیا جائے اور جنگل میں فائرنگ کی گونج کسی شدید فائر کرتے ہوئے توپ خانے کا دھوکا دے گی۔ یہ رائفلیں بھی انہوں نے ایک دور افتادہ پولیس تھانے پر حملہ کر کے حاصل کی تھیں۔ سردار قیوم اس مسلح طرز عمل کے اصل محرک تھے۔ اور ایک ایسے وقت میں جب مسلم کانفرنس کے اکابر کو سری نگر اور جموں میں گرفتار کر لیا گیا تھا' سردار قیوم نے مسلح جدوجہد کا تاریخ ساز فیصلہ کر کے کشمیر کاز کو ایک زیادہ مؤثر صورت دی اور آزاد کشمیر کے قیام کے امکانات پیدا کیے۔ اس تاریخ ساز واقعے کی رعایت سے اگر ان کو مجاہد اول کہا گیا ہے تو اس میں کسی کو کوئی اختلاف بھی نہیں ہونا چاہیے۔ قوموں کی تاریخ میں ایک وقت آتا ہے جب مسلح جدوجہد کے بغیر کامیابی کی کوئی اور صورت دکھائی

نہیں دیتی۔ سردار قیوم کا ایسا فیصلہ جو ہاڑی گہل کے واقعے سے تعلق رکھتا ہے ہر اعتبار سے آزادی پونچھ کا اصل سبب بنا تھا۔

ڈوگرہ فوجی حاکموں کی کوششوں کے باوجود جنگل کے راستے میں سپلائی کے قافلوں پر شب خون میں کمی ہوئی نہ فوجیوں کا مورال بحال ہوا۔ رات کو پہرہ دیتے ہوئے وہ کتے کے سائے سے بدکتے تھے۔ ان کا پختہ خیال تھا کہ ہاڑی گہل کا جنگل رائفل بردار آدمیوں سے بھرا ہوا ہے جو موقع ملتے ہی حملہ کر دیتے ہیں۔ باغ پہنچنے کے لیے اس سڑک کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہ تھا جسے کانوائے استعمال کرتا اور اسے ہر صورت میں نیچے نشیب میں اترنا پڑتا تھا اور دوبارہ چڑھائی چڑھنا پڑتی تھی۔ دونوں صورتوں میں اسے گولیوں کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ ڈوگرہ فوجیوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ہاڑی گہل کے اوپر واقع جنگل میں داخل ہو کر اصل صورت حال کا جائزہ لیتے۔

دراصل ڈوگرہ فوجیوں کو جنگ آزمائی کا کوئی تجربہ نہ تھا اور وہ علاقے کے لوگوں سے بھی خوفزدہ تھے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد جنوب مشرقی ایشیا' افریقہ اور جنوبی یورپ میں محاذ جنگ پر دادِ شجاعت دینے کے بعد فارغ ہو کر آزاد کشمیر میں واپس آ چکے تھے۔ اس علاقے میں اس اعتبار سے ایک جنگ آزمودہ لشکر برابر موجود تھا۔ سردار قیوم کا اپنا تجربہ بھی فلسطین اور شمالی افریقہ کے محاذ جنگ کا تھا' اس لیے کچھ عجب نہ تھا کہ ڈوگرہ فوجی خوفزدہ ہوتے' ان کا مورال گرتا اور وہ کسی قسم کی فوجی کارروائی سے گریز کرتے۔ دربار کشمیر کی طرح ان کی فوج بھی حالات سے ڈری ہوئی تھی۔ اگست کا مہینہ باغ میں ڈوگرہ فوجیوں کے لیے پریشانی کا تھا کہ ہر ہفتے ہاڑی گہل میں ان پر حملہ ہوتا اور وہ سپلائی کو راستے ہی میں چھوڑ کر سیدھے باغ کی جانب پناہ کے لیے بھاگتے۔ میں نے خوفزدہ اور ڈرے ہوئے فوجیوں کو پہلی بار باغ میں دیکھا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ قصبہ باغ کے سوا ڈوگرہ حکومت کی تحصیل باغ میں کوئی عمل داری نہ تھی۔ ادھر پونچھ کا شہر حکومت کے پاس تھا اور محض نفسیاتی دباؤ کے سبب پونچھ کے علاقے ڈوگرہ عملداری سے آزاد ہو گئے تھے! اس آزادی کا سہرا لوگوں کے عزم و ہمت پر تھا۔

آزاد کشمیر کے ان علاقوں میں رہنے والے باشندوں نے خود اپنے طور پر ڈوگرہ راج کا خاتمہ کیا تھا۔ اگست 1947ء میں کوئی قبائلی آزاد کشمیر میں نہ تھا۔ اور جس مسلح جدوجہد سے ڈوگرہ فوجی خائف تھے وہ بھی چار باحوصلہ نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ شیخ عبداللہ نے اپنی سوانح حیات ''آتش چنار'' میں پونچھ کے حالات کو بغاوت سے نسبت دی ہے اور یہ جائز عمل بھی تھا کہ ایک سو برس کے بعد انہی باشندوں کی اولاد دوبارہ اپنی آزادی کے حصول کے لیے کوشاں ہوتی جن کو 1850ء میں ڈوگرہ مہاراجوں نے نہایت بے دردی سے تہہ تیغ کیا تھا۔ تراڑکھل کے مقام پر سو برس پہلے ڈوگروں کے خلاف لڑنے والے افراد کی کھال کھینچ دی گئی تھی اور ان کے مردہ جسم درختوں پر لٹکائے گئے تھے۔

☆☆☆

اسی دوران ایم اے کے امتحان کے لیے میں نے لاہور لوٹنے کا ارادہ کیا۔ علی گڑھ جانے کا اب کوئی امکان نہ تھا کہ مشرقی پنجاب میں فسادات زوروں پر تھے' اس لیے میرا چھوٹا بھائی بھی میرے ساتھ لاہور کے لیے تیار ہو گیا۔ ہم دونوں ستمبر کے شروع میں نیزہ گلی سے گزرتے ہوئے دو دنوں کے پیدل سفر کے بعد جہلم وہلی روڈ تک پہنچ گئے اور سری نگر سے آنے والی بس میں سوار ہو کر راولپنڈی کے لیے روانہ ہو گئے۔ شام کو ہم کوہالہ سے گزرے اور رات باسیاں کے مقام پر بسر کرنے کے لیے وہیں رک گئے۔ ابھی ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ ایک شخص میرے

پاس آیا اور کہنے لگا: ''کوئی شخص آپ سے ملنے کا خواہشمند ہے' آپ میرے ساتھ آئیں۔''

تین چار کمروں سے گزرتے ہوئے میں ایک نیم تاریک کمرے میں داخل ہوا جہاں چند لوگ تھے جنہوں نے فوجی وردی پہنی ہوئی تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر سردار قیوم تھے۔ انہوں نے خیر خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ والد صاحب اور والدہ کہاں ہیں۔

''وہ تو وہیں باغ میں ہیں۔''

''بہتر ہوتا اگر وہ آپ کے ساتھ ہوتے۔'' سردار قیوم نے کہا' علاقے میں حالات معمول کے مطابق نہیں' کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ سنا ہے باغ میں سکھوں کا کیمپ کھولا گیا ہے۔''

''خبر تو ہے' لیکن ابھی تک کوئی سکھ باغ میں باہر سے نہیں آیا۔''

سردار قیوم کی زبانی معلوم ہوا کہ عنقریب کوئی بڑا حملہ ہونے والا ہے جس کے لیے 21 اکتوبر کی تاریخ مقرر کی گئی ہے۔ انہوں نے کشمیر کاز کے لیے نئی مملکت پاکستان کے زعما کا ذکر کیا اور بتایا کہ ان کی دعائیں اور کوششیں کشمیر کاز کی پرزور حمایت میں ہیں۔ ان سے رخصت ہوتے وقت میں نے کہا:

''سردار صاحب! جب آپ ہیں تو مجھے اپنے'' ''اللہ مدد کرے گا۔'' سردار قیوم نے جواب میں کہا۔

☆☆☆

باغ سے ایک ایک کر کے مسلمان گھرانے نکلنے لگے اور زیادہ محفوظ مقامات کی تلاش میں قصبہ مسلمانوں سے خالی ہونے لگا۔ جیسے جیسے مسلمان نکلتے گئے' باغ کے سکھ کیمپ میں باہر سے آئے ہوئے سکھ شرنارتھی وارد ہوتے گئے۔ ان سکھوں کی بڑی تعداد غیظ و غضب میں تھی کہ ان پر گنگا چوٹی سے گزرتے ہوئے فائرنگ کی گئی۔ ان کے عزیز و اقارب مارے گئے۔ وہ اپنی کرپانیں لہراتے تھے اور ست سری اکال کا مذہبی نعرہ بلند کرتے تھے۔ ایسے ماحول میں اگر کوئی مسلمان باغ میں موجود تھا تو وہ میرے والد' والدہ اور ایک چھوٹا بھائی تھا جس کی عمر دس گیارہ برس تھی۔ اس دوران میرے والد اسکول کی پختہ عمارت کے ایک کمرے میں اٹھ آئے تھے۔ اسکول باغ میں بازار سے ہٹ کر پہاڑی کے دامن میں تھا اور بظاہر محفوظ دکھائی دیتا تھا۔

ایک دن جب میرے والد کسی کام سے بازار سے ہوتے ہوئے سکھ کیمپ کے قریب سے گزرے تو کسی نے ان پر فائرنگ کر دی۔ وہ بچ گئے' مگر فائرنگ نے انہیں یہ پیغام ضرور دیا کہ اب وہ محفوظ نہیں۔ والد صاحب اس مخلوط معاشرے کے فرد تھے جہاں ان کے قریبی تعلقات ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ تھے اور وہ ان پر اعتماد بھی کرتے تھے' لیکن سکھ کیمپ سے ان پر فائرنگ نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ ملاقات پر انہوں نے کہا کہ مجھے ذرا بھر خیال نہ تھا کہ سکھ مجھ پر فائرنگ کریں گے جن کے بیٹے میرے اسکول میں پڑھتے تھے۔ میری اور ان کی لڑائی بھی کیا ہے؟ تو فائرنگ کیوں ہوئی؟ ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا' لیکن گورکھا رجمنٹ کے صوبیدار روشن جی کے پاس جواب تھا۔ اس نے ایک گورکھا سپاہی اسکول کے لیے حفاظتی ڈیوٹی پر بھیج دیا۔

دن گزرتے گئے اور علاقے میں مجاہدین کا نفسیاتی دباؤ بڑھتا گیا۔ سکھ کیمپ میں بھی تعداد بڑھتی گئی۔ اس دوران روشن جی صوبیدار وقتاً فوقتاً اسکول میں آ کر میرے والد صاحب سے ضرور ملاقات کرتا۔ خیر خیریت دریافت کرتا اور ان کی دلجوئی کرتا...... ''اب آپ پرماتما کے بعد میری حفاظت میں ہیں!''

ستمبر کا مہینہ ختم ہوا اور اکتوبر کے دن آ گئے۔ مہاراجہ کشمیر نے ابھی تک الحاق کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور دہلی کے نئے حکمران برابر اسے شیشے میں اتارنے کی سعی کر رہے تھے۔ مہاراجہ بھی شاید گومگو کی حالت میں تھا اور کسی فیصلے پر پہنچنے سے عاری تھا۔ ایسی کیفیت میں اکتوبر کی 21 تاریخ آ گئی۔ اور اس رات بے شمار نوجوانوں نے اسلحے کے ساتھ دریائے جہلم عبور کیا اور ریاست میں باقاعدہ مسلح محاذ آرائی کا دور شروع ہوا۔ کشمیر کی آزادی کو مسلح جدوجہد میں بدلنے کا یہ دور بھی سردار قیوم کی حکمت عملی کا ایک بنیادی جزو تھا۔

☆☆☆

باغ کے علاقے میں مسلح جدوجہد کا دباؤ بڑھ گیا تو ڈوگرہ فوجیوں نے سکھ شرنارتھیوں کو فوجی حفاظت میں شہر پونچھ بھیجنے کا انتظام کیا اور ایک دو ہفتوں میں کیمپ خالی ہو گیا۔ اب باغ میں صرف ریاست کے فوجی دستے تھے۔ ایک گورکھا رجمنٹ تھی جس کا صوبیدار روشن جی تھا یا میرے والدین اور چھوٹا بھائی جو اسکول کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ قصبہ پہلے سے زیادہ ویران ہو گیا تھا اور راتیں بھی سنسان ہو چکی تھیں۔ ویرانے کی سی کیفیت تھی جو پہاڑیوں سے وادیوں، وادیوں سے قصبوں اور قصبوں سے گھروں تک در آئی تھی۔

ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد میرے والد اسکول کے برآمدے میں بیٹھے ہی تھے کہ گورکھا رجمنٹ کا صوبیدار روشن جی آ گیا۔ اس نے بتایا کہ آج رات ہی سارے فوجی قصبے سے کوچ کر جائیں گے، اس لیے جو سپاہی اسکول کی ڈیوٹی پر ہے وہ شام ہوتے ہی واپس چلا جائے گا...... اب آپ اپنی حفاظت کا خود خیال رکھیں۔ کمرے سے باہر نہ جائیں...... صبح آپ کے ہم مذہب آ جائیں گے......''

وہ شام بڑے اضطراب میں گزری۔ رات کا سناٹا بے حد گہرا تھا اور خاموشی ہر جانب تھی جیسے جیسے رات بڑھتی گئی، میرے والدین کا اضطراب بھی بڑھتا گیا۔ رات اندھیری تھی، مگر ایک دم ہر جانب روشنی ہو گئی۔ والد صاحب نے کھڑکی سے باہر دیکھا کہ کوچ کرتی ریاستی فوج نے بازار کو نذر آتش کر دیا تھا۔ سارا بازار ساری دکانیں جل رہے تھے۔ اور زرد رنگ کی روشنی میں ہر شے کی شکل بدل رہی تھی۔ میری والدہ برابر نوافل پڑھ رہی تھیں، خدا سے مدد کی خواستگار تھیں۔ والد صاحب اپنے طور پر پریشان تھے، ان کی ڈاڑھی بڑھ گئی تھی اور بال بھی بڑھے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں کب ان کو نیند آ گئی، لیکن جیسے ہی ان کی آنکھ کھلی، کمرے کے باہر فوجی بوٹ کی چاپ سنائی دی۔ جیسے بہت سے لوگ باہر ہیں اور اسکول کے گرد ادھر ادھر سے آ جا رہے ہیں۔

کمرے کے اندر تینوں کا سانس رک گیا۔

دروازہ کھلا اور پشاور کی جانب کا ایک لشکری داخل ہوا۔ عورت کو دیکھ کر وہ فوری طور پر واپس ہو گیا، والد صاحب اٹھے اور اس کے ساتھ کچھ فاصلے پر ایک میدان میں پہنچے جہاں ان لشکریوں کا کوئی افسر بیٹھا تھا۔ لشکری نے اسے بتایا کہ اسکول کے کمرے میں ایک مرد، ایک عورت اور ایک لڑکا

ہے، میں مرد کو ساتھ لایا ہوں۔

''آپ کون ہوتے ہو؟'' افسر نے استفسار کیا۔

''میں اس اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں۔''

''کمرے میں کیوں تھے؟''

''صوبیدار نے کہا تھا کہ کمرے سے باہر نہ نکلیں۔''

''مسلمان؟''

''جی ہاں۔''

''مگر نظر تو سکھ آتے ہو؟''

یہ سن کر والد صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔''

افسر نے دوسرے ساتھیوں سے صلاح مشورہ کیا اور آخر والد صاحب کو کرسی دے کر ایک جانب بٹھا دیا گیا۔ باغ کا قصبہ لشکریوں سے بھرا ہوا تھا اور ہر جانب پشتو کا لہجہ سنائی دیتا تھا۔ والد صاحب نے لشکریوں کے افسر سے کہا کہ میرا لڑکا جو دس سال کا ہے اور اس کی والدہ ادھر کمرے میں ہیں۔

''کوئی فکر نہ کرو۔ ہماری حفاظت میں ہیں۔''

ایسے حالات میں وقت کے گزرنے کی رفتار بھی کم ہو جاتی ہے اور لمحہ ایک نہ ختم ہونے والے عرصے کی اکائی بن جاتا ہے۔ کچھ ایسے ہی انداز میں والد صاحب کے لیے وہ لمحہ لشکریوں کے درمیان گزرا۔ ابھی وہ پریشان خیالی ہی میں تھے کہ ایک جانب سے کوئی بیس بائیس نوجوانوں کا مسلح دستہ وارد ہوا جس کی قیادت ایک قبول صورت نوجوان کر رہا تھا......

جب وہ لشکریوں کے قریب پہنچا تو والد صاحب کو ان کے درمیان پا کر بہت حیران ہوا۔

''ہیڈ ماسٹر صاحب! آپ یہاں کیسے؟''

''اللہ کا شکر ہے کہ آپ آ گئے۔''

یہ قبول صورت نوجوان سردار قیوم تھا۔ اس نے والد صاحب کا تعارف لشکریوں کے افسر سے کرایا اور اس نے کسی بھی نادانستہ حرکت کے لیے والد صاحب سے معذرت کی۔

''میں آپ کے لیے چائے بھجواتا ہوں۔ آپ کمرے میں چلے جائیے۔'' سردار قیوم نے والد صاحب سے کہا۔

☆☆☆

سردار قیوم کی کوششوں سے میرے والدین اور چھوٹے بھائی کے لیے سفر کا انتظام ہوا اور لاہور روانہ ہونے سے قبل سردار قیوم نے والد صاحب سے کہا: ”خدا کا شکر ہے ہم نے اپنا علاقہ آزاد کرالیا ہے۔ اب ہم بھی آزاد ہیں اور دریائے جہلم کے اس طرف ہمارے بھائی بھی آزاد ہیں۔ اب آپ ہماری مدد کریں۔ کچھ عرصے میں ہم زندگی کو معمول پر لانے میں کامیاب ہو جائیں گے' آپ تب تک لاہور میں رہیں۔ میری درخواست ہے کہ آپ واپس آ کر ہمارے اسکول کی سربراہی قبول کر کے اس کارِخیر میں شرکت کریں جس کے لیے ہم نے جدوجہد کی ہے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو......“

کوہالہ سے راولپنڈی جاتی سڑک سے چمل کوٹ کی اترائی پر لوگ ہی لوگ نظر آ رہے تھے۔ رائفلوں کے ساتھ' تلواروں کے ساتھ' بندوقوں کے ساتھ......ایک ولولہ جذبہ بن کر ابل رہا تھا کہ کشمیر کی آزادی کا مطلب پاکستان کے ساتھ الحاق ہے۔ دریائے جہلم کی موجوں کی صدا ایک نیا گیت سنا رہی تھی جو 14 اگست کے بعد ایک نئے مفہوم کے ساتھ گونجا تھا۔ آزاد کشمیر کو اس کے بیٹوں نے ڈوگرہ شاہی سے آزاد کروالیا تھا۔

(جیلانی کامران۔ اردو ڈائجسٹ۔ اگست 1996ء)

تاش کے پتے

جُرم کی بساط پر کھیلی جانے والی خونی بازی......ایک جنونی قاتل کا قصہ جو دُنیا کے عظیم ترین قاتلوں کے درمیان اپنا نام سرِفہرست رکھنا چاہتا تھا۔ تاش کے باون پتے اُس کے مرکزِ نظر تھے۔ فی قتل ایک پتے کے حساب سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ قانون کے محافظ معمولی سے سراغ کو بھی فراموش نہ کرتے ہوئے قاتل تک پہنچنا چاہتے تھے۔ مگر قاتل کی احتیاط پسندی اور فنکاری محافظوں کی راہ میں حائل تھی۔

سطر سطر سنسنی اور سسپنس پھیلانے والے اس ناول کی دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ قاتل آپ کے سامنے ہونے کے باوجود بھی ساتھ پردوں میں پوشیدہ ہے۔

تاش کے پتے ایک سنسنی خیز اور دلچسپ ترین ایڈونچر سے بھرپور ناول ہے جسے کتاب گھر کے **ایکشن ایڈونچر جاسوسی ناول سیکشن** میں پڑھا جاسکتا ہے۔

لاہور جل رہا تھا

لاہور ریلوے اسٹیشن پر گولی چل رہی تھی رائفلوں سے بھرے ہوئے بکس بادامی باغ رکے ہوئے تھے۔
جب آگ لگی تو پاکستانی مسلمان کنواں کھودنے لگے۔

لاہور شہر جل رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر رائفلیں دھاڑ رہی تھیں۔ خونریزی عروج پر تھی۔ کالج کے دو مسلمان طالب علم جنگ آزادی کے انتہائی خطرناک مشن کی تکمیل کے آخری مرحلے میں بادامی باغ ریلوے سٹیشن پر رکے کھڑے تھے۔ ان کے پاس رائفلوں اور ایمونیشن سے بھرے ہوئے پانچ بکس تھے۔ وہ گاڑی میں تھے۔ لیکن انجن کے سکھ ڈرائیور نے گاڑی لاہور لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ رائفلوں کو چینی کے برتنوں کے دھوکے میں بہت جلدی لاہور پہنچانا تھا۔ مگر گاڑی چل نہیں رہی تھی اور گاڑی کے ساتھ پولیس کی گارڈ تھی۔ یہ دو مسلمان طالب علم زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑے لاہور سے اٹھتے ہوئے ہیبت ناک شعلوں اور دھوئیں کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں لاہور ریلوے اسٹیشن پر چلتی ہوئی گولیوں کے دھماکے بھی سنائی دے رہے تھے۔ وہ رات انگریز کی حکومت کی آخری رات تھی۔ کیا تاریخ نے ان دو لڑکوں کا نام کبھی سنا ہے؟

برصغیر میں مسلمانوں کی جنگ آزادی کی بیشتر تفصیلات تاریخ کے اندھیرے گوشوں میں گم ہوتی چلی جا رہی ہیں اور بہت سے مجاہد صرف اس لئے گمنامی میں تاریخ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے کہ انہوں نے کبھی تقریر نہیں کی تھی۔ اخباروں کو کبھی بیان نہیں دیا تھا۔ ان کی تصویریں نہیں چھپی تھیں کیونکہ ان کا جہاد زمین دوز تھا۔ وہ اخباری رپورٹروں اور فوٹو گرافروں کو نظر نہیں آتے تھے۔ وہ زمین دوز ضربوں سے انگریز اور ہندو کے مسلم کش اتحاد کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے۔

کالجوں اور سکولوں کے بعض مسلمان طلبہ کے ماں باپ کو بھی علم نہیں ہوتا تھا کہ ان کے بچے کئی کئی دن اور راتیں کہاں غائب رہتے ہیں اور جب وہ گھر آتے ہیں تو ان کے رنگ اڑے ہوئے اور جسم ٹوٹے ہوئے کیوں ہوتے ہیں۔ ماں باپ اپنے مجاہد بیٹوں کو ڈھونڈتے رہتے تھے اور بعض ماں باپ آج تک اپنے بچوں کو ڈھونڈ رہے ہیں جو 1946-47ء کے کسی روز گھر سے نکلے تھے پھر لوٹ کے نہ آئے۔ وہ پاکستان کے نام پر قربان ہو گئے تھے۔

میں جو واقعہ بیان کرنے جا رہا ہوں اس سے میرا مقصد اس واقعے کے کرداروں کی تشہیر نہیں بلکہ پاکستان کی حریت کی تاریخ کا ایک واقعہ ہے جسے ہمارے آج کے بچوں اور آنے والی نسلوں کے لیے تاریخ کے دامن میں ڈال دینا لازمی ہے۔ تاریخ کے منہ سے شجاعت کے کارناموں کو چھین کر پھینک دینا زندہ قوموں کا شیوہ نہیں ہوتا۔

گو قائداعظمؒ نے پاکستان کے حصول کے لیے آئینی راستہ اختیار کیا تھا اور ڈائریکٹ ایکشن کا پروگرام بھی عدم تشدد کی بنیادوں پر مرتب

کیا تھا لیکن کالجوں کے طالب علم اسلامی طریق جنگ یعنی حدیث دفاع کے اصولوں پر گوریلا جنگ لڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے مسلمان تو پہلے ہی گوریلا جنگ کے لیے تیار تھے اور اس صوبے کے قبائلی ایک صدی سے انگریز کے خلاف برسر پیکار تھے۔ لاہور میں ایک طالب علم نے گرنیڈ تک خود تیار کر لیے تھے اور دو چار نے ڈائنامیٹ (عمارتوں، گاڑیوں اور پلوں وغیرہ کو اڑانے والے بارود) کا انتظام کر لیا تھا۔

ہوسکتا ہے کہ ہمارے لیڈروں نے آئینی جنگ میں ہی مصلحت دیکھی ہو لیکن انہیں یہ پہلو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھا کہ ہندو ایک مدت سے باقاعدہ جنگی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ تاکہ جب بھی موقع آئے مسلمانوں کو دہشت اور قتل وغارت سے ملک سے ختم کر دیں۔ یہ وہی انداز تھا جو یہودیوں نے فلسطین میں آ کر اختیار کیا تھا۔ مگر مسلمان لیڈر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی تعلیمات کو نظر انداز کر کے صرف تقریروں، قراردادوں اور جلوسوں کی جنگ لڑتے رہے۔

لیکن 3 مارچ 1947ء کے روز جب پنجاب میں خضر کی وزارت مستعفی ہوئی تو ماسٹر تارا سنگھ نے اسمبلی ہال کے سامنے ننگی کرپان لہرا کر کہا کہ پاکستان کا فیصلہ میری تلوار کرے گی۔ تو مسلمانوں نے محسوس کیا کہ وہ کرپان کا جواب تلوار سے دینے کے لیے تیار نہیں۔ ماسٹر تارا سنگھ کی کرپان وقتی ابال کے زیر اثر نہیں بلکہ ہندو کے پچاس سالہ جنگی پروگرام کے تحت نکلی تھی۔ اسی روز امرتسر میں مسلمانوں کا کشت وخون شروع ہو گیا تھا۔ پھر جون 1947ء میں جب برصغیر کی تقسیم اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں استصواب اور پنجاب کو دو ٹکڑوں میں کاٹ دینے کا اعلان ہوا تو ہندو منظم طریقے سے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ لاہور میں سکھ نیشنل کالج نے جلوس نکالا اور یہ جلوس اشتعال انگیز نعرے لگاتا چوک متی پہنچا تو ہندوؤں اور سکھوں نے ایک مسلمان دوکاندار کو چاقوؤں سے حملہ کر کے شہید کر دیا۔

دلی سے مرکزی حکومت کا پاکستانی عملہ بال بچوں سمیت ریل گاڑی پر کراچی آ رہا تھا۔ ابھی پاکستان بننے میں کوئی ایک مہینہ رہ گیا تھا۔ ہندوؤں نے بٹھنڈہ ریلوے سٹیشن کے قریب اس پاکستان سپیشل ٹرین کے نیچے ڈائنامیٹ رکھ دیا۔ گاڑی کی پچھلی دو بوگیاں زد میں آ گئیں جس سے تین مسلمان شہید اور بہت سے زخمی ہوئے۔ ہندوؤں کی یہ تباہ کن سرگرمیاں ان کی منظم ٹریننگ اور جنگی اصولوں پر تیار کی ہوئی مسلم کش سکیم کا ابتدائی اقدام تھیں۔

مشرقی پنجاب کی مسلم لیگ نے لاہور مسلم لیگ ہائی کمان کو لکھا کہ مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کا میدان میں مقابلہ کرنے کے لیے رائفلیں بھیجو۔ اس خطے کے مسلمان نہ صرف غریب تھے بلکہ کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ انہیں اس وقت کے لیے بھی تیار کرنا ہے جب ہندو انہیں قتل کرنے اٹھ کھڑا ہو گا۔ ان کے پاس چاقوؤں اور لاٹھیوں کے سوا کچھ نہ تھا اور نہ وہ ذہنی طور پر دوبدو معرکے کے لیے تیار تھے۔ مسلم لیگ ہائی کمان کے پاس ہتھیار کہاں؟ سبز وردیوں میں ملبوس نیشنل گارڈ تھی اور وہ بھی فوجی تربیت اور حدیث دفاع سے بے بہرہ۔ اب نعرے لگانے اور ”لیفٹ رائٹ“ کا وقت گزر گیا تھا۔ اب تو ہندوستان کے مسلمانوں کے جان ومال اور آبرو کے تحفظ کا وقت آ گیا تھا۔ اور یہی تھا وہ وقت جس کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے حربی قواعد وضوابط اور احکام مرتب کیے تھے اور جس کے متعلق قرآن نے بھی فرمایا ہے کہ دشمن شر اور فساد سے باز نہ آئے تو اینٹ کا جواب پتھر سے دو مگر یہاں کیفیت یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو اتنی سی تربیت بھی نہ دی تھی کہ پتھر بھی نشانے پر مار سکتے۔

اس وقت لاہور کے ایک طالب علم سلیم طاہر نے ہندوؤں کو یہ بتانے کے لیے کہ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں اپنے دو تین ساتھیوں سے مل کر پنجاب کلکتہ میل (جو لاہور سے کلکتہ تک جاتی تھی) کو ڈائنامیٹ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے ڈائنامیٹ اور اس کو آگ لگانے کے لیے ڈینمو اسکپلوڈر کا انتظام کر لیا اور جلو موڑ سے آگے ریلوے لائن میں ڈائنامیٹ رکھ دیا اور خود دور محفوظ فاصلے پر ایکسپلوڈر جا رکھا۔ گاڑی آئی اور سلیم طاہر نے ایکسپلوڈر کا بٹن دبا دیا۔ مگر ڈائنامیٹ نہ پھٹا۔ بیشتر اس کے کہ وہ پھر بٹن دباتا گاڑی گزر گئی تھی۔

سلیم طاہر وہی مجاہد ہے جس نے فروری 1947ء میں خاور سلطانہ کے ساتھ لاہور سیکرٹریٹ میں گورنر کے دفتر پر سبز پرچم لہرایا تھا (سیارہ ڈائجسٹ: شمارہ نومبر 1967) میں آج بیس برس بعد سلیم طاہر سے ملا تو اس نے ڈائنامیٹ کی ناکامی کا ذکر کیا۔ اس کی آنکھیں لال سرخ ہو گئیں اور کہنے لگا کہ میں آج بھی اس واقعے کو یاد کرتا ہوں تو میرے ذہن میں ہیبت ناک دھماکہ ہوتا ہے اور مجھے یوں نظر آتا ہے جیسے ہندوؤں سے بھری ہوئی گاڑی کے پرخچے ہوا میں اڑ رہے ہوں۔

اس وقت ہندوؤں اور سکھوں نے اپنی تمام تر نقدی اور سونا سمیٹ کر ہندوستان لے جانا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ مسلمانوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آبادی کا اتحاد ہو گا یا قتل و غارت بھی ہو گی لیکن ہندوؤں نے بہت عرصے سے پروگرام طے کر رکھا تھا۔

مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا کشت و خون شروع ہو گیا تو مسلم لیگ ہائی کمان نے نیشنل گارڈ کو جنگی خطوط پر منظم کرنا چاہا۔ اس مقصد کے لیے آئی۔ این۔ اے (سبھاش چندر بوس کی نام نہاد آزاد ہند فوج) کے کرنل دارا کرنل اشرف اور کرنل تجمل نے نیشنل گارڈ کی کمان سنبھال لی۔ اور فوجی طریقے سے انہیں جنگی تربیت دینے لگے یعنی جب آگ لگی تو کنواں کھدنے لگا۔

سلیم طاہر کے جوش جہاد کا یہ عالم تھا کہ اس نے تعلیم بھی ترک کر دی تھی اور بیشتر طلبہ کا بھی یہی حال تھا۔ اس امر کا اعتراف تو قائداعظم نے بھی کیا تھا کہ پاکستان کی بنیاد قوم کے انہی نونہالوں نے رکھی ہے۔ ان لڑکوں پر دیوانگی طاری تھی۔ انگریز تو شکست کھا کر جا رہا تھا۔ مگر ہندو‘ مسلمان کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ اب مسلمان کی آبرو ان لڑکوں سے خون کے نذرانے مانگ رہی تھی۔

سلیم طاہر کرنل تجمل کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ کرنل تجمل نے اسے کہا کہ میانوالی پہنچو اور وہاں تمہیں رائفلیں ملیں گی۔ وہ لاہور لے آؤ۔ سلیم طاہر کے ساتھ دو آدمی۔ فتح محمد اور ''آزاد ہند فوج'' کا سابق کپتان غلام حسین بھیجے گئے۔ تینوں میانوالی پہنچے۔ انہیں نواب ممدوٹ نے رائفلوں کی قیمت دے دی تھی۔ میانوالی میں امیر عبداللہ روکڑی سے ملے جو مسلم لیگ کے صدر یا سیکرٹری تھے وہیں فتح شیر جھمٹ سے ملاقات ہوئی جو مسلم لیگ کے سرگرم رکن تھے۔ انہوں نے ان لڑکوں کو خوب شاباش دی۔ رات بھر وہیں رکھا اور سر آنکھوں پر بٹھا کر خاطر تواضع کی اور اگلے روز انہیں اپنے مکان کے ایک وسیع کمرے میں لے گئے۔ کمرے میں سینکڑوں رائفلیں‘ دیواروں کے ساتھ کھڑی تھیں اور فرش پر گولیاں اس طرح رکھی تھیں جیسے گندم کے دانوں کا ڈھیر کھلیان میں لگا ہوتا ہے۔

وہاں سے انہیں ابوخیل لے جایا گیا۔ جہاں مختلف گھروں میں رائفلوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ یہ تمام رائفلیں قبائلی علاقے سے آئی تھیں اور تمام کی تمام انگریز کی ان فوجوں سے چھینی ہوئی تھیں جو آزاد قبائل کو اپنا محکوم بنانے کے لیے لڑ رہی تھیں۔

کیپٹن غلام حسین نے چند ایک رائفلوں کا معائنہ کیا۔ فائر کر کے دیکھا اور انہیں پاس کر کے بکسوں میں بند کروا لیا۔ چار بکسوں میں رائفلیں اور ایک میں گولیاں ڈال لی گئیں۔ یہ بکس چھوٹے چھوٹے نہیں بلکہ ان کی لمبائی رائفل جتنی اور اونچائی چوڑائی اسی کے مطابق تھی وزن کا یہ عالم تھا کہ چار آدمی ایک بکس کو نہیں اٹھا سکتے تھے اور حقیقت بھی سامنے رکھیے کہ ابھی حکومت انگریز کی تھی۔ اور قدم قدم پر اور ہر گاڑی کے ساتھ پولیس کی گاڑیں موجود رہتی تھیں جن میں زیادہ تر ہندو اور سکھ ہوتے تھے۔ ان حالات میں اس قدر بڑے بڑے بکس گاڑی پر لانا آسان نہ تھا۔

امیر عبداللہ کبڈیاں تک ان لڑکوں کے ساتھ آئے اور انہیں خدا کے سپرد کر کے واپس چلے گئے۔ آگے لڑکوں نے یہ بکس لاہور پہنچا دیئے لیکن ان کے اعصاب پر ہر لمحہ یہ کھچاؤ رہا کہ وہ کسی بھی جگہ پکڑے جائیں گے۔ انہوں نے بکس کرنل تجمل کے حوالے کر دیئے تو رائفلوں کو انگور کے لمبے ٹوکروں میں رکھ کر ادھر ادھر خشک گھاس وغیرہ رکھی گئی اور یہ ٹوکرے انگور کے ٹوکروں کے بہروپ میں مشرقی پنجاب پہنچا دیئے گئے۔

ان رائفلوں نے وہاں کیا کام کیا؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام اور تیز ہو گیا تھا اور ہندو 14 اگست سے پہلے ہندوستان سے مسلمانوں کا وجود ختم کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ پاکستان پر مہاجرین کا اس قدر بوجھ ڈال دیا جائے کہ وہ اس مسئلے میں الجھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی سوچ ہی نہ سکے۔ سردار پٹیل نے یہ بات اعلانیہ کہہ بھی دی تھی کہ ہم پاکستان کو اقتصادی اور فوجی لحاظ سے اس قدر معذور کر دیں گے کہ وہ ہماری ایک ہی چوٹ سے ختم ہو جائے گا اور ہندوستان پھر ایک ہو جائے گا یعنی ہندو راج قائم ہو جائے گا۔

ہندوستان اور مشرقی پنجاب سے مہاجرین کا سیل چلا آ رہا تھا۔ مشرقی پنجاب کی مسلم لیگ نے مزید اسلحہ مانگا تو کرنل تجمل نے سلیم طاہر کو ہی حکم دیا کہ میانوالی جاؤ اور اسلحہ لے آؤ۔ یہ 11 اگست 1947ء کا ذکر ہے اس روز تک مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کا ردعمل اس طرف بھی شروع ہو چکا تھا۔ جوں جوں ادھر سے زخمی مہاجرین کے بھوکے پیاسے بچے اور بربریت کا شکار عورتیں ادھر آتی جا رہی تھیں۔ اس طرف کے مسلمان پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ وہ مشرقی پنجاب میں جا کے لڑنا چاہتے تھے جو ان کے لیے محال تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس طرف کے مسلمانوں کو بچانے کے لیے اس طرف کے ہندوؤں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ لیکن اسے ہم مشرقی پنجاب کی طرح کا قتل عام نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ اقدام ہندوؤں کی طرح منظم نہیں بلکہ انفرادی ردعمل تھا۔ پاکستانی مسلمان بحیثیت قوم اس الزام سے بری ہیں جس پر پاکستان ہمیشہ فخر کرتا رہے گا۔

11 اگست 1947ء کے روز سلیم طاہر اپنے ایک ساتھی ضیاء الدین کیساتھ نواب ممدوٹ سے رقم لے کر میانوالی امیر عبداللہ روکھڑی کے ہاں پہنچا۔ امیر عبداللہ نے اسے پہلے کی طرح چار بڑے بڑے بکس رائفلوں سے بھر دیئے اور پانچویں بکس میں ایمونیشن ڈال دیا۔ اور 12 اگست کو انہیں گاڑی پر سوار کرا دیا۔ اب یہ توقع عبث تھی کہ یہ اسلحہ پہلے کی طرح خیریت سے لاہور پہنچ جائے گا۔ کیونکہ گاڑی میں پولیس کے بے شمار ہندو اور سکھ افسر اور دیگر عملہ تبدیل ہو کر ہندوستان جا رہا تھا۔ ریلوے سٹیشنوں پر ہجوم اور اس ہجوم کے انداز میں ہیجان اور کھچاؤ تھا۔ ہر کوئی ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ گاڑی ہر سٹیشن پر لیٹ ہو رہی تھی۔ ابھی انگریز کی حکومت تھی۔

13 اگست کی صبح کو گاڑی کو لاہور پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن ابھی مشکل لائل پور (حال فیصل آباد) پہنچی تھی۔ سلیم طاہر کا دم خشک ہو چکا تھا۔ کیونکہ

ماحول بتا رہا تھا کہ اتنے بڑے بڑے پانچ بکس کسی وقت بھی پولیس کی نظر میں آ سکتے تھے۔ سلیم طاہر کے پاس ایک اٹیچی کیس بھی تھا جس میں اس نے بوقت ضرورت استعمال کرنے کے لیے دو چھوٹی رائفلیں چھپا رکھی تھیں اور ایمونیشن جیبوں میں تھا۔ وہ دن انگریز کی حکمرانی کا آخری دن تھا۔

لائل پور سٹیشن پر پولیس کا ہجوم کھڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ کوئی ہندو ایس پی اور دوسرے ہندو سکھ پولیس افسر تبدیل ہو کر جا رہے ہیں۔ یہ تمام لوگ سلیم طاہر کے تھرڈ کلاس ڈبے کے ساتھ ہی فسٹ کلاس میں بیٹھ گئے۔ سب سے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ سلیم طاہر کے ڈبے میں اس کے ساتھی کے علاوہ کوئی اور مسافر نہیں تھا۔ اس لیے پانچ بکس صاف نظر آ رہے تھے۔ سلیم طاہر نے سوچا کہ کسی مسلمان سپاہی کو اعتماد میں لے لیا جائے تا کہ خطرے کے وقت کام آئے۔ اس نے ایک سپاہی سے نام پوچھا تو وہ مسلمان نکلا۔ سلیم طاہر نے اسے طویل تمہید کے بعد بکس دکھا دیئے اور اسے ساری بات بتا کر کہا کہ آج یہ سامان غیر قانونی ہے لیکن آج رات بارہ بجے کے بعد یہ پاکستان کا سرکاری اسلحہ ہو جائے گا۔ اس کی حفاظت کے لیے کوئی مسلمان جان بھی دے دے تو یہ کوئی ایسی بڑی قربانی نہیں ہو گی۔

یہ سپاہی پہلے تو جھجکا لیکن سلیم طاہر نے اسے مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے خون اور مسلمانوں کی آبرو کا واسطہ دیا تو وہ سپاہی ہر طرح کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

خدا خدا کر کے گاڑی چلی اور سانگلہ ہل پہنچی تو ایک ہندو ٹکٹ چیکر آن دھمکا اس کی نظر اتنے بڑے بکسوں پر پڑی تو اس نے سلیم طاہر اور ضیاء سے کہا کہ صرف دو تھرڈ کلاس ٹکٹوں کے ساتھ تم اتنا سامان تو نہیں لے جا سکتے۔ اس نے ایک بکس کو ہاتھ لگایا تو سلیم طاہر کے دماغ نے ایک بات سوچ لی۔ ٹی ٹی نے کہا۔ ’’یہ بہت وزنی ہیں ہلتے ہی نہیں۔ ان میں کیا ہے؟‘‘...... سلیم طاہر نے خود اعتمادی بلکہ رعب سے کہا۔ ’’انہیں ہاتھ نہ لگانا۔ ان میں کراکری ہے۔ میں ڈی ایس پی جہان خان کا اردلی ہوں۔ یہ ان کا سامان ہے' لاہور جا رہا ہے...... جہاں خان کو پنجاب والے خوب جانتے تھے۔ ٹی ٹی پر یہ رعب کام کر گیا اور وہ ٹکٹ دیکھ کر چلا گیا۔ لیکن سلیم طاہر کا خون خشک کر گیا۔

گاڑی شیخوپورہ پہنچ گئی تو ایسی رکی کہ چلنے کا نام نہ لیتی تھی۔ معلوم ہوا کہ انجمن ڈرائیور سکھ ہے اور اس نے گاڑی لاہور لے جانے سے انکار کر دیا ہے۔ کیونکہ لاہور شہر جل رہا ہے۔ سلیم طاہر نے باہر نکل کر دیکھا تو لاہور سے اٹھتا ہوا سیاہ اور سرمئی دھواں شیخوپورہ سے یعنی کوئی بیس میل دور سے صاف نظر آ رہا تھا۔ دھوئیں کی گھٹائیں یقین دلا رہی تھیں کہ سارے شہر کو آگ لگی ہوئی ہے۔ سکھ ڈرائیور انجن سے اتر آیا لیکن سٹیشن ماسٹر نے اسے رکنے کی اجازت نہ دی اور کہا کہ گاڑیاں آ جا رہی ہیں۔ مجھے گاڑی روکنے کا اختیار نہیں دیا گیا۔ یہ خطرے کی کوئی سرکاری اطلاع آئی ہے۔

سکھ کو مجبوراً گاڑی چلانی پڑی۔ شام چار بجے شاہدرہ پہنچے۔ وہاں سے تو لاہور سے اٹھتے ہوئے بھیانک شعلے بھی نظر آ رہے تھے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ آگ کہاں کہاں لگی ہوئی ہے۔ اس ہیبت ناک منظر کو دیکھ کر سکھ ڈرائیور نے لاہور تک جانے سے بالکل ہی انکار کر دیا شاہدرہ کے سٹیشن ماسٹر نے لاہور کنٹرول سے بات کی تو وہاں سے اسے حکم نامہ مل گیا کہ گاڑی وہیں خالی کر دو۔ لاہور سٹیشن سخت خطرے میں ہے۔

سلیم طاہر اور اس کے ساتھی نے بکس پلیٹ فارم پر رکھے۔ ان دونوں سے بکس ہل بھی نہیں رہے تھے لیکن انہوں نے ہمت کی اور اتار لیے مگر ان کے دل حلق میں اٹک گئے۔ سٹیشن سے باہر کوئی تانگہ نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو یہ سامان ایک تانگے پر لے جانا آسان نہ تھا اور خطرہ بھی تھا۔ اب

بکس پلیٹ فارم پر رکھے تھے اور ہر کسی کو نظر آ رہے تھے اور یہاں بھی پولیس گھوم رہی تھی۔

سلیم طاہر نے پولیس کے حوالدار کو دیکھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ اسے مسلمان سمجھتے ہوئے سلیم طاہر نے اسے اسلام علیکم کہا تو اس نے وعلیکم السلام کہا: نام پوچھا تو اس کا نام بھی سلیم تھا۔ سلیم طاہر نے اسے بتایا کہ میں بھی سلیم ہوں۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سیکرٹری ہوں اور یہ بکس دیکھ لو...... اس نے حوالدار کو ساری بات بتا دی۔ یہ حوالدار پہلے تو گھبرایا لیکن سلیم طاہر نے اسے کہا کہ آؤ مجھے کسی ٹیلیفون پر لے چلو میں تمہارے سامنے فون پر نیشنل گارڈ سے بات کرتا ہوں۔

حوالدار اسے سٹیشن کے فون پر لے گیا۔ طاہر نے کرنل تجمل کو فون کیا اور صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ جیپ بھیج دیں لیکن کرنل تجمل نے جواب دیا کہ شہر بھر میں کرفیو شروع ہونے والا ہے۔ شام کے ساڑھے چھ بج چکے ہیں۔ اس لیے یہاں سے تمہیں کوئی مدد نہیں مل سکتی سلیم طاہر نے ان پر صورت حال پھر واضح کی تو کرنل تجمل نے مخصوص فوجی انداز میں حکم دیا۔ ''صورت حال کو خود کنٹرول کرو اور اسلحہ ٹھیک سے لے آؤ۔ سلیم طاہر اس فوجی حکم سے چکرا گیا اور فرض کی لگن نے اسے سنبھال لیا۔ بہر حال حوالدار سلیم کو یقین ہو گیا اور اس نے مدد کا وعدہ کیا اتنے میں پنڈی سے سندھ ایکسپریس آئی۔ اور ایک آدھ منٹ رک کر لاہور چلی گئی۔ پھر پتہ چلا کہ نارروال سے مسافر گاڑی آ رہی ہے۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ ہیجان اور گھبراہٹ سے بھرپور تھا۔ طاہر اور ضیا کو پکڑے جانے یا مارے جانے کا ڈر نہ تھا۔ وہ اسلحے کو لاہور تک پہنچانے کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔

نارووال سے گاڑی آئی تو دوسرے پلیٹ فارم پر رکی۔ جہاں تک اتنے وزنی بکس پہنچانا ناممکن تھا لیکن حوالدار سلیم نے قلیوں کو بلا کر پولیس والوں کا رعب جمایا اور بکس دستی ریڑھے پر رکھوا کر گاڑی پر لدوا دیئے۔ اب بکس ایک جگہ نہ رکھے گئے بلکہ مختلف ڈبوں میں ایک ایک بکس رکھ دیا گیا۔ دیکھا کہ اس گاڑی کے ساتھ پولیس کی پوری گارڈ تھی جو ہر کسی کے سامان کو بڑی غور سے دیکھ رہی تھی۔

سامان رکھتے ہی گاڑی چل پڑی اور بادامی باغ رک گئی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اور اب لاہور سٹیشن سے گولیاں چلنے کے دھماکے صاف سنائی دے رہے تھے۔ آگ کی قیامت تو اور زیادہ ہیبت ناک ہو گئی۔ بادامی باغ دراصل لاہور شہر کا ہی حصہ ہے جو لاہور سٹیشن سے بمشکل دو میل دور ہے، اسلحہ اب منزل سے دو ہی ہاتھ دور تھا۔ مگر منزل جل رہی تھی اور یہ دو ہاتھ دو سو کوس کی کٹھن مسافت بن گئے تھے۔ آگے سے اطلاع آئی کہ لاہور سٹیشن کا سٹاف یا تو مارا گیا ہے یا بھاگ گیا ہے اور سٹیشن پر فائرنگ ہو رہی ہے۔

یہ فائرنگ بلوچ رجمنٹ کے سپاہی کر رہے تھے۔ یہ پلٹن پاکستان کے حصے میں آئی تھی اور اسے فسادات کے دوران ہندوستان سے لاہور بھیجا گیا تھا۔ تمام افسر اور جوان مسلمان تھے۔ انہوں نے راستے میں (مشرقی پنجاب) کا قتل عام دیکھا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو بچانے کی بھی کوشش کی تھی اور بڑا نام پیدا کیا تھا۔ جن سپاہیوں نے ننھے ننھے مسلمان بچوں کو برچھیوں اور کرپانوں سے کٹتے دیکھا ہو یا مسلمان عورتوں کو بے آبرو ہو کر شہید ہوتے دیکھا ہو۔ ان سپاہیوں کے جذبات کو فوج کا قانون قابو میں کہاں رکھ سکتا تھا۔ بلوچ رجمنٹ کے جوان اب انگریز کے نوکر نہیں بلکہ پاکستان اور اللہ کے سپاہی تھے۔ جب یہ پلٹن لاہور سٹیشن پر پہنچی تو ادھر سے ہزار ہا ہندو سکھ اور ہندوستانی فوجی ہندوستان جانے کے لیے سٹیشن پر جمع تھے بعض گاڑیوں میں بیٹھ گئے اور ان کی حفاظت کے لیے پولیس موجود تھی لیکن بلوچ رجمنٹ کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماؤں بہنوں اور بچوں کا خون

اور بھوکے پیاسے ہراساں قافلے تھے۔ مسلمان سپاہیوں نے جب ہندوؤں کو دیکھا تو یہ خون ان کی آنکھوں میں چڑھ آیا اور وہ پاگل ہو کر افسروں کے قابو سے نکل گئے۔ رائفلیں اور ایمونیشن ان کے پاس تھا۔ انہوں نے ریلوے سٹیشن پر بکھر کر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ نہ سٹاف کو بخشا نہ کسی دوسرے ہندو سکھ فوجی یا شہری کو خیریت سے جانے دیا۔

اب کوئی یہ کہے کہ پاکستان میں بھی نہتے شہریوں کو قتل کیا گیا تھا۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ قتل عام شروع کس نے کیا تھا؟ پاکستان کی حکومت تو ابھی وجود میں ہی نہیں آئی تھی۔ ادھر کے شہریوں اور بلوچ رجمنٹ کے سپاہیوں کے ردعمل کو کون روکتا؟ اور ہندوستان سے مسلمانوں کی لاشوں کی بھری ہوئی جو ریل گاڑی لاہور پہنچی تھی اسے دیکھ کر بلوچ رجمنٹ کے سپاہی رائفلوں کی نالیوں کو نیچے کس طرح کر لیتے؟

بلوچ رجمنٹ تو آج تک بے گناہ مسلمانوں کے خون کو نہیں بھولی 6 ستمبر 1965ء کو جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تو یہی بلوچ رجمنٹ لاہور کے دفاع میں لڑی تھی اور اسی رجمنٹ کے مورچوں سے یہ نعرہ گرجا تھا۔ ''پاکستانیو! سن سنتالیس کا غبار نکالو۔ یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔'' یہی جذبہ اور یہی آگ تھی جس نے لاہور کو بچایا تھا۔ جو آگ اٹھارہ برسوں میں ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اسے اسی روز ٹھنڈا کر دینا جس روز مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ کس کے بس کی بات تھی؟

آج سلیم طاہر بھی یہ کہتا ہے کہ شہریوں کا خون نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ جب وہ بادامی باغ سٹیشن پر کھڑا لاہور سٹیشن پر چلتی گولیوں کے دھماکے سن رہا تھا تو اسے روحانی مسرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے قتل عام کو روکنے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ ہندوؤں کی لاشوں سے گاڑیاں بھر کر ہندوستان بھیجو...... اور کوئی نہیں' کوئی بھی اور ذریعہ نہ تھا۔

بادامی باغ میں سلیم طاہر نے سفید کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی سے راہ رسم پیدا کی تو آدمی مسلمان نکلا۔ اس کا نام سعید احمد ہے اور آج کل کسٹم انسپکٹر ہے۔ اس کے ساتھ پولیس گارڈ کا انچارج تھا۔ وہ بھی مسلمان نکلا اس کا نام محمد طفیل ہے۔ طاہر نے دونوں کو بکسوں کے متعلق بتا دیا۔ سعید امرتسر کا رہنے والا تھا اور بچوں کو لینے جا رہا تھا۔ اس نے طاہر کو بتایا کہ وہ راستے میں تین چار ہندوؤں کو مار آیا ہے۔ معلوم نہیں امرتسر میں میرے بچے زندہ ہیں یا نہیں۔ ان دونوں نے سلیم طاہر کو تسلی دی اور مدد کا وعدہ کیا۔

گاڑی چلنے کا کوئی امکان نہ تھا اور کوئی انتظام نہ تھا۔ پہلے تو وہ پلیٹ فارم پر گھومتے رہے لیکن جذباتی حالت ایسی تھی کہ طاہر کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ساتھی اور ان دونوں کو سٹیشن سے باہر مکندی کے کارخانے (جہاں آج بیکو کی فیکٹریاں ہیں) کے قریب لے گیا۔ وہاں ہندوؤں کی ایک سیاہی بنانے والی فیکٹری تھی۔ انہوں نے اسے آگ لگائی اور سٹیشن پر واپس آ گئے۔ سعید اور طفیل پرے چلے گئے اور ضیاء ایک ڈبے میں جا کر سو گیا۔

سلیم طاہر پلیٹ فارم پر اکیلا گھوم رہا تھا کہ طفیل اپنے ساتھ پولیس کے ایک اور سپاہی کو لیے آ گیا۔ دونوں کے پاس رائفلیں اور رائفلوں پر سنگینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ دونوں نے سنگینوں کی نوکیں سلیم طاہر کے پہلوؤں میں رکھ کر طاہر سے کہا۔ ''ہاتھ اوپر اٹھا دو'' ...... سلیم کو اس وقت معلوم ہوا کہ وہ مسلمان نہیں ہندو ہیں۔ اس کا خون ابلا لیکن دونوں پہلوؤں میں سنگینوں کی نوکیں تھیں۔ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے غم اسلحہ کا تھا اپنی جان کا نہیں۔ وہ مقابلہ کیے بغیر مرنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن بے بس تھا۔

وہ دونوں اسے فسٹ کلاس کے ڈبے کی طرف لے چلے تو سلیم طاہر سے انہیں کہا کہ دوسرے ڈبے میں لے چلو۔ اس کا اٹیچی کیس اس ڈبے میں تھا۔ اٹیچی میں اس نے اپنے استعمال کے لیے دو چھوٹی رائفلیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ایک رائفل نکال کر مقابلہ کرے گا۔ مگر پولیس کے دونوں آدمی اسے فسٹ کلاس کے ڈبے میں لے گئے۔ طاہر کو وار کرنے کا موقعہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ ڈبے میں جا کر دونوں نے اسے کہا کہ ہم یقین کرنا چاہتے ہیں کہ تم واقعی مسلمان ہو۔ سلیم طاہر کی جان میں جان آئی۔ اس نے انہیں بند ڈبے میں ان کے کہنے کے مطابق مسلمان ہونے کا ثبوت پیش کر دیا۔ دونوں نے اس سے بے تحاشا معافیاں مانگیں اور کہا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ وہ طاہر کے مسلمان ہونے کا یقین کر لیتے۔ انہوں نے طاہر کو فسٹ کلاس کے ڈبے میں پنکھے تلے سلا دیا اور خود رائفلوں کے بکسوں کی رکھوالی کرنے لگے۔ سلیم طاہر تو سو گیا لیکن وہ اس وقت کے جذباتی وبال کو آج بھی نہیں بھولا۔

رات بارہ بجے قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا اور ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام اور تیز اور شدید ہو گیا۔ صبح ہوئی تو سلیم طاہر تانگے پر لاہور ریلوے سٹیشن پہنچا۔ وہاں ڈاکٹر محمد باقر کے بھائی ملک بشیر مل گئے جو پولیس انسپکٹر تھے۔ طاہر نے انہیں ساری بات بتا دی تو انہوں نے تسلی بھی دی اور پتہ کروا دیا کہ بادامی باغ میں رکی ہوئی گاڑی آ رہی ہے۔ لاہور سٹیشن کے اندر اور باہر کا منظر یہ تھا کہ لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ بلوچ رجمنٹ کے سپاہی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ وہاں گورکھا سپاہیوں کا پہرہ بھی تھا لیکن منظر پر بلوچ رجمنٹ چھائی ہوئی تھی۔

طاہر باہر ہی کھڑا تھا کہ ریلوے سٹیشن کی پیشانی پر پاکستان کا جھنڈا چڑھایا گیا۔ یہ پہلا جھنڈا تھا۔ سلیم طاہر کا سینہ جذبات کی شدت سے تھرکنے لگا۔ اس جھنڈے کی خاطر اتنے انسانوں نے خون بہا دیا تھا۔ طاہر بہت دیر اس جھنڈے کو دیکھتا رہا اور فتح و مسرت کی رو اس کی رگ رگ میں سرایت کرتی گئی مگر جذبات میں پھر طوفان اٹھ آیا کیونکہ اسے یاد آ گیا تھا کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ وہ تڑپ اٹھا اور ان پانچ بکسوں کے لیے بیتاب ہونے لگا جو مشرقی پنجاب بھیجنے کے لیے بادامی باغ رکے ہوئے تھے۔

سلیم طاہر نے ریلوے سٹیشن کے تھانہ انچارج آغا صاحب کو جا بتایا کہ گاڑی میں اس قسم کے بکس آ رہے ہیں۔ آغا صاحب پہلے تو پولیس والوں کا رعب جمانے لگے لیکن ساتھ ہی اپنے ایک سب انسپکٹر صاحب کو اسی رعب دار لہجے میں کہا۔ ”جاؤ دیکھو یہ لڑکا کیا بکواس کر رہا ہے۔ اس کی ذرا مدد کر دینا۔“

گاڑی آ رہی تھی۔ سلیم طاہر ریلوے سٹیشن کے باہر کھڑا تھا کہ ایک سکھ میجر فوجی جیپ پر سوار آیا۔ اس نے جیپ روکی اور اتر آیا۔ ادھر سے بلوچ رجمنٹ کا ایک سپاہی آ گیا۔ اس نے سکھ میجر کو سلیوٹ کیا میجر نے بارعب طریقے سے سلیوٹ کا جواب دیا اور آگے چل پڑا بلوچ رجمنٹ کے سپاہی نے رائفل کندھے سے لگائی اور سکھ میجر کو گولی مار دی۔ میجر گرا اور مر گیا سپاہی نے اس کی لاش کو نہایت احترام سے سلیوٹ کیا اور اوپر سے چلا گیا۔

سب انسپکٹر صاحب اور پولیس کا ایک اور کانسٹیبل سلیم طاہر کے ساتھ تھے کہ ادھر سے دو سکھ آتے نظر آئے۔ میر صاحب نے کانسٹیبل سے کہا۔ ”گولی مار دو۔“ کانسٹیبل نے رائفل سیدھی کی اور گولی چلا دی۔ ایک سکھ گرا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ دوسرا چیخنے چلانے اور بھاگنے لگا کانسٹیبل نے اسے بھی گولی مار دی۔ وہ گولی کھا کر بھی چیختا رہا۔ اس وقت سلیم طاہر کو بہت دکھ ہوا لیکن وہ کہتا ہے کہ اس سکھ کی چیخیں ان مسلمان بچوں اور عورتوں کی چیخیں

بن گئیں جنہیں ہندو اور سکھ بے دردی سے قتل کر رہے تھے۔ آج بھی مجھے اس سکھ کی آخری چیخیں یاد آتی ہیں تو وہ مشرقی پنجاب کے شہیدوں کی چیخیں بن جاتی ہیں۔ ابتداً ہندوؤں نے کی تھی۔

گاڑی آ گئی۔ میر صاحب اور کانسٹیبل نے بکس اتروائے اور انسپکٹر بشیر صاحب نے اپنی جیپ پر رکھوا کر نیشنل گارڈ کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچا دیئے جہاں رائفلوں اور ایمونیشن کو پہلے کی طرح انگور کے لیے ٹوکروں میں سرحد پار کر دیا گیا۔ یعنی سمگل کیا گیا۔ کیونکہ اب سرحدیں تقسیم ہو چکی تھیں اور ادھر ہندوستان کی حکومت تھی۔

لیکن آج یہ سوال ذہن میں اٹھ آیا ہے۔ 1947ء میں بیشتر مسلمانوں نے کبھی رائفل کو چھوا تک نہ تھا۔ وہ زندہ باد اور مردہ باد کے نعروں پر بھروسہ کیے بیٹھے تھے۔ وہ یہ نعرہ بھی لگاتے رہے۔ ''نعرہ رسالت یا رسول ؐ اللہ...... لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پیغام کو نظر انداز کرتے رہے کہ دشمن شر اور فساد سے باز نہ آئے تو اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔

اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی ضرورت آج جوں کی توں ہی نہیں۔ ستمبر 1965ء کے بعد کہیں زیادہ ہو گئی ہے۔ کیا آج پاکستان کے ہر فرد کے ہاتھ میں ہندو کی اینٹ کا جوابی پتھر ہے؟ اور وہ اسے پھینکنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے؟

(حامد ہمدانی۔ سیارہ ڈائجسٹ جنوری 1968ء)

شکنجہ

شکنجہ ناول پاکستان میں ہونے والی تخریب کاری کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ہمارے ہاں گذشتہ کچھ سال سے ''ٹریک ٹو ڈپلومیسی'' کا غلغلہ کچھ زیادہ ہی زور شور سے مچایا جا رہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ محبتوں کے جو زنگ آلود دروازے حکومتیں نہیں کھول سکیں وہ شاید عوام بلکہ عوام بھی نہیں دانشور خواتین و حضرات اپنی مساعی سے کھولنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن...... اس ٹریک ڈپلومیسی کی آڑ میں کیا گھناؤنا کھیل رچایا جا رہا ہے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں ''بھولے بادشاہوں'' کو کس کس طرح اپنے جال میں پھانستی ہیں اور ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

ایک اور بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ پاکستان اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعے کی ذمہ داری ''را'' پر ڈال دیتا ہے۔ یہ بات کس حد تک سچ ہے؟ کس حد تک جھوٹ؟ شاید ان سوالات کے جواب بھی آپ کو اس ناول کے مطالعے سے مل جائیں۔ محبتوں کی آڑ میں منافقتوں کا دھندہ کون چلا رہا ہے؟ دشمن کی سازش کیسے انجام پاتی ہے اور اس سازش کا شکار ہم انجانے میں کیسے بن جاتے ہیں میں نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول کتاب گھر کے **ایکشن ایڈونچر جاسوسی** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

دہلی میں مسلمانوں کے لاشے تڑپ رہے تھے' ٹرینیں کٹ رہی تھیں......
اور سکندر مرزا کہہ رہا تھا:

کوئی خطرہ نہیں

اگست 1947ء میں دہلی کے خونریز ہنگاموں اور مسلمانوں کی ہجرت پاکستان کے وقت میں سنٹرل انٹیلی جنس اور آرمڈ فورسز ہیڈکوارٹرز سیکورٹی فورس سے منسلک تھا۔ پنجاب سی آئی ڈی کے ڈی ایس پی آغا رشید احمد میرے رفیق کار تھے اور سکندر مرزا واحد سینئر مسلمان افسر ہمارے بڑے باس (Boss) تھے۔ پنجاب سی آئی ڈی کے مشہور مسلم دشمن سابق سربراہ اور انٹیلی جنس ڈائریکٹر کرنل بائیس اور دوسرے افسروں کے علاوہ وزیر داخلہ سردار پٹیل کے ساتھ بھی اپنے فرائض کے سلسلے میں ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ انٹیلی جنس کے ذرائع سے ہمیں سیاسی اور فرقہ وارانہ کشیدگی کی اتار چڑھاؤ کی پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ ہمارے کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ سردار پٹیل اور کرنل بائیں کے خفیہ احکام پوشیدہ نہ رہتے۔

جولائی کے اواخر میں ہندو مسلم کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ سردار پٹیل نے ڈپٹی کمشنر دہلی کو طلب کر کے حکم دیا کہ وہ راشٹریہ سیوک سنگھ کے ہاتھ بٹائے۔ اسے مرکزی حکومت اور جنرل ہیڈکوارٹرز میں متعین ایسے مسلمان افسروں کی فہرست مہیا کرے جن کے پاس اسلحہ' کار اور ٹیلیفون ہے۔ فہرست میں ان افسروں کے مکانات کا اتا پتا اور گھر کے تمام مردوں' عورتوں اور بچوں کی تعداد بھی دی جائے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان دنوں ہندو انہی خطوط پر ہر جگہ کام کر رہے تھے۔ مقصد مسلمانوں کے مکمل کوائف سے آگاہی تھی تاکہ وقت آنے پر انہیں لوٹا اور مارا جا سکے۔ ڈپٹی کمشنر نے حکم کی تعمیل کی۔ مطلوبہ فہرست آر ایس ایس کو مہیا کر دی جس کے موٹر سائیکل سوار رضاکاروں نے راتوں رات ان مسلمان گھروں پر مخصوص نشان لگا دیے بنیادی کام انجام دینے کے بعد آر ایس ایس اور اکالی دل کے والنٹیر حرکت میں آ گئے۔ لوٹ مار اور مسلمانوں پر قاتلانہ حملے کے اکا دکا واقعات ہونے لگے۔ تاہم ان سے دہلی کے مسلمان اچھی طرح نبٹ لینے کے قابل تھے اور مردانہ وار نبٹ بھی رہے تھے۔

سکندر مرزا کا سیاہ کردار

ہمارے دفتر میں ایک مسلمان سٹینو طالب بیگ مرزا تھے۔ انہیں انٹیلی جنس کی طرف سے آر ایس ایس کی خفیہ سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے تنظیم میں شامل کیا گیا تھا۔ وہ خاصے جنگ ہندو کا ردھارے آر ایس ایس میں کام کرتے رہے۔ اگست کا آخری ہفتہ جا رہا تھا کہ ایک نہایت خوفناک خبر لے کر آئے۔ انہوں نے آتے ہی رپورٹ مرتب کی جو ہم نے اپنے بڑے باس سکندر مرزا کو پیش کر دی۔ رپورٹ میں طالب بیگ نے لکھا:

"24 اور 25 اگست کی درمیانی رات مجھے ہندو کا روپ دھار کر ہندوؤں اور سکھوں کے ایک اجلاس میں شریک ہونے کا موقع ملا' جو پتھر والا مندر میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں مسلمانوں پر بڑے پیمانے پر حملہ کرنے کی مندرجہ ذیل تجویزوں پر غور کیا گیا:

رپورٹ میں چیدہ چیدہ نکات کا لب لباب دیا جا رہا ہے۔ تفصیلات اس لیے نہیں پیش کی جا رہیں کہ راقم ان لوگوں کی زبان پوری طرح سمجھ نہ سکا کیونکہ اس کے زیادہ تر الفاظ سنسکرت کے تھے۔

1۔ مسلمان سرکاری ملازم اور ان کے خاندان جو اس وقت سرکاری کوارٹروں میں رہتے ہیں، خصوصاً وہ کوارٹر جو شہر سے دور ہیں ان پر حملہ کیا جائے اور انہیں کوارٹروں سے باہر گھسیٹ کر قتل کر دیا جائے۔ ان کی لاشیں وہاں سے لے کر جا کر ضائع کر دی جائیں، ان کا مال واسباب اٹھا لیا جائے۔ کوارٹر اس طرح نظر آئیں گویا ان کے مکین انہیں چھوڑ گئے ہیں۔

2۔ جی۔ ایچ۔ کیو (پاکستان) کی سپیشل ٹرین کی جو 26 اگست کو روانہ ہو رہی ہے، ڈائنامیٹ سے اڑا دینے کے منصوبوں پر غور کیا گیا۔ طے پایا کہ سپیشل ٹرین اگر بھٹنڈے کے راستے جائے، تو وہاں اور انبالے کے راستے جائے تو اس کے نزدیک، ریلوے لائن کے نیچے ڈائنامیٹ بچھا دیا جائے۔

3۔ آر ایس ایس کے کچھ ارکان ریل گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاری گاڑیوں پر جانے کا بندوبست کریں۔ ان لوگوں کو کافی طور پر مسلح ہونا چاہیے۔

4۔ آر ایس ایس اور سکھ رضا کاروں کی خاصی بڑی تعداد مہلک ہتھیاروں سے لیس ہو کر انبالہ پہنچے تا کہ وہاں گڑبڑ کر سکیں۔ توقع ہے دو ایک دن میں فرقہ وارانہ آگ بھڑک اٹھے گی۔ (آر ایس ایس اور سکھ مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیں گے) اجلاس کے سب شرکا نے اتفاق رائے سے کہا کہ فسادات کا دائرہ جمنا تک بڑھا دیا جائے۔ حاضرین نے جو زیادہ تر شرابی تھے، شکایت کی کہ دہلی کے ہندوؤں میں ان کے ساتھ تعاون کرنے کا حوصلہ نہیں پایا جاتا۔

5۔ بم اور دوسرے مہلک ہتھیار پہاڑ گنج کے ایک مکان میں بنائے اور جمع کیے جائیں گے۔ دہلی میں قتل وغارت کا آغاز دو مقامات سبزی منڈی ملتانی ڈھانڈا (پہاڑ گنج) سے ہوگا۔

6۔ ایک شخص نے تجویز پیش کی کہ مسلمان عورتیں، کالے برقعے پہنے شہر میں اس طرح گھوم پھر رہی ہیں جیسے یہ ان کے باپ کا شہر ہے۔ ان پر بھی حملے کیے جائیں اور انہیں قتل کر دیا جائے۔

سکندر مرزا کے مشیروں میں کرنل (بعد کے جنرل) ناصر، کرنل مجید ملک، آئی سی ایس کے مسٹر اختر اور انگریز افسر ڈنڈاس شامل تھے۔

رپورٹ میں مسلمانوں کے سر پر منڈلانے والے خطرات کی صاف صاف نشاندہی کر دی گئی تھی۔ ہم نے سکندر مرزا اور ان کے مشیروں کو ہندوؤں اور سکھوں کے ہولناک عزائم سے پوری طرح خبردار کر کے کہہ دیا تھا کہ جب تک تسلی بخش انتظامات نہیں ہو جاتے بطور احتیاط اسپیشل ٹرینوں کی روانگی روک دی جائے، لیکن سکندر مرزا (خدا اسے کبھی معاف نہ کرے) نے رپورٹ کی اہمیت اور سنگینی کا ذرا بھی احساس نہ کیا۔ اس نے رپورٹ پڑھ کر اپنے انگریزانہ لب ولہجے میں کہا:

Loon, Skils and Indus cot a ocd lesson in the last coatunal trouile in punjab. Theroure they will never raise their Haza again and Delhi bixos are not so fool so Induloe in the nass killins of muslds. They kndn the fatheition of the country iffeted in clear consent of ettior sine.

(دیکھو' سکھوں اور ہندوؤں کو پنجاب میں آخری فرقہ وارانہ فساد میں بڑا عمدہ سبق مل چکا ہے' اس لیے اب وہ اپنا سر دوبارہ کبھی نہ اٹھائیں گے۔ رہے دہلی کے ہندو' تو وہ اتنے بے وقوف نہیں کہ مسلمانوں کے قتل عام میں شریک ہوں۔ وہ جانتے ہیں ملک کی تقسیم فریقین کی واضح رضامندی سے ہوئی ہے۔)

اس پر چاروں مشیران باتدبیر نے بیک زبان کہا Yes sir ان میں خدا رکھے جنرل ناصر بقید حیات ہیں' کرنل مجید ملک اپنا حساب کتاب دینے اللہ کے حضور پہنچ گئے' مسٹر اختر اونچے سفارتی عہدے پر فائز رہے اور مسٹر ڈنڈاس پاکستان کے معرض وجود میں آنے پر صوبہ سرحد کے پہلے انگریز گورنر بنے اور گورنری کرنے کے بعد ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔'' اس سر پھرے انگریز نے تو ہمیں یہاں تک کہہ دیا:

Youre man brought a cotred story cvercoking all Irsas. must co althed.

(تمہارا آدمی کہانی گھڑ لایا ہے' ان سب باتوں کو نظرانداز کر کے ہمیں اپنا کام بے جھجک شروع کر دینا چاہیے:

سب اچھا!

سکندر مرزا اور ڈنڈاس نے پاکستانی سٹاف کو یقین دلایا کہ کسی قسم کا کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے۔ بے خوف وخطر کراچی چلے جاؤ' چنانچہ ریلیں چلنا شروع ہو گئیں۔ مسلمانوں نے جذباتی جوش میں آ کر اسپیشل ٹرین کے انجن سے آخر تک' ہر ڈبے پر جلی الفاظ میں لکھ دیا: ''قلم سے لیا ہے پاکستان' لڑ کے لیں گے ہندوستان۔'' ہندو اور سکھ تو پہلے ہی منصوبے بنانے تلے بیٹھے تھے۔ اس سے ان کا پارہ اور چڑھ گیا۔ پھر کیا تھا ریل گاڑیوں پر حملے اور لوٹ مار شروع ہو گئی۔ بہادر گڑھ کے مقام پر انہوں نے پاکستانی اسٹاف کا سامان لے جانے والی اسپیشل گڈز ٹرین لوٹ کر جلا دی۔ بٹھنڈہ کے قریب دو اسپیشل ٹرینوں کو ڈائنامیٹ کر دیا گیا۔ اسی طرح انبالے کے راستے جانے والی اسپیشل ٹرینوں پر سکھ درندوں نے جگہ جگہ قاتلانہ حملے کیے۔ آزادی کے متوالے مسلمانوں نے ڈٹ کر حملہ آوروں کا مقابلہ کیا' مگر وہ نہتے تھے ہتھیار بند ہجوم کا مقابلہ کب تک کرتے؟ سینکڑوں شہید ہو گئے اور سینکڑوں عصمت مآب خواتین کو سکھ درندے زبردستی پکڑ کر لے گئے۔ اس ہولناک تباہی کے باوجود سکندر مرزا اور اس کا سر پھرا انگریز مشیر' اسپیشل ٹرینوں کو چلائے رکھنے پر بضد تھے' لیکن ہم نے ہی جی۔ ایچ۔ کیو اسٹاف کی مسلم تنظیم کے ذریعے لوگوں کو منع کر دیا کہ وہ جان و مال کے خطرے کے پیش نظر اسپیشل ٹرینوں میں سفر نہ کریں۔

ناپاک منصوبے پر عملدرآمد

دن افراتفری میں گزر رہے تھے۔ آخر ہندوؤں اور سکھوں نے ستمبر کے تیسرے ہفتے میں مسلمان اسٹاف اور ان کے اہل خاندان کو قتل کرنے کے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ طے پایا کہ 21 ستمبر کو دفتروں سے چھٹی کے بعد چار اور پانچ بجے کے درمیان انڈیا گیٹ اور نواحی

سڑکوں پر اسٹاف کے تمام مسلمان ملازموں کا صفایا کر کے ان کے گھروں پر حملہ بول دیا جائے لیکن ہمیں بروقت خبر مل گئی۔ سیکورٹی پولیس کے آٹھ نو سو مسلمان ملازمین حرکت میں آ گئے اور مقررہ تاریخ سے ایک روز پہلے راتوں رات تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کو ان کے گھروں سے نکال کر جی ایچ کیو میں منتقل کر دیا۔ اس طرح ہندوؤں اور سکھوں کا ناپاک منصوبہ خاک میں مل گیا۔

اور طوفان امڈ پڑا

ہمارے مقابلے میں منہ کی کھانے کے بعد ہندو اور سکھ دہلی کے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق سبزی منڈی، ملتانی ڈھانڈا، قرول باغ اور پہاڑ گنج کے اطراف میں آتشزنی کی وارداتیں شروع ہو گئیں۔ یہ گویا آنے والے طوفان کا سگنل تھا جلد ہی مسلمانوں پر قاتلانہ حملے ہونے لگے اور پھر ان مسلمان محلوں پر عام حملے اور مار دھاڑ کا آغاز ہو گیا۔ رفتہ رفتہ شہر کے کئی اور حصے بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ ہر جگہ مسلمانوں نے مردانہ وار مقابلہ کیا، مگر وہ نہتے اور بے بس تھے۔ دوسری طرف دشمن مسلح تھا اور پولیس اس کی پشت پناہ تھی سینکڑوں شہید ہو گئے۔ آخر انہیں اپنے گھروں سے نکل کر پرانے قلعے میں پناہ لینا پڑی جہاں وہ بھوک پیاس اور گوناگوں صعوبتوں کا صبر و استقلال سے مقابلہ کرتے رہے۔ ہندو اور سکھ اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ وہ کسی مسلمان، خصوصاً سرکاری ملازموں کو زندہ بچ کر پاکستان نہ جانے دیں گے۔ ہماری انٹیلی جنس کی رپورٹیں قائداعظمؒ کو بھی پہنچ چکی تھیں۔ خدا غریق رحمت کرے، انہوں نے ان رپورٹوں کو اوّلین اہمیت دی۔ سکندر مرزا اور اس کے انگریز مشیر کے فیصلے کو مسترد کر دیا۔ ریل گاڑی کے سفر سے روک دیا اور برطانوی حکومت سے ہوائی جہاز حاصل کر کے ان کے ذریعے دہلی میں رکے ہوئے ہزاروں مسلمانوں کو کراچی پہنچایا۔

(کیپٹن راجہ الطاف حسین ریٹائرڈ۔ آزادی نمبر)

یتّی

اس طویل و عریض دنیا میں ابھی بے شمار حقائق ایسے بھی ہیں جن سے انسان پوری طرح باخبر نہیں ہو سکا ہے لیکن اس کی تجسس پسند فطرت ہر روز کسی نئے چونکا دینے والے انکشاف کے لئے اسے بے قرار رکھتی ہے۔ ایسے ہی چند تحقیق کے میدان کے کھلاڑیوں کی مہم جوئی کا قصہ۔ وہ ایک ان دیکھی مخلوق کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھے۔ ان کی مہم جو طبیعت انہیں خطرناک راستوں پر لے آئی تھی۔ ایک **یتّی (برفانی انسان)** کی انہیں تلاش تھی۔ اس کتاب کا قصہ جس کا آخری باب تحریر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ انگریزی ادب سے یہ انتخاب، کتاب گھر کے **ایکشن ایڈونچر ناول** سیکشن میں دستیاب ہے۔

لدھیانے سے لاہور تک

ہجرت کی المناک داستان جو محبتوں اور نفرتوں‘ ہمدردیوں اور ستم رانیوں‘
وفا شعاریوں اور بے وفائیوں کی سچی تصویریں دکھاتی ہے

میں محکمہ خوراک لدھیانہ میں ملازم تھا جب تقسیم پاک و ہند کا اعلان ہوا۔ قائداعظم کی محنت شاقہ‘ خلوص‘ ایثار اور بے لوث خدمت دنیا کے نقشے پر ایک نئی مملکت کے قیام کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔ علامہ اقبال کا خواب 14 اگست کی شب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ مسلم لیگ کے رہنماؤں کی انتھک کوششوں‘ طلبہ کی جدوجہد آزادی اور عامۃ المسلمین کی مشترکہ کاوشوں سے مملکت خداداد پاکستان وجود میں آ گئی۔ قید و بند اور جدوجہد نے انعام کی صورت اختیار کر کے ایک یہ فتح عظیم تھی۔ یہ کامرانی کا لمحہ تھا جس نے صدیوں کے غبار کا‘ مایوسیوں اور ناکامیوں کے ایک طویل دور کا خاتمہ کیا......
آج ہر مسلمان ایک نئی فضا میں سانس لے رہا ہے۔

آزادی مل گئی مگر اس آزادی کے لیے‘ پاکستان کی سرحد تک پہنچنے کے لیے ان مسلمانوں کو بڑی بڑی قربانیاں دینا پڑیں جو پاکستان سے متصل بھارتی علاقوں میں تھے۔ آزادی کے اعلان کو ایک دن بھی نہ گزرا تھا کہ مسلمانوں کو ابتلا و آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ سکھ اور ہندو جتھے بنا کر مسلمانوں کے گھروں پر حملہ کرنے لگے۔ وہ معصوم بچیاں جن کو ہندو اور سکھ ہمسائیوں نے شادی کے وقت دعاؤں سے رخصت کیا تھا‘ انہی کو نشانہ ہوس بنایا جانے لگا‘ بچے بوڑھے کی تمیز اڑ گئی‘ عورتوں کا تقدس پامال ہونے لگا۔ ہر طرف قیامت برپا ہو گئی۔

ہمارا مکان مس براؤن ہسپتال اور سول ہسپتال کے سامنے تھا۔ رات دن زخمی ان ہسپتالوں میں آتے‘ تلواروں سے زخم کھائے ہوئے‘ برچھیوں سے بدن دریدہ‘ بھالوں سے زخم چھلنی‘ نیزوں سے گھائل‘ بندوقوں کی زد میں آ کر مجروح ہونے والے بے گناہ‘ موت کے منہ میں آنے والے ان اسپتالوں میں لائے جاتے برآمدے زخمیوں سے بھر گئے‘ اسپتال کے دالانوں میں زخمی کراہ رہے تھے‘ ان کے زخم کھلے تھے ان پر پھاہا بھی نہ رکھا گیا تھا‘ زخموں سے خون رس رہا تھا‘ ڈاکٹر صاحبان‘ اسپتال کا عملہ حتی المقدور مصروف خدمت تھا۔ لواحقین حیرت کے مجسمے بنے اپنے عزیزوں‘ رشتے داروں کے چارپائیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ بے بس نہتے مسلمانوں پر حملے ہوئے۔ وہ بھاگ کر کہاں جاتے‘ غنڈے ہر جگہ ان کا تعاقب کر رہے تھے‘ شراب کے نشے میں دھت وہ تو مسلمانوں کے شکار کے لیے نکلے تھے۔ دوراہا نہر کا پانی سرخ ہو گیا‘ دیہات سے لاشیں بہہ بہہ کر آ رہی تھیں...... بے گور و کفن لاشیں...... جنہیں جاننے پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ درندگی کا منظر‘ وحشتوں کا یہ سیلاب‘ نفرتوں کا یہ لاوا پھیل رہا تھا‘ اسے روکنے والا کوئی نہ تھا...... ان کا قصور یہ تھا کہ وہ کلمہ گو تھے‘ مسلمان تھے‘ بتوں کے پجاری نہ تھے‘ خدا کو ایک ماننے والے‘ حضور اکرم ﷺ کے شیدائی تھے‘ یہ الگ

دین رکھتے تھے اس لیے کفران سے برسر پیکار تھا۔ حق و باطل کی جنگ ہمیشہ جاری رہی ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی

گاڑیوں میں نہنگ سکھ نیزے سنبھالے اور تلواریں لیے مسلمانوں کو تلاش کر رہے تھے۔ گاڑیاں خون سے رنگین ہوگئیں۔ جب لدھیانہ اسٹیشن پر گاڑی رکتی تو ڈبوں سے نعشیں برآمد ہوتیں۔ کسی کا بازو نہیں تھا کسی کا دھڑ تن سے جدا کر دیا گیا تھا‘ کسی کا سینہ گولیوں سے چھلنی تھا‘ کسی کے ہاتھ قلم کر دیے گئے تھے...... تاریخ عالم میں ایسی سفاکی کی مثال شاید ہی مل سکے۔

انہی دنوں ایک واقعہ سنا۔ دیوندر سیتارتھی مشہور ادیب‘ افسانہ نگار گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ ایک سٹیشن پر گاڑی رکی‘ ایک نہنگ خون آلود آنکھوں‘ وحشت و درندگی کا لباس پہنے ڈبے میں داخل ہوا۔ چہرے پر نفرت کی سیاہی پھیل رہی تھی...... اس نے للکار کر کہا: ’’یہاں کوئی مسلا تو نہیں؟‘‘ دیوندر سیتارتھی کے دل میں ایک ادیب‘ محبت کرنے والے ایک انسان کا دل تھا۔ اس نے یقین دلایا کہ یہاں کوئی مسلمان نہیں۔ نہنگ نے نیزے سے ٹٹی کا شیشہ توڑا‘ اندر ایک مسلمان دبکا کھڑا تھا...... ’’باہر نکل‘ ہم تو مسلمانوں کی بو سونگھ لیتے ہیں۔‘‘ وہ بیچارہ اجل رسیدہ لڑکھڑاتا ہوا ٹٹی سے باہر آ گیا۔ ’’پلیٹ فارم پر چل‘ کیا گاڑی خراب کرائے گا!‘‘ نہنگ اسے دھکا دیتا ہوا پلیٹ فارم پر لے گیا اور نیزوں اور بھالوں سے اسے قتل کر دیا...... سب دیکھ رہے تھے مگر کسی میں جرأت نہ تھی کہ ظلم و وحشت کے اس کھلے مظاہرے کو‘ اس انسانیت سوز فعل کو روک سکے یا مزاحمت کر سکے...... دیوندر سیتارتھی کو بڑا دکھ ہوا۔ اس نے اس نہنگ سے اتنا کہا کہ تو گاڑی خراب کرنے کو کہہ رہا تھا مسلمان کے خون ناحق سے‘ اس کے وحشیانہ قتل سے اب کون سا دھرتی کا روپ نکھر گیا ہے؟

یہ بربریت اور درندگی کا دور تھا۔ ہمسائیوں کی جانیں محفوظ نہ تھیں۔ ایک ہی محلے میں بسنے والے‘ دیوار سے دیوار ملی ہوئی‘ نسلوں سے اکٹھے رہنے والے خوفزدہ تھے۔ جن سے حفاظت کی توقع تھی‘ جن ہمسائیوں پر ناز تھا وہی جان کے دشمن‘ عصمت کے ڈاکو بن گئے‘ وہی مسلمانوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ وہ مسلح جتھوں کو اپنے ہی محلے میں لا کر قتل و غارت کا بازار گرم کراتے تھے۔ ایک گاؤں کے مسلح جتھے دوسرے گاؤں جاتے‘ ہندوؤں اور سکھوں کو اطلاع کر دی جاتی‘ وہ مسلمانوں کو گھیرے میں لیے رہتے‘ بچیاں پکارتیں چچا ہمیں جانے دو۔ بوڑھے کہتے تو تو میرا یار تھا‘ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ جوان اپنے ساتھیوں سے کہتے ابھی کل کی بات ہے ہم ساتھ کھیلتے تھے‘ ساتھ پلے بڑھے تھے...... مگر ان ظالموں پر تو خون سوار تھا۔ منظم گروہ حملہ کرتا‘ بچیوں کو اٹھا کر لے جاتا۔ بوڑھے‘ جوان قتل کر دیے جاتے۔ نیزوں پر معصوم سروں کی نمائش کی جاتی۔ بچیوں کی آوازیں آتیں: ’’بابا! یہ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟ بھیا ہمیں ان درندوں سے چھڑاؤ......‘‘ مگر جواب کون دیتا‘ وہ تو ابدی نیند سو چکے تھے...... وہ تو آزادی پر قربان ہو چکے تھے۔

لوگ قصبوں اور دیہات کو چھوڑ کر شہروں کا رخ کرنے لگے۔ اپنی اپنی بیل گاڑیوں اور چھکڑوں پر رات کی تاریکی میں بچا کھچا سامان لے کر نکلتے‘ مگر منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ان آفت زدوں‘ حرماں نصیبوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا‘ سامان لوٹ لیا جاتا۔ ہندو سکھ غنڈے چھپ کر مسلمانوں پر اچانک حملہ کر دیتے۔ فصلوں میں چھپ کر بیٹھ جاتے‘ جب کوئی قافلہ یا اکا دکا مسلمان جان بچاتا ہوا رہزنوں سے بچتا ہوا گزرتا تو

اس پر حملہ کر دیتے۔ انہوں نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی' لاوارث لاشوں پر آنسو بہانے والا ان کو ٹھکانے لگانے والا کوئی نہ رہا۔ ہندو سکھ مسلمانوں کی بے بسی پر قہقہے لگا رہے تھے۔ کھلے میدانوں پر گدھ منڈلا رہے تھے' لاشوں کے ارد گرد گدھ ہی گدھ تھے۔

اس وحشت ناک منظر میں' ظلم و بربریت کے ان دنوں میں شرافت اور انسانیت کی بھی چند مثالیں سننے میں آئیں۔ ایک گاؤں میں سردار بش سنگھ بہت بڑا زمیندار تھا۔ اس کے ہمسائے میں مسلمان زمیندار کا گھر تھا۔ دونوں کی گہری دوستی تھی' ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے' شادی بیاہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ سکھ زمیندار کی بہت بڑی قدیمی حویلی تھی' ایک قلعہ تھا جو اس کے آباؤ اجداد نے تعمیر کیا تھا۔

ہمسائے کی ننھی بچی اسے چچا کہا کرتی تھی۔ بچی کی عمر دس گیارہ برس کی تھی' اس کے دو چھوٹے چھوٹے بھائی تھے جو سارا دن سکھ زمیندار کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ بش سنگھ جب کوئی چیز اپنے بچوں کے لیے لاتا تو ان بچوں کے لیے بھی ویسی چیز لایا...... یہ بچے اسے اپنی اولاد کی طرح پیارے تھے۔ شام کو مسلمان زمیندار جب اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر گھر لوٹتا' تھوڑا آرام کر کے' کھانا کھا کے وہ چوپال میں آ بیٹھتا۔ بش سنگھ بزرگوں کے تعلقات' ان کے خلوص' ان کی محبت اور بھائی چارے کے قصے سناتا اور ان تعلقات پر اسے فخر تھا۔ دونوں زمینداروں کی دوستی' رفاقت اور محبت سارے گاؤں میں ضرب المثل تھی...... مسلمان کے گھر میں جب شادی بیاہ کا موقع آتا تو سردار بش سنگھ اپنے کارندوں کو لے کر پہنچ جاتا' سارے انتظامات خود کرتا' اپنے ہاتھوں سے جھنڈیاں لگاتا۔ ہمسائے کی بیٹی کی شادی ہوئی تو اس میں بھی وہ پیش پیش رہا۔

جب لڑکی سسرال سے واپس آتی تو سب سے پہلے اپنے چچا کو سلام کرنے اور دعائیں لینے جاتی۔ وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتا' جیب میں ہاتھ ڈال کر جو کچھ ہوتا وہ اپنی منہ بولی بیٹی کو دیتا۔ کئی نسلوں سے محبت کا یہ سلسلہ' بھائی چارے کا یہ انداز چلا آ رہا تھا۔

اب آزمائش کا وقت تھا۔ سردار بش سنگھ نے جب اس نفرت کے لاوے' وحشت کے سیلاب کو اپنے گاؤں کی طرف آتے دیکھا تو اس نے مسلمان زمیندار کو اپنی حویلی میں منتقل کر لیا۔ اس نے مسلمان بھائی کو یقین دلایا کہ اس کی زندگی میں کوئی ہاتھ' اسکے ناموس سے' اس کی عزت سے نہیں کھیل سکتا۔

پروگرام کے مطابق ہندوؤں اور سکھوں کے مسلح جتھے نے اس گاؤں کا رخ کیا۔ اسلحے سے لیس' قتل و غارت اور لوٹ مار کے ارادے سے وہ گاؤں میں داخل ہوئے۔ پل بھر میں قیامت برپا ہو گئی۔ ہنستے بستے گھر اجڑ گئے' سامان لوٹ لیا گیا' نوجوانوں کو جنہوں نے مزاحمت کی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا' بوڑھوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا' ہندو سکھ غنڈے نوجوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔ سب سے آخر میں جتھے نے سکھ زمیندار کی حویلی کا رخ کیا اور مسلمان زمیندار کے بارے میں پوچھا۔ بش سنگھ نے کہا کہ وہ رات کو گاؤں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس نے اپنے دو جوان بیٹوں کو مسلمان زمیندار کے کنبے کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا تھا اور انہیں ہدایت کی تھی کہ ان بچوں تک کسی ظالم کا ہاتھ نہ پہنچے۔

جتھے کے سردار نے کہا: ''بش سنگھ! ہمیں معلوم ہے کہ وہ آپ کی حویلی میں ہے۔ آپ اسے ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم نے کئی روز سے ناکہ بندی کی ہوئی ہے' وہ بھاگ کر نہیں جا سکتا' آپ نے اسے چھپایا ہوا ہے۔'' بش سنگھ نے غصے میں کہا وہ یہاں نہیں ہے۔ غنڈے زبردستی حویلی میں داخل ہو گئے۔ سکھ زمیندار کے لڑکوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ حملہ آوروں نے سوچا کہ زمیندار کی حویلی میں نجانے کتنے مسلح لوگ ہیں' ان کے چند ساتھی ڈھیر ہو گئے' باقی جان بچا کر یہ کہتے ہوئے بھاگ نکلے کہ ہم اس کا بدلہ لینے ضرور آئیں گے۔ اس فائرنگ میں زمیندار کا بڑا لڑکا بھی کام

آیا۔ اس کے سینے پر گولی لگی تھی۔ وہ ڈیوڑھی میں مدافعت کرتا ہوا مارا گیا۔

بش سنگھ بیٹے کی لاش پر پہنچا' اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: ''تو نے خاندانی شرافت کی لاج رکھ لی' تو نے اپنے باپ دادا کی محبت کی داستان کو اپنے خون سے لکھا...... تو نے میری نصیحت پر عمل کیا...... تو نے میری نصیحت پر عمل کیا...... میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ مسلمان زمیندار لاش پر دھاڑیں مار مار کر رویا۔

بش سنگھ جیپ میں مسلمان زمیندار اور اس کے بچوں کو لے کر رات کی تاریکی میں نکل کھڑا ہوا۔ اپنے کارندوں کو رائفلیں دے کر ساتھ کر لیا۔ وہ اور اس کا بیٹا رائفلیں لیے ہوئے آگے آگے تھے۔ بش سنگھ نے اپنے دوست اور اس کے بچوں کو کیمپ میں بہ حفاظت پہنچا دیا۔ ایسے واقعات دونوں طرف ہوئے' مسلمانوں نے اپنے ہمسائے' اپنے پرانے ساتھیوں' اپنے بچپن کے دوستوں کو ہر طرح کی امداد مہیا کی' ان کی آبرو اور ناموس کی حفاظت کی' ان کو واہگہ تک پہنچایا...... مگر یہ واقعات چند تھے۔

سکھوں اور ہندوؤں نے مشرقی پنجاب کے دیہات میں حشر برپا کر رکھا تھا۔ قتل و غارت' لوٹ کھسوٹ جاری تھی' فوج شہروں میں متعین تھی' وہ بھی ناکافی تھی۔ حملہ آور تو سینکڑوں کے جتھے میں آتے تھے' فوج کہاں تک حفاظت کرتی۔ بستیاں اجڑ گئیں' گھر تباہ ہو گئے' وہ کچھ ہوا جسے احاطہ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا' یہ انسانیت کے ماتھے پر ایسا بدنما داغ تھا جس کو سات سمندروں کے پانی بھی نہیں دھو سکتے۔

لدھیانہ نسبتاً محفوظ جگہ تھی' ہندوؤں اور مسلمانوں کی علیحدہ علیحدہ آبادی تھی۔ اگر کسی مسلمان کا ہندوؤں کے محلے میں مکان تھا تو وہ اس کشیدگی سے پہلے ہی اپنے عزیزوں کے ہاں اٹھ آیا تھا۔ مسلمان آبادی میں کوئی غیر مسلم نہیں تھا' اسی لیے مسلمانوں میں جرأت تھی' حوصلہ تھا' آنے والے برے وقت کی حفاظت کے لیے ان کے پاس وافر اسلحہ تھا۔ جن کے پاس اسلحہ تھا ان کو مکانوں کی چھتوں پر جہاں سے حملے کا خطرہ تھا متعین کر دیا تھا۔ نوجوانوں نے مورچے سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ تمام رات پہرہ دیتے۔

اردگرد کے محلوں کے لوگ بھی ہمارے محلے میں آ گئے۔ ہمارا مکان وسیع تھا۔ سارے محلے کے مکانوں کی چھتیں ملی ہوئیں تھیں۔ گرمیوں کا موسم تھا' دوسرے محلوں سے آنے والے لوگ چھتوں پر' کمروں میں اور گلیوں میں جہاں جگہ ملی اپنے بال بچوں کے ساتھ ٹھہر گئے۔ گھروں سے بچی ہوئی اشیائے خوردنی اٹھا لائے تھے۔ سب کے لیے اکٹھا کھانا پکتا اور تقسیم ہو جاتا۔ جانوروں کو ذبح کر کے گزر بسر کی۔ دوسرے محلوں تک جانا دشوار تھا۔ کرفیو لگا تھا۔

میرا راشنگ آفیسر سکھ تھا۔ اس کو مجھ سے بہت محبت تھی۔ آٹے کی چار بوریاں رکھ کر میرے گھر تک پہنچ گیا' سکھ کو دیکھ کر مسلمانوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا' میں نے محلے والوں کو بتایا کہ وہ محبت کی وجہ سے اس کڑے وقت میں مجھ تک راشن پہنچانے آیا ہے۔ میں نے سردار صاحب کو یہ صورت حال بتائی تو وہ جلدی بوریاں چھوڑ کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے کہنے لگا: ''خدا حافظ! آپ جب تک یہاں ہیں میں ہر قیمت پر آٹا مہیا کرتا رہوں گا۔''

کرفیو لگ جانے کے بعد گلیاں سنسان ہو گئیں' سارا شہر خوف و ہراس کی لہر میں تھا۔ ہر لحظہ جان کا خطرہ تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ میرا جوانی کا عالم تھا۔ میں چھپتا چھپاتا اسپتال پہنچ کر زخمیوں کی دیکھ بھال کرتا۔ جو کچھ مجھ سے بن پڑتا ان کی امداد کرتا۔ کئی بار

گولیوں کی زد سے بچ کر نکلا۔

ماسٹر تاج الدین انصاری احرار کے سرکردہ لیڈر تھے۔ وہ مسلمانوں کے لیے سراپا ایثار تھے۔ ان کی وجہ سے مسلمانوں کو تھوڑا بہت سہارا تھا۔ حکام کے ساتھ ان کے تعلقات تھے۔ ہندو غنڈے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ اس سہارے کو بھی ختم کر دینا چاہتے تھے۔ ماسٹر صاحب گولیوں سے بچتے، چھتوں پر سے پھلانگتے ہوئے میرے گھر تک پہنچ گئے۔ میں نے زبردستی ایک رات انہیں اپنے گھر میں رکھا۔ وہ مجھ سے کہتے رہے: ''حافظ صاحب! مسلمان مر رہے ہیں۔ زخمی اسپتالوں میں کراہ رہے ہیں، میں کیسے چین سے بیٹھ سکتا ہوں! اگر میری جان مسلمانوں کے کام آ جائے تو اس سے بڑھ کر میری خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے۔'' میں اس ضعیف العمر شخص کے جذبے اور بلند حوصلے کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرے روز وہ مجھے بتائے بغیر گھر سے باہر نکل گئے۔

سامان خورد و نوش ختم ہو گیا۔ بچے ماؤں کی چھاتیوں سے لپٹ لپٹ رو رہے تھے۔ مائیں انہیں جھوٹی تسلیاں دے رہی تھیں کہ چند روز کی بات ہے، ہم اپنے ملک پاکستان پہنچ جائیں گے۔ ایک دو جتھوں نے حملے کیے مگر ہمارے مسلح نوجوانوں نے انہیں پسپا کر دیا۔ حملہ آوروں کے چند آدمی مارے گئے۔ اس کے دیگر جتھوں کو ہمارے محلوں کی طرف آنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ایک روز اعلان ہوا کہ مسلمان چھاؤنی کیمپ میں چلے جائیں۔ وہاں سے انہیں ریل کے ذریعے پاکستان بھیجا جائے گا۔ اس اعلان میں امید کی کرن تھی کیمپ میں ہر لحظہ زندگی کو خطرہ تو نہیں ہوگا۔ فوج کے دستے حفاظت کے لیے معین ہوں گے۔ میری بڑی بہن کا پھگواڑہ میں انتقال ہو گیا تھا۔ بہنوئی لدھیانہ میں وفات پا چکے تھے۔ ایک یتیم بھانجی تھی جس کا والدہ نے جہیز تیار کیا تھا تاکہ اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ والدہ نے ہی اسے پالا تھا، اس کے جہیز کا سامان اٹھا کر کے والدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، میری طرف دیکھا۔ میں نے جہیز کو ساتھ لے جانے کی حامی بھر لی۔

والدہ ماجدہ نے سونے کے زیور ایک برتن میں ڈال کر کوٹھری کے کونے میں دبا دیے۔ کہا کہ چند روز کی بات ہے، حالات سازگار ہو جائیں گے تو آ کر نکال لیں گے۔ والد مرحوم نے والدہ کو سمجھایا، یہ چند دنوں کی بات نہیں، واپس آنے کا کوئی امکان نہیں، چنانچہ زمین کھود کر زیور نکالے، کمرے مقفل کیے، در و دیوار پر حسرت کی نگاہ ڈالی، زندگی بھر کی یادوں کو الوداع کہا...... گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اشکوں کی جھڑی لگ گئی۔ میں نجانے کیوں ایک بار کوٹھے پر چڑھ گیا، اردگرد کے مکانوں پر نظر ڈالی جن میں میرا بچپن گزرا تھا۔ میں نے ہمسائے کی بیری کو دیکھا جس کی شاخیں ہماری چھت تک آ گئی تھیں، جس سے میں چھپ چھپ کر تازہ، سرخ بیر کھایا کرتا تھا۔ ساتھ والے مکان کو دیکھا جس کے مکین جا چکے تھے، اس گھر میں ادبی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، شعر و شاعری کا دور ہوتا تھا۔ یہ ادبی گھر سونا پڑا تھا۔

ہم نے ایک ریڑھی کا بندوبست کیا۔ والدہ ماجدہ نے ضروری سامان کی گٹھڑیاں باندھ لیں۔ والد محترم نے سمجھایا کہ اکیلی جان لے کر چلنا دشوار ہے، سامان کون اٹھائے گا، وبال جان بن جائے گا۔ والدہ بضد تھیں کہ کہیں ٹھکانا تو کرنا ہوگا، چند کپڑے تو ساتھ ہوں۔ ریڑھی پر چند گٹھڑیاں لاد کر چلے۔ جب بازار سے گزرے تو ہندو اور سکھ ہماری حالت پر قہقہے لگانے لگے۔ ان قہقہوں کا جواب ہمارے پاس چند آنسو تھے۔ ہم سر جھکائے کیمپ کی طرف جا رہے تھے۔ میری بھانجی، میری والدہ، میرے والد محترم ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ والدہ برقع میں تھیں، ضعیفہ تھیں،

قدم قدم پر ٹھوکر لگتی۔ میرے والد انہیں سہارا دیتے۔ میری بھانجی نے ان کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا امی برقع اٹھا کر چلیں' یہ مصیبت کا وقت ہے۔ مگر انہوں نے کہا: ''بیٹا! ساری عمر چہرہ ننگا نہیں کیا' کیا میں غیر مسلموں کو چہرہ دکھاؤں؟'' میں خاموش ہو گیا' حیا و پاکیزگی کی تصویر کو میں دھندلانا نہیں چاہتا تھا۔

ریڑھی کھینچتے کھینچتے میری ہتھیلیوں پر رٹن پڑ گئے۔ زندگی بھر مشقت کا کام نہیں کیا تھا' سینے میں درد ہونے لگا۔ شہر سے مختلف گوشوں سے کارواں کیمپ کی طرف رواں دواں تھے۔ وہ بیبیاں جن کی کسی نے ایک جھلک بھی نہ دیکھی تھی برہنہ سر ان قافلوں میں شامل تھیں۔ مرد سروں پر گٹھڑیاں اٹھائے ہوئے ساتھ چل رہے تھے میری بیوی چھ ماہ کے بچے کو ساتھ چمٹائے چل رہی تھی' دمے کی مریضہ تھی' سانس اکھڑا ہوا تھا۔ قدم قدم پر رک کر چلتی تھی۔ میں کبھی والدہ کو کبھی اپنی بیوی کو مڑ کر دیکھتا۔ گرتے پڑتے کیمپ پہنچ گئے۔

کیمپ میں شور و بکا آوازیں آ رہی تھیں۔ بچے بلک بلک کر رو رہے تھے' وہ باعصمت باحیا عورتیں جو شرافت و نجابت میں بے مثل تھیں' آج اپنے دوپٹوں سے منہ چھپائے دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ مرد خورد نوش کا سامان مہیا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا بچہ ڈبے کا دودھ پیتا تھا جو ختم ہو چکا تھا۔ میں بچے کو دیکھ کر دعائیں مانگ رہا تھا کہ اے رازق کائنات ہم تو ایک دو روز کا فاقہ برداشت کر سکتے ہیں' اس معصوم بچے پر رحم فرما۔

میرا ایک ہم جماعت پرت پال سنگھ تھا جو فوج میں بھرتی ہو گیا تھا' کپتان کے عہدے پر تھا۔ وہ مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے بلکتا ہوا بچہ اس کے آگے کر دیا۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا' میں نے اسے دودھ مہیا کرنے کو کہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دودھ کے دو تین ڈبے لے آیا۔ مجھے تسلی دی کہ جس چیز کی ضرورت ہو' مجھے کہہ دیا کرو' مہیا کر دیا کروں گا۔

ہم کھلے میدان میں تھے۔ شدت کی گرمی تھی' کوئی سایہ نہ تھا۔ درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر چادریں تان لی تھیں مگر وہ گرمی کی شدت کو کیسے روک سکتی تھیں۔ والدہ صاحبہ کے آنسو نہ تھمتے تھے' بھانجی یاس کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ میں تسلی دیتا رہا کہ چند روز کی بات ہے' ہم پاکستان کے جھنڈے تلے آرام کریں گے جو ہمارے خوابوں کا محور ہے اور ہماری امنگوں کی نشانی ہے۔

والد مرحوم کا زیادہ تر وقت مسجد میں گزرتا' ان کی دعائیں ہمارے لیے سہارا تھیں۔ وہ سارا دن کلام پاک کی تلاوت کرتے' کیمپ کے تقریباً سارے لوگ والد مرحوم کے پاس دعا کے لیے حاضر ہوتے اور وہ خشوع و خضوع سے بخیریت پاکستان پہنچ جانے کی دعا کرتے۔

انتظار یہ تھا کہ گاڑی کب آئے اور ہم اپنی منزل کی طرف روانہ ہوں۔ میرے اسکول کے پرنسپل جے بی لیڈر اپنے شاگردوں کو تلاش کرتے کرتے مجھ تک پہنچ گئے' میں ان کا چہیتا شاگرد تھا۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں مجھ پر بہت مہربانیاں کی تھیں۔ ان کے چہرے سے محبت اضطراب کی صورت میں نظر آتی تھی۔ وہ اپنی معنوی اولاد کے غم میں ان کو سہارا دینے' ان کی فوری حاجات پورا کرنے کے لیے یہاں پہنچے تک تھے۔ اس زمانے میں استاد اور شاگرد کا رشتہ کتنا مقدس ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ میں ابھی مہیا کر دوں گا۔ میں خاموش رہا میرا ایک ہم جماعت بول پڑا سر! اسے سگریٹ کی طلب ہے۔ میں نے ہر چند انہیں یقین دلایا کہ یہ بات نہیں اس نے یونہی کہہ دیا ہے۔ مجھے شرم آئی کہ پرنسپل صاحب کہیں گے میرا شاگرد سگریٹ پیتا ہے۔ وہ خود سگریٹ نہ پیتے تھے' مگر انہوں نے سگریٹ کی جو ڈبیاں ملیں مجھے لا کر دیں۔ میرا

سر شرم سے جھک گیا۔ خجالت کی وجہ سے میرے منہ سے شکریے کے الفاظ بھی نہ نکلے۔ وہ سگریٹ دے کر چلے گئے۔

لوگ اپنا اپنا سامان ریلوے لائن کے دونوں طرف ڈھیر کر رہے تھے کہ جب گاڑی آئے تو ڈبے میں رکھا جا سکے۔ یوں سامان کے انبار لگ گئے اور گاڑی پر چڑھنے کے لیے جگہ نہ رہی۔ ہر آدمی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے بیتاب تھا۔ اپنا وطن، اپنا شہر اس کے لیے زنداں بن گیا تھا۔ وہ گلیاں، وہ بازار جن میں بچپن اور جوانی کے ایام گزرے تھے، قتل گاہوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اپنے ہی شہر میں ہم اجنبی تھے۔ اس شہر سے جلد نکل جانا چاہتے تھے۔ اس میں گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اب اس منزل مقصود کی طرف نگاہیں لگی تھیں جن کے لیے عزت، مال اور جان کی قربانیاں دی تھیں...... کیمپ میں چند روز قیام کیا۔ ایک روز کسی نے کیمپ میں دستی بم پھینکا تو بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ پہلے ہی خوفزدہ تھے، ان کے خوف و ہراس میں اضافہ ہو گیا۔ یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ غنڈے فوجیوں سے مل کر کیمپ پر حملہ نہ کر دیں۔

اللہ اللہ کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، بلوچ رجمنٹ پہنچ گئی، جسے ہمارے ساتھ لاہور تک جانا تھا رجمنٹ کے نوجوانوں کو دیکھ کر حوصلے بلند ہوئے۔ گاڑی آ گئی۔ نفسا نفسی کا عالم تھا، ہر شخص جان بچانے کی فکر میں تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے دے کر گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے بدقت سامان اٹھا کر گاڑی میں پھینکا اور والدہ صاحبہ کو گھسیٹتا ہوا گاڑی کے ڈبے تک پہنچ گیا...... بیوی اور بھانجی کو سوار کرایا۔ گاڑی میں بیٹھنے کی جگہ کہاں تھی۔ لوگ گٹھڑیوں کی طرح بیٹھے تھے، پہلو بدلنا مشکل تھا۔ والد ماجد مسجد میں تھے، ان کو لینے جاتا تو خواتین کی دیکھ بھال کون کرتا۔ چارو ناچار میں بھی سوار ہو گیا۔

بلوچ رجمنٹ کے فوجی گاڑی کے اوپر مشین گنیں لگا کر بیٹھ گئے، کچھ گاڑی کے باہر حفاظت کر رہے تھے۔

مجھے والد محترم کا غم کھائے جا رہا تھا کہ اس ضعیف العمری میں کیسے گاڑی میں سوار ہوں گے کس طرح منزل مقصود تک پہنچیں گے۔ گاڑی میں چڑھنے کی کشمکش میں میرے پاؤں سے جوتا نکل گیا۔ کپڑے پہنے ہوئے کئی روز ہو گئے تھے، دھکم پیل میں وہ بھی دو ایک جگہ سے پھٹ گئے۔ جسم گرد و غبار میں اٹا ہوا تھا۔ آنکھیں مسلسل بیداری سے بوجھل ہو رہی تھیں...... یہ زندگی کی سب سے کڑی آزمائش تھی۔ لوگ ہجوم کو چیرتے ہوئے گاڑی پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گاڑی کے اوپر پناہ گزین اپنے اپنے سامان سے لپٹے ہوئے تھے۔ پائدانوں پر لوگ کھڑے تھے۔

گاڑی چلتی تو اشک بار آنکھوں سے اپنے وطن کو دیکھا، یادوں کا سیلاب امڈ آیا۔ شہر کا ایک ایک کوچہ، ایک ایک گلی نظروں میں پھر گئی۔ کالج میں گزرے واقعات، ساتھیوں کے ساتھ گزارے ہوئے اوقات، سکون و آرام سے بسر کیے ہوئے لمحات...... ہنگامے، محبتیں، رفاقتیں...... تعلیمی دور کی برکات، جدوجہد زندگی کا آغاز، بزرگوں کی صحبتیں، مشاعرے، ادبی نشستیں، شنے، دینی ماحول...... ان گنت یادیں افق ذہن پر نمودار ہوئیں، جوں جوں شہر دور ہوتا جا رہا تھا دل ڈوب رہا تھا۔ خدا جانے ان گلیوں، ان کوچوں، ان احباب، ان عزیزوں کو پھر کب دیکھنا نصیب ہو...... یہ آزادی کے لیے، آزاد مملکت کے لیے، مسلمانوں کی علیحدہ وخطہ زمین کے لیے، دین کے لیے، اسلام کے لیے بہت بڑی قربانی تھی۔ اشکوں سے چہرہ بھیگ گیا۔

مولانا حبیب الرحمن رئیس احرار اور مفتی محمد نعیم بھی اسی کارواں میں شریک تھے...... جن کو کانگرس کے زعماء پر ناز تھا کہ وہ اس نازک مرحلے میں ان کی نگہداشت کریں گے، جنہوں نے کانگرس کے لیڈروں کے ساتھ جدوجہد آزادی میں حصہ لیا تھا اور جو ان کے ہم نوا رہے تھے، اب وہ بھی

کسمپرسی کے عالم میں جان کے خوف سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں بھی پاکستان کے سوا کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی۔ جو متحدہ ہندوستان کے حامی تھے وہ بھی اس نوزائیدہ مملکت میں سر چھپانے کے لیے آئے۔ سارے سہارے جھوٹے تھے۔ ساری امیدیں خاک میں مل گئیں، نظریات باطل ہو گئے، ذہنی خاکے دھندلا گئے...... ایک ہی حقیقت تھی کہ مسلم لیگ کی جدوجہد نے، نوجوانوں کی شب و روز کی جدوجہد سے ایک مملکت معرض وجود میں آئی۔ یہ مسلم لیگ کے نظریات کی فتح تھی، یہ دین کی فتح تھی، یہ اسلامی عقائد اور نظریات کی فتح تھی۔

گاڑی کے رکتے ہی خوف و ہراس کے سائے منڈلانے لگتے۔ بلوچی رائفلیں اور سٹین گنیں سنبھال کر آنے والے کسی حادثے کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد تھے۔

اسٹیشن گزرتے گئے۔ ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سکڑ گئیں۔ چھ ماہ کا بچہ بھوکا تھا۔ دودھ ختم ہو چکا تھا۔ پانی کا قطرہ قطرہ اس کے منہ میں ٹپکا رہے تھے تاکہ معصوم بچے کی جان بچ جائے۔ گرمی کی شدت تھی۔ پانی بھی ختم ہو گیا...... لدھیانہ تا لاہور کا سفر جو چند گھنٹوں کی بات تھی، دو دن میں طے ہوا۔ جگہ جگہ گاڑی روک لی جاتی، بے وجہ گھنٹوں ٹھہرایا جاتا۔ یہ بھی مسلمانوں کو اذیت دینے کا ایک انداز تھا۔ یہ بھی آزمائش کی گھڑیاں تھیں۔

آخر پاکستان کی حدود دکھائی دینے لگیں، مایوس چہرے گلاب کی طرح کھل اٹھے، ہمارے آنسوؤں کی دعائیں قبول ہوئیں...... اب ہم ایک آزاد مملکت، آزاد فضا میں سانس لے رہے تھے۔ ہمیں ارض پاک کی خوشبو آ رہی تھی۔ یہ بہاروں کی سرزمین تھی، تصوراتی پیکر کو آنکھوں سے دیکھ رہے تھے...... ہم پاکستان پہنچ چکے تھے۔ ہم نے منزل مراد پا لی تھی۔

ہم ارض پاک پر سربسجود ہو گئے، بارگاہ رب العزت کے سامنے اپنی پیشانیوں کو جھکا دیا۔ یہ زمین ہماری ساری قربانیوں، ساری کلفتوں، ساری پریشانیوں سے زیادہ پیاری تھی۔ اس کے لیے ہی تو ساری کشمکش تھی، طویل جدوجہد کی تھی۔ نجس و ناپاک لوگوں نے حتی المقدور پاکستان کے وجود کی مخالفت کی مگر عزم صمیم رکھنے والے باطل کی طاغوتی قوتوں سے ٹکرانے والے مسلمانوں کے عظیم رہنما قائد محمد علی جناح رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی فراست سے یہ عظیم مملکت ہمیں حاصل کر کے دی۔

پاکستان آتے ہی ایک سو اشعار پر مشتمل ایک نظم لکھی تھی جس میں گردش دوراں سے لے کر مطلع صبح تک کے احساسات کی ترجمانی کی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

چمک رہا ہے جہاں میں وہ میرے فن کی طرح
نہیں ہے کوئی وطن میرے وطن کی طرح
روش روش پہ مری چاہتوں کے پھول کھلے
کھلا ہوا ہے گلستاں مرے سخن کی طرح
وہی ہی روپ، وہی تازگی، وہی نکہت
تمام بزم چمن ہے ترے بدن کی طرح

مرے وطن کی ہر ایک شے عزیز ہے مجھ کو
یہاں کی مٹی بھی ہے تیرے پیرہن کی طرح
ہر اک درد وطن کو گلے لگایا ہے
بہت عزیز ہے غم زلف پر شکن کی طرح
مرا وطن ہے مرے سوز و ساز کی دنیا
مرے وطن کی بہاریں سدا رہیں آباد
ہر اک پھول شگفتہ ہے انجمن کی طرح

ہم اپنے وطن کی سرزمین میں داخل ہو چکے تھے‘ لاہور اسٹیشن پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اترے۔ والدہ صاحبہ کو سہارا دے کر آہستہ آہستہ اس مقدس سرزمین پر چلایا۔ دو روز کے پیاسے تھے۔ ہم ایک دروازے سے گزرنے لگے‘ ایک فوجی نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا دوسرے دروازے سے گزرو۔ والدہ صاحبہ کی چیخ نکل گئی‘ ہمشیرہ صاحبہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نیرنگیٔ زمانہ کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

میں نے خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور دوسرے دروازے کی طرف چل پڑے۔ ہم شکستہ حال‘ تھکے ماندے‘ بھوکے پیاسے لاہور کی سرزمین پر اترے۔ پیاس سے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ ہمشیرہ کے پاس پانچ روپے تھے۔ یہی دولت تھی جو ہم ساتھ لائے تھے۔ اسٹیشن سے باہر لان میں اس قافلے کو ٹھہرایا گیا۔ اسٹیشن پر اترتے ہی بچے نے گردن ڈھلکا دی‘ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا‘ بیوی نے بچے کو سینے سے چمٹا لیا۔ پانی کے قطرے بچے کے منہ میں ٹپکائے۔ دودھ لیا‘ چمچہ چمچہ اس کو پلایا تو اس نے آنکھ کھولی۔ والدہ کی زبان پر شکر کے کلمات جاری ہو گئے۔

مہاجرین کے لیے لاہور کیمپ کھل چکا تھا۔ اجڑے ہوئے خاندان ان کیمپوں میں آ گئے۔ لدھیانہ میں بھی ایک لاکھ افراد کا قافلہ روانہ ہوا تھا‘ اس کی حفاظت کرنے کے لیے ہندو سپاہی تھے۔ اس قافلے میں ہمارے شہر کے معززین بھی تھے۔ بیل گاڑیوں پر سامان رکھا تھا‘ اکثر لوگ پیدل چل رہے تھے۔ انہوں نے سیدھا راستہ اختیار نہ کیا کیونکہ ہر جگہ خطرہ تھا۔ ہندو اور سکھ سپاہیوں کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی بڑی سازش میں شریک ہیں۔ لیاقت علی خان مرحوم کو اس سازش کا علم ہو گیا‘ انہوں نے پنڈت نہرو کو پیغام بھیجا کہ لدھیانہ کے گردونواح سے ایک لاکھ مہاجرین کا قافلہ آ رہا ہے۔ ایک بڑی سازش کا انکشاف ہوا ہے۔ آپ فوراً ہندو اور سکھ سپاہیوں کو ہٹا کر مسلمان فوجی متعین کر دیں جو قافلے کے ساتھ ساتھ پاکستان سرحد تک آئیں اگر ایسا نہ ہوا تو پاکستان سے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے قافلے سلامت بھارت نہ پہنچ سکیں گے۔ پنڈت نہرو پیغام کی اہمیت اور خطرات کو بھانپ گئے۔ ان کو ہندوؤں کی جانیں بہت عزیز تھیں۔ انہوں نے پیغام ملتے ہی ہندو اور سکھ فوجیوں کو واپس بلا لیا اور مسلمان فوجی متعین کر دیئے۔ اس طرح ایک لاکھ مہاجرین کا قافلہ صحیح سلامت واہگہ پہنچ گیا۔

ایک دفعہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر فرما رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قوت استدلال کا انوکھا انداز عطا فرمایا تھا۔ بات ہندوؤں کی ہو رہی تھی۔ شاہ جی ہندوؤں کی ذہنیت کے بارے میں فرما رہے تھے کہ جب ان کو تکلیف پہنچتی ہے تو مسلمانوں کے ہمدرد بن جاتے ہیں۔ انہوں نے

فرمایا کہ بچہ جب گود میں ہوتا ہے تو ڈاڑھی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ میرے بچے نے بھی ڈاڑھی کو زور سے پکڑا۔ اگر میں جھٹکا دے کر ڈاڑھی چھڑواتا تو بالوں کے ٹوٹ جانے کا خطرہ تھا۔ میں نے ایک ترکیب سوچی۔ میں آہستہ آہستہ اس کے سر کے بال کھینچنے لگا۔ جیسے جیسے میں بال کھینچتا جا رہا تھا اس کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ آخر اس نے ڈاڑھی چھوڑ دی...... بالکل اس طرح ہندو کا معاملہ ہے۔ جتنی زور سے آپ اس کی بودی کھینچیں گے وہ آپ کی ڈاڑھی چھوڑتا جائے گا ورنہ وہ آپ کی ڈاڑھی کا ایک ایک بال کر دے گا...... بات ساری قوت کی ہے۔

یہ بات تو ضمناً آ گئی۔ ہم اسٹیشن پر بیٹھے سوچ رہے تھے کہاں ٹھکانا کیا جائے۔ ہمارے ایک عزیز مصری شاہ میں رہتے تھے۔ وہ ریلوے میں ملازم تھے۔ لاہور کے ایک سال کے قیام میں زیادہ تر وقت انہی کے ہاں گزارا۔ ہمیں اس کسمپری میں یہی جائے پناہ نظر آئی...... کیمپ میں رہنا ہمارے بس کی بات نہیں تھی، وہاں کا انتظام ناقص تھا۔ وہ متوسط گھرانا تھا مگر خلوص و مروت کی دولت سے مالا مال تھا، ان کی محبت اور شفقت نے ہمارے رستے ہوئے زخموں پر پہلا پھاہا رکھا انہوں نے ہمیں ایک کمرہ رہنے کے لیے دیا۔ ہم نے زمین پر بستر لگا لیے، سامان رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ بھانجی کا جہیز کے کپڑے لپیٹ دیے گئے تھے۔ میں نے ایک دوست کے گھر کے نچلے حصے میں یہ سامان رکھ دیا۔ خیال تھا کہ جب مستقل ٹھکانہ مل جائے گا تو وہاں منتقل کر لیں گے۔

مجھے والد محترم کی فکر دامن گیر تھی۔ وہ ضعیف العمر تھے۔ کچھ سوجھتا نہ تھا کیا کروں۔ آنسو دعا بن کر نکلے۔ سارا گھرانا ان کے لیے دعائیں کرتا تھا۔ اللہ اپنے بندوں کا خود ہی محافظ ہوتا ہے۔ وہ اندھیرے میں روشنی اور مشکلات میں آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔ کئی روز کرب اور پریشانی میں گزارے۔ ایک ہفتہ بعد والد صاحب بخیریت لاہور پہنچ گئے، چہرے پر وہی سکون کا نور، وہی قلب مطمئن، زبان پر کلام پاک کی تلاوت...... اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے رضا کے مقام پر ہوتے ہیں، خوشی ہو یا غم، رنج ہو یا پریشانی، بیماری ہو یا صحت وہ اسے عطائے الٰہی تصور کرتے ہیں اور اس کی رضا میں خوش رہتے ہیں، اسی لیے قرآن پاک نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ اللہ کے دوستوں کو، اولیاء اللہ کو خوف ہوتا ہے نہ حزن۔

گھر سے نکلتے ہوئے تین چار چیزیں ہی اٹھائیں تھیں۔ ایک بی اے کی ڈگری اور اس کے ساتھ محکمہ خوراک میں ملازمت کے کاغذات، ایک کالج کے زمانے کی یادگار تصویر اور دوستوں کے خطوط...... والد محترم نے فرمایا کچھ پہننے کا سامان لے لو، میں نے ادب سے عرض کیا کہ اللہ مالک ہے جس نے یہاں تن ڈھکنے کو دیا ہے وہاں بھی ہر طرح پردہ پوشی کرے گا، روزی کا کوئی نہ کوئی وسیلہ پیدا کر دے گا۔

لاہور کی سرزمین میں قدم رکھا تو پاؤں ننگے، شیو بڑھی ہوئی، پتلون پھٹی ہوئی تھی۔ ایک ادبی پرچے ''شاہکار'' میں میری غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ اس ہیبت کذائی کے ساتھ ''شاہکار'' کے دفتر پہنچا، اس ادبی مجلّے کے مدیر آصف تھے۔ دوسرا کپڑوں کا جوڑا نہ تھا کہ تبدیل کر لیتا...... دفتر میں داخل ہوا، آصف صاحب نے ایک نظر مجھے دیکھا، پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ میں انقلابات زمانہ کی تحریر پڑھ رہا تھا، وہ ادبی تحریر لکھ رہے تھے، یہ بے حرف تحریریں مہاجرین ہی پڑھ سکتے تھے کہ انہوں نے اپنے آنسوؤں سے، اپنے خون سے یہ تحریر لکھی تھی۔

آصف صاحب نے دوبارہ نظر اٹھائی، میرے لبوں پر بے بسی کی مسکراہٹ پھیل گئی...... انہوں نے مجھے پہچان لیا، اٹھ کھڑے ہوئے، ادھورے ادھورے فقرے بول سکے۔ یہ کیا ہو گیا، یہ کیا حالت بن گئی، پاکستان کب آئے، گھر والے صحیح سلامت آ گئے، بچے بھی ساتھ ہی ہیں؟ انہوں

نے ایک ہی سانس میں کئی فقرے کہہ ڈالے۔ میں نے ان سوالات کے جوابات میں اتنا کہا: ’’جو بیت چکی وہ بیت چکی......اب ہر طرح خیریت ہے۔ اب کوئی غم‘ کوئی پریشانی نہیں۔ ہمیں اپنا مقصود مل گیا‘ ہم منزل تک پہنچ گئے ہیں۔‘‘

میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک پرانی لکھی ہوئی غزل ان کی طرف بڑھا دی۔ میں نے کہا اگر ہو سکے تو کچھ پیسے دیجئے۔ انہوں نے دس کا نوٹ میری طرف بڑھایا‘ پھر کہا: ’’میرے لائق کوئی خدمت؟ میں اس مصیبت میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟‘‘ میں مزید گفتگو کے بغیر سلام کر کے واپس آ گیا۔ شیو کا سامان خریدا‘ حلیہ ٹھیک کیا‘ ایک دوست سے کپڑوں کا جوڑا عاریتاً مانگا...... بھارت کی ناپاک گرد کو جھاڑا جو صعوبتوں اور کلفتوں کا نشان تھی۔

علامہ لطیف انور گورداسپوری میرے بزرگ دوست تھے۔ وہ ان دنوں ریڈیو پاکستان لاہور میں ملازم تھے۔ خبروں کا پنجابی ترجمہ کرنا ان کا کام تھا۔ جب یہ قیامت بپا ہوئی تو علامہ کو میرے بارے میں بے حد پریشانی ہوئی۔ انہوں نے ریڈیو میں بارہا اعلان کرایا کہ حافظ لدھیانوی کا جس کو کچھ علم وہ مجھ سے رابطہ قائم کرے۔ اخبارات میں خبر شائع کرائی کہ حافظ لدھیانوی اگر یہ خبر پڑھیں تو فوراً مجھ سے ملیں۔ یہ دور پریشانی کا تھا‘ اخبار کی خبریں کون دیکھتا‘ ریڈیو کے اعلانات کون سنتا!

ایک دوست مجھ سے ملے اور علامہ کی پریشانی کا ذکر کیا‘ انکی پریشانی اور ان کے خلوص نے مجھے بھی پریشان کر دیا۔ میں ریڈیو سٹیشن پہنچا......میری طرف دیکھا‘ اشکوں کی برسات لگ گئی‘ مجھ سے لپٹ گئے۔ ’’حافظ تم آ گئے‘ الحمدللہ! کب آئے؟ خیریت سے آئے؟ کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا؟ وہ روتے ہوئے یہ جملے کہتے جا رہے تھے‘ میں ان سوالوں کا کیا جواب دیتا! جب حواس درست ہوئے تو میں نے ساری سرگزشت سنائی۔ علامہ کی حالت میری سرگزشت کی علامت بن گئی‘ کرب ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ انہوں نے چائے منگوائی‘ پھر فرمایا کہ آج رات سکون کی نیند سو سکوں گا‘ مجھے میرا دوست مل گیا۔

سچی دوستی کا دائرہ بہت محدود ہوتا ہے‘ بہت ہی کم ایسے احباب ہوتے ہیں جن پر پریشانی کے وقت بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ جو دوستی کے مختلف مراحل میں ساتھ دیتے ہیں ایسے ہی مخلص‘ بے لوث دوستوں میں چودھری محمد اسلم بھی تھے۔ ان کے بھائی لدھیانہ میں بجلی کے محکمے میں ایس ڈی او تھے۔ ہمارے محلے میں رہتے تھے۔ اسلم اپنے بھائی کے پاس رہ کر تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ہم دونوں کا روز و شب کا ساتھ تھا۔ اسلم نے دسویں تک تعلیم لدھیانہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ وہ دلاور چیمہ کا رہنے والا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اس نے اپنے آباؤ اجداد کی زمینوں کی دیکھ بھال کی اور جاکے چٹھہ میں چاولوں کا وسیع پیمانے پر کاروبار کیا۔ اس کاروبار میں اس کا ایک ہندو شریک تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے پر مکمل اعتماد تھا۔ لاکھوں کا کاروبار تھا۔ تقسیم پاک و ہند میں اس کا شریک کاروبار بھارت چلا گیا۔

لاہور سے میں اپنے دوست سے ملنے دلاور چیمہ گیا۔ چودھری محمد اسلم نے میری دکھ بھری کہانی سنی‘ آبدیدہ ہو گیا‘ وہ اتنا پریشان اور مضطرب ہوا کہ صرف تسلی کے لیے اسے موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ میں دو ایک روز اس کے پاس گزار کر واپس لاہور آ گیا۔

حکومت نے اسلم کو کسٹوڈین مقرر کر دیا۔ اس نے اپنے ملازم کے ہاتھ مجھے رقعہ بھیجا جس کا ایک ایک حرف اس کی محبت کا آئینہ دار تھا۔ اس

نے مجھے دلاور چیمہ میں سکونت اختیار کرنے کی پیشکش کی تھی اور لکھا تھا کہ یہاں آپ ہر طرح سکون واطمینان سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ اس نے کاروبار میں شرکت کی پیشکش کی، ہندو حصہ دار کے وسیع عریض گھر کی الاٹمنٹ کی بات کی، دکانوں میں حصہ دینے کی بات کی۔ یہ بہت بڑی پیشکش تھی۔

میں نے رقعہ پڑھ کر والد محترم کے ہاتھ میں دے دیا۔ انہوں نے ایک ایک لفظ غور سے پڑھا...... خاموش ہو گئے۔ میں ان کے حکم کا منتظر تھا۔ میں نے مودبانہ دریافت کیا کہ میرے لیے کیا حکم ہے، میں جواب میں کیا لکھوں...... فرمایا: ”سراج! میں جانتا ہوں اسلم تمہارا بے لوث دوست ہے۔ میں اس کی محبت اور خلوص کو بارہا دیکھ چکا ہوں۔ بیٹا! دوستی بے غرض ہونی چاہیے۔ اس پر کوئی غرض کا دھبہ نہیں لگنا چاہیے۔ اگرچہ مہاجر ہونے کی حیثیت سے ہمارا حق ہے مگر تمہاری دوستی میں کاروبار حائل نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ رازق ہے، آج نہیں تو کل حالات سدھر جائیں گے۔“ ابا جی یہ کہہ کر خاموش ہو گئے...... میری آنکھوں سے چشمے ابل پڑے، اس کسمپرسی، اس ضعیف العمری میں والد محترم کو عزت نفس کا کتنا پاس تھا۔ میں نے اشک آلود چہرے سے ان کی طرف دیکھا اور ان کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیا۔ پھر میں نے چودھری صاحب کو شکریے کا خط لکھا تب مجھے اپنی علمی بے بضاعتی کا شدت سے احساس ہوا۔ میرے ذخیرہ علم میں وہ الفاظ نہیں تھے کہ میں اپنے مخلص دوست کا شکریہ ادا کر سکتا۔

میں گھر سے روزگار کی تلاش میں نکلا جب مصری شاہ کے پل سے گزرا تو پیچھے ایک شور سنائی دیا۔ معلوم ہوتا تھا حشر برپا ہو گیا۔ یہ ناگہاں آفت کہاں سے آ گئی؟ پیچھے مڑ کر دیکھا تو سیلاب کا پانی طوفانی رفتار سے بڑھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی کی سطح کئی فٹ بلند ہو گئی۔ پانی دکانوں میں داخل ہو گیا، لوگوں کا سامان پانی میں بہہ گیا، اتنی مہلت کہاں تھی کہ سامان سمیٹ کر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا جاتا۔ نشیبی علاقے کے مکانوں میں پانی بھر گیا۔ بارش تھی کہ مسلسل ہو رہی تھی، پانی میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ سڑک کے درمیان پانی زور سے گزر رہا تھا۔ میں دیواروں کو تھام تھام کر گرتا پڑتا رہائش گاہ تک پہنچا۔ وہاں چاروں طرف پانی دریا کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ بھانجی کا جہیز جو دوست کے مکان کے نچلے حصے میں رکھا تھا وہ پانی میں تیر رہا تھا۔ کون اسے بچاتا! دو روز کے بعد پانی کی سطح کم ہونا شروع ہوئی۔ آخری ریلا گزر گیا تو لوگ واپس گھروں میں آنے لگے۔

جب ہم لاہور پہنچے تو ہندوؤں کے سارے علاقے خالی تھے، دروازے کھلے تھے اور گھر سامان سے بھرے تھے، بھارت روانہ ہوتے وقت ہندو صرف قیمتی اشیاء لے جا سکے، لوگ خالی گھروں سے چیزیں اٹھا اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ مہاجر خالی گھروں پر قبضہ کر رہے تھے۔ ہم بھی ایک خالی مکان میں داخل ہوئے۔ یہ گھر رام گلی میں تھا، گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ چھوٹے چھوٹے کھلونے صحن میں بکھرے ہوئے تھے۔ کمرے میں زیورات کے خالی ڈبے تھے۔ گھر میں وہ سب کچھ موجود تھا جس کی ایک آسودہ حال گھرانے کو ضرورت ہوتی ہے۔ ڈنر سیٹ، صوفہ سیٹ، کرسیاں، قالین، برتن، ٹرنک، کپڑے...... چیزوں کی نفاست سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ گھر کسی نفیس الطبع شخص کا تھا، اس کی مالکہ حسین ذوق کی مالک تھی۔ گیراج میں ایک کار بھی تھی۔

ہم نے وہاں رات بسر کی۔ میری بھانجی نے فرش دھویا، کھلونوں کو اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ ہمارے پاس کیا تھا جو اس گھر میں لاتے جو کچھ مشقت سے اٹھا کر لائے تھے وہ سیلاب کی نظر ہو گیا تھا۔ دوسرے روز مجسٹریٹ صاحب مکان کے سامان کی فہرست تیار کرنے آئے، میرے واقف تھے۔ میری خیریت پوچھی اور کہا: ”حافظ صاحب! آپ اس مکان میں اطمینان سے قیام کریں، فہرست بعد میں بنا لیں

گے۔'' پھر کار کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے: ''یہ کار آپ کے کس کام کی، آپ تو درویش آدمی ہیں۔'' میں اشارہ سمجھ گیا۔

میں کمزور طبیعت کا مالک تھا، کچھ تقسیم کے ہنگامے نے کمر توڑ دی، مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ اگر پولیس آ گئی یا کسی دوسرے مجسٹریٹ نے فہرست نہ تیار کرنے کی وجہ پوچھی تو کیا جواب دوں گا۔ یہ میرا وہم تھا ورنہ لوگ تو دو دو چار چار کوٹھیوں پر قبضہ کر کے سامان ہضم کر گئے تھے۔ میں تمام رات جاگتا رہا کہیں پرسش نہ ہو، دوسرے دن خالی ہاتھ واپس مصری شاہ چلے گئے، یہ لوٹ مار کا دھندا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔

مقامی افراد اور مہاجرین میں سے اکثر نے لوٹ مار کی۔ ہندوؤں کے مال و اسباب کو مال غنیمت جانا۔ بے دھڑک گھروں میں گھس گئے اور سارے سامان کا صفایا کر دیا۔ وہی چیزیں بازار میں لا کر اونے پونے داموں فروخت کر دیں اور پیسے کھرے کر لیے، جن کے پاس پیسہ تھا انہوں نے کوڑیوں کے مول سامان خریدا اور گھر بھر لیے۔

جگہ جگہ مہاجر کیمپ تھے جن کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ یہ کیمپ برائی کے مراکز بن گئے۔ گناہوں سے پناہ کرنے والے، خدا سے خطاؤں کی معافی مانگنے والے، جو مہاجرین قافلوں کے ساتھ آئے تھے، جنھوں نے خدا سے، اس کے احکام پر چلنے اور صالح زندگی گزارنے کے عہد کیے تھے، وہی ہر قسم کی برائی کے مرتکب ہوئے۔

مہاجر اپنے اپنے کلیم کی فکر میں تھے، محکمہ بالیات کے چکر کاٹ رہے تھے۔ دن بھر دفتر کے سامنے کھڑے رہتے، بارسوخ آدمی، شاطر اور چالاک لوگ کامیاب تھے۔ انہوں نے جس طرح بھی ہو سکا فارم داخل کرا کے کوٹھیوں پر قبضہ کر لیا۔ اسی دوران آتش زدگی کی وارداتیں ہوئیں، شاہ عالمی کا بازار جل کر راکھ ہو گیا۔ بازار کے درمیان ایک مسجد تھی۔ دونوں طرف کے مکانات جل کر راکھ ہو گئے مگر اس مسجد کو آنچ تک نہ آئی...... اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے۔

لوٹ مچی ہوئی تھی۔ جس کی ہندوستان میں گز بھر زمین بھی اپنی ملکیت نہ تھی وہ وسیع و عریض کوٹھیوں کے مالک بن گئے، مکانوں کی طرح دکانیں بھی سامان سے بھری ہوئی تھیں، ان کی الاٹمنٹ کے لیے لوگ بھاگ دوڑ کرنے لگے اگر کسی کو موقع کی دکان مل گئی اس کے وارے نیارے ہو گئے، ہزاروں روپے مالیت کے سامان کا پل بھر میں مالک بن گیا۔ سیٹھ بن بیٹھا، اکڑ کر چلنے لگا، ایسے بھی معززین نظر سے گزرے جن کا لاکھوں روپے کا کاروبار تھا، باوقار زندگی گزار رہے تھے۔ ان کو یہاں آ کر دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے میسر آتی تھی۔ ہمارے شہر میں ایک خاندان تھا جس کا ملٹری سپلائی کا کاروبار تھا۔ مگر لاہور آنے کے بعد میں نے انہیں کچہری میں عرضیاں ٹائپ کر کے پیٹ کا جہنم بھرتے دیکھا ہے۔

مفتی ضیاء الحسن صاحب مفتی محمد نعیم کے بڑے صاحبزادے تھے، ایک دن اچانک ان سے ملاقات ہو گئی، انہوں نے سارے حالات سنے، افسوس کیا کہ ہمیں سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں ملی۔ ان کے ایک دوست رضوی صاحب ''ملاپ'' اخبار کی بلڈنگ میں رہتے تھے...... ''ملاپ'' کا دفتر انار کلی کی نکڑ پر تھا۔ ایک بڑا احاطہ تھا، اس کے ارد گرد کمرے تھے۔ مہاجرین نے ایک ایک دو دو کمروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ سامنے چادریں تان کر صحن بنا لیا تھا۔ رضوی صاحب اوپر کی منزل میں قیام پذیر تھے۔ مفتی ضیاء الحسن نے ان سے بات کر کے ہمیں دو کمرے رہائش کے لیے دلوا دیے۔ ایک بڑے کمرے میں ہندوؤں کا سامان بھرا تھا جسے رضوی صاحب نے تالا لگا رکھا تھا۔ وہ رات کی تاریکی میں کمرے کا تالا کھول کر سامان خورد برد کرتے،

خدا جانے وہ یہ سامان راتوں رات کہاں پہنچا دیتے‘ یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ میں یہ سب منظر دیکھ رہا تھا...... قول و فعل کے اس تضاد نے میری آنکھیں کھول دیں۔ ان کی گفتگو اور ان کے کردار کے درمیان زمین آسمان کا فرق تھا۔ چند روز رضوی صاحب اوپر کی منزل میں رہے‘ جب کمرہ خالی ہو گیا تو وہ بھی کسی عالیشان بنگلے میں منتقل ہو گئے...... انہوں نے اپنے ایثار‘ اپنی قربانی کی قیمت وصول کر لی۔

میں ملازمت کے لیے تگ و دو کرنے لگا‘ ایک دوست کے وساطت سے مجھے منٹ یعنی ٹکسال میں ایک عارضی ملازمت مل گئی...... مجھے اس کمرے کا چارج دیا گیا جو چاندی کی اینٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہمارا کام چاندی کی اینٹوں کو ٹکسال تک پہنچانا تھا اور بس...... سارا دن اور کوئی کام نہ تھا۔ ہم دس پیسے کا چائے کا سیٹ چاندی کے ڈھیر پر رکھ کر پیتے...... دو تین ماہ یہ نوکری رہی۔ ایک دن اس نوکری سے بھی جواب مل گیا‘ پھر بیکاری کا دور شروع ہو گیا۔

محکمہ خوراک کے کاغذات میرے پاس تھے۔ تقسیم ہند و پاک کے وقت میں محکمہ خوراک میں انسپکٹر تھا۔ ایک روز کاغذات لے کر محکمہ خوراک کے سیکرٹری سے ملاقات کے لیے گیا۔ انہوں نے مجھ سے کاغذ لے لیے اور دوسرے روز ملازمت دے دی۔ میں انکوائری آفیسر مقرر ہو گیا‘ تنخواہ 125 روپے ماہانہ تھی۔ بس ڈپو کی چیکنگ میرے ذمے تھی۔ یہ دور تھا جب چینی نایاب تھی۔ ڈپو کے مالکان نے جعلی کارڈ تیار کر رکھے تھے اور ان کارڈوں پر حاصل کردہ چینی بلیک کر کے دولت اکٹھی کر رہے تھے۔ انکوائری آفیسر کا ماہانہ ”وظیفہ“ مقرر تھا۔ تین چار سو روپے ہر ڈپو پر مقرر تھے۔ اس طرح انکوائری آفیسر کو ہزاروں کی آمدنی تھی۔

ڈپوؤں کے علاوہ دکانوں سے بھی آمدنی ہوتی تھی‘ لیکن گھریلو تربیت نے یہاں بھی مجھے حرام کمائی سے باز رکھا۔ سستا زمانہ تھا‘ تنخواہ شریفانہ زندگی گزارنے کے لیے کافی تھی۔ مکان الاٹ نہ ہوا تھا مگر ہم ”ملاپ“ کے دفتر میں دو کمروں میں رہائش رکھے ہوئے تھے اور ذہنی آسودگی میسر تھی۔

(حافظ لدھیانوی خودنوشت ”یادوں کے انمول خزانے“ سے انتخاب جسے جنگ پبلشرز لاہور نے شائع کیا ہے۔)

دیوانہ ابلیس

عشق کا قاف اور پکار جیسے خوبصورت ناول لکھنے والے مصنف سرفراز احمد راہی کے قلم سے حیرت انگیز اور پراسرار واقعات سے بھرپور، سفلی علم کی سیاہ کاریوں اور نورانی علم کی ضوفشانیوں سے مزین، ایک دلچسپ ناول۔ جو قارئین کو اپنی گرفت میں لے کر ایک ان دیکھی دُنیا کی سیر کروائے گا۔ سرفراز احمد راہی نے ایک دلچسپ کہانی بیان کرتے ہوئے ہمیں ایک بھولی کہانی بھی یاد دلا دی ہے کہ گمراہی اور اَن دیکھی قباحتوں میں گھرے انسان کے لئے واحد سہارا خدا کی ذات اور اس کی یاد ہے۔

سورت کی دلخراش صورت

سانحۂ بابری مسجد کے بعد گجرات کاٹھیاواڑ میں وحشی جنونی ہندوؤں کا بے کس مسلمانوں پر ظلم وتشدد
رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات بھارتی اخبار ''اردو ٹائمز'' کے نمائندہ فاروق انصاری کی خصوصی رپورٹ

تقسیم ہند سے لے کر اب تک بھارت میں بے شمار بدترین قسم کے ہولناک فسادات ہوئے ہیں اور ہر فساد میں شرپسندوں نے مذہبی جنون میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ انسانیت کو ذبح کیا ہے۔ مسلمانوں کو جانی و مالی اعتبار سے تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ چاہے وہ مراد آباد اور جمشید پور کے فساد ہوں یا علی گڑھ‘ بجنور‘ احمد آباد‘ میرٹھ‘ ملیانہ‘ بھاگل پور اور کرنیل گنج کے فسادات‘ مسلمانوں کا خون بہت ارزاں ہو کر بہا ہے۔ ملک کا کوئی علاقہ ایسا نہیں بچا جہاں کی زمین مسلمانوں کے خون سے تر نہ ہوئی ہو۔ ہر جگہ مسلمانوں کے قتل عام کے ساتھ ساتھ ان سے وابستہ صنعت وحرفت کو بھی تباہ وتاراج کیا گیا ہے۔

انسانیت سوز مظالم

میرٹھ‘ ملیانہ اور بھاگل پور کے سانحات اب تک بدترین فسادات میں شمار کئے جاتے تھے جہاں مسلمانوں کی لاشوں پر فصلیں اگائی گئیں۔ ان واقعات کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے‘ انسانیت لرز اٹھتی تھی‘ دل کانپ جاتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انسانیت ظالموں کی چوکھٹ پر سسک سسک کر دم توڑ رہی ہو۔ وہ سب فسادات فرقہ ورانہ مذہبی جنون کے تھے لیکن گجرات کے شہر سورت میں مذہب کے جنونیوں نے بھگوان رام کے نام پر جو کچھ کیا‘ اسے لکھتے ہوئے مورخ کی انگلیاں کانپ جائیں گی ہاں معصوم مسلمانوں کو نہ صرف گاجر مولی کی طرح سفاکی سے کاٹا گیا اور ان کی املاک کو تباہ کیا گیا بلکہ مسلمان عورتوں کی اجتماعی آبروریزی بھی کی گئی۔ ان کے سینوں پر ''شری رام'' لکھا گیا۔ انہیں برہنہ کر کے سڑکوں پر دوڑایا گیا اور اس شرمناک منظر کی ویڈیو فلم اتاری گئی۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو چیر دیا گیا۔ نوزائیدہ بچوں کو لوہے کی سلاخوں میں پرو کر آگ میں سینکا اور پھر جلا دیا۔ گھروں میں بند کر کے پورے پورے خاندانوں کو نذر آتش کیا گیا۔ آگ کی لپٹوں میں ماں‘ باپ‘ بھائی‘ بہن چیختے اور چلاتے رہے لیکن بھگوان رام کے ماننے والوں نے بے رحمی سے آگ اور خون کا یہ کھیل جاری رکھا۔ مہاتما گاندھی کی وہ سرزمین جہاں سے انہوں نے عدم تشدد کا پیغام پوری دنیا کو دیا تھا‘ آج مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے لرزہ خیز مظالم کی گواہ ہے۔

لوگوں نے بتایا کہ 27ء دسمبر کو سورت میں کارپوریشن کا الیکشن تھا۔ انتخابی پروپیگنڈے کی شروعات تھی۔ شرپسندوں کے پاس الیکشن رول

تھا، وہ اس میں سے نام دیکھ دیکھ کر مسلمانوں کے گھر جاتے اور تمام گھر والوں کو قتل کر دیتے۔

شہر کے کئی معتبر لوگوں نے نام نہ ظاہر کرنے کی شرط پر بتایا کہ شرپسندوں نے پورے علاقے میں جگہ جگہ لاؤڈ اسپیکر لگا رکھے تھے۔ وہ اونچی آواز میں ریڈیو ٹیپ بجاتے جس میں شور شرابا، مارو بچاؤ اور نعرہ تکبیر کی آوازیں ہوتیں۔ یہ سن کر مسلمان اپنے دینی بھائیوں کی مدد کے خیال سے باہر نکلتے تو انہیں قتل کر دیا جاتا۔ اسی طرح ہندو علاقوں میں کیسٹ بجائی جاتی کہ ”ڈیڑھ دو سو ہندو لڑکیوں کو مسلمان اٹھا کر لے گئے ہیں اور ان کی آبروریزی کر رہے ہیں۔ ہندو! باہر نکلو! اپنی بہنوں کی حفاظت کرو۔“ اس طرح کے اشتعال انگیز پروپیگنڈے سے شرپسندوں نے عام ہندوؤں کو نفرت کی آندھی میں جھونک کر انتقام لینے کے لیے پاگل کر دیا۔ مسلمان اپنے گھروں میں بیٹھے تلاوت کرتے رہے، عافیت کی دعا مانگتے رہے اور شرپسندوں کے پانچ پانچ سو افراد کے ٹولے شہر کو جلانے، مسلمانوں کا قتل عام کرنے اور مسلم لڑکیوں کی آبروریزی کرنے کے لیے نکل پڑے۔ شرپسند سڑکوں پر آئے تو پولیس اپنے ہیڈ کوارٹر میں چلی گئی۔

سورت کے سابق میئر قدیر پیرزادہ اور چند اور مسلمان فساد کے پہلے روز یعنی 7 دسمبر کی شب جب کمشنر کے گھر گئے تو وہ بڑے اطمینان سے ٹی وی پر انڈیا ساؤتھ افریقہ کرکٹ میچ دیکھ رہے تھے۔ انہیں بتایا گیا کہ شہر کے حالات اچھے نہیں، اگر فوری بندوبست نہ کیا گیا تو بھیانک صورت حال پیدا ہو جائے گی، لیکن کمشنر صاحب اطمینان سے مسکرائے اور کہا کہ جاؤ، جا کر سو جاؤ، کچھ نہیں ہوگا۔ تھوڑا بہت ہلڑ کر کے خاموش ہو جائیں گے۔ بتایا جاتا ہے کہ مسلم وفد مایوسی میں چلا آیا۔ اتفاق سے گجرات کے وزیر داخلہ بھی سورت ہی میں موجود تھے، ان سے رابطہ قائم کیا گیا، لیکن انہوں نے بھی یہی کہا کہ کچھ نہیں ہوگا۔

تین روز تک سورت لٹتا اور جلتا رہا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے اور نوجوانوں کی چیخ و پکار سے آسمان بھی کانپتا رہا مگر پولیس کمشنر میچ دیکھتے رہے۔

وہ بھگوان رام جنہوں نے اصولوں کی خاطر چودہ سال کا بن باس کاٹا اور وہ سیتا دیوی جنہوں نے اپنی آبرو پر لگائی جانے والی تہمت کو برداشت نہ کر کے شعلوں کی سمادھی لے لی تھی، آج انہی کے ماننے والوں نے سورت کی سرزمین پر وحشت، درندگی اور سفاکی کی تمام منزلوں کو اس طرح عبور کر لیا کہ ان کی گھناؤنی حرکتوں کے لیے لغت میں کوئی لفظ موجود نہیں۔ وہ ثنا خوان تقدیس ہند کہاں ہیں جو ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی بات کرتے تھے؟ وہ دیکھ لیں کہ گنگا کے ”پوتر“ پانی میں مظلوم مسلمانوں کی لاشیں تیر رہی ہیں اور لٹی ہوئی دوشیزائیں اپنی عزت و ناموس کے لٹیروں کے خلاف فریاد کر رہی ہیں۔ ”امن کے مسیحا“ جو قومی یکجہتی کی بات کرتے ہیں، وہ جا کر سورت کی گلیوں کا نظارہ کریں جہاں انسانیت کو تار تار کرنے کے بعد مسجدوں کو زمین بوس کر دیا گیا۔ مزاروں پر بلڈوزر اور روڈ رولر چلا دیے گئے۔ آج بھی وجے نگر اور دربار نگر میں خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ مکان تباہ اور ویران پڑے ہیں۔ ہر سو وحشت ناک سناٹا چھایا ہے۔ خون کی بو آ رہی ہے۔ قطار گام مسجد محلّہ، وارچھا روڈ، اونا نگر، وشرام نگر، تری لوک نگر، پھول واڑی، داول شاہ پیر، پھاٹخہ واڑی، سنڈاس نگر، ہدایت نگر اور ویڈر روڈ کے علاقوں میں آباد مسلمان خیموں میں پناہ گزیں ہیں۔ ان خیموں میں کسی خاندان کا ایک فرد بچا ہے، کسی کی معصوم بچی زندہ ہے، کسی کا ہاتھ کٹا ہے، کسی کا سر پھٹا ہے اور کسی کے پیر ٹوٹے ہیں۔

ظلم و وحشت اور درندگی کا ننگا ناچ سورت میں 8 دسمبر سے 10 دسمبر تک ہوتا رہا اور پولیس صرف اپنے ہیڈ کوارٹر میں بیٹھی دنگوں پر قابو پانے کا منصوبہ بناتی رہی۔ انسان مذہبی جنون میں اس طرح وحشی اور درندہ ہو جائے گا، اس کا مظاہرہ سورت میں دیکھنے کو ملا جہاں شرپسند ہندو،

مسلمانوں کے گھروں کو لوٹتے رہے۔ عورتوں کی آبروریزی ہوتی رہی۔ چن چن کر نوجوان لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر انہیں قتل کیا گیا۔ مکانوں کو جی بھر کر لوٹا اور آگ لگائی گئی لیکن ارباب حکومت اور امن وقانون کے رکھوالے ''حالات کنٹرول میں ہیں'' کی بانگ دیتے رہے۔ سورت جہاں 1947ء کی تقسیم ہند میں بھی کچھ نہیں ہوا تھا' وہاں شرپسندوں نے ظلم ونسق اور لا اینڈ آرڈر کے تمام اصولوں کو پیروں تلے روند ڈالا اور 2 لاکھ کی آبادی والے اس شہر میں ڈھائی لاکھ پولیس مظلوموں کی حد تک مجبور اور لاچار مگر ظالموں کی مدد کرتی ہوئی نظر آئی۔

سورت ہم اس وقت گئے' جب بھرے پرے مکانات کوئلہ ہو گئے تھے اور مظلوموں کی آنکھیں رو رو کر خشک ہو چکی تھیں۔ سرکاری اعتبار سے ساڑھے تین سو اور غیر سرکاری ذرائع کے مطابق کم وبیش ساڑھے نو سو کے قریب مسلمان شہید کئے گئے۔ ہم نے خیال کیا کہ ایودھیا میں بابری مسجد شہید کئے جانے کے بعد پورے ملک میں پھوٹ پڑنے والے پرتشدد واقعات کا اثر سورت میں بھی پڑا' لیکن یہاں تو شرپسندوں نے قتل عام کی سازش مہینوں پہلے تیار کر رکھی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ جن جن مسلم آبادیوں کو شرپسند نشانہ بنانے والے تھے اگر ان میں ایک دو گھر یا دکان کسی غیر مسلم کی تھی تو اس کے دروازے پر ''جے شری رام'' یا ''ہندوونی دکان'' لکھ دیا گیا تھا۔ پاس پڑوس کے تمام مکان جل کر خاک ہو گئے لیکن جس مکان پر ''شری رام'' لکھا تھا وہ بالکل محفوظ رہا تھا۔

وجے نگر میں نسوانی آبروریزی اور قتل وجے نگر ویڈر روڈ پر واقع ایک بہت بڑی کالونی ہے جہاں تقریباً ساڑھے تین سو گھروں پر مشتمل مسلمانوں کی آبادی تھی۔ اس کے درمیان دربار مدینہ نامی ایک مسجد بھی آباد تھی۔ مسلمانوں کے گھروں میں کہیں کہیں ایک دو دکانیں اور مکانات ہندوؤں کے تھے جن پر ''جے شری رام'' لکھا ہوا تھا۔ 7 دسمبر کو جب شہر میں تناؤ بڑھا تو وجے نگر کے ہندو نوجوانوں نے مسلمانوں سے کہا کہ آپ لوگ یہاں اطمینان سے رہیں' کوئی گھر چھوڑ کر نہ جائے۔ ہم سب مل کر رہیں گے۔ اگر تمہارے گھروں میں کوئی ہتھیار رہیں تو وہ سب تم نکالو' ہم بھی نکالیں اور ضائع کر دیں۔ لوگوں نے بتایا کہ مسلمانوں نے سارے ہتھیار نکال کر پھینک دیے جنہیں عیار ہندوؤں نے جمع کر لیا۔

8 دسمبر کو صبح 11 بجے شرپسندوں کا دو ڈھائی ہزار پر مشتمل ٹولہ وجے نگر میں داخل ہوا اور گھر گھر سے مسلمانوں کو نکال کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ یاسمین بانو دختر غفار احمد جورانی تلاؤ میمن جماعت خانہ میں پناہ گزیں ہے' اس نے بتایا کہ شرپسندوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور گھر کے آدمیوں کو گھسیٹ کر باہر نکالا اور تلوار سے مار ڈالا۔ وجے نگر کے اطراف میں پائپ لائن ڈالنے کے لیے بڑے بڑے گڑھے کھودے گئے تھے' وہ مسلمان مردوں کو کاٹ کاٹ کر ان میں ڈال دیتے اور پیچھے سے دس بارہ آدمی پھاوڑا لے کر گڑھے پاٹ دیتے تھے۔ یاسمین بانو نے بتایا کہ 8 دسمبر کی شام اس نے اور لوگوں کے ساتھ گھر سے باہر نکل کر رام پورے میں جانے کی کوشش کی لیکن شرپسندوں نے ان سب کو گھیر لیا۔ یاسمین کی ماں کو پٹرول ڈال کر جلا دیا گیا۔ اس کے باپ پر تیزاب انڈیل دیا جو اس کے سامنے تڑپ تڑپ کر شہید ہو گیا۔ تین لڑکیوں کو پکڑ کر ننگا کیا جن کی عمریں 16 سے 20 سال کے درمیان تھیں' پھر برہنہ حالت میں انہیں ایک کمرے میں لے گئے۔ وہ چلاتی رہیں لیکن درندے ان کی عزت لوٹتے رہے۔ پھر ان تینوں بدنصیبوں کو قتل کر کے گڑھے میں دفن کر دیا۔ اس کے بعد بلوائی میرے پاس آئے اور مجھے بھی برہنہ کر دیا اور میری آبروریزی کی۔ پھر میرے اوپر مٹی کا تیل چھڑک دیا۔ اتنے میں دو اور لڑکیوں کو پکڑ کر لایا گیا۔ سب ان کی طرف بھاگے تو میں برہنہ حالت میں وہاں سے بھاگی اور پھر

ایک مقام پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔ ہوش آیا تو اس کیمپ میں موجود تھی۔ اس نے بتایا کہ ہم 45 افراد محلے سے نکلے تھے جن میں سے صرف 7 زندہ بچے ہیں۔ اس طرح یحییٰ خان بنارسی نامی شخص کے شرپسندوں نے چار ٹکڑے کر دیئے' اس کی بیوی ممتاز کو ذبح کیا اور پھر یحییٰ کے پورے خاندان کو اسی طرح کاٹ کر زمین میں دفن کر دیا اور نوری نامی لڑکی کی اجتماعی آبروریزی کی گئی۔

وجے نگر کی 7 سالہ کمسن لڑکی مہ جبین جو اپنے گھر میں تنہا زندہ بچی ہے' اس نے جب اپنی داستان سنائی تو اس وقت وہاں موجود تمام لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ مہ جبین نے بتایا کہ ہم اپنے گھر میں تھے۔ ہزاروں لڑکوں کا ٹولہ آیا۔ ہم نے دروازہ بند کر لیا۔ ہماری ماں دعا مانگنے لگی۔ شرپسند دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے۔ ماں ان کے پیروں پر گر گئی۔ ہمارا باپ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ خدا کا واسطہ دیا' گھر کا سارا سامان لے جانے کو کہا لیکن ان لوگوں نے کچھ نہ سنا۔ ہمارے ماں باپ کو گھسیٹتے ہوئے گھر سے باہر لے گئے اور میرے سامنے تلوار سے کاٹنے لگے۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر بھاگی۔ پولیس والے کھڑے تھے لیکن کچھ نہیں بولے۔ میرے ماں باپ کا آج تک پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں ہیں۔

آسمان پھٹ کیوں نہ گیا!

وجے نگر ہی کی عائشہ بی بی نے بتایا کہ اس کے گھر پر شرپسندوں نے پہلے پتھراؤ کیا اور اس کے لڑکے اعجاز کا سر پھوڑ دیا' پھر لڑکیوں کے کپڑے پھاڑ کر انہیں برہنہ کر دیا اور ان سے کہا کہ رام بولو۔ جب وہ نہیں بولتی تھیں تو مارتے تھے اور پھر ان سب کی آبروریزی کی۔ اکبر بھائی نے بتایا کہ اس کے والد عبدالقاضی کے اس کی آنکھوں کے سامنے کاٹ کر چار ٹکڑے کر دیئے گئے۔ اسی طرح ایک سابق پولیس جمعدار عبدالمجید غلام رسول کو بھی شرپسندوں نے ذبح کر دیا۔ شرپسند مسجد دربار مدینہ میں داخل ہوئے اور مولانا قطب الدین آسامی کو' جو مسجد کے امام ہیں' مسجد کے پنکھے پر الٹا لٹکا دیا اور ان سے کہنے لگے ''جے شری رام'' بولو۔ امام صاحب ''یا اللہ'' کہتے۔ شرپسند پھر ان سے رام کا نام لینے کو کہتے۔ امام صاحب پھر ''یا اللہ مدد'' پکارتے۔ شرپسندوں نے امام صاحب کو نیچے اتارا اور تلوار سے کئی ٹکڑے کر دیے۔ اسی طرح امام صاحب کی بیوی کی آبروریزی کی جسے اسپتال میں داخل کیا گیا مگر وہ دو روز کے بعد جاں بحق ہوگئی۔ ایسے ہی مولانا عثمان کو بھی ذبح کر دیا گیا۔ ان کی بیوی کی اجتماعی آبروریزی کی گئی۔ اسی طرح وجے نگر کی بغل میں واقع دربار نگر مسجد کے امام کے بھی تین ٹکڑے کر دیے گئے۔ لوگوں نے بتایا کہ دربار نگر سوسائٹی میں ایک کھاڑی ہے۔ شرپسندوں نے مسلمانوں کو قتل کر کے اسی کھاڑی میں دفن کر دیا۔ کھاڑی کو پاٹ کر میونسپل کمیٹی نے اس پر پتھر بچھا دیا ہے۔ کانگرس کے ایم ایل اے منو پھوری والا اور بی جے پی کے ایم ایل اے ڈاکٹر کنو مساوانی نے مل کر یہاں قتل عام کروایا۔ گجرات کے سابق وزیر احمد سورتی جو سورت کے باعزت اور بااثر لوگوں میں شمار ہوتے ہیں' انہوں نے بتایا کہ جب وہ وجے نگر اور دربار نگر پہنچے تو تقریباً 37 لاشیں کٹی پھٹی پڑی تھیں' ان میں عورتیں بچے سب شامل تھے۔ ان کے بقول سورت کے 95 فیصد ہندوؤں نے اس خون خرابے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس میں بی جے پی اور آر ایس ایس نے اڑیا مالی قوم' کاٹھیاواڑی' مہاراشٹرین' ہیرے تراشنے والوں اور یو پی کے ہندو بھیا لوگوں کو تشدد کے لیے استعمال کیا۔ وجے نگر میں کچھ لاشوں کو ہندوؤں ہی نے رشتے دار بن کر جلا دیا اور اب اس کا دعویٰ کر کے سرکار سے ایک ایک لاکھ روپیہ لے رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان حالات میں بھی بعض ہندوؤں نے مسلمانوں کو بچایا۔

ایک ہندو نے اپنی فیکٹری میں 67 مسلمانوں کو پناہ دی۔ شر پسند انہیں تلاش کرتے رہے لیکن وہ نہیں ملے۔ آخر پولیس فورس اور اقبال بھائی واڈی والا نے مل کر ان سب کو بچایا اور اگر دو چار منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو سب مارے جاتے۔

وجے نگر کی مسجد گلی خان منزل، سعد الرحمٰن منزل، شاہی منزل، آمنہ منزل، شیخ منزل اور پٹیل منزل کے تمام کمرے نیست و نابود کر دیے گئے۔ وجے نگر میں 78 لوگوں کو قتل کیا گیا جبکہ دو سو شدید زخمی ہوئے۔

وجے نگر کے بعد قتل و غارت گری کا ہولناک منظر قطار گام روڈ پر دیکھنے میں آیا جہاں پھول پاڑہ بابھن پڑیا میں مقیم مہندی خان نامی ایک شخص نے بتایا کہ ہیرا تراشنے والے تقریباً 30 افراد آئے اور انہیں تلاش کرنے لگے جیسے ان کے پاس لسٹ ہو۔ انہوں نے نام بنام اعلان کیا اور کہا کہ باہر آ جاؤ۔ مہندی خان نے کہا کہ ہم سب ڈر کے مارے پیلو بابھن کے گھر میں گھس گئے لیکن شر پسند وہاں بھی آ گئے اور سب سے پہلے میری بیوی زہرہ کو تلوار اس طرح ماری کہ اس کا ایک ہاتھ کٹ کر دور گر پڑا اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔ شر پسندوں نے ترشول سے اسے چھلنی کر دیا۔ اس کے بعد میرے معصوم بچوں مصطفیٰ، علی رضا، مشتاق خان اور ایک بھانجے اصغر کو تلوار سے کاٹنے لگے۔ مہندی خان نے روتے ہوئے اس نمائندے کو بتایا کہ وہ یہ ظلم برداشت نہ کر سکا اور ایک غنڈے سے تلوار چھینی اور دو شر پسندوں کے ہاتھ اتار دیئے، پھر ایک کا پیٹ پھاڑ ڈالا، چوتھے کے سر پر وار کیا تو وہ بزدل بھاگ نکلے۔ اسی دوران یہ اپنے معصوم بچے اکبر کو لے کر وہاں سے بھاگا۔

اسی طرح قطار گام روڈ عیدگاہ کے پاس رہنے والی زاہدہ بانو نے بتایا کہ اس کے باپ، بہن اور بھائی کو اس کے سامنے آگ میں پھینک دیا گیا۔ اس کے والد، نذیر بھائی، بہن کلثوم اور بھائی محمد حسین کو پہلے تلوار سے مارا گیا، پھر گھر کے سامان کے ساتھ سب کو زندہ جلا دیا۔ قطار گام روڈ پر واقع گھوڑے پیر درگاہ کو شر پسندوں نے بلڈوزر سے نیست و نابود کر دیا اور اسی روڈ پر موجود احمد آباد بیکری بھی لوٹ کر جلا دی۔

قطار گام مسجد محلّہ میں 40 گھر مسلمانوں کے تھے، سب کو تہس نہس کر دیا اور آدھے افراد کو کاٹ کر جلا دیا۔ لوگوں نے بتایا کہ جب شر پسند مسجد محلے میں داخل ہوئے تو ایک پاگل کتیا نے انہیں دوڑا دوڑا کر کاٹا۔ لوگوں نے بتایا کہ قطار گام ہی میں آر ایس ایس کا ہیڈ کوارٹر ہے اور وہیں سے سب کنٹرول ہوتا تھا۔ اس نمائندے نے دیکھا کہ قطار گام مسجد محلّہ میں، جہاں ایک مسجد اور مدرسہ تھا، دو روز کے دوران شر پسندوں نے پوری مسجد اور مدرسے کے علاوہ پختہ مکانات کو ڈھا کر وہاں زمین ہموار کر دی ہے۔

وشرام نگر میں تباہ کاریاں

ویڈر روڈ پر واقع وشرام نگر کالونی، راجیو نگر، مینا نگر اور تری دینی نگر میں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ لاؤڈ اسپیکر پر کیسٹ بجائی جا رہی تھی جس میں ''بچاؤ، مارو کاٹو'' کی آوازیں تھیں۔ اس سے خائف ہو کر راجیو نگر کے لوگ اپنے گھر بند کر کے دوسری جگہوں پر منتقل ہو گئے۔ 9 دسمبر کو شر پسند جنوبی جانب سے داخل ہوئے اور گھروں کے دروازے توڑ توڑ کر جلانے لگے۔ حبیب النساء نامی ایک بیوہ عورت نے بتایا کہ وہ اپنے چار بچوں کے ساتھ رہتی تھی اور گارمنٹس کی سلائی کر کے گزارا کرتی تھی۔ شر پسندوں نے اس کے گھر کو آگ لگا دی اور سارا سامان لوٹ کر لے گئے۔ اسی

طرح حبیب بھائی بیرل والے کے کارخانے کو آگ لگائی گئی۔ یعقوب بھائی کے مکان کو لوٹ کر نذر آتش کیا گیا۔ لوگوں نے بتایا کہ جب شرپسند لوٹ مار کر کے اور آگ لگا کر بھاگنے لگے تو کچھ لوگوں نے پتھراؤ کیا۔ پھر پولیس آئی اور اس نے بجائے بلوائیوں پر فائرنگ کرنے کے مسلمانوں پر ہی فائرنگ کی جس سے وشرام نگر مسجد کے امام مولانا امتیاز الحق اور حیدر علی اور اسلم نامی دو افراد شہید ہو گئے۔

انسپکٹر کی بہنوں کو بھی نہیں چھوڑا

ابراہیم ماسٹر اپنے گھر میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ شرپسندوں کا ٹولہ ان کے گھر کے باہر آیا۔ ایک نے آواز دی ابراہیم بھائی دروازہ کھولو۔ ابراہیم نے جیسے ہی دروازہ کھولا' شرپسند گھر میں گھس آئے اور انہیں باندھ کر ایک طرف پھینک دیا۔ ابراہیم بھائی کی 20 سالہ لڑکی کو کھینچ کر باہر لائے اور اس کے کپڑے اتار دیے۔ اس نے احتجاج کیا تو تلوار سے اس کا ایک ہاتھ کاٹ دیا' پھر دوسرا ہاتھ کاٹا گیا۔ گھر کے تمام سامان کو آگ لگائی اور ابراہیم بھائی کو آگ میں پھینک دیا۔ وہ چلانے لگے۔ بعد میں گھر کے دیگر افراد کو بھی آگ میں جھونک دیا گیا۔ پھر ابراہیم بھائی کی بہو کے کپڑے اتار کر اس کی اجتماعی آبروریزی کی اور برہنہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

سب انسپکٹر منشی کے گھر کو شرپسندوں نے گھیر لیا۔ ان کی بہنوں کے ساتھ اجتماعی آبروریزی کرنے کے بعد ذبح کر دیا گیا۔ وار چھا روڈ پر لڑکیوں کی چھاتیاں کاٹ دی گئیں اور سینوں پر ''رام'' لکھ کر چھوڑ دیا گیا۔ لوگوں نے رو رو کر منتیں کیں۔ ایک علاقے میں دو نوزائیدہ بچوں کو چیر کر تار میں باندھا اور لوہے کی سلاخ میں پرو کر ماں باپ کے سامنے انہیں آگ میں ڈال دیا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہاں مسلم خواتین نے تلک لگایا اور ''جے شری رام'' بولتے ہوئے وہاں سے بچ کر نکلیں۔ وار چھا روڈ کے ایک لڑکے نے ہچکیاں لیتے ہوئے بتایا کہ ہمارے گھر کا سارا سامان جلانے کے بعد اس میں میرے ماں باپ کو رسی سے باندھ کر جھونک دیا گیا۔

عبدالرحمان خاں نے بتایا: ''میں گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شرپسند آئے۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں اور گینتیاں تھیں۔ میں ان کے پاؤں پڑ کر رونے لگا اور اپنے بچوں کی دہائی دینے لگا۔ پڑوس میں میرے بھائی نے میرے بچوں کو نکالا' لیکن شرپسندوں نے اس کے پیٹ میں گینتی گھونپ دی۔ اس طرح استا دیوی روڈ کی مسجد اور نندو دوشی کی واڑی میں واقع پوری مسجد کو شرپسندوں نے توڑ کر زمین بوس کر دیا۔ وار چھا روڈ پر واقع مسلمانوں کے پانچ ہزار مکانات اور تین سو دکانیں لوٹ کر جلا دی گئیں۔

مسلمانوں کی انڈسٹریز جلا کر راکھ کر دیں

اونا نگر میں واقع مسلمانوں کی بڑی بڑی انڈسٹریز ڈائنگ پروسس کی تھیں' انہیں جلا دیا گیا۔ دادا سلک مل میں تقریباً آٹھ لاکھ میٹر کپڑا جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ چوکشی ڈائنگ کے مالک ستار بھائی چوکشی نے بتایا کہ شرپسندوں کا ڈیڑھ سے دو ہزار کا ٹولہ فیکٹری میں گھس آیا۔ وہ پٹرول اور مٹی کے تیل کے کین ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے کارخانے میں پٹرول چھڑکا اور آگ لگا کر چلے گئے۔ اسی طرح گلیکسی ڈائنگ (پانڈے سرا) اور ویل نون ڈائنگ کا گودام مکمل طور پر جلا کر خاک کر دیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق مذکورہ تمام انڈسٹریز کا نقصان تقریباً 22 کروڑ روپے ہے۔

ساڑی شاپنگ کمپلکس کی تباہی

چونا بازار شاپنگ کمپلکس میں ساڑیوں کی بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ تین روز تک شر پسند انہیں لوٹتے رہے، پولیس پہنچی نہ کوئی اور مدد گار۔ فیشن کلب نزد آرٹی او دفتر میں واقع پریسیڈنٹ شوز کا پورا شوروم لوٹ لیا گیا۔ شوروم کے مالک صدرالدین بھائی حال ہی میں احمد آباد سے اپنا پورا کاروبار منتقل کر کے سورت آئے تھے کیونکہ احمد آباد میں بار بار ہونے والے فسادات نے انہیں تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ ان کے شوروم میں کروڑوں روپے کا سامان تھا جسے ہندو تین روز تک لوٹتے رہے۔ لوگ ماروتی کاروں میں اپنے بچوں کے ہمراہ آتے اور باقاعدہ ناپ کر پہن کر جوتے سینڈل لے جاتے رہے اور پولیس کچھ نہ کر سکی۔ اسی طرح ایک مسلمان کا گیراج جلا کر راکھ کر دیا جس میں کھڑی درجنوں امپورٹڈ کاریں بیکار ہو گئیں۔

راحت کاری کیمپ

فساد سے متاثرہ لوگوں کے لیے سب سے بڑا کیمپ رانی تلاؤ بھاربن واڑ کے میمن جماعت خانہ میں ہے جہاں تقریباً 5 ہزار عورتیں، بچے اور بوڑھے موجود ہیں۔ وہاں چھوٹے چھوٹے ایسے معصوم بچے بھی تھے جن کے ماں باپ، بھائی بہن سب کو شر پسند ظالموں نے جلا ڈالا یا قتل کر دیا۔ کیمپ کی نگرانی ابراہیم بھائی بھروچی اصغر بھائی وغیرہ کر رہے ہیں۔ اس کیمپ میں وجے نگر کی چند بدنصیب لڑکیاں بھی موجود ہیں جن کی شر پسندوں نے آبروریزی کی اور برہنہ کرنے کے بعد ہی انہیں فرار ہونے کا موقع دیا۔

نسیم خان صاحب پولس نگر کے ہیں، ان کی دو فیکٹریاں جلا کر تباہ کر دی گئیں۔ اسی طرح علی جبر خان پٹھان کی پانچ ٹیکسٹائل ملز اور تین منزلہ عمارت جلا کر راکھ کر دیں۔ انہوں نے بتایا کہ کل تک میں ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں سوتا تھا، آج ریلیف کیمپ میں پڑا ہوں۔

ایورگرین سوسائٹی میں ڈیڑھ سو خاندان مسلمانوں کے تھے۔ ان میں سیل ٹیکس کمشنر بشیر بھائی بھی رہتے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ 8 دسمبر کو شر پسند سوسائٹی میں داخل ہوئے اور پہلے پتھراؤ کیا، پھر گھروں میں گھس کر قتل عام شروع کیا۔ سیل ٹیکس کمشنر کا بیٹا جاوید اور ایک مسلم فاریسٹ آفیسر کے لڑکے کو ذبح کر دیا گیا۔ شر پسندوں نے 18 افراد کو قتل کیا اور فرار ہو گئے۔ سوسائٹی کے لوگوں نے ان لاشوں کو خدا کے رحم و کرم پر چھوڑ کر راحت کیمپ میں پناہ لی۔

پٹنی محلّہ کے ابراہیم بھائی اور شبیر بھائی کھنی والا نے بتایا کہ یہ شہر بالکل پر امن تھا۔ یہاں چند کہنہ مشق پسند تنظیموں نے فساد کروایا ہے۔ یہاں 22 لاکھ کی آبادی میں تین چار لاکھ مسلمان ہیں جو ہر لحاظ سے خوشحال تھے۔ اس نمائندے نے دیکھا کہ چونا بازار وغیرہ میں اشتعال انگیز بورڈ لگائے گئے تھے جن پر لکھا تھا: ''سورت کو کشمیر نہ بننے دیا جائے۔ مسلمانوں سے اپنی بہو بیٹیوں کو بچاؤ، ان کا بائیکاٹ کرو، ان کی دکانوں سے خریداری نہ کرو'' وغیرہ وغیرہ۔

سابق میونسپل کونسلر مختار بھائی ناتال والے کی پانچ دکانیں اور دو فیکٹریاں جلا کر خاک کر دی گئیں۔ ایک اندازے کے مطابق مجموعی نقصان ساڑھے چار کروڑ روپے کا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ پنڈول انڈسٹریل اسٹیٹ اور پوانگر انڈسٹریل اسٹیٹ میں بھی شر پسندوں نے آگ لگائی

جس سے ہزاروں مسلمان کاریگر بے روزگار ہو گئے۔

اونا پانی روڈ پر علی محمد احمد بھائی چاندی والا کا کارخانہ جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ لوگوں نے بتایا کہ پورے سورت میں مسلمانوں کی تقریباً دو سو فیکٹریوں کو آگ لگا کر تباہ کیا گیا۔ سورت میونسپل کارپوریشن میں ہیلتھ کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر سیہانے' جو آر ایس ایس کا نائب صدر ہے' شر پسندوں کی رہنمائی کی۔ جب شر پسندوں کا پتھراؤ ہوتا اور اس کے بعد وہ بستی میں لوٹنے' جلانے اور کاٹنے کے لیے آتے تو پولیس کو اطلاع دی جاتی۔ پولیس کا جواب ہوتا: ''اب تو یہی ہوگا۔''

معجزاتی واقعات

مسلمانوں کی انڈسٹریز کو جب شر پسندوں نے آگ لگائی تو ایک آئل ڈرم پھٹ پڑا اور آگ کا ہالہ تقریباً دس منٹ تک آسمان میں اونچائی پر ناچتا رہا۔ شر پسندوں کا ٹولہ آگ لگانے کے بعد جب قریب کی مسجد پر حملہ کرنے کے لیے بڑھا تو آسمان پر جلتے ہوئے ہالہ کو دیکھا اور خوف کھا کر الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

سورت کی مختلف مسجدوں کو نذر آتش کیا گیا اور وہاں موجود قرآن مجید کے نسخوں کو شر پسندوں نے آگ لگا دی' تو قرآن کے صفحات صرف کناروں سے جلے اور درمیان سے سب پیلے پڑ گئے۔ اقبال واڈی والا نے تمام صفحات کو یکجا کیا اور گھر لا کر رکھ لیا۔ اقبال بھائی کے پاس آج بھی وہ اوراق محفوظ ہیں۔

اب تک مہلوکین کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے جبکہ آج بھی سینکڑوں زخمی سردجنگ اسپتال' لوکھت ملا اسپتال اور مہادیہ اسپتال میں زیر علاج ہیں جن میں کسی کا سر پھٹا ہے' کسی کا ہاتھ اور کسی کا پیر کٹا ہے۔ کسی کا پیٹ کٹا ہے اور کسی کی آنکھ پھوٹ گئی ہے۔ ان میں 75 فی صد مسلمان ہیں۔

سورت سے واپسی پر ٹرین سے ہم نے دیکھا کہ اونا اسٹیشن سے کچھ دور ریلوے ٹریک کے قریب ہی کسی مسلمان کی پوری کھیتی کو آگ لگا کر تیار فصل تباہ کر دی گئی تھی۔ ہمارے کمپارٹمنٹ کے ٹی سی شری ورما نے کہا کہ یہ کیسا ظلم ہو رہا ہے' چند پتھروں کے لیے پورے ملک کو آگ میں جھونکا جا رہا ہے۔ ہمارے کمپارٹمنٹ ہی میں سفر کرنے والے ایک مہاراشٹرین ملٹری نوجوان نے بھی کہا کہ وہ سورت میں تعینات تھے۔ انہوں نے خونی منظر دیکھا ہے اور جس طرح مسلمانوں کو ذبح کیا گیا وہ اس کے عینی گواہ ہیں۔

(فاروق انصاری۔ اردو ڈائجسٹ۔ اپریل 1993ء)

اور بھوانی مسلمانوں سے خالی ہو گیا

ہندو تنظیم راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ کے وحشیانہ مظالم کی لمحہ بہ لمحہ روداد

میرا سابق وطن بھوانی ضلع حصار (مشرقی پنجاب) میں چالیس پچاس ہزار کی آبادی کا بارونق شہر تھا۔ مسلمان اس آبادی کا صرف چوتھائی حصہ تھے۔ سکھ یہاں برائے نام تھے۔ یہ لوگ موٹر ڈرائیوری کا پیشہ کرتے تھے۔ اور دیر تک بے اثر رہے لیکن بعدازاں مقامی سول اسپتال میں ایک سکھ اسسٹنٹ سرجن کی آمد نے ان کو منظّم کر دیا تھا اور انہوں نے یہاں ایک چھوٹا سا گوردوارہ بھی تعمیر کر ڈالا تھا۔ مسلمان زیادہ تر پسماندہ اور غیر تعلیم یافتہ تھے لیکن جسمانی لحاظ سے چاق چوبند، مضبوط اور دلیر تھے۔ مسلم لیگ کی مقامی شاخ بالکل کمزور تھی۔ اس شہر میں جہاں کانگرس کے جلوسوں میں پنڈت جواہر لال نہرو اور مسز سروجنی نائیڈو جیسی اہم اور بلند پایہ شخصیتیں تقریر کر چکی تھیں، وہاں مسلم لیگ کے کسی تیسرے درجے کے آدمی کو بھی یہاں آنا نصیب نہ ہوا تھا۔

بھوانی شہر کی بیشتر آبادی ہندوؤں کی تھی جن میں بنئے مہاجنوں کی تعداد زیادہ تھی۔ تجارت اور کاروبار کی باگ ڈور تمام تر انہی لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔ بنئے طبعاً بزدل تھے۔ شہر میں ذرا سا شور و غل ہوتے ہی یہ لوگ اپنی دکانیں بند کر کے بھاگ اٹھتے۔ ہندوؤں کی سب سے فعال جماعت راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ تھی جس کا اوّلین مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کی نسل کشی تھا۔ یہ جماعت ہندوستان میں ہسپانیہ کی تاریخ دہرانا چاہتی تھی۔ مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ اس جماعت کے رضا کاروں کو ہسپانیہ کی تاریخ کے اس دور کا خاص طور پر مطالعہ کرایا جاتا تھا جس میں عیسائیوں نے مسلمانوں پر انسانیت سوز، وحشت ناک اور بہیمانہ مظالم ڈھانے کے بعد ان کے بچے بچے کو اس سرزمین سے نکال باہر کیا تھا جہاں مسلمانوں نے کم و بیش سات آٹھ سو برس نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی تھی۔

راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ نے اپنے اس مقصد کی خاطر ایک لمبی مدت صرف کی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے بنیوں کے نوجوان لڑکے جو اپنے سے کم عمر مسلمان لڑکوں کے سامنے خم کھاتے تھے، طاقت کے نشے میں سرشار نظر آنے لگے۔ اس جماعت کے رضا کار گجردم ایک دوسرے کو جگاتے پھرتے، پھر ایک جگہ جمع ہو کر ورزش کرتے، لاٹھیاں اور بلم چلانا سیکھتے اور چاقوؤں اور چھروں سے حملہ کرنے کی تربیت حاصل کرتے تھے۔

فسادات سے کوئی ایک ماہ پیشتر راشٹریہ سیوک سنگھ کے ان رضا کاروں نے مسلمانوں کے قتل و غارت کے عملی مظاہرے کے لیے ایک ریلوے ٹرین منتخب کی۔ وہ بھوانی ریلوے اسٹیشن سے کوئی دو اسٹیشن پہلے سے اس گاڑی پر سوار ہوئے۔ گاڑی کا رخ بھوانی ریلوے اسٹیشن کی طرف تھا۔ یہ رضا کار ایک درجن کے قریب تھے اور انہوں نے اس موقع پر صرف ایک ڈبے کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا، چنانچہ سات مسلمان جن میں تین

بھوانی شہر کے باشندے تھے‘ اس حادثے میں کام آئے۔ ایک مسلمان نوجوان جو بھوانی کا رہنے والا تھا‘ گاڑی سے کود پڑا۔ خوش قسمتی سے جہاں وہ گرا وہاں ریت کے ٹیلے تھے اور اسے کوئی چوٹ نہ لگی۔ اس طرح یہ نوجوان بھاگ کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ شہر پہنچ کر اس نے مسلمانوں کو اپنے بدقسمت ساتھیوں کے انجام کی خبر سنائی۔ سات مسلمان مسافروں کی لاشیں پہنچتے ہی شہر میں فوراً کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ پولیس کی حفاظت اور بہت تھوڑے مسلمانوں کی معیت میں جلد از جلد ان شہداء کی تدفین عمل میں لائی گئی۔ اس واقعے سے مسلمانوں میں زبردست اشتعال پیدا ہوا‘ لیکن مسلمانوں نے صوبے کی مکدر فضا کے پیش نظر اور مسلمان تھانیدار کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ہندوؤں کی اس زیادتی پر صبر کیا اور حالات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔

اس واقعے کو بمشکل ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک دوپہر شہر میں اس قدر زبردست دھماکا ہوا کہ اس کی بازگشت پورے شہر میں سنی گئی۔ دراصل شہر کے وسط میں ایک مکان میں راشٹریہ سیوک سنگھ کے کچھ نوجوان رضا کار بم سازی میں مصروف تھے کہ ایک بم پھٹ گیا۔ جس سے ایک رضا کار بری طرح جھلس گیا اور اس کا ایک ہاتھ جسم سے الگ اور ایک آنکھ بیکار ہوئی۔ کرفیو ختم ہوئے ابھی دو دن ہوئے تھے کہ اب پھر کرفیو نافذ کرنے کی نوبت آ گئی۔ بم پھٹنے کے دس بارہ دن بعد تک شہر میں بظاہر سکون واطمینان رہا لیکن اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ فریقین ایک دوسرے کے محلوں میں جانے سے حتی الوسع گریز کرتے تھے۔

15 اگست کو یوم آزادی بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ مسلمان بھی جلسے اور جلوس میں شامل ہوئے باوجود یہ کہ اس موقع پر پاکستان کے قیام کو برا بھلا کہا گیا اور قائداعظم اور دوسرے مسلم لیگی اکابر کی شان میں گستاخی کی گئی۔ مسلمان حالات کے پیش نظر پرامن ہی رہے۔ انہوں نے اپنے گھروں کو کانگرس کے ترنگے جھنڈوں سے سجایا اور رات کو چراغاں بھی کیا لیکن ہندوؤں کو امن کی یہ پرکیف فضا گوارا نہ تھی۔ ہزار برسوں کی غلامی سے دبا ہوا ہندو راج آزادی کے پہلے ہی دن مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ پندرہ اگست ہی کو ایک ایسا ناخوشگوار واقعہ رونما ہوا جس کی آڑ لے کر ہندو بخوبی فساد کی ابتدا کر سکتے تھے۔ ہوا یوں کہ یوم آزادی کی صبح تھانہ شہر کے تھانیدار ظہور احمد خاں تھانے پر کانگرس کا جھنڈا نصب کر رہے تھے کہ یہ جھنڈا ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ یہ ایک اتفاقیہ واقعہ تھا‘ لیکن ہندو اس پر بڑے مشتعل اور برافروختہ ہوئے۔ انہوں نے برملا الزام لگایا کہ مسلمان تھانیدار نے دیدہ دانستہ ہمارے قومی پرچم کی توہین کی ہے اور ہم اس توہین کا بدلہ لے کے رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اس ہجوم میں کچھ سنجیدہ اور بردبار قسم کے ہندو بزرگ موجود تھے جنہوں نے تھانیدار کی اس یقین دہانی پر کہ یہ ایک اتفاقیہ واقعہ تھا‘ معاملہ رفع دفع کرا دیا ورنہ ہجوم کے لیے بے قابو ہونے میں کوئی دیر نہ تھی۔

29 اگست کو جمعے کا دن تھا۔ مسلمان نہانے دھونے اور جمعے کی نماز ادا کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ گیارہ بجے کے قریب شہر میں فساد شروع ہونے کی اطلاع موصول ہوئی۔ فساد کی ابتدا حسب معمول ہندوؤں کی طرف سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے علاقے میں بڑی بزدلی سے ایک مسلمان نوجوان کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ یہ نوجوان اپنے پیٹ کو پکڑے ہوئے گرتا پڑتا قریبی مسلمان محلے تک پہنچ گیا اور وہیں دو چار منٹ بعد دم توڑ گیا۔ اس کے بعد نہتے مسلمان راہ گیروں اور ہندو آبادی میں گھرے مسلم گھرانوں پر پے در پے قاتلانہ حملے ہونے لگے۔

فسادات سے پہلے اپنے آپ کو منظّم کرنے کے لیے مسلمانوں نے کوئی مثبت قدم نہ اٹھایا تھا۔ ان کے پاس انسانی قوت تو تھی لیکن اسلحے کی مقدار بالکل ناکافی تھی۔ انہیں بدلے ہوئے حالات کی رفتار کا صحیح اندازہ ہی نہ تھا۔ فسادات شروع ہونے سے دو روز پیشتر چار پانچ مسلمان ایک قریبی مسلمان ریاست سے اسلحہ خریدنے گئے لیکن جب یہ لوگ واپس آ رہے تھے ان کی بس کا انجن خراب ہوگیا۔ اس طرح یہ بدنصیب لوگ ہندوؤں کے نرغے میں پھنس گئے اور ان کے لائے ہوئے اسلحے پر دشمنوں کا قبضہ ہوگیا۔ ان سب مسلمانوں کو ایک مکان میں قید کردیا گیا اور یہ طے ہوا کہ اگلے روز ان سب کو تہہ تیغ کردیا جائے لیکن ان بے چاروں کی زندگی ابھی باقی تھی۔ اس گاؤں کی ایک بڑھیا جس کے پاس اس مکان کی چابی تھی، رات کو اس کا جذبہ رحم جاگ اٹھا۔ اس نے تالا کھول کر ان سب کو رہا کردیا اور یہ لوگ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلے اور بعد از خرابی بسیار بھوانی پہنچے۔

جس روز فساد شروع ہوا، مسلمانوں کے پاس تمام شہر میں محض پانچ چھ بندوقیں اور رائفلیں تھیں۔ ان میں دو بندوقیں ایسے کم حوصلہ اور بزدل آدمیوں کے قبضے میں تھیں جنھوں نے انہیں خود استعمال کیا نہ دوسروں کو استعمال کرنے کی اجازت دی۔ دو رائفلوں کی نالیاں پھٹ گئیں۔ اب صرف دو رائفلیں ایسی باقی رہیں جو میدان کار میں آخر وقت تک کام آئیں۔ گو ہتھیاروں کی یہ تعداد بہت ہی قلیل تھی لیکن مسلمانوں نے مورچے لگانے کے لیے ایسے عمدہ مقامات کا انتخاب کیا کہ شام تک مسلسل گولیوں کا تبادلہ ہونے کے باوجود ایک مورچے پر صرف ایک مسلمان شہید ہوا جبکہ دشمن کے خاصے آدمی کھیت رہے اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے ''جیالے'' مار کھا کر گھروں میں جا گھسے۔

اگلے روز ہندو اس وقت گھروں سے برآمد ہوئے جب ان کی امداد کے لیے بھارتی فوج کا ایک پورا دستہ پہنچ گیا۔ ان فوجیوں نے آتے ہی رائفلوں اور اسٹین گنوں کے منہ کھول دیے۔ جدید ترین آتشیں اسلحے کے سامنے مسلمانوں کی پرانی رائفلیں، لاٹھیاں، نیزے، بلم اور اسی قبیل کے دوسرے دقیانوسی ہتھیار بے کار ہو کر رہ گئے۔ نہتے مسلمان بھارتی فوجیوں کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ سینکڑوں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے صرف ایک دن میں اس خونیں ہنگامے کی بھینٹ چڑھ گئے۔

فسادات سے دو تین روز پہلے تھانیدار ظہور احمد خاں کا تبادلہ ہوگیا تھا۔ ان کی جگہ ایک سفید ریش سکھ تھانیدار تعینات ہوئے، ان کی عمر اس وقت پچاس برس ہوگی۔ وہ نہایت نیک طینت اور بے تعصب آدمی تھے۔ انہوں نے بھوانی کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کی اتنے خلوص کے ساتھ خدمت کی کہ شاید کوئی مسلمان بھی نہ کرسکتا تھا۔ جب تک ان کا انتظام برقرار رہا، انہوں نے اپنے ماتحت پولیس اہل کاروں کو جانبداری پر مائل ہونے سے باز رکھا، تاہم جب باہر سے بھارتی تعداد میں فوجی جوان آ گئے تو وہ مجبور ہوگئے۔ جب پولیس کے مسلمان عملے سے ہتھیار واپس لے گئے تو ماتحت ہندو سب انسپکٹر اور دوسرے ہندو اہلکاروں نے یہ سازش کی کہ ان تمام مسلمانوں ملازموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ تھانیدار صاحب کو خبر ملی تو انہوں نے بڑی سختی سے اس منصوبے کی مخالفت کی اور ان تمام لوگوں کو ان کے کنبوں کے ہمراہ بہ حفاظت مسلم کیمپ میں پہنچوا دیا۔

مسلم کیمپ کے لیے راشن کی فراہمی کا انتظام بھی انہی سکھ تھانیدار کے سپرد تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً مسلم کیمپ کا چکر لگاتے رہے اور پوچھ پوچھ کر مسلمانوں کی ضروریات پوری کرتے۔ مسلمانوں کو شروع شروع میں پانی کی قلت کے باعث بڑی تکلیف اٹھانا پڑی۔ کیمپ مرزا نذیر بیگ صاحب

کے باغ میں قائم کیا گیا تھا۔ مسلمان تین چار دن باغ کی ''ڈگی'' کا گندہ پانی پیتے رہے بعد میں تھانیدار صاحب نے اجازت دے دی کہ مسلمان کیمپ سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر لگے نل سے پانی لے لیا کریں۔

ادھر تھانیدار صاحب کی یہ کرم فرمائیاں تھیں اور ادھر بھوانی کے ریذیڈنٹ مجسٹریٹ مسٹر جین چاہتے تھے کہ ان ستم رسیدہ مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں لیکن اللہ کو یہ منظور نہ تھا۔ مسٹر جین کا تقرر اس عہدے پر کوئی تین چار ماہ پیشتر ہوا تھا۔ وہ ایک نہایت متعصب اور فتنہ پرور افسر تھے اور فسادات کو منظم کرنے میں ان کے مشوروں کا خاصا دخل تھا۔ ان سے پہلے کنور سریندر سنگھ بیدی' جو مشہور شاعر ڈپٹی کمشنر کنور جندر سنگھ بیدی سحر کے چھوٹے بھائی تھے' یہاں ریذیڈنٹ مجسٹریٹ تھے۔ اگر کنور صاحب اس زمانے میں وہاں مجسٹریٹ ہوتے تو بھوانی شہر کے امن میں اس درجہ خلل پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ کنور مریندر سنگھ بیدی کے مسلمانوں کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے اور سیر وشکار وغیرہ کے لیے وہ ان ہی کی مجلسوں میں آتے جاتے تھے۔

جب مسلم کیمپ قائم ہو گیا تو مسٹر جین معائنے کے لیے آئے۔ اس روز ان کے تکبر کی انتہا نہ تھی۔ وہ فوج کے جوانوں کے ساتھ بڑے اکڑ اکڑ کر چل رہے تھے۔ مرزا نذیر بیگ اور دوسرے معزز مسلمان جب ان کے استقبال کے لیے آئے تو وہ چھوٹتے ہی کہنے لگے: ''مرزا صاحب! کہاں ہے آپ کا خدا اور کہاں ہے اس کی مدد؟ (نعوذ باللہ) دیکھا آپ لوگوں نے اپنا پاکستان؟'' مرزا صاحب! نے فرمایا: ''ڈپٹی صاحب! خدا سے ڈریئے اور ایسا نہ کہیئے۔ خدا موجود ہے اور موجود رہے گا۔ یہ جو کچھ ہوا ہمارے اعمال کی سزا ہے اور ہم اس پر نادم ہیں۔''

ایک متکبرانہ مسکراہٹ جین صاحب کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی' وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن خاموش رہے' پھر کیمپ کا حال دریافت کرنے لگے۔ کچھ دیر گھومے پھرے اور چل دیے۔ اللہ کی شان دیکھئے کہ اس واقعے کو ابھی دو ہی دن گزرے تھے کہ مسٹر جین ایک حادثے کی نذر ہو گئے۔ وہ اپنی کار میں حصار جا رہے تھے کہ مخالف سمت سے آنے والے ایک تیز رفتار فوجی ٹرک سے تصادم ہو گیا۔ حادثہ اس قدر شدید تھا کہ ان کی کار چکنا چور ہو گئی اور مسٹر جین موقع ہی پر ہلاک ہو گئے۔

ہمارا مکان جس گلی میں تھا اس میں سارے مکانات ہندوؤں کے تھے۔ ہمارے گھر کی پشت پر مسلمانوں کا محلّہ تھا جس سے ہندو بہت خائف تھے۔ فسادات سے چند روز پہلے ہماری گلی کے ہندوؤں نے ایک نام نہاد امن کمیٹی بنائی اور مسلمانوں کو بھی اس میں شامل ہونے کی دعوت دی' چنانچہ مسلمان بھی اس امن کمیٹی میں شامل ہو گئے اور فریقین میں یہ طے پایا کہ شہر میں چاہے کہیں فساد ہو ہم اپنے محلوں میں فساد نہیں ہونے دیں گے۔ ہم اس معاہدے پر آخر وقت تک کاربند رہے۔ اگر ہم اس فیصلے کی خلاف ورزی کرنے پر تل جاتے تو محلے کے سارے کے سارے ہندو کھیت رہتے کیونکہ وہ سب کے سب بنئے تھے اور ان کے پاس اسلحے کا نام ونشان تک نہ تھا مگر ہمارا یہ اقدام اسلامی تعلیمات اور مردانگی کی روح کے منافی ہوتا لہٰذا ہم نے معاہدے کا احترام کیا اور ایک موقع پر کچھ ہندوؤں کی حفاظت بھی کی۔

ہمارے محلے دار لالہ گوکل چند آریہ پرانے کانگرسی تھے جو امن کی اس مہم میں پیش پیش تھے لیکن سب جانتے تھے کہ وہ موقع پرست اور منافق آدمی ہیں۔ فساد کے پہلے دن جب مسلمان ابھی محلے میں موجود تھے' باہر کے کچھ شوریدہ سر مسلمان نوجوان ہماری گلی میں گھس آئے اور لالہ

گوکل چند کے مکان پر جا کر للکارے۔ لالہ جی، ان کی بیوی اور بیٹیاں مکان کے چھجے پر ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ والد صاحب کو معلوم ہوا تو وہ بھاگ کر وہاں پہنچے اور بڑی مشکل سے ان کی جان بچائی۔ فساد کے دوسرے دن جب ہمارے محلے کے مسلمان بھی بھارتی فوج کے حملوں سے گھبرا کر بھاگنے لگے تو کچھ گھرانے ایسے بھی تھے جنہوں نے خوف کے مارے اپنے مکانوں کے دروازے بند کر لیے اور بزعم خود اپنے آپ کو محفوظ خیال کیے بیٹھے رہے۔ جب لالہ گوکل چند کو معلوم ہوا کہ محلے کے اکثر مسلمان بھاگ چکے ہیں اور محلے میں اکا دکا گھروں میں کچھ مسلمان ابھی تک موجود ہیں تو انہوں نے ہندو نوجوان بلوا لیے اور ان مسلمانوں کو ختم کر دینے کا پروگرام بنایا۔ ان ظالموں نے مکانوں کے دروازے توڑ توڑ کر ان مسلمانوں کو ہلاک کر ڈالا۔ کچھ مسلمان عورتیں اور بچے کمروں کے اندر چھپے ہوئے تھے جن کے مضبوط دروازے ٹوٹ نہ سکے تو چھتوں میں سوراخ کر دیے گئے اور مٹی کے تیل میں بھیگے روئی اور کپڑے کے گولے آگ لگا کر کمروں کے اندر پھینکے گئے۔ کمروں کے دروازے باہر سے بند کر دیے گئے تا کہ کوئی باہر نہ نکل سکے۔ اس طرح وہ بدنصیب مسلمان آگ اور دھوئیں میں گھٹ گھٹ کر مر گئے۔ میرے ایک دوست نے بعد میں خط کے ذریعے مجھے مطلع کیا کہ ہمارے مکان کو لوٹنے میں بھی لالہ گوکل چند پیش پیش تھے۔

فسادات کے دوران پنڈت نیکی رام شرما کی پوزیشن بھی نہایت افسوس ناک اور قابل اعتراض تھی۔ پنڈت جی صوبائی کانگرس کی مجلس عاملہ کے رکن اور مقامی کانگرس کمیٹی کے صدر تھے۔ ان کی متعصّبانہ ذہنیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک موقع پر جب کیمپ میں مسلمانوں نے تھانیدار صاحب سے درخواست کی کہ ان کے لیے تھوڑے سے نمک کا انتظام کر دیا جائے تو پنڈت نیکی رام شرما اس وقت وہیں موجود تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے منہ پر تھانیدار سے کہا: ”سردار صاحب! بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ ان نمک حراموں کے لیے نمک کا انتظام فرماتے ہیں۔ میرا بس چلے تو میں ان کو گولیوں سے اڑا دوں۔“

انہی دنوں بھوانی سے پندرہ سولہ میل دور مسلمان راجپوتوں کے مشہور قصبے کلانور ضلع روہتک میں مسلمان اور ہندو راجپوتوں کی ایک مشترکہ کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس کے انعقاد کا مقصد پورے علاقے میں امن و امان قائم رکھنا اور حالات کو ہر قیمت پر دگرگوں ہونے سے بچانا تھا۔ امن و آشتی کی ایسی کوششیں پنڈت نیکی رام شرما جیسے شرپسند لوگوں کو کہاں برداشت تھیں، چنانچہ اس نے اس موقع پر ایک شرمناک سازش کی۔ ان کی یہ سازش اگر کامیاب ہو جاتی تو ضلع روہتک میں زبردست فسادات شروع ہو جاتے۔

کلانور کانفرنس میں مسلمان اور ہندو راجپوتوں کے علاوہ کسی اور کو شرکت کی اجازت نہ تھی مگر پنڈت نیکی رام شرما نے اپنے بھتیجے ودیا برشاد کو، جو ایک گرایجویٹ نوجوان تھا، کلانور بھیجا تا کہ وہ اس کانفرنس کی سرگرمیوں کا پوری طرح جائزہ لیتا رہے اور اگر اسے کامیاب ہوتا دیکھے تو وہاں سے فوراً لوٹ کر کلانور بھوانی کے درمیان ہندو دیہات میں اس قسم کا پروپیگنڈا کرے جس سے یہ کانفرنس ناکام ہو کے رہ جائے۔

یہ کانفرنس جیسا کہ توقع تھی، نہایت کامیاب رہی۔ اسے کامیاب ہوتے دیکھ کر ودیا پرشاد کلانور سے چل پڑا۔ راستے میں یہ شخص جس ہندو آبادی سے بھی گزرا، وہاں اس نے مسلمانوں کے خلاف نہایت اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کیا اور ہندوؤں کو بھڑکایا کہ کلانور کانفرنس میں جو ہندو اور راجپوت نمائندے شریک ہوئے تھے وہ تمام کے تمام وہاں مار ڈالے گئے ہیں۔

اس خبر سے ہندو راجپوتوں کا مشتعل ہونا ایک لازمی امر تھا، چنانچہ وہ لوگ کلانور پر چڑھائی کرنے اور مرنے مارنے پر تیار ہو گئے لیکن اس اثنا میں ایک بوڑھے ہندو راجپوت کو خیال آیا کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی ایک راجپوت سے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، اتنی بڑی بدعہدی کی امید نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سب کچھ اس برہمن زادے کی شرارت اور دھوکا ہی ہو۔ اس نے بپھرے ہوئے ہندو نوجوانوں کو ٹھنڈا کیا اور کہا کہ میں بوڑھا آدمی ہوں، مجھے کلانور جانے دو۔ اگر میں وہاں مارا بھی گیا تو مجھے مسلمان راجپوتوں کی اس حرکت پر کوئی رنج و افسوس نہ ہوگا، البتہ میری اور دوسرے راجپوتوں کی موت کا انتقام لینا تم لوگوں پر فرض ہوگا اور اگر میں زندہ سلامت لوٹ آیا تو تھوڑی دیر میں تمام صحیح حالات تم لوگوں کے سامنے ہوں گے۔

یہ کہہ کر بوڑھا راجپوت گھوڑے پر سوار ہوا اور کلانور پہنچ گیا۔ وہاں دیکھا کہ کلانور کانفرنس کا اجلاس جاری ہے اور ہندو راجپوتوں کا قتل تو کیا کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ یہ بوڑھا راجپوت اطمینان سے واپس آیا اور اس طرح اس زبردست فساد کا خطرہ ٹل گیا۔ اب ہندو راجپوتوں نے ودیا پرشاد کو تلاش کرنا شروع کر دیا تا کہ اس شرپسند کو ایسی سخت سزا دی جائے جو دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔ لیکن وہ بدبخت خرمن امن میں آگ لگا کر بھوانی پہنچ گیا تھا۔

1947ء کے ان فسادات میں ہندو راجپوتوں کی من حیث القوم تعریف کرنی پڑے گی۔ ان لوگوں نے ان فسادات میں بہت ہی کم حصہ لیا اور ہندوستان میں ان کی ریاستوں میں بھی فسادات برپا نہیں ہوئے۔ بڑودہ، بیکانیر، جے پور، جودھ پور، اودے پور اور جیسلمیر جیسی راجپوت ریاستوں کے مسلمان اب تک وہیں آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں، البتہ جاٹوں کو خواہ وہ ہندو تھے یا سکھ خدا جانے مسلمانوں سے کیا پرخاش تھی کہ انہوں نے ان کو تباہ و برباد کر ڈالنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ انہوں نے اور ان کی ریاستوں یعنی پٹیالہ، نابھہ، جنید، کپورتھلہ، فرید کوٹ، الور اور بھرت پور نے مسلمانوں پر وہ مظالم ڈھائے کہ دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی۔

بھوانی شہر میں ہندو راجپوت آباد تھے۔ ان کی حالت خاصی مستحکم تھی اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے اچھے مراسم تھے۔ وہ اگر چاہتے تو شاید ہمارے شہر میں فسادات برپا کر سکتے تھے لیکن آزادی سے چند ماہ پہلے کچھ سرپھرے مسلمان نوجوانوں نے برسر بازار ایک ہندو راجپوت وکیل چرنجیت سنگھ کو پیٹ ڈالا تھا۔ چرن جیت سنگھ بھوانی میونسپل کمیٹی کا پریذیڈنٹ بھی رہ چکا تھا۔ سیرت النبیؐ کے جلسوں میں اکثر تقریر کرتا اور رسول اللہ کے اسم مبارک کے ساتھ ﷺ کہتا۔ بہرحال یہ واقعہ افسوس ناک تھا، اس کے بعد فریقین میں بظاہر صلح صفائی ہو گئی تھی لیکن ہندو راجپوتوں کے دلوں میں کدورت باقی رہی اور اس کا اظہار انہوں نے ان فسادات میں کیا۔ وہ فسادات میں صرف پہلے دن شریک ہوئے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے محلوں میں کسی نہتے اور اکیلے دکیلے مسلمان پر کوئی وار نہیں کیا اور اس طرح راجپوتی شان برقرار رکھی، تاہم ان کے بوڑھے اور سنجیدہ افراد راجپوتوں کی فسادات میں شمولیت پر افسوس اور ندامت کا اظہار کرتے رہے۔

1947ء کے یہ فسادات قیامت صغریٰ سے کم نہ تھے۔ ان فسادات میں ایسے ایسے واقعات دیکھنے میں آئے کہ لوگوں نے اپنی زندگی بچانے کے لیے اپنے بیوی بچوں تک کی کوئی پرواہ نہ کی۔ بعض آدمیوں نے اپنے ماں باپ کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ دیا جیسے ان سے کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ ماں کی ممتا کا کیا ٹھکانہ لیکن اس زمانے میں ایسی مائیں بھی دیکھی گئیں جنہوں نے اپنے دودھ پیتے جگر پاروں کو راہ کا کانٹا سمجھ کر پھینک

دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ ایسے جگر خراش مناظر بھی دیکھنے میں آئے کہ ایک انسان دم توڑ رہا تھا اور اس کے نہایت قریبی عزیز اسے اس حالت میں تنہا چھوڑ کر چل دیے۔

بھوانی میں میرے واقف ایک صاحب تھے جو اچھے تعلیم یافتہ اور دین دار آدمی تھے۔ ان کی ایک لڑکی سات آٹھ برس کی تھی۔ لڑکی مجذوب قسم کی تھی اور اس نے بڑی خاموش طبیعت پائی تھی۔ کسی سے بولنا نہ چالنا‘ کسی نے کھانے کو دے دیا تو کھا لیا ورنہ خاموش بیٹھی رہتی۔ فساد کے خوف سے جب یہ صاحب گھر سے رخصت ہونے لگے تو اپنے تمام بچوں کو ساتھ لے لیا لیکن اس مجذوبہ کو وہیں چھوڑ دیا۔ ان کی والدہ نے کہا بھی کہ اسے بھی ساتھ لے لو مگر وہ نہ مانے۔ اس سنگدلی پر والدہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انہوں نے بڑی شفقت سے اس لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر ''بیٹی! تجھے اللہ کے حوالے کیا'' کہہ کر وہاں سے چل پڑے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس غریب لڑکی کا کیا حشر ہوا۔

فسادات کی ان شب ہائے تیرہ و تار میں بھی اللہ کے کچھ نیک بندوں نے انسانیت کے ایسے چراغ روشن کیے جن کی روشنی سے راستے جگمگا اٹھے۔ شجاع الدین خاں بھوانی میں چونے کا کاروبار کرتے تھے۔ پیسے والے آدمی تھے بلکہ یوں سمجھیے کہ تیس چالیس ہزار کی اسامی تھے۔ اس کے والد اسی پچاسی برس کی عمر کے بزرگ تھے‘ قریبی مسجد میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا ان کا شغل تھا۔ فساد کے دوسرے دن جب ان کا محلّہ غیر محفوظ نظر آنے لگا تو شجاع الدین خاں بھی بھاگنے کی فکر کرنے لگے۔ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ مسلم کیمپ قائم ہو چکا ہے‘ اس لیے وہ یہ سوچ رہے تھے کہ بھاگ کر مسلمان آبادی والے کسی نواحی گاؤں میں پہنچ جائیں‘ چنانچہ وہ اپنے والد صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ شہر کی حالت بہت خراب ہے‘ اب تو یہاں سے بھاگنا ہی اچھا ہوگا۔ والد کہنے لگے: ''بیٹا! مجھے کہاں لیے پھرو گے‘ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھے یہیں اللہ اللہ کرنے دو۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے جو کوئی مجھے مارے گا۔'' لیکن شجاع الدین خان نہ مانے۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کو ہرگز یہاں نہ چھوڑوں گا۔ آپ اٹھیں اور میرے ہمراہ چلیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے بڑے میاں کو اپنی کمر پر بٹھایا اور اپنے کنبے کے لوگوں کے ہمراہ لے کر بھاگ نکلے۔ جب یہ لوگ شہر کی حدود سے گزرنے لگے تو وہاں کھڑے ہندوؤں نے ان لوگوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمان تعداد میں کم بلکہ نہتے بھی تھے‘ تاہم اس گئی گزری حالت میں بھی انہوں نے کئی گنا زیادہ اور مسلح ہندوؤں کا مقابلہ کیا۔ لیکن اللہ کو ان کی فتح منظور نہ تھی اور وہ بھاگنے لگے۔ ان بھاگنے والوں نے شجاع الدین خاں سے بہت کہا کہ وہ اپنے والد صاحب کو چھوڑ کر اپنی جان بچا لیں مگر وہ مرتے مر گئے مگر انہوں نے اپنے والد کا ساتھ نہ چھوڑا۔ دونوں باپ بیٹا شہید کر دیے گئے۔

میری اہلیہ کی بڑی ہمشیرہ کی دونوں ٹانگوں پر ان دنوں فالج گرا ہوا تھا اور وہ چلنے پھرنے سے معذور تھیں۔ ان کے شوہر دلی گئے ہوئے تھے اور وہ اپنی والدہ کے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ ان کے ہمراہ ان کے دو بچے بھی تھے۔ جس روز مورچہ ٹوٹا اور مسلمان مجبور ہو گئے کہ شہر کو خیر باد کہہ کر مسلم کیمپ کا رخ کریں‘ اس روز عجب افراتفری اور آپا دھاپی کا عالم تھا۔ تڑاتڑ گولیاں چل رہی تھیں اور ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ اس خاتون کو اپنی بے بسی اور بے چارگی کا بڑا احساس تھا۔ وہ زار زار رو رہی تھیں۔ شاید وہ دل میں سوچ رہی تھیں کہ یہ لوگ انہیں اس حالت میں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ انہیں روتے دیکھا تو ان کے چھوٹے بھائی رشید احمد نے کہا: ''بہن! روتی کیوں ہو؟ کیا تم سوچتی ہو کہ ہم تمہیں یہیں چھوڑ جائیں گے؟ نہیں‘ جب تک رشید احمد کے دم میں دم ہے وہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔'' چنانچہ جب وہ اپنے مکان سے باہر نکلے‘ گولیوں کی بارش

ہو رہی تھی اور رشید احمد اپنی اپاہج بہن کو پیٹھ پر سوار کیے بھاگے جا رہے تھے۔ یہ مرحلہ بڑا سخت تھا لیکن رشید احمد اور عزیز احمد دونوں بھائیوں نے یکے بعد دیگرے اپنی بہن اور ان کے دو بچوں کو بہ حفاظت کیمپ میں پہنچا کر دم لیا۔

اسی طرح میرے ایک ہم وطن محبوب خاں کی گود میں ان کی نواسی تھی جس کی عمر دو تین سال تھی۔ محبوب خاں کے داماد یعنی اس لڑکی کے باپ نے بار بار ان سے کہا کہ اس لڑکی کو پھینک دو لیکن انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ جب تک میری جان میں جان ہے میں اس ننھی سی جان کو اپنی گود سے الگ نہ کروں گا‘ چنانچہ یہ لڑکی ان کے ہمراہ پاکستان پہنچ گئی اور آج یہ لڑکی کتنے ہی بچوں کی ماں ہے اور اپنے گھر شاد و آباد ہے۔

1947ء کے فسادات کی یہ کہانی اس وقت تک مکمل نہ ہو گی جب تک بھوانی کے اس مرد مجاہد کا ذکر نہ کیا جائے گا جس کا نام مرزا قدیر بیگ تھا۔ وہ مرزا نذیر بیگ کے صاحبزادے تھے جن کی کوٹھی کے احاطے میں مسلم کیمپ قائم کیا گیا تھا۔ ان کی کوٹھی شہر سے کچھ دور ان کے باغ میں واقع تھی۔ یہاں ہر آن قریبی دیہات کے ہندوؤں کے حملوں کا پورا پورا خطرہ تھا لیکن جب مرزا صاحب نے سنا کہ شہر میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی ہے تو وہ اپنی کوٹھی کو جس میں ان کے والدین‘ بیوی بچے اور بہن بھائی موجود تھے‘ اللہ کے حوالے کر کے اپنی رائفل لیے شہر کے مورچے پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے والد نے انہیں روکا بھی لیکن اس ایثار پیشہ مسلمان نے ان کی ایک نہ سنی۔ شہر کے جس مورچے کی حفاظت مرزا قدیر بیگ کر رہے تھے وہ سب سے اہم مورچہ تھا۔ انہوں نے جان ہتھیلی پہ رکھتے ہوئے خوف و ہراس کی اس فضا میں جس سرفروشی اور بے جگری کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ انہوں نے جرأت و مردانگی کے اس مقابلے میں بھوکے پیاسے صبح سے شام کر دی تھی مگر ہندو حملہ آوروں کو مسلمان محلوں کی طرف بڑھنے نہ دیا۔ ان کا نشانہ اس قدر سچا تھا کہ ان کی رائفل سے گولی جب بھی نکلتی دشمن کے کسی نہ کسی آدمی کو کھیت رکھتی تھی۔ دور و نزدیک اونچی اونچی حویلیوں پر بیٹھے ہندو بندوقچی ان پر گولیاں برسا رہے تھے لیکن خدا کے فضل و کرم سے وہ مامون و محفوظ رہے اور مورچے سے اس وقت لوٹے جب رات ہو چکی تھی اور حملہ آور تنگ آ کر واپس جا چکے تھے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ آخر تک لڑنے والوں میں اکثریت ہندو راجپوتوں کی تھی ورنہ راشٹر یہ سیوک سنگھ کے بہادر نوجوان تو میدان چھوڑ کر ایسے غائب ہو گئے کہ ڈھونڈنے سے بھی ان کا نام و نشان نہ ملتا تھا۔ سچ ہے جان دینا بڑی بات ہے یہ ہر کسی کا کام نہیں۔ اگلے روز مرزا قدیر بیگ کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس کی پوری جمعیت ان کی کوٹھی پہنچی اور بڑی سرگرمی سے پوری کوٹھی کی تلاشی لی لیکن مرزا صاحب نہ ملے اور ملتے بھی کہاں‘ وہ تو اپنی کوٹھی کے ایک تہ خانے میں آرام سے بیٹھے تھے اور اس تہ خانے کی چھت پر فرش بچھا ہوا تھا جہاں ان کی بیمار والدہ لیٹی ہوئی تھیں۔

رات کو مرزا صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر کوٹھی سے باہر نکلے اور روہتک کی طرف چل پڑے۔ اللہ کی مدد شامل حال تھی‘ وہ راتوں رات بخیریت روہتک پہنچ گئے اور اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرے لیکن گرفتاری کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ انہوں نے اسی روز سکھ کا بھیس بدلا‘ نقلی ڈاڑھی لگائی اور دلی روانہ ہو گئے پھر وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے پاکستان پہنچے اور ملتان رہائش اختیار کی۔ سکھ کے لباس میں مرزا صاحب کی یہ تصویر اب بھی ان کے پاس موجود ہے اور ہم نے بھی اسے دیکھا ہے۔

ہمارے شہر کے ایک ہندو رئیس لالہ کشن لال جالان تھے۔ انہوں نے ایک اندھے کی حالت سے متاثر ہو کر ایک لاکھ روپے کے قریب رقم

اپنی جیب خاص سے صرف کر کے 1935ء میں شہر میں ایک پر فضا مقام پر آنکھوں کے امراض کا عظیم الشان اسپتال تعمیر کرایا۔ اس اسپتال کے انچارج ایک ہندو نوجوان ڈاکٹر مقرر ہوئے، نام پرشوتم دت گردھر اور ملتان شہر کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر گردھر بڑی محبت کے انسان اور نہایت خلیق معالج تھے۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں بڑی شفا رکھی تھی۔ مریضوں کے ساتھ ان کا سلوک بہت ہمدردانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا اور ہندو مسلمان کی ان کے ہاں کوئی تمیز نہ تھی۔

ڈاکٹر پرشوتم دت اور انکے چھوٹے بھائی ڈاکٹر نارائن داس نے 1947ء کے فسادات میں جس شجاعت اور دلیری سے اسپتال کے مسلمان مریضوں کی جانیں بچائیں وہ انسانیت کی تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رہیں گے۔ ہندو حملہ آوروں کی سنگدلی اور شقاوت قلبی دیکھئے کہ وہ لوگ بیمار مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے کی غرض سے مقامی اسپتال میں بھی پہنچ گئے۔ سول اسپتال میں جہاں ایک متعصب ہندو اسسٹنٹ سرجن تعینات تھا انہیں کامیابی نصیب ہوئی۔ وہاں سب مریض ختم کر دیے گئے۔ ایک دوسرے گروہ نے آنکھوں کے اسپتال کا رخ کیا۔ ڈاکٹر پرشوتم دت کو ان کے ارادوں کی خبر مل چکی تھی۔ انہوں نے اسپتال کے تمام دروازے بند کر دیے اور دونوں بھائی رائفلیں لے کر اسپتال کی دوسری منزل پر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے حملہ آوروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”آپ یہ فراموش کر چکے ہیں کہ دنیا میں انسانیت نام کی بھی کوئی چیز موجود ہے اور اتنے گر چکے ہیں کہ دکھی اور بیمار انسانوں کی جان لینا بھی شیوہ مردانگی سمجھتے ہیں۔ نہتے انسانوں کا قتل آپ کی نگاہوں میں ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ آپ کو اپنی اس ذلیل حرکت پر شرم محسوس کرنا چاہیے۔ کل آپ اپنے اس گھناؤنے فعل پر پچھتائیں گے، لیکن انسانیت آپ کو کبھی معاف نہ کرے گی۔ آپ لوگوں کے لیے اب بھی وقت ہے کہ اس بیہودہ خیال سے باز آئیں اور یہاں سے چلے جائیں ورنہ جب تک ہم دونوں بھائیوں کے جسم میں جان اور ہماری رائفلوں میں گولیاں موجود ہیں ہم آپ لوگوں کو اپنے مریضوں تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔“

ڈاکٹر صاحب کے ان الفاظ نے حملہ آوروں کے ایک حصے پر خوشگوار اثر ڈالا مگر شرارت پسند عنصر نے مخالفانہ نعرے بلند کیے، ان پر مسلمانوں کے ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا اور انہیں مار ڈالنے اور اسپتال کو نذر آتش کر ڈالنے کی دھمکیاں دیں، تاہم ڈاکٹر صاحب نے حوصلہ نہ ہارا اور وہ ان دھمکیوں سے بالکل نہ گھبرائے۔ ان کی ہمت و عزم دیکھ کر حملہ آوروں کی ہمت پست ہو گئی اور وہ ان کو گالیاں دیتے اور برا بھلا کہتے وہاں سے چلے گئے۔

ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب ایک ایک مسلمان مریض کے پاس گئے اور انہیں اطمینان دلایا کہ جب تک وہ صحت یاب نہ ہو جائیں، وہ ہر قیمت پر ان کی حفاظت کریں گے، چنانچہ جو مریض تندرست ہو جاتا وہ اسے مسلمانوں کے مقامی کیمپ میں پہنچا دیتے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا حتی کہ اسپتال کا آخری مسلمان مریض مسلم کیمپ میں داخل ہو گیا۔

(عبدالمجید قریشی۔ اردو ڈائجسٹ۔ اگست 1997ء)

ہم نے پاکستان بنتے دیکھا

تقسیم برصغیر کے ولولہ خیز اور زہرہ گداز واقعات جن سے ہماری نئی نسل کم کم آشنا ہے

1945ء میں شملہ کانفرنس میں شرکت سے واپسی پر قائداعظم، علی گڑھ سے گزر رہے تھے مسلم یونیورسٹی کے طلبہ اپنے محبوب قائد کا استقبال کرنے ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ مسلم لیگ کے مقامی لیڈروں نے قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ ریلوے اسٹیشن پر جمع ہونے والوں سے چند منٹ خطاب کریں مگر قائد نے کہا کہ یہ بات میرے شیڈول میں نہیں۔ تب ان لوگوں نے کہا کہ علی گڑھ کے طلبہ بھی آئے ہوئے ہیں، انہیں اپنی جھلک دکھا دیں۔ اس پر قائداعظم اپنے ڈبے کے دروازے میں نمودار ہوئے اور انہوں نے طلبہ سے مخاطب ہو کر کہا:

(لڑکو! آگے بڑھتے رہو) Boys! March on قائداعظم کا یہ فقرہ ذومعنی تھا۔ اس کا ایک مطلب تو یہ تھا کہ ڈبے کے سامنے پلیٹ فارم پر ہجوم نہ ہو اور آگے چلتے جاؤ۔ دوسرا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کی جنگ میں پیش قدمی کرتے رہو۔

اس برس برصغیر میں عام انتخابات ہونے والے تھے جن میں قیام پاکستان یا متحدہ ہندوستان کا فیصلہ ہونا تھا چنانچہ قائداعظم کا فرمان سن کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ مسلم لیگی امیدواروں کی انتخابی مہم کرنے کے لیے سرگرم ہو گئے۔ آٹھ لڑکوں پر مشتمل گروہ نومبر 45ء میں نواب شاہ کے صوبائی حلقے میں پہنچی وہ طلبہ سندھ کے تھے اور ان میں ڈاکٹر بنی بلوچ گروہ کے قائد تھے۔ سانبھر، راجستھان اور طلبہ حسن محمود اور وقار احمد بھی ہمارے ہمراہ تھے ہم سندھ میں ریل گاڑی پر سفر کر رہے تھے۔ ہمارے لیڈر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ چلتی گاڑی میں مسافروں سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے قائداعظم مسلم لیگ کی بات کرتے ہوئے مسلم لیگی لیڈروں کو ووٹ دینے کی اپیل کی۔ وہ اپنی بات کر چکے تو ایک بوڑھا ان پڑھ سندھی، بلوچ صاحب کے پاس آ کر بولا: ''آپ نے جس امیدوار کو ووٹ دینے کو کہا ہے، اس کا کردار یہ ہے کہ وہ ممبر یا وزیر نہیں بنا ہے تو وہ ہماری بہو بیٹیوں کو گھروں سے اٹھوا لیتا ہے جب ہم سو رہے ہوتے ہیں۔ اگر وہ ممبر یا وزیر بن گیا تو وہ ہمیں جگا کر ہماری بہو بیٹیوں کو اٹھوا لے جائے گا۔ اس کے باوجود ہم بابا قائداعظم کے حکم کے مطابق ووٹ مسلم لیگ ہی کے نمائندے کو دیں گے۔''

نواب شاہ کے حلقے میں ہم صبح دیہات میں نکل جاتے اور رات کو لوٹتے تھے۔ ہمیں کسی باقاعدہ جلسہ گاہ کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ ہم نہر کی پٹری پر کسی جگہ لاؤڈ اسپیکر لگا کر ترانے اور تقریریں شروع کر دیتے اور اردگرد کے دیہاتی آواز سن کر وہاں آن اکٹھے ہوتے اور ہمارے قائد کی بات سنتے۔ الیکشن ہوا تو نواب شاہ کا مسلم لیگی نمائندہ بھاری اکثریت سے جیتا۔ اگرچہ سندھ میں جی ایم سید گروپ کی مسلم لیگ سے علیحدگی کے باعث

حالات ناساز گار تھے، مگر عوام نے قائداعظم کی زبان پر لبیک کہتے ہوئے مسلم لیگی امیدوار بڑی تعداد میں کامیاب کرائے اور بنگال کے بعد سندھ واحد صوبہ تھا جہاں مسلم لیگ کی حکومت قائم ہوئی۔

انتخابی مہم سے فارغ ہو کر ہم کراچی گئے اور سندھ مسلم کالج کے ہال میں ٹھہرے۔ وہاں سے ریل گاڑی پر لاہور آئے اور مسلم لیگ کے صوبائی دفتر میں اپنی خدمات پیش کر دیں۔ انہوں نے ہمیں مکتیسر، فیروز پور کے حلقے میں بھیج دیا۔ یہ نواب افتخار حسین ممدوٹ کا حلقہ تھا۔ وہاں بھی ہم نے قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں جا کر کام کیا۔ اس حلقے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ یونینسٹ حکومت کی مخالفت کے باعث نواب ممدوٹ کو اپنی انتخابی مہم چلانے کے لیے پنجاب سے بسیں نہیں ملی تھیں اور انہیں جموں و کشمیر سے بسیں منگوانی پڑیں تھیں۔ نواب ممدوٹ یہ انتخاب جیت گئے اور پھر قیام پاکستان پر پنجاب کے پہلے وزیراعلیٰ بنے۔

قائداعظم کی آواز دوسری بار میں نے بھوانی میں سنی جب وہ 3 جون 47ء کو آل ریڈیو پر قیام پاکستان کا اعلان کر رہے تھے۔ ان کی آواز کیا تھی، بجلی کی کڑک تھی۔ انہوں نے اپنی ریڈیائی تقریر کے آخر میں ''پاکستان زندہ باد!'' کا نعرہ لگا کر مسلمانان برصغیر کو عزم و یقین کی نئی لذت سے سرشار کر دیا۔

(روایت: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی)

☆☆☆

1947ء کی گرمیوں تک ریاست کپورتھلہ میں کامل امن و امان تھا۔ پاکستان بننے کا اعلان ہو چکا تھا۔ ریاست کپورتھلہ میں 64 فیصد آبادی مسلمانوں کی تھی، اس لیے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہمیں اپنی جنم بھومی چھوڑ کر پاکستان کی طرف ہجرت کرنی پڑے گی۔ مہاراجہ جگت جیت سنگھ ان دنوں گرمیاں گزارنے یورپ گیا ہوا تھا اور پیچھے ولی عہد ٹکا صاحب مختار مطلق تھا۔ ٹکا صاحب مسلمانوں سے بڑا عناد رکھتا تھا۔

14 اگست 1947ء کو پاکستان وجود میں آ گیا تھا۔ اگست کے اواخر میں ریاست کپورتھلہ میں حالات خراب ہونے لگے۔ نواحی علاقوں میں مسلمانوں کا جو کشت و خون ہو رہا تھا، اس سے ریاست کے مسلمانوں میں خوف و دہشت کی لہر دوڑ گئی۔ سلطان پور کے ہندو بڑے منظّم تھے۔ انہوں نے مسلح تیاری کر رکھی تھی۔ مرزا شورش نامی ایک مسلمان بڑا دلیر جوان تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ اس کا بڑا یارانہ تھا۔ ہندوؤں نے اسے دھوکے سے اپنے ہاں بلا کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

تلونڈی کے مسلمان چودھری خاصے رسوخ والے تھے۔ چودھری فضل محمد بلدیہ سلطان پور کے صدر تھے اور چودھری فتح محمد منتظم انجمن عیدگاہ 25 اگست کو مولوی ظفر حسین مجسٹریٹ اور چودھری حسن محمد تحصیل دار سے ہندو، سکھ افسروں نے چارج لے لیا۔ بدلتی صورت حال میں چودھریوں نے رات کے وقت اپنے اہل و عیال دریائے بیاس کے پار پہنچا دیے اور گرد و نواح میں انخلا کا اعلان کرا دیا، چنانچہ لوگوں نے افراتفری میں ہجرت شروع کر دی۔ سلطان پور میں پیچھے رہ جانے والے خاصے مسلمان شہید کر دیے گئے۔

شروع میں ہمارے بعض رشتے دار تحصیل ترنتارن (ضلع امرتسر) سے اٹھ کر دریائے بیاس پار کر کے ہماری طرف چلے آئے تھے۔ ادھر

حالات بگڑنے لگے اور تلونڈی کے چودھریوں کا اعلان سنا تو 26 اگست کو ہمارے گاؤں الاٹ والا کے باسی افراتفری میں خالی ہاتھ اٹھے اور گلزاری باغ کے راستے باجہ پہنچ گئے جہاں مولوی عبدالقادر مشہور عالم دین رہتے تھے۔ باجے کے مغرب میں صفدر پور کا گاؤں ڈیڑھ دو سال پہلے دریا برد ہو چکا تھا جہاں سے ہمارے پھوپھا امیر الدین کا گھرانہ گلزاری باغ چلا آیا تھا۔ ان بستیوں کے لوگ بھی قافلے میں شامل ہوتے گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ باجے سے دریا پار کر کے امرتسر کی طرف نکل جائیں گے جہاں سے پاکستان پہنچنا آسان ہوگا۔ لیکن ادھر حالات بہت مخدوش ہو چکے تھے' اس لیے ہمارے قافلے کو شمال کا رخ کرنا پڑا۔ قافلہ نواحینگا اور رتڑے سے ہوتا ہوا سات آٹھ میل آگے گڈانہ پہنچا جو جی ٹی روڈ پر ایک اہم قصبہ تھا۔ کیہر سنگھ تھانیدار اور دس بارہ سپاہی رتڑے سے قافلے کے ساتھ آئے تھے۔ تھانیدار نے قافلے کی حفاظت کے نام پر لوگوں سے بیس روپے فی کنبہ وصول کیے تھے اور اچھی خاصی رقم بنالی تھی۔ راستے میں قافلہ سکھوں کے دیہات سے گزرا۔ کھکھرین کا سکھ نمبردار کرپان لیے کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں غضب نمایاں تھی۔ ادھر کانجلی سے آنے والا قافلہ بھی گڈانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سکھ بلوائی ان دونوں قافلوں کو لوٹنا چاہتے تھے اور اس لیے انہوں نے کیہر سنگھ سے سازباز کر لی تھی' چنانچہ اس کے ساتھ آئے ہوئے ہندو سکھ سپاہی رات کے وقت کھسک گئے۔ تھانیدار نے مسلمانوں سے ہر قسم کے ہتھیار اور ڈنڈے تک پہلے ہی چھین لیے تھے اور یوں قافلے کو ہندو سکھ بلوائیوں کے لیے نرم چارہ بنا دیا۔

ہمارے قافلے میں موضع سوال کے کیپٹن چودھری نظام دین بھی شامل تھے جو ان دنوں فوج سے رخصت پر آئے ہوئے تھے۔ انہیں قافلے کے غیر محفوظ ہونے کا احساس تھا۔ اتفاق سے جی ٹی روڈ پر ایک فوجی جیپ نمودار ہوئی جس میں چار بلوچ مسلمان فوجی سوار تھے۔ وہ جالندھر کیمپ سے مسلمان مہاجروں کو لینے جا رہے تھے۔ کیپٹن نظام دین نے جیپ روک کر ان سے کہا کہ یہاں کم و بیش تین لاکھ مسلمان نہتے اور غیر محفوظ پڑے ہیں' ان کی حفاظت کا فوری انتظام کیا جائے کیونکہ آج رات بلوائیوں کے حملے کا خطرہ ہے۔ پاک فوج کے افسر نے اپنے تین ساتھی وہاں چھوڑے' مزید فوجی بھیجنے کا وعدہ کیا اور پھر جیپ جالندھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

وہاں سڑک اور ریلوے لائن متوازی گزرتی تھیں۔ دونوں کے درمیان نشیب تھا جس پر پلیاں بنا کر لائن گزاری گئی تھی۔ نشیب میں ایک چبوترہ سا تھا۔ اس پر بلوچ فوجیوں نے رات پڑنے تک مٹی اور پتھر کا ایک مورچہ بنا لیا تھا تاکہ مغربی' جنوبی اور شمالی جانب سے قافلے کی حفاظت کر سکیں۔ کیہر سنگھ کے سپاہی جنوب کی طرف گئے تھے اور ادھر ہی سے حملے کا خطرہ تھا۔

ستمبر کی 2 یا 3 تاریخ تھی۔ فجر کے وقت کیہر سنگھ کے سپاہی ہندو سکھوں کا ایک جتھا لے کر آ گئے۔ گھوڑی پر سوار کیہر سنگھ بھی ان کے ہمراہ تھا۔ بلوچ فوجیوں نے اسے بلا کر وارننگ دی کہ بلوائیوں سے کہو واپس چلے جائیں' مگر اس نے جواب دیا کہ جتھے والے میرا کہنا نہیں مانتے۔ یہ سن کر پاک فوج کے ان جیالوں نے آناً فاناً برین گن کا فائر کھول دیا۔ کیہر سنگھ سمیت آٹھ نو سکھ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ باقی بھاگ نکلے۔ کیہر سنگھ کی گھوڑی بھی ماری گئی۔ بدبخت تھانیدار کی جیب سے 2300 روپے برآمد ہوئے جو اس نے عیاری سے بے کس مسلمانوں سے ہتھیا لیے تھے۔ ہمارے فوجیوں نے یہ رقم غریبوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی۔ ہندو سکھ مقتولین کی لاشیں اٹھانے کوئی نہ آیا اور نہیں گیدڑ اور جنگلی جانور کھاتے رہے۔

فوجیوں کی فائرنگ سے جو بلوائی بھاگ نکلے تھے انہوں نے پلٹ کر کانجلی سے آنے والے قافلے پر کپورتھلہ نہر کے نزدیک حملہ کر دیا۔ اس قافلے میں کم وبیش ایک لاکھ مسلمان مہاجر تھے جو سلطان پور اور کپورتھلہ کے مشرقی دیہات سے اٹھ کر آئے تھے۔ مسلح ہندوؤں سکھوں نے نہتے مسلمانوں کے اس قافلے کو گھیر کر اس قدر قتل وغارت کی کہ ان میں سے گنتی کے چند خوش قسمت بچ نکلے ہوں گے۔

اس دوران جالندھر سے مزید بلوچ فوجی گڈانہ آ گئے اور وہ سات آٹھ دن وہیں قافلے کی حفاظت کرتے رہے جو دس پندرہ میل تک پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے اجازت دے دی کہ اردگرد کے دیہات (رتڑے وغیرہ) سے جانور‘ اناج اور ایندھن لاؤ اور کھاؤ پیو۔ ہمارے آدمی بھی کچھ گندم‘ مسور اور ایک چکی اٹھا لائے۔ اس طرح بھوکے مہاجروں کے لیے پیٹ کی آگ بجھانے کا بندوبست ہو گیا۔ ہمارے چچا خوشی محمد بیان کرتے ہیں: ’’میں نے ایک خالی گھر میں داخل ہو کر چادر میں کچھ گندم سمیٹی ہی تھی کہ کرپان سے مسلح ایک سکھ آ ٹپکا۔ ہم چند لمحے ایک دوسرے کو گھورتے رہے‘ پھر وہ بولا شوق سے گندم لے جاؤ اور ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ بظاہر وہ نیک دل آدمی لگتا تھا‘ مگر ان دنوں ہندوؤں اور سکھوں پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا‘ اس لیے میں نے کہا کہ اگر تمہاری نیت میں خرابی نہیں تو الٹے قدموں لوٹ جاؤ تاکہ مجھے یقین آ جائے۔ وہ گلی میں خاصی دور چلا گیا تو میں گندم اٹھا کر کیمپ میں چلا آیا۔‘‘

ایک ہفتہ بعد ہندو ڈوگرہ فوجی آ گئے اور پاک فوج کے بلوچ جیالے گڈانہ کیمپ کی نگرانی انہیں سونپ کر کہیں اور ڈیوٹی دینے چلے گئے۔ ہندو ڈوگرہ فوجی اپنی جیپوں میں قافلے کے دونوں طرف سختی سے گشت کرتے اور کسی کو ادھر ادھر نہ ہونے دیتے۔ ان کی نگرانی میں ہمارے قافلے نے دریائے بیاس کا پل وزیر پار کیا اور ضلع امرتسر میں داخل ہوئے۔ کھچلیاں سے ہو کر چوتھے دن ہم امرتسر کے نواح میں پہنچے۔ راستے میں دونوں طرف مسلمانوں کے گاؤں اجڑے ہوئے تھے۔ ہم سے پہلے گزرنے والے قافلے کے بدنصیب مردوں‘ عورتوں اور بچوں کی لاشیں جا بجا پڑی تھیں۔ جگہ جگہ مسلمانوں کے دیہات جل رہے تھے‘ تاہم ہندو سکھوں کے گاؤں آباد اور پر رونق تھے۔

منڈی مویشیاں‘ امرتسر کے میدان میں آ کر ہمارا قافلہ رک گیا۔ یہاں بھی ڈوگروں کا پہرہ تھا۔ اس کیمپ میں ہم آٹھ دن رہے جو بڑی تنگی ترشی سے گزرے۔ کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ حکومت کی طرف سے ملنے والا راشن مہاجر کیمپ کی ضروریات کے لیے انتہائی ناکافی تھا۔ یہاں مٹھی مٹھی بھر گندم ایک روپے میں خریدی گئی۔ جس روز قافلے کو آگے روانہ ہونا تھا‘ ڈوگروں کی جگہ بلوچ فوجی آ گئے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ آج رات جو کچھ میسر آئے‘ کھا پی لو کیونکہ آگے کہیں نہیں رکیں گے۔ ہمارے گھرانے میں اسی کے قریب افراد تھے۔ ہم نے چودہ روپے کا ایک بچھڑا خریدا اور اس کا گوشت ابال کر کھایا۔

صبح ہوئی تو قافلہ منڈی مویشیاں کیمپ سے اٹھا اور امرتسر کے مشرقی جانب سے نہر کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ ایک بس میں سوار لوگوں نے شہر کے بیچ میں سے گزرنا چاہا‘ مگر وہ بس تھوڑی دیر بعد لوٹ آئی۔ اس میں آدھے لوگ ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے اور باقی شدید زخمی تھے۔ ہم صبح پانچ بجے سے رات آٹھ بجے تک نہر کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ راستے میں نہر کے مغربی جانب ایک ڈیڑھ فرلانگ پر ایک ڈیرہ دکھائی دیا۔ پاک فوج کے سپاہیوں نے دور ہی سے بھانپ لیا کہ وہاں مسلح سکھ موجود ہیں۔ انہیں شرارت کا موقع دینے سے پہلے ہی ہمارے جیالوں

نے ڈیرے پر مشین گن سے فائرنگ کر دی۔ مسلح سکھ چیختے چلاتے بھاگ اٹھے۔ نہر کے ہر پل پر بھارتی فوجی اور ٹینک تعینات تھے مگر بلوچ رجمنٹ کے شیروں کی موجودگی میں کسی کو دست درازی کی جرأت نہ ہوئی۔

عشاء کے وقت ایک پل آیا اور اسے پار کر کے ہمارا قافلہ پاکستان میں داخل ہو گیا۔ پاک سرزمین پر آ کر خوشی کے آنسو بہہ نکلے اور سب نے سجدہ شکر ادا کیا۔ آدھ میل آگے آ کر میدان میں پڑاؤ کیا۔ صبح ہوئی تو ہڈیارہ پہنچے اور پھر دوسرے دن صدر بازار لاہور آ گئے۔

ہمارا قافلہ پیدل پاکستان آیا تھا کیونکہ ریل گاڑیاں صرف جالندھر کے آگے سے مسلمانوں کو لا رہی تھیں۔ اس قافلے میں جن لوگوں کے پاس بیل گاڑیاں تھیں' انہوں نے ہم سے دس دن پہلے کوچ کیا تھا۔ بیل گاڑیوں کا یہ قافلہ امرتسر شہر میں سے تو فوج کی نگرانی میں گزر آیا' مگر واہگہ سے کچھ پیچھے ہندوؤں سکھوں کے ایک جتھے نے اس پر حملہ کر دیا۔ لاٹ والا کے چودھری رکن دین کے گھرانے کے دلیر جوانوں نے حملہ آوروں کا جی توڑ کر مقابلہ کیا۔ اس مقابلے میں ان گنت افراد شہید ہوئے۔ پانچ چھ میل تک ہندو سکھ بلوائی حملہ آور ہوتے رہے۔ دلاں والا سے ہمارے پھوپھا چودھری فتح محمد کا گھرانا بھی اس قافلے میں شریک تھا۔ اللہ کے فضل سے ان کا کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔

کپورتھلہ کے نزدیک شیخوپورہ نامی قصبے پر ہندوؤں سکھوں کا جتھا حملہ آور ہوا تھا۔ انہوں نے قصبے کی ساری مسلمان آبادی کو اکٹھا کر کے گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا۔ ہزاروں مسلمان تہہ تیغ کر دیے گئے۔ اس قصبے کے چودھری شاہ محمد کو ظالم ہندو سکھ کرپانوں سے ڈراتے رہے کہ ہندو ہو جاؤ تو بچ جاؤ گے۔ شاہ محمد نے اپنا دین چھوڑنے سے انکار کیا تو اسے وحشیانہ طور پر شہید کر دیا گیا۔

کپورتھلہ اور جالندھر کے راستے میں مسلمان مہاجروں کی ایک ریل گاڑی نو دن تک رکی رہی۔ بلوائیوں نے اس کے آگے بم رکھ دیا تھا اور گاڑی کے رکتے ہی قتل و غارت شروع کر دی تھی۔ جان بچا کر بھاگنے والوں میں بے شمار لوگ شہید ہوئے۔ میری پھوپھی زاد بہن کے شوہر عبدالغنی اور ان کے والد گاڑی سے نکل بھاگے تھے اور انہوں نے کھیتوں میں چھپ کر اپنی جان بچائی تھی۔ اسی طرح ترنتارن امرتسر روڈ پر نورنگ آباد کے قریب مسلمانوں کا بے تحاشا خون بہایا گیا اور تین میل تک بے گور و کفن لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

(روایت: چودھری عبدالرشید ریٹائرڈ ٹیچر)

☆☆☆

یہ ساٹھ برس پرانی بات ہے جب میں نے مسلم لیگ کی رکنیت حاصل کی۔ میں نوجوان تھا' ایم ایس ایف کے اجلاسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتا۔ 1947ء میں جالندھر میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں شرکت کے لیے قائداعظم محمد علی جناح آئے۔ ان کے لیے ہم نے چار سفید گھوڑوں کی بگھی تیار کی تھی۔ قائداعظم کے ساتھ ان کی بہن محترمہ فاطمہ جناح بھی تھیں۔ میں بطور سکاؤٹ ان کے ساتھ اور قائداعظم کا ہماری طرف دیکھنا ہی ہمارے لیے بڑا اعزاز تھا۔

میرے بڑے بھائی دہلی میں تھے۔ مسلم لیگ میں کام کرنے کا جذبہ مجھے دہلی لے گیا۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ میں قائداعظم کا پیغام دہلی کے گردونواح کی بستیوں میں پہنچاتا۔ ہم لوگوں کو بتاتے تھے کہ پاکستان مسلمانوں کی ریاست ہو گا اور وہاں مسلمان آزادانہ طور پر اسلامی

تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔ یہ 1946ء کی بات ہے۔ میں لیاقت علی خان کی رہائش گاہ گل رعنا میں پہرا دے رہا تھا۔ میرے پاس لاٹھی تھی۔ بیگم رعنا لیاقت علی خان باہر آئیں تو ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی جھجک کر اپنا منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ بیگم رعنا لیاقت علی خان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''تمہارا تعلق پنجاب سے ہے؟'' میں نے کہا ہاں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے دفتر لے گئیں۔ انہوں نے مجھے دیوار پر لگا ایک نقشہ دکھایا اور بولیں یہ پاکستان کا نقشہ ہے۔ انہوں نے مختلف علاقوں کے بارے میں بتایا کہ یہ سب پاکستان میں شامل ہوں گے اور کہا کہ تم پاکستان کا نقشہ اچھی طرح سمجھ لو تا کہ اگر کوئی پوچھے تو اسے صحیح صحیح بتا سکو۔ اس وقت میرے ذہن میں تھا کہ جالندھر اور امرتسر پاکستان میں شامل ہوں گے۔

1946-47ء میں پنجاب میں خضر حیات کی یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی۔ مسلم لیگ نے جالندھر میں خضر حیات کے خلاف کئی جلوس نکالے۔ ان میں سے کئی جلوسوں کی قیادت شیخ الیاس، قاضی محبوب اور مولانا شریف جالندھری کے ساتھ میں نے بھی کی اور لاٹھیاں کھائیں اور دفعہ 144 کی خلاف ورزی کے جرم میں گرفتار بھی ہوا۔ جب خضر حیات حکومت نے دہلی کے روزنامہ ''جنگ'' کے پنجاب میں داخلے پر پابندی لگائی تو شیخ یامین نے مجھے ذمہ داری سونپی کہ ''جنگ'' پنجاب کے شہروں لاہور، جالندھر اور لدھیانہ میں پھیلایا جائے کیونکہ یہ اخبار قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ تھا۔ میں اخبار کا بنڈل دری میں چھپا کر بمبئی ایکسپریس کے ذریعے لاتا اور جالندھر میں شمس الحق کو دیتا اور اسی دن واپس دہلی چلا جاتا۔

قیام پاکستان کے بعد میں نے جالندھر چھاؤنی کے نزدیک ''گڑھا'' کیمپ میں مہاجرین کی خدمت کی۔ مشرقی پنجاب سے لاہور آتے ہوئے میرے تیس کے لگ بھگ عزیز و اقارب ستلج کے سیلاب میں بہہ گئے۔ صرف ایک خاتون اپنی جان بچا سکیں۔ لاہور آنے کے بعد میں چھاؤنی میں اپنے بھائی کے گھر ٹھہرا، پھر تاج سالار کرنل دارا نے مجھے والٹن کیمپ میں ذمے داری سونپ دی اور میں دن رات لٹے پٹے قافلوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت لوگوں میں عجیب جذبہ تھا۔ اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی ان کی پیشانی پر بل نہ آتے تھے۔

(تحریر: محمود الحسن اختر جالندھری)

☆☆☆

میں نے پنجاب یونیورسٹی سے 1942ء میں ایم اے اکنامکس کی ڈگری حاصل کی اور تحریک پاکستان میں کردار ادا کرنے کے لیے قلم کا ذریعہ اپنایا اور اپنی تحریروں اور مضامین کے ذریعے مسلمانوں کا علیحدہ تشخص ابھارنا شروع کیا۔ 1939ء میں مجلس کبیر پاکستان بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور اس کا بانی ممبر بنا۔ مجلس کبیر پاکستان کی شاخیں تمام ہندوستان میں پھیلائیں۔ بعد ازاں 1942ء میں قائداعظم کے حکم پر مجلس کبیر توڑ دی اور میں مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔ 1941ء میں اورینٹ پریس آف انڈیا میں چیف رپورٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ اس مسلم نیوز ایجنسی کے قیام سے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے میں مدد ملی بلکہ مسلمان صحافیوں کی ایک نئی کھیپ بھی میسر آئی۔

قائداعظم کرشماتی اور عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اس صدی کے قابل ترین رہنما تھے۔ قائداعظم کے بارے میں ہندوؤں نے مشہور کر رکھا تھا کہ آپ بہت کم گو اور مغرور ہیں، کسی سے ملنا اور بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ وہ کوئٹہ سے کراچی ٹرین کے ذریعے آ رہے

تھے۔ میں اور قائداعظم کے سیکرٹری سید احمد بھی ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ایک جگہ گاڑی رکی۔ قائداعظم اتر کر ہمارے پاس آئے اور پوچھا کہ آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتائیں۔ میں ان کی شخصیت کا یہ پہلو دیکھ کر بہت حیران ہوا۔

اسی اثناء میں ایک ہندو سوامی وہاں آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ یہ دبلے پتلے صاحب کون ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ برصغیر کے مسلمانوں کے رہنما قائداعظم محمد علی جناح ہیں۔ وہ گھبرا گیا اور کہنے لگا: ”یہ جناح صاحب ہیں۔“ میں نے کہا آؤ میں تمہیں ان سے ملاتا ہوں۔ وہ ہچکچایا۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر قائداعظم کے پاس لے گیا۔ اس وقت وہ گاڑی کے دروازے میں کھڑے تھے۔ انہوں نے نیچے اتر کر اس ہندو سوامی سے ہاتھ ملایا اور اس کی خیریت دریافت کی۔ بعد میں سوامی مجھ سے کہنے لگا: ”جناح تو بہت اچھے انسان ہیں۔ ہم نے تو سنا تھا کہ وہ بہت مغرور ہیں اور کسی سے ملنا پسند نہیں کرتے۔“

ہندو قوم کی فطرت میں تعصب رچا بسا ہے۔ وہ سطحی سوچ رکھنے والی قوم ہے۔ اس نے پاکستان کو اول دن سے کبھی قبول ہی نہیں کیا۔ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ اگر مسلمان اور سانپ اکٹھے جا رہے ہوں تو پہلے مسلمان کو مارو۔ پاکستان معرض وجود میں آنے سے پہلے جب مجھے اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی کے لیے سندھ جانا پڑا تو میں وہاں اکیلا مسلمان صحافی تھا۔ ہندو صحافی مجھ سے خار کھاتے اور مختلف حیلوں بہانوں سے مجھے تنگ کرتے تھے لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ میں باپ کی طرف سے رام چندر اور ماں کی طرف سے کرشن کی اولاد ہوں تو وہ میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔

1947ء میں جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو اس وقت مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں مسلمان مہاجرین پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے مگر اس طرف صورت حال مختلف تھی۔ کراچی میں ہندو عورتیں ہمارے دفتر کو محفوظ سمجھتے ہوئے پناہ لینے کے لیے آ گئیں۔ جب تک پولیس نے آ کر انہیں حفاظت سے محفوظ مقام تک نہیں پہنچا دیا‘ میں نے انہیں اپنے دفتر میں پناہ دیے رکھی۔ میرا نوکر ایک ہندو گھر سے سامان اٹھا لایا‘ میں نے وہ واپس کروا دیا۔

(تحریر: احمد بشیر سابق ڈائریکٹر جنرل اے پی پی‘ رکن تحریک پاکستان ورکرز ٹرسٹ)

(تحریر و ترتیب: محسن فاروقی۔ اردو ڈائجسٹ اگست 1997ء)

ہیرے کے آنسو

ہیرے کے آنسو ایک نوجوان کی کہانی ہے، جس کے ساتھ اس کے اپنوں نے ہی ظلم کیا تھا۔ ایک دن اچانک اس کی زندگی میں ایک موڑ آ گیا۔ ایک شخص نے اس کے والد کی کوئلے کی کانوں کو قیمتی قرار دیتے ہوئے ثبوت بھی فراہم کر دیا کہ وہاں ہیرے موجود ہیں۔ جھوٹ فریب لالچ اور دھوکہ دہی کے تانے بانے سے بُنی جرم و سزا کے موضوع پر ایک دلچسپ کہانی۔ اثر نعمانی کے تخلیق کردہ سراغرساں ندیم اختر کا کارنامہ۔ ہیرے کے آنسو کتاب گھر کے جاسوسی ناول سیکشن میں پڑھی جا سکتی ہیں۔

بچوں کا کردار تحریک پاکستان میں

تقسیم ہند سے پہلے راقم الحروف کا گھرانہ مشرقی پنجاب کے ایک چھوٹے سے مگر متمول اور تہذیبی لحاظ سے قابل ذکر شہر لدھیانہ میں آباد تھا۔ ہمارے آباؤ اجداد ہندوستان کی تحریک آزادی (غدر دہلی) سے کوئی دو عشرے سے بسلسلہ ملازمت لدھیانہ میں آباد ہوئے جو اس وقت دریائے ستلج کے کنارے سکھ سٹیٹ کے ساتھ ایک سرحدی شہر تھا۔ لدھیانہ شہر کی آبادی میں مسلمان بھی خاصی تعداد میں تھے۔ ان میں محنت کش اور دست کار بے شمار تھے۔ انگریزوں نے افغانستان کے معزول بادشاہ شاہ شجاع کو بھی لدھیانہ میں آباد کیا۔ ان کی اولاد اپنی تہذیبی روایات کے ساتھ لدھیانہ میں آباد تھی۔ مجھے شروع میں لدھیانہ میں مشن اسکول کے ساتھ کنڈر گارٹن سکول میں داخل کرایا گیا' لیکن چند ماہ بعد اس مدرسے سے اٹھا لیا گیا کہ بچہ عیسائی نہ ہو جائے۔ چونکہ اسکول میں نیکر پہننا ضروری تھا۔ ویسے اسکول کا معیار آج کل کے انگریزی ذریعہ تعلیم کے سکولوں سے یقیناً بہتر تھا۔ ہندو اور مسلمان لوگوں کا آپس میں میل جول بہت کم تھا۔

مسلم لیگ کی تحریک کا پہلی بار کچھ ادراک اس وقت ہوا جب ایک دن ہمارے تایا بشیر ممتاز مرحوم ایک جلوس میں سر پر لاٹھی کھا کر زخمی حالت میں گھر آئے پلنگ صحن میں بچھا کر لحاف اوڑھا دیا گیا۔ تمام گھر ارد گرد جمع تھا۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ کچھ دن بعد وہ ٹھیک ہو گئے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی کوئی خاص تحریک جاری ہے۔ اور اس میں لڑائی بھی ہو سکتی ہے۔ مسلم لیگ کا جھنڈا جو تایا مضروب ہونے کے باوجود اٹھائے ہوئے تھے دیر تک ہمارے گھر میں رہا اور میں نے پہلی بار اسے دیکھا۔

ہمارے والد صاحب بسلسلہ ملازمت ضلع فیروز پور کے مختلف قصبات میں تعینات رہے۔ یہ علاقہ سکھوں کا گڑھ تھا۔ ہندو مہاجن علاقہ کی منڈیوں پر قابض تھے اور اجناس کی تمام خرید و فروخت اور آڑھت وہ کرتے تھے۔ مجھے مختلف اسکولوں میں ہندو اور سکھ لڑکوں کے ساتھ پڑھنا پڑا۔ مسلمان کلاس میں دو چار سے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔

1945-46ء میں جب تحریک پاکستان زوروں پر تھی ہم موگا میں مقیم تھے جو فیروز پور کی تحصیل تھی' آج کل ضلع بن چکا ہے۔ شہر میں ہندو غالب اکثریت میں تھے۔ ارد گرد کے دیہات سکھوں کے تھے۔ شہر میں ایک مشہور شخصیت ڈاکٹر متھرا داس ہو گزری تھی۔ متھرا داس کا اسپتال آنکھوں کے علاج کے لیے پنجاب بھر میں مشہور تھا۔ اس کے علاوہ متھرا داس کالج اور متھرا داس اینگلو سنسکرت اسکول بھی تھے۔ مجھے متھرا داس اسکول میں پانچویں جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ اسکول پڑھائی کے لحاظ سے بہت اچھا تھا۔ اساتذہ بھی اس معاملے میں سخت گیر تھے۔ ان میں تمام کے تمام ہندو تھے یا ایک آدھ سکھ۔

تحریک پاکستان کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہندو استاد متعصب ہوتے گئے۔ اسکول کے تختہ سیاہ پر صبح کے وقت اخبارات سے خبروں کی شہ سرخیاں لکھی جاتی تھیں۔ ایک دن صبح ''سندھ میں پاکستان کا جنازہ نکلنے لگا'' (نعوذ باللہ) کی خبر لگائی گئی۔ ہندو لڑکے بہت خوش تھے۔ ہم کلاس میں پانچ مسلمان لڑکے تھے۔ کوئی پچاس ہندو۔ دو چار سکھ بھی تھے۔ ہندو لڑکوں نے صبح حاضری کے وقت کلاس میں یس سر کے بجائے جے ہند کہنا شروع کر دیا۔ یہ کہتے وقت وہ بہت اچھلتے تھے۔ ہم نے اس کا توڑ کرنے کے لیے حاضری میں پاکستان زندہ باد اور جے پاکستان کہنا شروع کر دیا۔ ہندو ماسٹر سیخ پا ہو کر ہمیں صبح ہی بنچ پر کھڑا کر دیتے اور تمام دن کھڑا رکھتے حالانکہ کلاس میں میرا دوست اقبال حسین ہمیشہ اول اور میں دوم آتے تھے۔ اقبال حسین کی لکھائی نگینے کی طرح تھی۔ وہ اتنا لائق تھا کہ 1951ء میں پاکستان میں جب میں نے میٹرک کا امتحان دیا تو یہ نہ جانتے ہوئے کہ اقبال حسین کہاں ہے میں نے رزلٹ کی صبح کو اخبار دیکھے بغیر کہا کہ اقبال حسین اول آیا ہوگا اور وہی ہوا۔ وہ پنجاب بھر میں اول تھا۔ اقبال حسین بعد میں پولیس سروس میں چلے گئے اور آج کل شاید (انٹرپول) میں ہیں۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ لیاقت اور قابلیت کے باوجود ہمیں دن بھر کھڑا رکھا جاتا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ قابلیت صرف ہندوؤں کی میراث نہیں تھی۔

ایک ہندو استاد بکرم پرشاد تھے۔ کٹر مہا سبھائی۔ دھوتی کو ٹانگوں کے درمیان میں سے پیچھے لے جا کر کمر میں اڑس لیتے۔ پستہ قد' سیاہ فام' چہرے پر درشتی۔ ہماری حساب کی کلاس لیتے' لیکن صبح کو دھرم سکشا یعنی دینیات کی کلاس لیتے۔ کلاس کیا تھی۔ مسلمانوں کے خلاف خوب زہر گلتے۔ چونکہ اس کا امتحان بھی ہوتا۔ میں نے بھی دو منتر یاد کر لیے جن کو سنا کر امتحان میں پاس ہوتا۔ ایک منتر کی اہمیت تو مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب میں نے راجیو گاندھی کی چتا کے گرد چکر لگاتے ہوئے ایک برہمن کو ٹی وی پر منتر پڑھتے ہوئے سنا۔ ایک دن ماسٹر بکرم پرشاد نے فرمایا کہ ہندو ایک بہت بڑا شیر ہے۔ یہ ذرا سا سو گیا ہے اس لیے یہ چوہے جن میں مسلمان خاص طور پر شامل ہے اس پر چڑھ کر شرارتیں کرتے ہیں۔ ایک دن یہ شیر اٹھے گا۔ دہاڑے گا۔ اور یہ سب چوہے اپنے بل میں جا گھسیں گے۔ ہندو لڑکے کھلکھلا کر ہنسے۔ میں نے یہ واقعہ شام کو اپنی والدہ کو سنایا۔ انہوں نے صبح ایک خط لکھ کر ہیڈ ماسٹر کو دینے کے لیے کہا۔ میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہو کر ڈرتے ڈرتے یہ خط ان کی میز پر رکھ آیا۔ اگلی صبح اسمبلی میں جب لڑکے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' گا چکے تو ہیڈ ماسٹر نے کہا یہ انیس احمد کون ہے۔ آگے بڑھا تو نہایت درشت لہجے میں تمام سکول کے لڑکوں کے سامنے مجھے سخت سست کہا۔ اور پھر بولے اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو عرب چلے جاؤ۔ تفریح کے وقت قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود پانچ دس مسلمان لڑکے تمام ہندو لڑکوں سے بدلہ لیتے اور دو چار کو خوب پٹخنیاں دیتے۔ میں خاموش تماشائی رہتا چونکہ جسمانی طور پر کمزور تھا' لیکن مشورے اکثر میرے ہوتے۔

ایک ہندو لڑکا سنتوش کمار میرا دوست تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ سب مسلمان لڑکوں کا بھی دوست تھا۔ ایک دن مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کی ماں اور کئی دوسری خواتین گھر کے آگے چبوترہ پر چرخہ لیے بیٹھی تھیں۔ سنتوش میرے لیے پانی لینے اندر گیا۔ اس دوران اس کی ماں نے میرا نام پوچھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں مسلمان ہوں تو پانی اندر بھیج دیا گیا۔ اور مجھے جلدی سے واپس بھیج دیا گیا۔ بچہ تھا۔ میرے دل پر کوئی اثر نہ ہوا کہ کیا گزری ہے۔

روزانہ شام کو بچے پاکستان کے حق میں جلوس نکالتے اور ہندوؤں کے محلے کے قریب پاکستان کا نام گونجتا رہا۔ 11 مئی کو ہندوؤں نے اینٹی

پاکستان ڈے منایا۔ ایک بڑا جلوس ہمارے گھر کے سامنے سے گزرا۔ ہندو اچھل اچھل کر نعرے لگا رہے تھے۔ ''نئیں بنن دینا۔ پاکستان'' ہمارے محلے سے گزرتے ہوئے جہاں آبادی زیادہ تر مسلمان تھی جلوس کے پرجوش لیڈر بھی کچھ خاموش ہو گئے۔ ایک نے کہا: ''ساتھیو! ہتھ نال ہتھ پھڑ لو۔ خطرناک ایریا آ گیا۔'' اس بزدلی سے مسلمان بہت خوش ہوئے۔

جلوس کی نعری بازی سے متاثر ہو کر میں نے شام کو اپنے والد سے پوچھا۔ کیا پاکستان بن جائے گا۔ وہ یقین سے بولے کیوں نہیں بنے گا۔ اور بنتا بھی کیوں نہ۔ وہ تو اس وقت ضروری ہو گیا تھا جب ریلوے اسٹیشن پر ہندو پانی اور مسلمان پانی کی تخصیص ہوئی۔ ہندو اور مسلمان کبھی ایک قوم نہ تھی۔ اگر ہوتی تو سنتوش کمار کے گھر میں میرے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا۔

(ڈاکٹر انیس احمد' اردو ڈائجسٹ اگست 1997ء)

قلمکار کلب پاکستان

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ مختلف موضوعات پر لکھ سکتے ہیں؟
☆ آپ اپنی تحریریں ہمیں روانہ کریں، ہم ان کی نوک پلک سنوار دیں گے۔
آپ شاعری کرتے ہیں یا مضمون و کہانیاں لکھتے ہیں؟
☆ ہم انہیں مختلف رسائل و جرائد میں شائع کرنے کا اہتمام کریں گے۔
آپ اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کرانے کے خواہشمند ہیں؟
☆ ہم آپ کی تحریروں کو دیدہ زیب و دلکش انداز میں کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔
آپ اپنی کتابوں کی مناسب تشہیر کے خواہشمند ہیں؟
☆ ہم آپ کی کتابوں کی تشہیر مختلف جرائد و رسائل میں تبصروں اور تذکروں میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔
اگر آپ اپنی تحریروں کے لیے مختلف اخبارات و رسائل تک رسائی چاہتے ہیں؟
تو...... ہم آپ کی صلاحیتوں کو مزید نکھارنے کے مواقع دینا چاہتے ہیں۔
مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔
ڈاکٹر صابر علی ہاشمی
قلمکار کلب پاکستان
0333 222 1689
qalamkar_club@yahoo.com

معصوم خون

کفرزارِ ہند میں گرفتار بلا ایک ''پاکستان'' خاتون کی زہرہ گداز سرگزشت

28 اگست 1973ء کو جب میں انوپ گڑھ سے فرار ہوا تو بوجوہ چند میل دور جا کر دو سکھ کسانوں نے مجھے دوبارہ پکڑ لیا۔ سرجیت سنگھ اور مہندر سنگھ نامی یہ دونوں سکھ کہہ رہے تھے کہ اگلے روز تمہیں دوبارہ انوپ گڑھ پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ وہیں ایک باوقار سکھ خاتون سے ملاقات ہوئی جسے میں نے بتایا کہ میں پاکستانی ہوں اور چھوٹی موٹی اسمگلنگ کرتا ہوں۔ مجھے ایک کمرے میں بند کر کے دونوں سکھ کہیں باہر چلے گئے۔

میں خاصی دیر زمین پر لیٹا اپنی سعی کی ناکامی پر افسوس کرتا اور سوچتا رہا کہ تقدیر میں لکھی ہوئی سیاہیاں تدبیر سے نہیں ڈھل سکتیں۔ کچھ دیر بعد اٹھ کر بیٹھ گیا اور گھسٹ کر کھڑکی کے سامنے جا بیٹھا اور بے مقصد ہی باہر دیکھتا رہا۔ اس دوران ان دونوں افراد کی صورت دوبارہ نظر نہ آئی۔ صحن میں درختوں کے سائے طویل ہونے لگے تھے۔ اس وقت وہ مہربان عورت کھڑکی کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور تھوڑی دیر مجھے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اس کے آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے جنہیں اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کیا اور پھر ٹھہری ہوئی آواز میں گویا ہوئی: ''بیٹا! تم یہ اسمگلنگ کا گندا دھندا کیوں کرتے ہو؟ کیا تم نے پاکستان انہی غلیظ کاموں کے لیے حاصل کیا تھا؟'' اس کے لہجے میں عجیب سی کاٹ تھی جسے محسوس کر کے میں بری طرح چونک اٹھا۔ میں جاننے کے باوجود اسے نہ بتا سکا کہ اے مہربان ہستی! میں ہرگز اسمگلر نہیں ہوں بلکہ......

اب اس کی آواز میں غصے کا عنصر نمایاں تھا جواب دو۔ کیا ہم نے لاکھوں جانوں کا نذرانہ اس لیے پیش کیا تھا کہ تم لوگ اپنی چند دنیاوی آسائشیں حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی گھٹیا حرکتوں پر اتر آؤ؟'' اس کی اس بات نے مجھے پوری طرح ہلا کر رکھ دیا کیونکہ اس نے لفظ ''ہم'' استعمال کر کے اپنی شخصیت کو انتہائی پراسرار بنا لیا تھا۔

اپنی حالت زار بھول کر اب میری خواہش تھی کہ اس کی شخصیت کو پوشیدہ گتھیاں کسی طرح معلوم ہو سکیں۔ میں نے جواب دیا: ''ماں جی! میں تسلیم کرتا ہوں کہ اسمگلنگ کے دھندے میں پڑ کر میں نے کوئی مستحسن کام نہیں کیا' لیکن آپ کے لہجے میں میرے لیے جو حد درجہ اپنایت ہے اسے محسوس کر کے میں الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ آخر آپ کو مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں محسوس ہو رہی ہے؟''

یہ سن کر چند لمحوں کے لیے وہ خاموش رہی' پھر بولی۔ میں صرف انسانیت کے ناتے سے تمہیں سمجھا رہی ہوں ورنہ میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ'' اس دوران اس نے چارپائی کھینچ کر کھڑکی کے سامنے کر لی تھی اور اس پر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے چند ثانیئے توقف کے بعد اس سے پوچھا:

”ماں جی! آپ نے اپنی گفتگو کے دوران اردو کے بعض ٹھیٹھ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی باتوں میں جو خلوص اور پیار ہے وہ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں آپ سے پوچھنے کی جسارت کروں کہ آپ میں ایسی کون سی بات ہے جو مجھے آپ میں کسی ایک آدمی کی ماں کا چہرہ نظر نہیں آتا بلکہ آپ صرف ”ماں“ لگتی ہیں۔ آپ جیسی نفیس خاتون مندر سنگھ جیسے حیوان کے ساتھ کیسے زندگی بسر کر رہی ہیں۔“

کچھ دیر خاموشی کے بعد وہ اٹھی اور اس نے کہا: ”میں حویلی کا بڑا دروازہ بند کر آؤں تاکہ ان کے آنے کا پتہ چل سکے۔“ واپس آ کر وہ کچھ دیر بیٹھی سوچوں میں گم رہی پھر کہنے لگی: ”بیٹا! میں ان لوگوں میں سے نہیں جو زندگی کو گزارتے ہیں بلکہ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جن پر سے زندگی گزرتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اپنی بات کا سرا کہاں سے پکڑوں۔ یادوں کا ایک ہجوم ہے اور ہر یاد پوری عمر پر محیط ہے۔ میں مشرقی پنجاب کے ضلع سنگرور کے ایک چھوٹے سے گاؤں راج گڑھ میں پیدا ہوئی۔ اس گاؤں کی اکثریت ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھی۔ پندرہ بیس گھرانے مسلمان تھے۔ میرے والد گاؤں کے پرائمری اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور ساتھ ہی گاؤں کی ایک مسجد میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ 1947ء کی تقسیم ہند کے موقع پر میں سولہ سترہ سال کی ایک لاابالی سی لڑکی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی دس سال کا تھا۔ میں نے گھر ہی میں والد صاحب سے اردو اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہمارا چھوٹا سا گھرانہ ہر طرح سے مطمئن زندگی بسر کر رہا تھا۔ پورا گاؤں میرے والد صاحب کا احترام کرتا تھا‘ لیکن شاید یہ خوشیاں زیادہ دیر ہمارا مقدر نہ تھیں۔ قیام پاکستان کے اعلان کے فوراً بعد شمالی ہندوستان کے طول و عرض میں ہندو مسلم دنگے فساد پھوٹ پڑے۔ انسانی اور اخلاقی قدریں محض قصہ ماضی بن کر رہ گئیں۔ سالہا سال سے اکٹھے رہنے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ان حالات میں میرے والد نے گاؤں کے دوسرے لوگوں سے مشورے کے بعد پاکستان کی طرف ہجرت کا فیصلہ کیا‘ لیکن ہندوؤں اور سکھوں کو یہ بات بھی گوارا نہ تھی اور عین ہماری روانگی کے وقت آس پاس کے گاؤں سے مسلح جتھے وہاں پہنچ گئے اور چشم زدن میں تمام مردوں کو تہ تیغ کر دیا۔ نوجوان لڑکیوں کو ان کی ماؤں کے سامنے اجتماعی ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ آج بھی جب میں ان دلخراش منظر کو چشم تصور سے دیکھتی ہوں تو یقین نہیں آتا کہ ابن آدم ذلت کی ان گہرائیوں تک جا سکتا ہے۔ میرا معصوم بھائی باقی بچوں کی طرح ڈرا سا کھڑا تھا۔ جب اس نے چند حیوانوں کو میری طرف بڑھتے دیکھا جن پر میری منت سماجت کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا تو بھاگ کر میرے سامنے آ گیا اور مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔ تبھی ایک منحنی سے ہندو نے اپنی کلہاڑی کا زوردار وار اس معصوم کی گردن پر کیا جس سے اس کا سر تن سے جدا ہو کر دور جا پڑا۔ اس پر اس ظالم نے شیطانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تمہاری گردن اتنی کمزور ہے تو اپنی کلہاڑی تمہارے گندے خون سے بھرشٹ (ناپاک) نہ کرتا۔ اب مجھے اپنی کلہاڑی گنگا جل سے دھو کر پوتر کرنی پڑے گی۔“ یہ کہہ کر وہ بھی شیطانی کھیل میں شامل ہو گیا۔

یہ سب کچھ ہونے کے باوجود زمین پھٹی نہ آسمان ٹوٹ کر گرا۔ تمام بوڑھی عورتوں کو قتل کرنے کے بعد سب لڑکیوں کو وہ ایک حویلی میں لے گئے اور سب قطار بنا کر کھڑے ہو گئے اور باری باری اپنے ”اشرف المخلوقات“ ہونے کا ثبوت فراہم کرتے گئے۔ نئے آنے والے قطار کے آخر میں اپنی باری کے انتظار میں کھڑے ہو جاتے۔ اس عمل میں زندہ بچ جانے والی چند خوش نصیبوں یا بدنصیبوں میں‘ میں بھی شامل تھی۔ اس کے بعد میں ایک کے ہاتھوں سے دوسرے تک پہنچتی رہی۔ آخر سوہن سنگھ نے مجھے اپنے گھر ڈال لیا اور شادی بھی کر لی۔ وہ کانگڑہ کے گاؤں راسپورہ کا سرپنچ تھا

اور بہر حال ایک ہمدرد انسان ثابت ہوا۔ شادی کے سات سال بعد سوہن سنگھ سورگباش ہو گیا اور اس کے چھوٹے بھائی مہندر نے مجھ سے شادی کر لی۔ یہاں راجستھان میں بھی ہم نے زمین خریدی ہوئی ہے‘ اس لیے میں یہاں کچھ عرصہ مہندر کے پاس رہتی ہوں اور پھر کانگڑہ میں اپنے بچوں کے پاس چلی جاتی ہوں۔ سرجیت سنگھ یہاں والی زمین میں مہندر کا حصے دار ہے۔‘‘

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو کر اپنی آنکھوں میں آئی ہوئی نمی اپنی انگلیوں سے صاف کرنے لگی۔ میں گنگ سا بیٹھا اس کے پر عصمت چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ ایک سوال جو میرے ذہن میں خاصی دیر سے کلبلا رہا تھا‘ زبان پر آ ہی گیا: ’’ملکی حالات نارمل ہونے کے بعد آپ پاکستان کیوں نہیں گئیں؟‘‘

یہ سن کر وہ خفیف سا مسکرائی اور پھر سنجیدہ ہو گئی: ’’تقسیم ہند کے کچھ عرصے بعد حالات واقعی نارمل ہو گئے تھے۔ میں چاہتی تو پاکستان جا سکتی تھی‘ لیکن اس معاملے میں چند باتیں آڑے آئیں ورنہ اس جنت ارضی میں جانے کی خواہش‘ جس کے لیے ہم نے لاکھوں جانوں کا بلیدان دیا‘ کیسے نہیں ہو سکتی؟ میں شروع میں کرب اور اذیت کے جس جہنم سے گزری تھی اس کے بعد اپنی نظروں میں خود ہی اتنا گر گئی تھی کہ اپنے آپ کو اس مقدس دھرتی پر پاؤں رکھنے کے قابل نہ سمجھتی تھی۔ اس کے بعد میری اولاد ہو گئی اور میں انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر جانے کی ہمت اپنے اندر پیدا نہ کر سکی کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری بیٹیاں یہاں ساری عمر اچھوتوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ میری غیر موجودگی میں ایک مسلمان عورت کی بیٹیاں ہونے کے ناتے ان سے ہریجنوں جیسا سلوک ہوتا۔ ویسے جہاں تک پاکستان سے محبت کا تعلق ہے یہ میرے اور میرے رب کے درمیان معاملہ ہے۔ کیا تم یقین کرو گے کہ اگر میرے بچوں کو کوئی بیماری یا تکلیف ہوتی ہے تو میں لفظ پاکستان پڑھ کر ان پر پھونک مارتی ہوں اور میرا سچا رب میرے اس اندھے اعتقاد کی لاج رکھتے ہوئے ان کی تکلیف دور کر دیتا ہے۔ میری ہر سانس میں یہ پوتر نام رچا بسا ہے۔ جہاں تک اس وقت پاکستان جانے کا تعلق ہے‘ صاف بات ہے کہ اب میں وہاں جانا ہی نہیں چاہتی۔ مجھے معلوم ہے کہ دور کے ڈھول کتنے سہانے ہوتے ہیں۔ وہاں جا کر میرا بنایا ہوا حسین خوابوں کا شیش محل یقیناً ٹوٹ جائے گا کیونکہ میرے سپنوں کا پاکستان وہ نہیں جو وہاں کے حکمرانوں کا پاکستان ہے۔ میں مورکھ نہیں‘ مجھے اخباروں اور ریڈیو کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ وہاں پاکستان تو ہے مگر کوئی پاکستانی نہیں۔ کوئی پٹھان ہے تو کوئی بلوچ‘ کسی کے لیے سندھی اجرک ہی سرمایہ حیات ہے تو کوئی پنجاب کے پگ پر داغ نہ لگنے کو اپنی ساری زندگی کا ماحصل سمجھتا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے روز مجھے اپنا معصوم بھائی کتنا یاد آیا تھا جس کی نازک گردن ہندو بلوائیوں نے کلہاڑی کے ساتھ دھڑ سے الگ کر دی تھی۔ اگر تم میرے پاکستان میں کبھی پہنچو تو لوگوں کو بتانا کہ زمین کا یہ خطہ اتنی ارزاں شے نہیں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں کتنی ہی دیر بت بنا اس خاتون کے آئینے میں اپنے چہرے کی سیاہیاں دیکھتا رہا۔ اس کے سامنے مجھے اپنے قد کی کوتاہی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ لمحوں کا فاصلہ صدیوں میں طے ہوتا محسوس ہوا۔ شام رات کی تاریکی میں بدل رہی تھی جب وہ اٹھی اور کہنے لگی: ’’تمہیں بھوک لگی ہو گی۔ میں تمہارے لیے روٹی لے کر آتی ہوں۔‘‘ کچھ دیر بعد لوٹ کر آئی تو بولی: ’’تمہارے کمرے کا دروازہ تو بند ہے اور چابی مہندر لے گیا ہے۔ کھڑکی کی سلاخوں ہی سے روٹی پکڑ لو۔‘‘ دو روٹیوں کے اوپر ہی اس نے کریلوں کا سالن رکھ دیا اور مجھے سلاخوں میں سے روٹیاں دوہری کر کے پکڑا دیں۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے باہر سے پانی انڈیلا جو میں نے اوک لگا کر پی لیا۔ پھر اس نے یہ کہتے ہوئے کہ ’’میں تمہارے لیے دروازہ تو نہیں

کھول سکتی'' کھڑکی میں سے چارہ کاٹنے والی درانتی لاکر مجھے دی اور بولی: ''دیوار کچی مٹی کی ہے۔ رات ان کے سونے کے بعد تم اگر درانتی سے دیوار کریدو گے تو تھوڑی دیر بعد اس میں اتنا شگاف ہو جائے گا کہ تم باہر نکل سکو۔ یہاں سے پاکستانی سرحد چار میل دور مغرب میں ہے۔ اگر قسمت نے تمہارا ساتھ دیا تو اپنے وطن پہنچ جاؤ گے۔ میں اب جاتی ہوں کیونکہ وہ دونوں اب آنے والے ہیں، کہیں انہیں شک نہ ہو جائے۔ خدا تمہیں کامیاب کرے!'' یہ کہہ کر وہ عظمتوں کی امین ہستی وہاں سے چلی گئی۔ میں اپنے فرار سے زیادہ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

(''را کے دیس میں عرصہ اسیری کے نو سال'' تصنیف ابو جواد اصغر علی چوہدری)

(اردو ڈائجسٹ۔ اگست 1997ء)

دو بوندیں ساون کی

دو بوندیں ساون کی، ترجمہ ہے جیفری آرچر کے شہرہ آفاق ناول کین اینڈ ایبل کا جسے اُردو زبان میں ترجمہ کیا ہے علیم الحق حقی نے۔ دو بوندیں ساون کی کہانی ہے دو ایسے افراد کی جو ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو شکست دینے اور تباہ و برباد کرنے کے درپے تھے۔ ان میں سے ایک منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا اور دوسرا در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ ایک شخص نے دُنیا کے بہترین تعلیمی اداروں سے تعلیم پائی اور دوسرے کا استاد زمانہ تھا۔

یہ ناول کتاب گھر کے **معاشرتی اصلاحی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

چور بازار

بعض لوگ سیاست کا سہارا لے کر کس طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، **چور بازار** پڑھ کر آپ بخوبی اندازہ لگا سکیں گے۔ جرم و سراغرسانی کی دلچسپ کہانی۔ ایک سپر مارکیٹ میں ہونے والی عجیب و غریب چوریوں کا احوال جہاں دکانوں کا ساز و سامان تالا توڑے اور نقب لگائے بغیر غائب ہو رہا تھا۔ اثر نعمانی کے تخلیق کردہ سراغرساں ندیم اختر کا کارنامہ۔ **چور بازار** کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیکشن میں پڑھی جا سکتی ہیں۔

اور دیا جلتا رہا

پنجاب پر نوے سالہ انگریزی استعمار کے دوران سفر اور متضاد کرداروں سے محبت کا رس کشید کرتی پر تاثیر کہانی

اس بات کا اعلان جون 1947ء میں کر دیا گیا تھا کہ چودہ اگست کو پاکستان معرض وجود میں آ جائے گا۔ یہ اعلان سن کر ملکہ ہانس کے چودھری اکبر خان کی حویلی میں چراغاں کیا گیا تھا۔ یہ چراغاں چودھری اکبر کی بیٹی شہ بانو نے کیا تھا جو خواتین مسلم لیگ کی مقامی شاخ کی جنرل سیکرٹری تھی‘ وہ جھلملاتی روشنیاں دیکھ کر دیگر خواتین کے ساتھ بڑی خوش ہو رہی تھی۔ مبارک بادوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ شہ بانو اپنے باپ کو بھٹکتا تاریک کونے میں بیٹھے دیکھ کر اس کے قریب گئی اور پوچھا:

’’میاں! اپنی حویلی میں چراغاں کیسا لگا۔‘‘

’’چراغ چھوٹا ہو یا بڑا‘ روشنی تو دیتا ہی ہے۔‘‘ ایک دو لمحے سوچ کر چودھری اکبر نے جواب دیا۔ ’’1857ء میں ہماری آزادی کے چراغ گل کر دیے گئے تھے۔ آج نوے سال بعد ہم نے پھر سے یہ چراغ روشن کیے ہیں۔‘‘ شہ بانو نے ماضی میں جھانکتے ہوئے کہا۔

چودھری اکبر نے بیٹی کی بات پر کوئی تبصرہ کیا نہ کچھ کہنا مناسب سمجھا‘ خاموشی سے اٹھا اور بالائی منزل کی چھت پر جا بیٹھا۔ وہ منڈیر کے جھرنوں سے چراغوں کی روشنیوں کے عکس کانپتے دیکھ رہا تھا لیکن اندر کی تاریکیاں اسے پریشان کیے ہوئے تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے ساری زندگی جس مسلم لیگ کی مخالفت کی‘ اب وہ برسر اقتدار آ جائے گی۔ ٹوانے‘ سردار اور انگریز کے سب حاشیہ بردار قوم کے سامنے سرنگوں ہو گئے تھے۔ اس کی امیدوں کا مرکز تو وہی تھے۔ خضر حیات ٹوانہ نے پنجاب کی وزارت اعلیٰ کا منصب چھوڑ دیا تھا اور پنجاب میں گورنر راج نافذ ہو گیا تھا۔ اس کا ذہن کئی ماہ تک سیاست کی سولی پر لٹکا رہا تھا۔ اس کی بیٹی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنا باعث رسوائی ہو گا۔ مراد نے اسے پیش کش کی تھی کہ وہ اسے مسلم لیگ سے ٹکٹ دلوا سکتا ہے لیکن وہ بیٹی کی بات مانا تھا نہ مراد کی۔ اس کے اندر چراغوں کی موجودگی کے باوجود اندھیرے امڈے آ رہے تھے۔ اس کی زندگی کے ساٹھ سالہ تجربات کی عمارت مراد اور شہ بانو جیسے ناپختہ ذہنوں کے سامنے ڈھے گئی تھی۔ وہ پاکستان کے اعلان پر متذبذب تھا۔ ایک صدمے سے دوچار تھا۔

ہر قطرہ دریا کے اندر ہی موج بنتا ہے۔ ہر فرد قوم کی قسمت کا ستارہ ہوتا ہے لیکن چودھری اکبر وہ قطرہ نہیں تھا جسے دریا میں موج بن کر رہنا

پسند ہو نہ وہ ستارہ تھا جس میں قوم کی قسمت جھلملاتی ہو۔ وہ تو کھرلوں کی اس نسل سے تعلق رکھنے والا مرد تھا جو چودھری سرفراز خاں سے شروع ہوئی تھی۔ کھرلوں کے آزاد قبیلے کے اس اہم سردار نے، جس کا نام سرفراز خاں تھا، قوم سے غداری کر کے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اور معاوضے میں جاگیر وصول کی تھی۔ وہ کبھی سرفراز خاں کے کردار پر شرمندہ نہیں ہوا تھا بلکہ اسی کے اتباع میں چلتا رہا تھا۔ آج پہلی بار اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زندگی کی تمام تر سہولتوں اور نعمتوں کے باوجود اندھیروں میں بھٹکتا رہا ہے۔ ساری زمینوں، حویلیوں اور جاگیر کی وارث بھی اس کی اکیلی اور لاڈلی بیٹی تھی گویا سرفراز کی نسل کا وہ آخری مرد تھا۔ اس کی بیٹی کی سوچ بھی اس سے مختلف نکل آئی تھی۔

☆☆☆

صاحب خاں بھی کھرل قبیلے کا سردار تھا۔ سرفراز خاں سے اس کی قرابت داری تھی لیکن صاحب خاں نے سرفراز خاں سے تعلق توڑ لیا تھا، اس لیے کہ وہ جنگ آزادی کا ایک سپاہی تھا۔ اس نے احمد یار خاں کھرل کے ساتھ مل کر انگریزوں سے جنگ لڑی تھی جو اپنے ہی وطن کے غداروں کی وجہ سے ہاری جا چکی تھی، تاہم اسے امید تھی کہ وہ دن ضرور آئے گا جب وہ انگریزوں سے ہاری ہوئی بازی جیت کر رہے گا۔ 112 سال کی عمر میں جب وہ بستر مرگ پر تھا تو کھرل خاندان کی تمام عورتیں، مرد اور بچے اس کے قریب جمع تھے۔ ان سب میں اس کا خون دوڑ رہا تھا لیکن اس کا اپنا بیٹا ان لوگوں میں نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ کی زندگی ہی میں ستر برس کی عمر پا کر 1934ء میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا، مگر صاحب خاں کے لیے دو بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑ گیا تھا جو صاحب خاں کو داداجان کہہ کر پکارتے تھے۔ پوتیاں، نواسے نواسیاں اور انکی اولادیں بھی بوڑھے کھرل کو دادا ہی کہتے تھے کہ انہوں نے سنا ہی ایسا تھا۔

بوڑھا کھرل بے چین تھا اور اپنے عمر رسیدہ پوتوں احمد خاں اور محمد خاں سے بار بار پوچھ رہا تھا کہ اس کا پڑپوتا مراد خاں ملکہ ہانس سے آیا ہے کہ نہیں۔ نفی میں جواب سن کر اس نے کہا کہ اس کی وصیت لکھ لی جائے۔ محمد خاں کے بیٹے جمال نے یہ کام سرانجام دیا۔ بوڑھے کھرل نے لکھوایا:

”احمد خاں! اپنے باپ کی وفات کے بعد تم خاندان کے سربراہ بنے تھے لیکن اب میرے مرنے کے بعد میری ذمے داریاں بھی تم سنبھالو گے، لہٰذا جب مراد آئے تو اسے میری باتیں پڑھا دینا، وہ سب سمجھ جائے گا کہ اسے کیا کرنا ہے اور تم سب کو کیا کرنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جو داغ میں سینے پر لیے جا رہا ہوں قیامت کے دن وہ داغ تمہارے سینوں پر بھی ہوں۔ میں اپنی پوری نسل کو یہ وصیت کر کے جا رہا ہوں کہ میں نے 1857ء میں جو جنگ انگریز کے مقابلے میں ہاری تھی وہ جنگ میری اولاد کو جیتنی ہے۔ تبھی قبر یا برزخ میں میری روح کو چین آئے گا۔ میں بستر پر پڑنے تک جدوجہد کرتا رہا ہوں۔ جس دن پاکستان بن جائے اور انگریزوں کی غلامی کا جوا اتر جائے تو اس شام میری قبر پر ایک دیا ضرور روشن کر دینا تاکہ دنیا دیکھ لے کہ صاحب خاں جیت گیا ہے۔ میں نے انگریزوں کے پٹھو سرفراز خاں کھرل اور اس کے ہمنوا کھرلوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھا۔ میں جو تھوڑی بہت زمینیں تمہارے لیے چھوڑے جا رہا ہوں وہ گاڑھے خون پسینے کی کمائی ہے۔ سرفراز خاں کھرل خاندان اور ملت کا غدار تھا، لہٰذا میری نسل میں سے کوئی بھی اس مردہ ضمیر خاندان کی باقیات سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔“

بوڑھے صاحب خاں نے آزادی کی حسرت کے ساتھ داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کا پورا خاندان رو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ان کے دادا نے کیسی انوکھی تمنا کی ہے۔ احمد خاں نے قریب ہو کر دادا سے جانکنی کے عالم میں پوچھا کہ کیا اس نے کچھ اور بھی کہنا ہے۔ جب بوڑھا کھرل کچھ نہیں

بولا تو اسے آب زم زم کا چمچ پلایا گیا جو اس کے حلق سے نہیں اترا۔ عورتیں اپنی چیخیں ضبط نہ کر سکیں۔ احمد خاں نے دادا کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ اس طوفانی رات کو منٹگمری میں صاحب خاں کھرل نہیں مرا تھا پوری ایک صدی مر گئی تھی۔

اچانک گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ پھر مراد خاں آ گیا، مراد خاں آ گیا، کی آوازیں بلند ہوئیں۔ صورت حال کا علم ہونے پر مراد خاں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا: ''معاف کرنا، دادا، مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔'' پھر اس نے دادا کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اپنے باپ احمد خاں سے پوچھا کہ دادا نے کوئی وصیت چھوڑی ہے۔ اسے وصیت دکھائی گئی جسے پڑھ کر اس پر سکتہ طاری ہو گیا اور وہ دل کو پکڑ کر دادا کی چارپائی کے قریب ہی ڈھے گیا۔

صاحب خاں کھرل جاتے جاتے اپنے بے حد چہیتے اور پڑھے لکھے سمجھدار پڑپوتے کو امتحان میں ڈال گیا تھا۔

☆☆☆

پنجاب کا وہ علاقہ جو نیلی، گنجی، ساندل اور ایسی ہی کئی باروں پر مشتمل ہے، ایسے قبائل کی سرزمین تھی جنہوں نے تاریخ کے ہر دور میں بیرونی جارحیت کا مقابلہ کیا۔ اگر وہ حملہ آوروں پر غالب نہ بھی آ سکے تو انہوں نے اپنے حقوق ضرور تسلیم کروا لیے۔ محمود غزنوی سے پہلے سندھ، سرہند اور ملتان تک اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ہندوستانی سماج اور اس کی دیہاتی تقسیم کے مقابلے میں اسلام کا مساوات پر مبنی پیغام لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا تھا۔ شمال مغرب کی طرف سے آنے والے حملہ آور اگرچہ عرب نہیں تھے لیکن مسلمان تھے اور ان کا پیغام پنجاب کے لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث بنا تھا۔ باروں کے انہی علاقوں سے غزنویوں، غوریوں، سوریوں، خلجیوں، تاتاریوں، مغلوں، درانیوں، مرہٹوں اور سکھوں کے لشکر گزرے تھے اور علاقے کے باشندوں نے ان کی تہذیب اور بہادری کے اثرات قبول کیے تھے اور اپنے اثرات ان پر مرتب کیے تھے۔ اس علاقے کے مشہور قبیلوں میں کھرل، سیال، وٹو اور کاٹھے خاص طور پر اہم تھے۔ اسی علاقے میں کھرلوں، سکھوں اور سیالوں نے اپنی آزاد ریاستیں قائم کیں۔

ہماری کہانی کا تعلق بیسیویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے سے ہے۔ اس دور کے کھرل خاندان کے متعلق تفصیلی معلومات کہانی سمجھنے میں آسانی پیدا کریں گی لہٰذا مختصراً بیان ناگزیر ہے۔ کھرل خاندان کا بانی رائے کھرل ایک ہندو تھا جس نے سید جلال الدین سرخ بخاری کے پوتے حضرت مخدوم جہانیاں کے ہاتھ پر چھٹی صدی ہجری میں اسلام قبول کیا۔ اسی خاندان میں کئی پشتوں کے بعد جنگ آزادی کے ہیرو سردار احمد خاں کھرل نے جنم لیا۔ کھرل قبیلے کا کچھ حصہ ملتان ڈویژن کے قصبے جھامرہ میں آباد تھا اور دو بھائی میر خاں اور امیر خاں اس وقت قبیلے کے سردار تھے۔ کچھ کھرل خاندان چنیوٹ کے گردونواح میں بھی آباد تھے۔ راوی کے مشرقی ساحل پر سکھ ریاست منگھرہ قائم تھی۔ کھرل اور سکھ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔

دونوں سردار بھائیوں کے بعد کھرل قبیلے کی سرداری رائے صالح خاں کھرل کو ملی۔ رائے صالح مہاراجہ رنجیت سنگھ کی رانی جنداں کو اپنی بہن سمجھتا تھا۔ وہ سردار مان سنگھ کی بیٹی تھی اور رائے صالح سردار مان سنگھ کے ہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ مہاراجہ نے ملتان سے لاہور تک کا علاقہ رائے صالح کے اختیار میں دے رکھا تھا۔ بیدی سکھوں کو یہ ناگوار گزرا تو انہوں نے علاقے کے مکینوں پر ظلم وستم شروع کر دیے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کو رائے صالح کے خلاف اکسانا شروع کر دیا۔ کشمکش کے انہی دنوں میں رائے صالح کھرل کا بھتیجا رائے احمد خاں کھرل منظر عام پر آیا جس نے بارہ بیدی سکھوں کو تہ تیغ کر دیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کھرلوں کو سزا دینے کا ارادہ کیا لیکن مہارانی جنداں نے اسے اونچ نیچ سمجھا کر دھیما کیا۔ احمد خاں کھرل

نے بھی تمام سرداروں کو متحد کر لیا اور اس کے چچا نے کھرلوں کی سرداری بھتیجے کو سونپ دی۔

مہاراجہ کھرلوں سے چھیڑ خانی کرنے سے باز نہیں آیا۔ اس نے کھرلوں سے ان کے زیر اقتدار علاقے کا ٹیکس فوری طور پر طلب کیا۔ احمد خاں کھرل مہارانی جنداں سے ملا جس نے شاہی خزانے سے ٹیکس کی مالیت کا سونا احمد خاں کھرل کو دے دیا۔ احمد خاں کھرل نے سونے کی اینٹیں مہاراجہ کو دیں تو وہ پہچان گیا۔ محل میں جا کر مہارانی جنداں سے الجھ پڑا اس نے پھر سمجھایا کہ کھرلوں کی حمایت ہی سے سکھ حکومت طاقتور ہو سکتی ہے۔ کھرلوں کی مختلف شاخوں کے علاوہ انگریزوں کے مقابلے میں بے شمار مسلمان خانوادے سکھوں کی حمایت کے لیے تیار تھے' لیکن مہاراجہ نہیں سمجھ رہا تھا۔ مسلمانوں سے حسد اور بغض رکھنے والا گلاب سنگھ' احمد خاں کھرل سے کینہ رکھتا تھا اور اس نے کھرلوں کی کمالیے کی شاخ کے رئیس سعادت یار خاں سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ اس کے تین بیٹے سکھوں کی طرف سے ٹیکس وصول کرتے تھے اور ٹھاٹ باٹھ سے رہتے تھے۔ تیسرے بیٹے کا نام سرفراز خاں تھا۔ اس کے مقابلے میں رائے احمد خاں کھرل کو فتیانہ چشتی اور کاٹھیا خاندانوں کی حمایت حاصل تھی۔ احمد خاں کھرل کے خلاف اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ مر گیا۔ اس کا بیٹا دلیپ سنگھ تخت پر بیٹھا لیکن عملی طور پر اختیارات مہارانی جنداں کے ہاتھ میں تھے اور وہ احمد خاں کھرل کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

رنجیت سنگھ ایک ذہین راجہ تھا' اس کی موت کے ساتھ ہی پنجاب میں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں بڑھ گئیں۔ سکھوں اور انگریزوں کے درمیان تصادم ہوا تو گلاب سنگھ کے حامیوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ دیگر عوامل بھی انگریزوں کے معاون ثابت ہوئے اور انگریز لاہور دربار میں اپنا اختیار قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لاہور دربار کا یہ حال تھا کہ سکھ سردار بھی ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ سازش کے تحت مہارانی جنداں کو لاہور سے رخصت کر دیا گیا۔ دلیپ سنگھ کے جانشیں پنجاب کو متحد نہ رکھ سکے۔ مغل' مرہٹے اور سکھ ہتھیار پھینک کر کمپنی سرکار سے وظیفے لینے لگے۔ فرنگی فوج نے ہندوستانی فوج میں بھرتی کھول دی تا کہ ہندوستانی فوج ہی کو ہندوستانیوں کے خلاف استعمال کیا جائے۔ انہوں نے پادریوں کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ شروع کی۔ گرجے تعمیر ہوئے اور ان کے لیے زمینیں اور جائدادیں وقف کیں۔ عیسائیت قبول کرنے والوں پر نوازشات کی بارشیں کیں۔ مقامی لوگوں کے مذہب اور دھرم کو خراب کرنے کے تمام حربے آزمائے۔ فوج میں سور اور گائے کی چربی والے کارتوس مہیا کیے گئے جن کو بندوق میں بھرنے سے پہلے منہ سے اس کی ٹوپی علیحدہ کرنا پڑتی۔

جسمانی اور ذہنی غلامی کی ان سامراجی کوششوں کے خلاف بیرک پور (بنگال) سے اٹھی جہاں ایک برہمن نوجوان منگل پانڈے نے کارتوس کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور دوسرے ساتھیوں کو للکار کر کہا کہ کمپنی سرکار ان کا دھرم بھرشٹ کر رہی ہے۔ بغاوت کے الزام میں منگل پانڈے کو پھانسی کی سزا دی گئی لیکن پورے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ باغی سپاہیوں نے میرٹھ سے لے کر دہلی تک بہت سے انگریزوں کا خون بہایا اور لال قلعے کے سامنے جمع ہو کر اسی سالہ بوڑھے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو شہنشاہ کا خطاب دے کر عزت و تکریم دی۔ انگریزوں کے خلاف نفرت کا طوفان بڑھتا گیا۔ دہلی میں مغل اور روہیلے انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوئے۔ ناگ پور اور کانپور میں مرہٹے سردار نانا فرنویس نے علم بغاوت بلند کیا۔ جھانسی کی رانی الگ سامراج کے خلاف مورچہ بند ہوئی۔ پنجاب کے مسلمان قبیلوں نے بھی شاہ پور

گوگرہ، کمالیہ، جھنگ، سرسا، پاکپتن، ساہیوال اور ملتان میں انگریزوں کی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کے لیے ایک فوج اکٹھی کی۔ ان علاقوں سے جس شخص کے خلاف زیادہ شکایات انگریزوں کو پہنچائی گئیں وہ احمد یار خاں کھرل تھا اور خبریں پہنچانے والا سرفراز خان کھرل ہی تھا۔ سردار گلاب سنگھ بھی سرفراز خان کے ساتھ انگریزوں کے لیے ہی کام کر رہا تھا۔ یہ دونوں انگریزوں کے خلاف ہونے والی ہر کارروائی کو احمد یار خاں کھرل کے کھاتے میں ڈالنے کے لیے گوگیرہ کے اسسٹنٹ کمشنر لارڈ برکلے کے پاس جاتے آتے رہے۔

احمد یار خاں کھرل پر ہاتھ ڈالنے کے لیے اور متوقع بغاوت سے نبرد آزما ہونے کے لیے انگریزوں نے پنجاب کے مسلمانوں اور سکھوں سے ہتھیار تھانوں میں جمع کرا لیے۔ احمد یار خاں اور اس کے ساتھی سرداروں نے ہتھیار جمع کرانے سے انکار کر دیا تو اسسٹنٹ کمشنر نے گلاب سنگھ کے ایما پر ایک سازش تیار کی۔ اس سازش کے تحت برکلے ایک دن اچانک جھامرہ پہنچا اور احمد یار خاں کھرل سے ملاقات کی اور کہا کہ وہ احمد یار خاں کھرل سے دوستی کرنا چاہتا ہے۔ احمد یار خاں نے جواب دیا کہ جو اندھیرے انگریزوں نے پھیلا رکھے ہیں ان میں دوستی کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر برکلے نے کہا کہ سرکار نے اسے احمد خاں کے پاس بھیجا ہے کہ وہ احمد یار کی گھوڑی حاصل کرے۔ احمد یار خاں کھرل نے جواب دیا کہ گھوڑی اس کے مرشد کی امانت ہے اور وہ امانت میں خیانت کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

صورت حال ایسی تھی کہ اگر احمد یار خاں کھرل کے آدمی برکلے کو بحفاظت واپس نہ پہنچاتے تو وہ راستے ہی میں مارا جاتا لیکن وہ ایک کینہ توز شخص تھا اس نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ وہ احمد یار خاں کھرل سے اس توہین کا بدلہ لے گا جو کھرل نے اسے گھوڑی نہ دے کر کی ہے۔ رائے صالح نے بھی بھتیجے کو خبردار کیا کہ برکلے کا گوگیرہ سے جھامرے آنا بے سبب نہیں۔ چنانچہ احمد یار خاں نے بھی اپنے قبیلے کے سرداروں اور اپنے دست راست مراد فتیانہ کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

برکلے نے لگان کی وصولی کے سلسلے میں قصبہ لکھو کے سرداروں کو پنچایت میں بلا کر گرفتار کر لیا۔ احمد یار خاں کھرل قیدیوں سے ملنے آیا، اس کے ساتھ فتیانہ قبیلے کے لوگ بھی تھے۔ اسی رات قیدیوں نے بغاوت کر دی۔ کئی سکھ سپاہی مارے گئے اور قیدی فرار ہو گئے۔ اس شک کی بنا پر کہ قیدیوں کو احمد یار خاں کھرل نے بغاوت پر اکسایا ہے اسے گرفتار کر لیا گیا۔ بے شمار لوگ انگریزوں اور ان کے پٹھوؤں سے نمٹنے کے لیے تیار تھے لیکن احمد یار خاں نے ان کو منع کر دیا۔ عدالت میں اس کے خلاف کوئی گواہ پیش نہیں ہوا لہٰذا برکلے کو اسے رہا کرنا پڑا۔ یہ اس کی دوسری شکست تھی۔

دہلی اور اس کے گرد و نواح میں انگریزوں کے خلاف ایک جنگ جاری تھی۔ پنجاب میں بغاوت کا مرکز جھامرہ تھا۔ بغاوت کی لہر آہستہ روی سے ہریانہ، حصار اور روہتک سے ہوتی ہوئی پنجاب کی طرح بڑھ رہی تھی۔ احمد یار خاں نے بیلی، لکھوکا، پنڈی، شیخ موسیٰ، محمد پورہ، ہڑپہ، چیچہ وطنی، کاٹھیا، حلیبی گڑھ، ملکہ ہانس، سوجا، بھنڈرا، ست گڑھا اور نواحی علاقوں کے سرداروں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا تھا۔ سازشیوں اور مخبروں سے حاصل ہونے والی معلومات کے تحت برکلے کو حکم دیا گیا کہ وہ احمد یار کھرل پر خصوصی نظر رکھے کیونکہ وہ وٹو، فتیانہ، تریانہ، مروانہ، کاٹھیا، جنجوعہ، مکھیل، لک اور نول قبیلوں سے مل کر ایک آزاد ریاست قائم کر رہا ہے۔ انگریزی فوج احمد یار خاں اور مراد فتیانہ کا تعاقب کرتی رہی لیکن وہ اس کی گرفت میں نہیں آئے۔ انگریزوں نے ایک چال چلی کہ احمد یار خاں اور مراد فتیانہ اپنے سرداروں کے ہمراہ ایک مقررہ تاریخ کو کمالیہ میں سرفراز خاں کی حویلی

پہنچ جائیں تاکہ باہم سمجھوتہ کیا جاسکے۔

انگریزوں کی اس چال کو سمجھتے ہوئے تمام سردار مقررہ تاریخ سے ایک دن قبل اچانک کمالیہ پہنچ گئے۔ ابتدائی گفت وشنید کے بعد سب سرداروں نے قرآن اٹھا کر قسم کھائی کہ وہ انگریزوں کے مقابلے میں متحدر ہیں گے اور ہر قسم کی قربانی دیں گے۔ اس حلف میں ماچھیا لنگڑیال اور سرفراز خاں کھرل بھی شامل تھے لیکن یہ دونوں ہی تھے جو در پردہ قرآنی حلف سے منحرف ہو گئے اور باقی سرداروں کے منصوبوں اور ارادوں کے متعلق انگریزوں کو مخبری کرتے رہے جس کے نتیجے میں انگریزوں کی افواج نے 17 ستمبر 1857ء سے لے کر بیس اگست 1858ء تک مختلف اوقات میں قبائل کے ساتھ لڑائی کیں، لیکن 21 اگست 1858ء کو ایک فیصلہ کن معرکہ کش کوریان کے قریب نورے کی ڈل پر ہوا۔ اس جنگ میں غداروں اور مخبروں نے اپنا پورا حق نمک ادا کیا۔ احمد یار خاں کے دو بھتیجے مراد اور سارنگ شہید ہوئے۔ احمد یار خان ڈل میں نماز پڑھ رہا تھا کہ دہاڑا سنگھ اور کھیم سنگھ انگریزی فوج کو لے کر وہاں پہنچ گئے۔ احمد یار خاں سجدے میں تھا کہ گلاب رائے بیدی نے گولی مار کر اسے شدید زخمی کر دیا۔ دوسری گولی سے احمد یار خاں کھرل نے جام شہادت نوش کیا۔ اس کا سر کاٹ لیا گیا جسے ایک گھڑے کے پیندے میں ڈال کر جیل کی دیوار پر رکھ دیا گیا تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔

احمد یار خاں کی شہادت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ صاحب خاں اس وقت بالکل نوجوان تھا وہ انتقام کے لیے دیوانہ ہو گیا۔ وہ راتوں رات گوگیرہ سے بھگیانہ پہنچا۔ دلیر اور جانباز مراثیوں کی مدد سے گوگیرہ جیل کی دیوار سے احمد یار خاں کا سر لے آئے۔ صاحب خاں نے اس سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ برکلے سے اس خون کا بدلہ لے گا۔ اس سر کو خاموشی سے قبرستان میں دفن کیا اور خود مراد فتیانہ کے پاس پہنچ گیا۔

برکلے علاقے میں دہشت پھیلاتا ہوا محمد پور اور ہڑپہ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ مجاہدین نے اچانک حملے کر کے برکلے کو فوج سمیت بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ابھی کاہلوں پہنچا تھا کہ مراد خاں اور صاحب خاں اس کے استقبال کو اس کے سامنے موجود تھے۔ برکلے نے مراد فتیانہ پر گولی چلائی وہ زخمی تو ہو گیا لیکن اس نے جوش جہاد میں اپنا نیزہ برکلے کے سینے میں اتار دیا۔ دوسرا نیزہ صاحب خاں نے مارا۔ وہ گر پڑا تو ولی داد اور سوجھا بھدرو نے لاٹھیاں مار مار کر اسے جہنم واصل کر دیا۔ فتیانہ نے اس کا سر کاٹ لیا اور نیزے پر چڑھا کر فتح کے شادیانے بجاتے جھلی پہنچے۔ کئی روز برکلے کے سر کی نمائش کے بعد اسے دریا میں پھینک دیا۔ پنجاب میں مجاہدین نے انگریزوں کے خلاف جنگ جیت لی تھی لیکن دہلی میں مغل شہنشاہ یہ جنگ ہار چکا تھا۔ انگریز نے حالات سدھارنے کے بعد برکلے کے قتل کا بدلہ لینے کا ارادہ ترک کر دیا تاہم راوی اور نیلی بار کے علاقوں میں ان کا تسلط مضبوط ہو گیا۔

احمد یار خاں کے دھڑ کو موضع کھوکیہ میں دفن کیا گیا تھا جبکہ سر بھگیانہ میں تھا۔ وہ گھڑا جس میں احمد خاں کا سر تھا تقریباً ایک صدی بعد برآمد ہوا جسے دھڑ کے ساتھ جوڑ کر دفن کیا گیا۔ اس کا مقبرہ بھگیانہ میں ہے جبکہ انگریزوں نے جو یادگار برکلے کی تعمیر کی اس میں اس کا سر ہے نہ دھڑ۔

☆☆☆

جس وقت صاحب خاں کا انتقال ہوا اس وقت پاکستان بنانے کا غلغلہ بلند ہو چکا تھا جو جنگ آزادی لڑائی سے پہلے شکست میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھی پھر سے وہ زندہ ہو رہی تھی۔ یہ دوسری جنگ کی تیاری تھی۔ جب اس کے پڑپوتے مراد خاں نے دادا کی وصیت پڑھ لی تھی۔ اس وصیت کا مطلب وہ اپنے باپ چچا اور دیگر عزیز و اقارب سے بہتر سمجھتا تھا۔ اس کی زندگی کے دیے میں صاحب خاں کے جذبوں کا تیل جل رہا تھا۔

تاریخ نے کھرلوں کی غدار شاخ میں ایک اور سرفراز بھی ملکہ ہانس کے علاقے میں اکبر علی کے نام سے پیدا کر دیا تھا جو انگریزوں کا وفادار تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے انگریزوں کو ہندوستان سے رخصت کرنا ایک خیال ہی تھا اور بیکار کی ایک جدوجہد تھی جو مسلم لیگ اور کانگرس جیسی جماعتیں کر رہی تھیں۔ صاحب خاں اپنے پڑپوتے کو ہمیشہ یہ نصیحت کرتا رہا کہ وہ اکبر علی سے دور رہے اور اس سے اس طرح کوئی واسطہ نہ رکھیں جس طرح صاحب خاں نے سرفراز خاں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ مراد کے لیے یہ اچانک موت ایک عظیم صدمے سے کم نہ تھی کیونکہ وہ ملکہ ہانس سے ایک ایسا پیغام لے کر آیا تھا جس پر اس کی زندگی کا دارومدار تھا اور وہ اس پیغام کے سیاق وسباق بیان کر کے دادا سے اس کی منظوری لینا چاہتا تھا لیکن اس کا دادا تو اسے بگولوں میں تنہا چھوڑ کر راہی ملک عدم ہو چکا تھا۔

مراد خاں دادا کی میت کے سرہانے تصویر غم بنا بیٹھا تھا۔ اس نے ساری رات سکتے کے عالم میں گزار دی تھی۔ جب جنازہ اٹھا تو اس نے چارپائی کا جو پایہ اٹھایا وہ اسے کسی کو بدلنے کے لیے نہیں دیا۔ جب لوگ تدفین کے بعد دعا مانگ کر گھروں کو لوٹے تو وہ تب بھی دادا کی قبر کے پاس ہی خاموش بیٹھا رہا۔ کہیں رات گئے علم ہوا کہ مراد گھر میں نہیں ہے۔ اس کے بھائی بندا سے تلاش کرتے قبرستان پہنچے۔ ہر ایک نے اسے دلاسا دینے کے لیے کوئی نہ کوئی جملہ ضرور کہا لیکن مراد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا لائے تو وہ چپکے سے ان کے ساتھ آ گیا۔ ماں، بہنوں اور بھائیوں نے اسے بڑے دلاسے دیے لیکن وہ خاموش رہا اور خالی خالی نگاہوں سے ان کو دیکھتا رہا۔ کھانے کو کہا تو چپ چاپ دسترخوان پر بیٹھ گیا اور بے دلی سے دو چار لقمے لیے۔

حقیقت یہ ہے کہ بوڑھے صاحب خاں کا کردار ہر چھوٹے بڑے کے لیے بڑا مخلصانہ تھا۔ ایک سو بارہ سالہ بوڑھے شخص کا غم بھلانے کے لیے ایک سو بارہ سال ہی درکار تھے مگر مرنے والوں کے ساتھ کبھی کوئی مرا نہیں۔ نئی کونپلیں پھوٹتی ہی رہتی ہیں اور پرانے پتے جھڑتے رہتے ہیں۔ مراد کو سب موقع بموقع سمجھا رہے تھے۔ وہ گھرانے کے رواج کے مطابق جمعرات کو دادا کی قبر پر چراغ جلانے بھی نہیں گیا گھر والے سمجھے کہ وہ دادا کی قبر پر اسی وقت چراغ جلائے گا جب آزادی کی دوسری جگ جیتی جا چکی ہوگی تاہم اس وقت مراد خاں اپنی حالت کو وہ خود ہی سمجھ سکتا تھا دوسروں کی تمام تاویلات غلط تھیں۔ وہ خود ایک دھواں دیتا ہوا چراغ تھا۔ اس کی ماں نے اس کا ماتھا چوم کر کہا۔

”کل تیرا ماموں ملکہ ہانس لوٹ جائے گا۔ کچھ دن کے لیے تو بھی اس کے ساتھ چلا جا تا کہ تیرا غم ہلکا ہو۔“

مراد جانتا تھا کہ اس کی ماں اسے یہ مشورہ کیوں دے رہی تھی۔ اس کی ماموں زاد مریم تعلیم مکمل کر کے گھر بیٹھی تھی۔ ماں نے اسے بچپن ہی میں مراد کے لیے پسند کر لیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ مراد اور مریم کا باہم لگاؤ بڑھے۔ مراد بھی اس سے مل کر خوش ہوتا تھا لیکن اس کا خوش ہونا اس حوالے سے نہیں تھا جس طرح سے اس کی ماں سوچتی تھی۔ وہ مریم سے باتیں کر کے خوش ہوتا تھا۔ تعلیم، تجسس اور حالات حاضرہ کے متعلق دونوں کے خیالات میں ہم آہنگی تھی۔ ملاقاتوں کے دوران جب بھی اسے یہ محسوس ہوا کہ مریم اس کی طرف ایسی ایسی نظروں سے دیکھ رہی ہے جس میں ایک منگیتر یا بیوی کا تاثر پایا جاتا ہے تو وہ اسے اشاروں کنایوں سے سمجھاتا کہ وہ دونوں اچھے دوست ہیں جو ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں کیونکہ دوستی کا مطلب ہی خیالات وجذبات میں ہم آہنگی ہے۔

ملکہ ہانس جانے میں اسے کوئی عذر بھی نہ تھا لیکن دادا کے انتقال کا جو حادثہ رونما ہو چکا تھا وہ ملکہ ہانس میں کسی اور کے قدموں تلے سے بھی زمین اسی طرح کھسکا سکتا تھا جس طرح اس کے قدموں تلے سے کھسک چکی تھی۔ وہ خود کو ایک ہارا ہوا انسان سمجھ رہا تھا اور شکست کا سایہ لے کر وہ ملکہ ہانس نہیں جانا چاہتا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ آخر اسے ایک نہ ایک دن تو اپنی زندگی کے اہم سوال کا جواب دینے کے لیے ملکہ ہانس جانا ہی ہوگا۔

اس کی آمنہ بھابی اس کے پاس بیٹھی اور دلجوئی کی خاطر اس نے مریم کا ذکر چھیڑ دیا تو مراد نے اس کے تمام استفسار کا جواب یہ دیا کہ وہ شادی کے معاملے میں قطعی عجلت نہیں چاہتا لیکن وہ اس کی سوچ کے مطابق دل بہلانے کے لیے ملکہ ہانس ضرور چلا جائے گا۔ اس اثنا میں مراد کی ماں اپنے بھائی سے مریم کا ہاتھ مانگ چکی تھی اور بھائی نے کہا کہ مریم اس کے گھر میں بہن کی امانت کے طور پر ہے جب چاہے لے آئے۔

ثقافتی لحاظ سے ملکہ ہانس وہ قصبہ ہے جہاں مسجد کے ایک تہ خانے میں وارث شاہ نے ہیر کی لافانی محبت کی داستان کو شعر و نغمے کے سانچوں میں ڈھالا۔ ویسے یہ قصبہ 1946ء میں ہانسیوں کے بڑے سردار محمد عظیم نے اپنی خود مختار جاگیر میں آباد کیا۔ سکھوں کے قبضے میں رہنے کے بعد یہ انگریزوں کی عملداری میں آیا تھا۔ ملکہ ہانس کی طرف جاتے ہوئے اب کی مراد کی ذہنی کیفیت اور تھی۔ اس کے اندر ایک ایسی کشمکش جاری تھی جس کا اختتام اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ یا پھر اس مزار کے ارد گرد بھٹکتا رہا جہاں جمعرات کو چراغ جلانے کی روایت چلی آ رہی تھی۔

اسی مزار پر وہ صاحب مزار کے عرس کے موقع پر ایسے ہی مطالعے کے ارادے سے چلا گیا تھا کہ دیکھے عرس کیا ہوتا ہے، لوگ کیا کرتے ہیں۔ کیا کھیل تماشے ہوتے ہیں اور کیسے بہانوں بہانوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ اس نے دیکھا ایک بالکل مختلف نظر آنے والی لڑکی چراغوں کی روشنی میں دعا مانگ رہی ہے۔ پھر وہ لڑکی اسے چوڑیاں خریدتے نظر آئی جہاں وہ بھی بہن کے لیے چوڑیاں لینے پہنچا تھا۔ اس نے جلدی میں سرخ چوڑیاں پسند کیں تو اس لڑکی کی سہیلیوں میں سے ایک نے کہا:

''شہ بانو! دیکھو اب گھبرو بھی چوڑیاں پہننے لگے ہیں۔''

''خود بھی پریوں جیسی ہے اور نام بھی پریوں جیسا ہے۔'' مراد نے دل ہی دل میں سوچا اور برجستہ اس نے رد کرنے والی لڑکی کو جواب دیا۔ ''میں چوڑیاں پہننے کے لیے نہیں خریدنے کے لیے دیکھ رہا ہوں۔''

''پہننے والی بھی ہوگی؟'' اس نے پھر کہا۔

''بھابی کے لیے خرید رہا ہوں۔'' مراد کو پسینہ آ گیا بہن کی بجائے بھابی منہ سے نکل گیا۔

''تو خود ابھی لنڈورے ہی ہو'' شہ بانو کی سہیلی نے کہا۔ شہ بانو نے سہیلی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''تو ہر کسی سے الجھ جاتی ہے، کوئی اپنا پرایا تو دیکھا کر، پردیسی ہے بے چارہ''

''کوئی اتنا بھی پردیسی نہیں، ملکہ ہانس میں چودھری ہاشم میرے ماموں ہیں جہاں میں آتا جاتا ہی رہتا ہوں۔'' مراد نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''ان کی بیٹی کا نام مریم ہے، میری ہم جماعت رہ چکی ہے۔'' شہ بانو نے کہا۔

''کہیں یہ چوڑیاں مریم کے لیے ہی تو نہیں خرید رہے۔'' پہلے والی شوخ لڑکی نے کہا۔ اسے ایسے لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ حقیقت یہی تھی کہ چوڑیوں کی خریداری وہ مریم کے لیے ہی کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے ذہن میں پردہ پوشی کی خاطر ایک بار بہن کا نام گونجا تھا اور دوسری بار بھابی کا لفظ زبان پر آیا تھا۔ انکار میں اس نے کہا کہ وہ تو اس کے ماموں کی لڑکی ہے۔

اسی اثنا میں شہ بانو کا رکھوالا اس کے قریب آیا اور اس نے یاد دلایا کہ دیر ہو رہی ہے۔ شہ بانو نے اسے کہا کہ ابھی چلتے ہیں۔

مراد نے گھر پہنچ کر چوڑیاں مریم کو ہی دیں اور اس سے شہ بانو کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ ملکہ ہانس میں ایک ہی شہ بانو ہے جو دسویں تک اس کے ساتھ پڑھتی رہی ہے وہ بھی کھرل ہے۔ یہ سن کر مراد کے تصور میں ستارے جھلملا اٹھے۔ اس نے سوچا کہ وہ خود بھی تو کھرل ہے اور صاحب خان جیسے نامور کھرل کا پڑپوتا ہے۔ ملکہ ہانس اور منٹگمری میں فاصلہ ہی کتنا تھا۔ اسے خیالوں میں کھویا دیکھ کر مریم کھنکھاری اور اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ مراد نے پوچھا: ''میرے چہرے پر کیا دیکھ رہی ہو۔''

''تم شہ بانو کے ذکر پر کہیں کھو گئے تھے، مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔'' مریم نے کہا اور وہ مسکرا کر رہ گیا تھا۔ اس نے کوئی غلط بھی نہیں کہا تھا۔ سال پہلے کا یہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔

پھر وہ سال کے دوران کئی بار شہ بانو سے ملا تھا۔ ملکہ ہانس میں اس کی بار بار آمد پر اسکے ماموں اور ممانی یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ مریم کے لیے آتا ہے۔ مریم بھی گومگو کے عالم میں تھی۔ وہ کبھی دوست، کبھی محبوبہ اور کبھی بیوی کے روپ میں اپنے متعلق اور مراد کے متعلق سوچتی اور اسے کچھ سمجھ نہ آتی۔

ابھی دو ماہ پیشتر ہی اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کی محبوبہ، اس کی جان، اس کی سب کچھ شہ بانو چودھری اکبر علی کی بیٹی ہے۔ یہ انکشاف مراد کے دل و دماغ پر بجلی بن کر گرا تھا۔ بدحواسی کی کیفیت دیکھ کر شہ بانو حیران رہ گئی تھی اس نے اس کی وجہ پوچھی تو مراد خاں نے اسے بتایا کہ جو کچھ اس نے سنا ہے اس کے گھر والے یہ سب کچھ سن کر کبھی شہ بانو کا رشتہ مانگنے کے لیے اس کے والد کے پاس نہیں آئیں گے۔ یہ بات سن کر شہ بانو بھی پریشان ہو گئی مگر اس نے مراد خاں کو بتایا کہ انگریزوں کے خلاف جنگ لڑنے کے اقدام کی وجہ سے وہ احمد یار خاں کھرل کو اپنی قوم کا ہیرو سمجھتی ہے۔ اس پر فخر کرتی ہے اور سرفراز خاں کے کردار کو ناپسند کرتی ہے، لیکن اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ سرفراز خاں نے جو زمینیں اور جائدادیں انگریز کی حمایت اور قوم سے غداری کر کے حاصل کی تھیں انہیں میں چودھری اکبر علی کے اثاثے بھی شامل ہیں۔ سرفراز خاں کی طرح اکبر علی اب بھی انگریز کا دم بھرتا تھا۔ اگر وہ اپنے دادا صاحب خان سے اپنے رومان کا ذکر کرتا تو ممکن تھا کہ دادا مشتعل ہو جاتا اور اس کی شادی فوری طور پر مریم سے کر دیتا۔

چاہتے ہوئے بھی شہ بانو مراد کو اور مراد شہ بانو کو نہ بھلا سکے۔ خاصی سوچ بچار کے بعد مراد اور شہ بانو اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ان کے درمیان کھڑی کانٹوں کی دیوار کو صرف ایک شخص ہٹا سکتا ہے اور صاحب خاں ہے۔ یہ دیوار کھڑی بھی تو اسی نے کی تھی۔ شہ بانو نے اپنی محبت کے آشیانے کی جلی بجھی راکھ کو ٹٹولتے ہوئے مراد سے کہا۔

''مراد! احمد یار خاں کھرل اور تمہارے دادا صاحب خاں نے جو جنگ ہاری تھی اس کو 83 برس بیت چکے ہیں۔ آج جب ہم اس جنگ کا

ذکر کرتے ہیں تو میرے دل کو دھچکا لگتا ہے کہ ہم نے وہ جنگ کیوں ہاری لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اگر میری زندگی میں کوئی ایسی جنگ دوبارہ لڑی گئی تو میں ضرور اس میں شریک ہوں گی اور ہم وہ جنگ ہاریں گے نہیں' خواہ اس جیت کے لیے مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔''

بانو کے یہ الفاظ ایسے تھے جو اسے اس خاندان سے علیحدہ کرتے تھے جسے اس کا دادا غدار قرار دیتا تھا۔ اس نے سوچا اگر وہ یہ سب کچھ دادا سے کہہ دے اور اسے یقین دلا دے کہ شہ بانو جسمانی طور پر تو سرفراز خاں کی لڑی میں پیدا ہوئی ہے لیکن اس کی سوچ اور روح احمد یار خاں اور صاحب خاں کی لڑی جیسی ہے۔ امید کی یہی کرن تھی جس نے مراد خاں کے دل اور دماغ میں نئی روشنی پھونک دی تھی۔ یہی الفاظ جو شہ بانو کے تھے صاحب خاں نے اپنی ساری اولاد سے کہے تھے کہ وہ آزادی کی دوسری جنگ نہیں ہاریں گے۔ وہ بے جھجک اپنے دادا سے کہہ سکتا تھا کہ شہ بانو کی صورت میں کیچڑ میں ایک پھول کھلا ہے اور اس کے دادا کا فرض ہے کہ وہ اس پھول کو آزادی کے گلدستے میں سجائے۔ اس نے شہ بانو سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے دادا صاحب خاں کو راضی کرے گا کہ وہ شہ بانو کو اپنی بہو کے طور پر قبول کر لے۔

شہ بانو کو جلد خوشخبری سنانے کی تمنا لے کر وہ ملکہ ہانس سیمنٹگمری لوٹا تھا لیکن اس کی واپسی سے پہلے ہی اس کے دادا کی زندگی کا چراغ بجھ چکا تھا اور وہ وصیت لکھوا کر اس باڑ کو اور مضبوط اور ناقابل عبور بنا گیا تھا جو ان دو چاہنے والوں کے درمیان کھڑی تھی۔ وہ حیرت کے اس مقام پر کھڑا رہ گیا تھا جس میں خود فراموشی ہی کچھ سکون دیتی ہے۔ وہ لٹا لٹایا سا ملکہ ہانس آیا تھا اور چارپائی پر لیٹے لیٹے کروٹیں بدلے جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ شہ بانو کو کیا جواب دے گا۔

☆☆☆

''دادا نے کیا کہا۔'' اگلی صبح باغ میں ملاقات کے دوران شہ بانو نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' مراد نے جواب دیا اور پھر اس نے حقیقت حال واضح کرتے ہوئے دادا کی وفات اور وصیت کے متعلق شہ بانو کو بتایا تو اس نے کہا۔ ''مجھے یوں لگتا ہے کہ صورت حال تمہارے قابو میں نہیں رہی مگر میں وہی کروں گی جو میں کہہ چکی ہوں۔ مجھے ماضی کی شکست کا غم ہے۔ لیکن میں مستقبل کو ہارنا نہیں چاہتی۔ میں نے تمہارے ساتھ محبت کی ہے اور عورت زندگی میں ایک ہی بار محبت کرتی ہے۔''

''شہ بانو!'' مراد نے کہا۔ ''مرد بھی ایک ہی بار محبت کرتا ہے اور میری محبت تم ہو' میں ہر قیمت پر تمہیں حاصل کروں گا۔'' ابھی ان کا یہ پیمان ختم نہیں ہوا تا کہ شہ بانو کا رکھوالا بدحواسی کے عالم میں آیا اور اس نے بتایا کہ اکبر علی دو سواروں کے ہمراہ باغ کی طرف آ رہا ہے لہٰذا مراد فوراً یہاں سے چلا جائے۔

مراد نے گھوڑی کی لگام تھامی اور ماموں کے گھر جانے کے بجائے منٹگمری کی سمت ہوا ہو گیا۔ اس کا تعاقب اکبر علی کے سواروں نے کیا لیکن مراد کی گھوڑی کا مقابلہ عام گھوڑیاں نہیں کر سکتی تھیں۔

باپ کو سامنے پا کر شہ بانو نے پوچھا: ''میاں! کیا بات ہے۔''

''یہاں کون تھا؟'' اکبر علی نے جواب کے بجائے سوال کیا۔

”منٹگمری کے کھرل صاحب خاں کا پوتا‘ مراد خاں مجھے ملنے آیا تھا۔“ شہ بانو نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”کیا پہلے بھی کبھی آیا ہے؟“ چودھری اکبر علی نے مزید سوال کیا۔

”ہاں...... کئی بار آ چکا ہے۔“

”کیوں آتا ہے؟“

وہ خاموش رہی تو اکبر علی سمجھ گیا اور اس نے لہجہ بدل کر کہا۔ ”تم نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔“

”میں ذکر کرنے والی تھی مگر تین چار دن ہوئے اس کے دادا صاحب خاں کا انتقال ہو گیا ہے۔ مجھے یہ بتانے آیا تھا۔“ دوبارہ صاحب خاں کا نام سن کر اکبر علی دل گرفتہ ہوا اور اس نے دھیرے سے کہا۔ ”گھر چلو۔“

شہ بانو نے تھوڑی سی جرأت کا مظاہرہ مزید کیا اور کہا: ”میاں! میں خوب جانتی ہوں کہ میں چودھری اکبر علی کی بیٹی ہوں۔ ہمارے درمیان کوئی غلط بات نہیں ہے۔“

اس نے بیٹی کو تھپکی دی۔ دونوں وہاں سے نکلے تو چودھری اکبر علی نے دستگیر کو آواز دی کہ وہ گھوڑی گھر لے چلے۔ اچانک شہ بانو کو خیال آیا کہ اس کا باپ دستگیر پر سختی کرے گا کہ اس نے اسے بھروسے کا آدمی سمجھ کر شہ بانو کا رکھوالا مقرر کیا تھا اور اس نے مالک کے مقابلے میں شہ بانو کا ساتھ دیا تھا۔ اس نے مراد اور شہ بانو کی محبت اور ملاقاتوں کے متعلق چودھری اکبر علی کو نہیں بتایا تھا۔ شہ بانو نے باپ سے کہا۔

”جب میں پہلی بار مراد سے ملی تھی تو دستگیر نے مجھے روکا تھا لیکن میں نے اسے یہ کہہ دیا تھا کہ میاں کو اس بات کا علم ہے۔“ اکبر علی نے بیٹی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اچھا کیا‘ تم نے مجھے بتا دیا۔“

چودھری اکبر علی اپنے دیوان خانے میں بیٹھا نئے حالات پر غور کر رہا تھا۔ بیٹی اس کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس نے اسے ماں کی طرح پالا تھا وہ تو کبھی بیٹی سے اونچی آواز میں بولا بھی نہیں تھا۔ بھول پن میں اس کی بیٹی جو قدم اٹھا چکی تھی وہ اس کی عزت کے لیے ایک خطرہ تھا مگر مشکل یہ تھی کہ بیٹی کو کس طرح سمجھائے۔ اسی اثنا میں اس کے دونوں سوار رحمت اور برکت واپس آئے تو ان کی ناکامی پر پھٹکارنے کے بعد اس نے حکم دیا کہ اگر کبھی وہ نوجوان پھر باغ کے اردگرد نظر آئے تو اس کی ٹانگیں توڑ دیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ نوجوان کو پہچان نہیں سکے تو اکبر علی نے کہا کہ وہ اس کا حلیہ انہیں بتا دے گا۔ شہ بانو نے باپ کی تمام گفتگو سن لی تھی۔ رحمت اور برکت کے چلے جانے کے بعد شہ بانو نے باپ سے کہا کہ اگر وہ حکم دیں تو وہ مراد کو ادھر بلوا لیتی ہے‘ حلیوں میں الجھنے کی کیا ضرورت ہے۔

چودھری اکبر علی بھی بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ وہ بات سمجھ گیا اور اس نے بیٹی کو بتایا کہ اگر مراد خاں صاحب کا پوتا نہ ہوتا تو وہ اس کی پسند کی داد دیتا۔ پھر اس نے بیٹی کو بتایا کہ ان کھرلوں سے ان کی دشمنی شراب کی طرح پرانی ہے اور وہ مرتبے میں بھی ملکہ ہانس کے کھرلوں سے کم تر ہیں۔ یہ سب باتیں شہ بانو پہلے ہی سے جانتی تھی اس نے باپ کی ساری تقریر کے جواب میں اتنا کہا کہ وہ تو صرف یہ جانتی ہے کہ وطن سے محبت کی جاگیر سب سے بڑی بات ہوتی ہے۔ ”میاں“ شہ بانو نے کہا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ ہمارا ملک غیر ملکی استبداد سے آزاد ہو اور مراد خاں بھی یہی چاہتا ہے۔“

اکبر علی نے بیٹی کو منع کیا کہ وہ انگریز کے متعلق غلط باتیں نہ کرے اگر کسی کو خبر ہوگئی تو وہ سرکار کی نظروں میں گر جائے گا۔ شہ بانو نے پھر کہا کہ وہ سرکار کی نظروں سے گر کر قوم کی نظروں میں بلند ہو جائے گا تو چودھری اکبر علی نے ضد کرتے ہوئے کہا کہ مراد خاں نے شہ بانو کو بہکا رکھا ہے اور وہ جانتا ہے کہ صاحب خاں کا گھرانہ ماضی کی طرح ایک بار پھر ذلیل ہوگا۔

میاں آزادی کی دوسری جنگ نہیں ہاری جائے گی۔ شہ بانو یہ کہہ کر دیوان خانے سے نکل گئی اور چودھری اکبر علی منہ کھولے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

دوسرے ہی دن مراد خاں کو واپس آتے دیکھ کر اس کے گھر والے حیران رہ گئے۔ جب اس کی بھاوج نے اتنی جلد لوٹ آنے کی وجہ پوچھی تو مراد نے بے معنی جواب دیا۔ ’’بھابی! دادا کے بعد دل کہیں بھی نہیں لگتا۔‘‘

میرا تو خیال تھا کہ مریم تمہارا غم بھلا سکتی ہے جواب کا انتظار کیے بغیر اس کی بھاوج کھانا لینے چلی گئی بڑے بھائی نے اسے دیکھا تو کہا کہ اچھا ہوا وہ چلا آیا میاں لاہور جانے کا پروگرام بنائے بیٹھا ہے مراد خاں کو بھی یاد آیا کہ 23 مارچ کو لاہور میں زبردست جلسہ ہو رہا ہے جس میں مسلم لیگ مسلمانوں کے الگ وطن کا باقاعدہ مطالبہ کرے گی۔ پنجاب کے مسلمان اس جلسے کو کامیاب بنانے کے لیے جوق در جوق لاہور کی سمت جانے والے تھے۔ مراد خاں کے باپ احمد خاں نے مراد خاں کو جلسے میں جانے سے پہلے ایک دو روز کے اندر اندر لالہ کاشی رام سے حساب فہمی کے لیے جانے کو کہا۔ مہاجن کا بہی کھاتہ اس دور میں لکڑی کے جاتے کی طرح ہوتا تھا جو اس میں پھنس گیا بس اس سے نہ نکلا۔ مراد کو اپنے خاندان کے تمام قرضوں کی تفصیل یاد تھی۔ ادائیگیوں کا پورا حساب اس کے پاس تھا۔ کچھ زمینیں اب تک واگزار ہو جانا چاہئیں تھیں۔ اسی لیے احمد خاں لالہ کاشی رام کے پاس گیا تھا اور اسے لالہ کی نیت میں فتور نظر آیا تھا۔

مراد نے جب اپنے گھرانے کے بہی کھاتے ملاحظہ کیے اور ادائیگیوں کی فہرست سے ان کا معائنہ کیا تو مراد کو علم ہوا کہ لالہ اس کے باپ اور چچا کی لاعلمی سے ناجائز فائدہ اٹھاتا رہا ہے۔ اس نے لالہ سے تلخ لہجے میں کہا کہ حساب میں گڑ بڑ ہے اور وہ کل اپنے باپ اور چچا کو لے کر آئے گا۔ لالہ نے مراد کے تیور دیکھ کر کہا۔ ’’مہاراج کوئی بات نہیں آپ جب چاہیں آئیں۔ اگر کوئی اندراج غلط ہو یا رہ گیا ہوگا تو میں درست کر دوں گا۔ یہ حرام خور منیم دل لگا کر کام نہیں کرتا۔‘‘ اگلے روز جب حساب فہمی ہوئی تو محمد خاں اور احمد خاں نے لالہ کو کئی ادائیگیاں یاد دلائیں جو بہی کھاتے میں نہیں تھیں۔ لالہ کی دیانت داری کا بھانڈا پھوٹا تو لالہ نے منیم کو بلا کر اسے گالیاں دیں۔ منیم لالہ کی کارگزاریوں پر پردہ ڈالنے لگا تو مراد خاں نے اسے گھور کر دیکھا۔ لالہ نے بھی منیم کو کہا کہ کھرل خاندان کے حساب میں کوئی گڑ بڑ نہیں ہونی چاہیے۔ تمام سابقہ حساب بے باق ہوئے صرف پچھلے سال کا قرضہ اور مراد کی تعلیم کے سلسلے میں لی گئی رقم باقی رہ گئی۔ مراد نے لالہ سے سب کچھ لکھوا لیا تاکہ لالہ ان کی زمینیں ہی ہڑپ نہ کر جائے۔

ان دنوں پنجاب میں سر سکندر حیات کی حکومت تھی۔ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی لیکن قائد اعظم کے سمجھانے سے سر سکندر حیات نے اپنے تمام ساتھیوں سمیت مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا تھا۔ مسلم لیگ کے منشور کے خلاف کئی مسلم جماعتیں بھی تحریک آزادی کو مختلف تاویلات سے نقصان پہنچا رہی تھیں اور اقتدار میں اپنے حصے کے لیے لڑ رہی تھیں۔ 23 مارچ 1940ء کے التوا کے لیے

گورنر نے خاکسار تحریک کے ایک جلوس پر گولی چلادی جو بھاٹی دروازے سے شاہی محلے کی طرف جا رہا تھا۔ اخبارات نے اس واقعے کو بہت اچھالا تھا اور مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ 23 مارچ کو جلسے میں شامل نہ ہو سکیں۔

مراد خاں کے گھرانے کے مرد بھی اپنے دیوان خانے میں بیٹھے یہی سوچ رہے تھے کہ ان کو لاہور جانا چاہیے یا نہیں' مراد خاں کے بڑے بھائی کا خیال تھا کہ حکومت یہ جلسہ نہیں ہونے دے گی' لیکن مراد کا خیال تھا کہ انہیں جلسے سے دو روز قبل ہی بذریعہ ریل لاہور پہنچ جانا چاہیے۔ جلسہ منسوخ نہیں ہوگا کہ حکومت کا منتخب وزیر اعلیٰ خود مسلم لیگی ہے۔ گھر میں لاہور جانے کی تیاریاں اس طرح ہونے لگیں جیسے وہ جنگ جس کا ذکر صاحب خاں کیا کرتا تھا لاہور میں شروع ہو چکی ہے۔

لاہور پہنچ کر مراد خاں کے پورے قافلے نے دہلی مسلم ہوٹل انارکلی میں قیام کیا۔ اچانک انہیں 22 مارچ کو اسی ہوٹل میں مقیم چودھری اکبر علی اور منٹگمری کا رائے ریاست نظر آئے۔ سب نے سوچا کہ وہ دونوں تو مسلم لیگ کے مخالف اور انگریز کے حاشیہ بردار ہیں۔ وہ اس موقع ہی پر لاہور کیوں آئے ہیں۔ احمد خاں نے کہا کہ شاید وہ شالامار کا میلہ دیکھنے کے ارادے سے آئے ہوں وہ بھی تو منعقد ہونے والا ہے۔ چودھری اکبر علی کو بھول کر انہوں نے لاہور کا قلعہ دیکھا۔ شاہی مسجد گئے اور پھر منٹو پارک (موجودہ اقبال پارک) میں اس پنڈال کا جائزہ لیا جو تاریخی جلسے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ واپسی پر انہوں نے خلیفہ کبابوں والے کے کباب کھائے۔ ہر کوئی مسلم لیگ' قائداعظم اور انگریز بہادر پر تبصرے کر رہا تھا۔ حیات اور مراد خاں واپسی پر کچھ پیچھے رہ گئے تھے کہ اچانک مراد کو پروفیسر مرزا اسلم مل گئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں وہ ان سے پڑھتا رہا تھا اور وہ مراد خاں کو بڑا عزیز رکھتے تھے۔

دونوں راوین کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ ناگاہ سامنے کی دکان پر کھڑے ایک شخص کی جیب سے ایک جیب تراش نے بٹوہ نکال لیا۔ مراد پوری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس نے پروفیسر صاحب کو ''ایک منٹ'' کہا اور لپک کر جیب تراش کو دکان کی سیڑھیوں ہی پر دبوچ لیا۔ جیب کترا بڑا مضبوط اور ہٹا کٹا تھا لیکن وہ ٹکریں مارنے اور داؤ پیچ لڑانے کے باوجود مراد کی گرفت سے نہ نکل سکا۔ پورا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ فطری بات ہے کہ دکان پر موجود ہر شخص نے اپنی اپنی جیب ٹٹولی کہ کس کا نقصان ہوا ہے۔ مراد خاں کے لیے یہ مقام حیرت تھا کہ بٹوے کا مالک چودھری اکبر علی نکلا۔ مراد خاں نے جیب تراش کو بٹوے سمیت چودھری اکبر کے حوالے کیا۔ رقم کے علاوہ چودھری اکبر کے ضروری کاغذات بھی بٹوے میں تھے۔ رائے ریاست نے جب چودھری اکبر علی کو بتایا کہ اس کا محسن صاحب خاں کھرل کا پوتا مراد خاں ہے تو اس نے شفقت سے رکھا ہوا اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے مراد خاں کے کندھے سے اتار لیا۔ مراد خاں پھر سے پروفیسر صاحب سے باتیں کرنے لگا۔ چودھری اکبر نے ہوٹل کی طرف بڑھتے ہوئے ایک بھرپور نظر مراد خاں پر ڈالی۔

اسی شام چودھری اکبر علی نے رائے ریاست سے پوچھا کہ اس کا بیٹا کیا کر رہا ہے اور کیا اس نے اس کا رشتہ کہیں طے کیا ہے۔ رائے ریاست علی بھی ایک کائیاں شخص تھا وہ چودھری اکبر علی کا مدعا سمجھ گیا۔ اس نے کہا کہ اس کا بیٹا شوکت بڑا سعادت مند ہے اور وہ چودھری اکبر خاں کے سارے بوجھ اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چودھری اکبر خاں نے کہا کہ چلو ہم اس طرح دوستی سے ایک قدم اور آگے بڑھیں گے۔

23 مارچ کے دن منٹو پارک میں جہاں تک نظر جاتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آ رہے تھے۔ سبز ہلالی پرچم اڑانی سروں سے بلند لہرا رہا تھا۔

مراد خاں کا خاندان اسٹیج کے قریب بیٹھا محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں 83 سال بعد نئی جنگ کا آغاز ہو چکا ہے اور سب اس میں شریک ہیں۔ قائدین کی تقریریں لوگوں کا لہو گرما رہی تھیں۔ مسلمانوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ بے شمار مسائل پر روشنی ڈالنے کے بعد وہ قرارداد منظور کی گئی جو قیام پاکستان کی پہلی اینٹ ثابت ہوئی۔ جذباتی انداز میں مراد نے اپنے چچا سے کہا:

’’چاچا اگر موت چند دن صبر کر لیتی اور دادا اس جلسے کو دیکھ لیتا تو اس کی روح کو کس قدر سکون ملتا۔ وہ دنیا سے شکست کا داغ لے کر رخصت ہوا۔‘‘

محمد خاں نے اپنے بھتیجے کی پشت پر ہاتھ رکھا اور کہا:

’’بیٹے! وہ اس وصیت کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے تھے کہ ہم یہ جنگ نہیں ہاریں گے۔‘‘

’’بے شک ہم جنگ نہیں ہاریں گے۔‘‘ مراد خاں نے یہی الفاظ دل ہی دل میں اس نے دوبارہ شہ بانو کی طرف سے بھی ادا کیے۔

23 مارچ کی قرارداد پورے ہندوستان کے لیے ایک دھماکہ ثابت ہوئی۔ کانگرس، ہندو مہاسبھا، جن سکھی اور دوسری کئی جماعتوں نے مسلم لیگ کی اس قرارداد کی مخالفت شروع کر دی۔ وہ نیشنلسٹ مسلمان کے لوگوں کے حواری تھے کھل کر مسلم لیگ کے سامنے آ گئے۔ ہر رنگ و نسل کے ہندو نے مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے مطالبے کو دیوانے کا خواب سمجھا۔ قائداعظم کی شان میں گستاخیاں کی گئیں۔ بھلا ہندو ساہوکاروں کو یہ کس طرح گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ مسلمانوں کو اپنے چنگل سے آزاد کر دیں۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار لالہ کاشی رام رائے ریاست سے منٹگمری میں اپنی دکان پر بیٹھا کر رہا تھا۔ رائے ریاست نے کاشی رام سے قرض لینا تھا لہٰذا وہ خوشامدانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

’’کیا بات کرتے ہو کاشی رام! ملک بنانا کوئی خالہ جی کا واڑہ ہے۔‘‘

’’ہندو مسلم صدیوں سے مل جل کر رہتے آ رہے ہیں۔ انہیں بھلا کون ایک دوسرے سے جدا کر سکتا ہے، لیکن مسلم لیگ نے دونوں قوموں کے درمیان دراڑ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔‘‘ لالہ کاشی رام نے جواب دیا۔

’’کاشی رام! کسی دیوار پر لکیر کھینچ دینے سے دراڑ تھوڑا پڑ جاتی ہے۔ ابھی تو ہندوستان میں انگریز کی حکومت ہے اور میرے خیال میں وہ جانے والا نہیں۔‘‘

’’نہیں رائے صاحب! انگریز کو تو جانا ہی چاہیے۔ سالا کب تک ہم پر راج کرتا رہے گا۔‘‘ کاشی رام نے کانگرسی لہجے میں بات کی اور مزید کہا۔ ’’ہٹلر نے ہندوستان پر حملہ کرنے کا اعلان کیا ہے لیکن انگریز کی ہڈی بڑی سخت ہے ہندوستان کا مال کھا کھا کر پل گیا ہے۔‘‘ یک لخت اسے خیال آیا کہ رائے ریاست اس کی دکان پر سیاست کی بات کرنے نہیں آیا۔ ویسے بھی اس کی دکان ساہوکار کا کام کرتی ہے سیاست کا کاروبار نہیں۔ اس نے پوچھا کہ رائے صاحب آنا کیسے ہوا۔

کاشی رام کو رائے ریاست نے فخر سے بتایا کہ وہ اپنے لڑکے رائے شوکت کا رشتہ ملکہ ہانس کے چودھری اکبر علی کی اکلوتی بیٹی سے کر رہے ہیں۔ دھوم دھام سے منگنی کرنے کے لیے انہیں رقم چاہیے۔ کاشی رام نے رائے ریاست سے کہا کہ اس رشتے سے تو اس کے نصیب کھل جائیں گے۔

ساتھ ہی اس نے رائے ریاست کی نالے والی زمین گروی رکھی اور پانچ ہزار روپے رائے ریاست کے ہاتھ میں تھما دیے۔ رائے ریاست کے جانے کے بعد لالہ نے اپنے منیم سے کہا کہ رائے ریاست نے بڑا لمبا ہاتھ مارا ہے لہٰذا تھوڑا سا ہاتھ اندراجات میں وہ بھی مارے۔ منیم نے پہلی تحریر کے آگے ہی لکھا کہ اگر رائے ریاست تین ماہ کے اندر قرض اور سود ادا نہ کر سکے تو اسے زمین پر کوئی اختیار نہیں رہے گا۔

☆☆☆

گندم کی کٹائی کے بعد مراد خاں کے دل میں ملکہ ہانس جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ اکبر علی سے اس کی لاہور میں جو ڈرامائی ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد چودھری اکبر خاں کا رویہ اس کے بارے میں بدل گیا ہوگا۔ وہ اگلے روز دن کے دس بجے ملکہ ہانس پہنچ گیا۔ باغ کو پانی لگاتے ہوئے دستگیر اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے اس بات کا کوئی فکر نہ تھا کہ چودھری کا کوئی کاما اسے ادھر دیکھ لے گا۔ یہ جان کر اسے یک گونہ راحت ہوئی کہ اکبر خاں نے شہ بانو پر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی۔ ملاقات ہونے کے امکان پر دستگیر نے کہا کہ وہ شام کے بعد اس کے گھر میں بی بی سے مل سکتا ہے۔ شام تک کے لیے وہ ماموں کے گھر چلا گیا جہاں گھر میں اسے اکیلی مریم ہی ملی۔ اس نے اسے پوچھا کہ کیا وہ پچھلی دفعہ کی طرح چپکے سے واپس بھاگنے کے لیے تو گھوڑی پر نہیں آیا۔ ممانی بھی پڑوس سے آ گئی۔ کھانا کھا کر وہ شام کے انتظار میں سو گیا۔

شام کے اندھیرے چھا جانے کے بعد وہ بچتا بچاتا' چھپتا چھپاتا جب دستگیر کے گھر پہنچا تو لالٹین کی روشنی میں اس نے دستگیر کے چہرے کو بدلا ہوا پایا۔ دستگیر نے اسے خود ہی بتایا کہ حویلی میں بازی الٹ گئی ہے۔ منٹگمری سے رائے ریاست' شہ بانو کے لیے اپنے بیٹے کی منگنی کا شگن لے کر آیا ہوا ہے۔ اس کی بیوی اور بیٹا بھی ساتھ ہی ہیں مگر چھوٹی بی بی نے منگنی سے انکار کر دیا ہے۔

مراد کا دل اس ناشدنی کا سن کر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے رائے ریاست اور چودھری اکبر خاں کا اکٹھے ہوٹل میں رہنا اور گھومنا یاد آیا۔ یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اکبر خاں کو مراد اور شہ بانو کا ملنا پسند نہیں آیا تھا اور اب آئندہ بھی وہ کبھی ان دونوں کو ملنے نہیں دے گا۔ تاہم یہ بات اس کے حق میں جاتی تھی کہ شہ بانو نے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ دستگیر نے یہ بھی بتایا کہ موقع ملتے ہی بی بی مراد سے ملاقات کے لیے اس کے گھر آنے والی ہے۔

دونوں کی ملاقات رات گئے ہوئی۔

شہ بانو نے مراد سے کہا: ''مراد! میاں میری منگنی رائے ریاست کے بیٹے شوکت سے کرنا چاہتا ہے مگر اسے صاحب خاں کے پوتے سے بیٹی کا رشتہ منظور نہیں اور میں نے شوکت سے منگنی کرانے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ لوگ زیور کپڑے اور قریبی رشتہ داروں کے لیے جوڑے لے کر آئے ہیں۔ میرے لیے ایک قیمتی سکارف جس پر سنہری تاروں سے ''ایس'' کاڑھا ہوا ہے مٹھائی بھری ٹوکریوں کے ساتھ لائے ہیں۔ میں نے میاں سے کہا ہے کہ میں اکبر علی جیسے راٹھ چودھری کی بیٹی ہوں اور اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہوں اور کسی ایسے لڑکے سے منگنی نہیں کرا سکتی جسے میں جانتی تک نہیں۔ اس بات پر میاں کو غصہ آیا۔ اس نے مجھے دھمکایا لیکن میں اپنی بات پر اڑی رہی۔ اب میاں میری خوشامد پر اتر آیا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی عزت رکھنے کی خاطر میں منگنی قبول کر لوں کیونکہ منگنی کوئی نکاح تو نہیں کہ ٹوٹ نہ سکے۔''

''تم نے میاں کو جواب دیا ہے۔'' مراد نے کہا۔

میں نے صبح تک جواب دینے کا وقت مانگا ہے‘ میاں دیوان خانے چلا گیا تو میں ادھر تمہاری طرف آ گئی۔ راستے میں‘ میں نے سوچا کہ اگر تم اجازت دو گے تو میاں کا بھرم رکھنے کے لیے انگوٹھی پہن لیتی ہوں۔ باقی نکاح تو دور کی بات ہے۔''

مراد خاں نے اسے بخوشی اپنے باپ کا بھرم نبھانے کی اجازت دے دی۔ مراد سے رخصت ہوتے وقت شہ بانو وہ ولایتی رومال جس پر ''ایس'' کاڑھا گیا تھا مراد کو اپنی طرف سے تحفہ دیا۔

عقبی دروازے سے نکل کر مراد نے ابھی گلی میں پاؤں ہی رکھا تھا کہ وہ ایک پرچھائیں دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ وہ رائے شوکت تھا۔ مراد اسے پہچاننے کے باوجود رکا نہیں۔ شوکت بھی اسے دیکھ کر نقش حیرت بن گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر عقبی دروازے سے نکلنے والا مراد خاں تھا تو وہ اس وقت یہاں کیا کر رہا تھا۔ کئی خیالات‘ کئی وسوسے اور کئی امکانات شوکت کے ذہن میں ابھرے اور بیٹھ گئے۔ وہ بے خیالی میں اسی سمت ہولیا جدھر مراد گیا تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ مراد کے ننھیال بھی تو ملکہ ہانس میں ہیں اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ماموں کے ہاں ہی مراد کی شادی ہونے والی ہے لیکن وہ نکلا تو اکبر خاں کی حویلی سے تھا؟ پھر اسے یہ بھی خیال آیا کہ نکلنے والا ملازموں کی کوٹھڑیوں والے دروازے سے نکلا ہے اور مراد خاں کو بھلا اکبر خاں کے ملازموں سے کیا واسطہ۔ وہ کوئی اور ہی تھا‘ مراد خاں نہیں تھا۔

مزید سن گن لینے کے لیے مراد دو دن کے لیے ملکہ ہانس ہی میں رک گیا۔ ایک روز موقع پا کر مریم نے اس سے پوچھا کیا اسے معلوم ہے کہ گھر والے کیا سوچ رہے ہیں۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' مراد خاں نے پوچھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے‘ اپنا خیال نہیں بتاؤ گے؟'' مریم نے پوچھا۔

''اگر میرا خیال پوچھتی ہو تو دنیا کے رشتے رسمی ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ گھر گرہستی اور میاں بیوی یہ سارے معاملے زندگی کے عام دستور سے تعلق رکھتے ہیں مگر میں تمہیں ان رشتوں ناتوں سے کہیں بلند مقام پر دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''رشتے ناتے سے بلند مقام کون سا ہو سکتا ہے۔'' مریم نے پوچھا۔

''دوستی کا مقام رشتے ناطے سے اونچا ہوتا ہے۔''

''میاں بیوی بھی دوست ہو سکتے ہیں۔''

''عام طور پر میاں بیوی‘ میاں بیوی ہی رہ جاتے ہیں۔ دوست دوست کے لیے قربانی دیتا ہے۔ دوستی کا رشتہ ازدواجی رشتے سے کہیں بلند اور کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے۔

جس جذبے اور جوش و خروش سے مراد نے یہ بات کہی تھی اسی جوش و جذبے کے ساتھ مریم نے جواب دیا: ''پھر میں تمہیں دوست بھی بن کر دکھاؤں گی۔'' اس پر دونوں نے ہاتھ ملا کر دوستی کو پکا کیا۔

سرفراز خاں کی لڑکی کے کھرل مراعات یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے عموماً وہ اپنے ہی خاندان میں رشتے ناتے کرتے تھے۔ شاہ

بانو کا رشتہ راجپوتوں میں طے ہوا تھا اور ملکہ ہانس کے علاوہ منٹگمری کے زمیندار اس رشتے پر تعجب کا اظہار کر رہے تھے۔ اکبر خاں نے رائے ریاست سے کہہ دیا تھا کہ شادی شوکت کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہوگی اور تعلیم کا مطلب بی اے کرنا تھا جبکہ رائے شکوت بیماری کی وجہ سے ایف اے کا امتحان بھی نہیں دے سکا تھا۔ رائے ریاست کا منصوبہ یہ تھا کہ جلد از جلد بیاہ ہو جائے خواہ اسے رہی سہی زمین بھی رہن رکھنی پڑے کیونکہ ایک راٹھ چودھری کے ہاں برأت لے کر جانا اور ولیمہ کرنا ایک بہت بڑا مرحلہ تھا۔

(سلمٰی رعنا اردو ڈائجسٹ اگست 1997ء)

پاکستان عالمی سازش کے نرغے میں

طارق اسماعیل ساگر کے چشم کشا مضامین کا مجموعہ...... جن میں پاکستان کو لاحق تمام اندرونی و بیرونی خطرات و سازشوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ 4 اگست 2009 کے موقع پر، پاکستانی نوجوانوں کو باشعور کرنے کی کتاب گھر کی ایک خصوصی کاوش...... درج ذیل مضامین اس کتاب میں شامل ہیں: پاکستان پر دہشت گردوں کا حملہ، 20 ستمبر پاکستان کا نائن الیون بن گیا، دھماکے، وطن کی فکر کر ناداں!، پاکستان عالمی سازش کے نرغے میں، حکمتِ عملی یا سازش، طالبان آ رہے ہیں؟، محلاتی سازشوں کے شکار، ابھی تو آغاز ہوا ہے!، بلیک واٹر آرمی، اکتوبر سرپرائز اور ”کشمیری دہشت گرد“، سازشی متحرک ہو گئے ہیں!، وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے!، پاکستان کے خلاف ”گریٹ گیم“، حمیت نام تھا جس کا......، آئی ایم ایف کا پھندہ اور لائن آف کامرس، آئی ایس آئی اور ہمارے اربابِ اختیار، ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا اغواء، کمانڈو جرنیل بالآخر عوام کے غضب کا شکار ہو گیا، انجامِ گلستاں کیا ہوگا؟، خون آشام بھیڑیے اور بے چارے پاکستانی، عالمی مالیاتی ادارے، چلیے تو کٹ ہی جائے گا سفر!، APDM، سکے جمع کرنے کا شوق، اب کیا ہوگا؟، الیکشن 2008ء اور تلخ زمینی حقائق، کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟، آمریت نے پاکستان کو کیا دیا، ہم کس کا ”کھیل“ کھیل رہے ہیں!، نئی روایات قائم کیجئے، نیا پنڈورا باکس کھل رہا ہے، قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند!، خوراک کا قحط!، 10 جون سے پہلے کچھ بھی ممکن ہے؟، پہنا گئی درویش کو تاجِ سرِ دارا، کالا باغ ڈیم منصوبے کا خاتمہ، بے نظیر کا خون کب رنگ لائے گا؟، صدر کا مواخذہ، صدر کو اہم مسائل کا سامنا ہے، جناب صدر! پاکستانیوں پر بھی اعتماد کیجئے!، نیا صدر...... نئے چیلنج اور سازشیں، 23 مارچ کا جذبہ کہاں گیا؟، امریکہ، امریکہ کی عسکری اور بھارت کی آبی جارحیت، امریکی عزائم اور ہماری بے بسی، پاکستانی اقتدارِ اعلیٰ کا احترام کیجئے!، امریکہ کی بڑھتی جارحیت، ہماری آنکھیں کب کھلیں گی؟، وقتِ دعا ہے!، امریکی جارحیت کا تسلسل، جارحانہ امریکی یلغار اور بھارتی مداخلت، وزیراعظم کے دورے، عالمی منظر نامہ بدل رہا ہے، باراک اوباما، ممبئی لرز اٹھا، بھارت خود کو امریکہ سمجھ رہا ہے، بھارت سے ہوشیار، مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی نئی لہر

اس کتاب کو پاکستان کی تاریخ اور حالات حاضرہ سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

عشو پگلی

وہ اپنی دھن میں ’’پاکستان زندہ باد‘‘ اور ’’پاکستان جانا ہے‘‘ کے نعرے لگاتی تھی اور پھر ایک معجزہ رونما ہوا۔

تقسیم ہند کے پس منظر سے جنم لینے والی ایک عبرت خیز داستان

میرے لڑکپن کے ڈھائی تین برس میرٹھ چھاؤنی کے صدر بازار کی اس چھوٹی سی گلی میں آتے جاتے گزرے تھے۔ گلی میں دائیں طرف ہمارے مولوی ذکی صاحب کا مدرسہ تھا جس میں‘ میں نے جماعت سوم تک تعلیم حاصل کی۔ اور بائیں طرف حاجی حافظ نور محمد جنرل مرچنٹ کی دکان تھی۔ یہ دو بڑے دروں والی دکان بازار کی طرف کھلتی تھی جبکہ مدرسے کے دروازے گلی کے اندر تھے۔ گلی کے آخر میں درمیانے درجے کا ایک مکان تھا جو ایک کندھا مدرسے کی دیوار کے ساتھ اور دوسرا جنرل سٹور کی پشت سے لگائے کھڑا تھا آگے گلی بند تھی۔ اس مکان میں ایک لمبی سفید ڈاڑھی والے عالم دین رہتے تھے جو کبھی کبھار مدرسے میں تشریف لا کر ہمارے‘ کالی سفید کھچڑی ڈاڑھی والے مولوی ذکی صاحب سے بحث مباحثہ کیا کرتے جسے ہم لڑکے بالے بڑی حیرت مگر دلچسپی سے سنا کرتے۔

ادھر حاجی حافظ نور محمد کے دونوں جوان اور شادی شدہ صاحبزادے ایک ہندو ملازم کے ساتھ دکان کا سامان جمع کرنے اور اسے تھوک اور پرچون پر فروخت کرنے میں ہمہ وقت مصروف نظر آتے‘ لیکن ’’حاجی صاحب‘‘ دکان سے محض اتنا ناطہ رکھتے کہ صبح ساڑھے آٹھ نو بجے بیٹوں کے ساتھ دکان کھولی اور پھر وضو کر کے اپنی مخصوص گدی پر چوکڑی جما لیتے اور ایک بڑا سا قرآن ڈھلوان صندوقچی پر رکھ کر تلاوت میں محو ہو جاتے۔ ان کی گدی کے چبوترے کو لکڑی کے ایک خوشنما چھجے نے گھیر رکھا تھا‘ جس کے آگے سڑک پر گزرنے والے‘ کیا مسلمان کیا ہندو‘ انہیں احترام سے تکتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ تلاوت لگاتار جاری رہتی۔ عین بارہ بجے حاجی صاحب دکان سے اٹھ کر تھوڑی دور واقع اپنی رہائش گاہ پر دوپہر کے کھانے اور ظہر و عصر کی باجماعت نمازوں کے دوران آرام کرنے کے لیے چلے آتے۔ دن ڈھلے وہ دوبارہ دکان پر آ بیٹھتے۔

حاجی صاحب کی شام کی ایک ’’عبادت‘‘ بھی دور دور تک لوگوں کو معلوم تھی۔ لڑکے لڑکیاں دکھتی ہوئی آنکھیں لے کر اپنے والدین یا بھائیوں کے ساتھ حاجی صاحب کی خدمت میں پیش ہوتے اور وہ مریض کو اسی تلاوت والی گدی پر لٹا کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیتے اور صندوقچی کا ڈھلوان ڈھکنا اٹھا کر سفید سفوف کی پڑیا نکال کر دکھتی آنکھوں میں چٹکی چٹکی ڈال دیتے اور پپوٹے بند کر کے کوئی دعا پڑھتے اور دونوں آنکھوں پر دم کر کے ہدایت کرتے کہ رات بھر آنکھیں نہ کھولیں۔ مریض رات بھر کے لیے ’’نابینا‘‘ بن کر اپنے کسی بڑے کا ہاتھ پکڑے گھر جاتا۔ صبح جاگ کر حقے کے باسی پانی سے آنکھیں دھو کر کھولتا اور صرف تین راتوں کی چٹکیوں سے آنکھیں صاف شفاف ہو جاتیں۔

عشرت آرا انہیں حاجی صاحب کی بیٹی تھی اور وہی تھی جس کے غم نے حاجی حافظ نور محمد کے وجود کو اتنا پگھلا کے رکھ دیا تھا کہ اکثر اوقات تلاوت پاک کے دوران ان کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ وہ ضبط کر کے آنسو روکنے کی کوشش کرتے مگر کبھی کبھی ان کی عینک کے بیضوی شیشوں کے پیچھے رحمدل آنکھوں میں دو موتی سے گرتے اور ان کے نورانی چہرے اور زردی مائل بھوری ڈاڑھی میں گم ہو جاتے۔ کبھی کبھی سیلاب اشک زوروں پر ہوتا تو مقدس مصحف کا ورق بھیگنے لگتا اور حاجی صاحب کچھ دیر کے لیے قرآن پاک بند کر کے تلاوت روک دیتے۔ عشرت آرا ذہنی توازن کھو چکی تھی اور صدر بازار کے علاقے میں عشو پگلی کے نام سے جانی جاتی تھی!

مدرسے کے دور میں، میں اور میرے کچی عمر کے سنگی ساتھی حاجی صاحب کے آنسوؤں کا مفہوم سمجھتے تھے نہ مولوی صاحب اور ان جبہ و دستار والے عالم دین کے مابین نوک جھونک کا مطلب اور نہ یہ علم رکھتے تھے کہ ستائیس اٹھائیس برس کی جس پاگل عورت کو صدر کی سڑکوں پر دیکھ کر ہم دیوانہ وار چلانے لگتے...... ''عشو پگلی...... عشو پگلی!'' وہ انہی قابل احترام حاجی صاحب کی صاحبزادی ہے جن کی چٹکیوں سے ہماری دکھتی آنکھیں ٹھیک ہوتی تھیں۔ لیکن جوں جوں وقت آگے بڑھتا گیا اور میں مدرسے سے نکل کر ہائی اسکول اور پھر کالج جا پہنچا، بھیدوں کی یہ گرہیں ہمارے ذہنی شعور کے سامنے کھلتی گئیں...... مجھے کالج جاتے ہوئے تیسرا سال شروع ہونے کو تھا اور تین جون 1947ء کی شب آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے برصغیر کے مسلمانوں اور ان کے ساتھ دنیا بھر کے لوگوں نے محمد علی جناح کی زبانی سن لیا تھا کہ چودہ اگست 1947ء کو ایک نئی آزاد اور خود مختار اسلامی ریاست پاکستان وجود میں آ جائے گی...... اب مجھے مولوی ذکی اور عالم دین کی چشمکوں کا پس منظر بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ہمارے استاد محترم تو جناح اور مسلم لیگ کے مطالبے کے کٹر حامی تھے اور سفید ریش مولانا، گاندھی جی اور نہرو کے طرفدار اور ہندوستان کے بٹوارے کے سخت مخالف تھے۔ اور یہ کہ حاجی حافظ نور محمد کی مترحم آنکھوں سے جھڑیاں کیوں اور کس کے لیے برسنے لگتی تھیں۔ ان کے ولی اور میرٹھ کی پنجابی سوداگران کی برادری کے اکثر گھرانے نقل وطن کر کے پاکستان کو اپنا نیا اور دائمی وطن بنانا چاہتے تھے۔ خود حاجی صاحب کے دونوں بیٹوں اور بہوؤں نے تجویز رکھ دی تھی کہ اب پاکستان چل کر گھر بسانے کی تیاری کی جائے۔ دونوں چھوٹی بیٹیوں اور دامادوں نے بھی دلی کو خیر باد کہہ کر لاہور، راولپنڈی یا کراچی کو منزل مقصود ٹھہرایا تھا۔ ان کے لیے سب سے بڑی بہن...... عشرت آرا جو لاکھ قدغنوں کے باوجود گھر سے نکل کر صدر کی سڑکوں پر مجذوبوں، دیوانوں کی طرح گھومنے لگتی، اب اسی قابل تھی کہ صبر کی سل سینوں پر رکھ کر اسے بھول جائیں اور خدا ترس بندگان خدا کے ٹکڑوں اور طفلان شہر کے سنگریزوں اور آوازوں کے سپرد کر کے خاموشی سے پاکستان کی طرف روانہ ہو جائیں۔

مگر دوسروں کے بچوں اور بچیوں کی دکھتی آنکھوں میں شفقت کے ساتھ شافی چٹکیاں ڈال کر انہیں ٹھنڈک پہنچانے والے حاجی صاحب کے لیے جو اپنی پہلوٹھی کی نور نظر کے پاگل پن کی وجہ سے درد والم کی آگ اپنے سینے میں چھپائے نہ چھپا پائے تھے، اس آتش دروں کی تپش اس وقت دو چند ہو جاتی جب عزیز و اقارب تو ایک طرف خود اپنی اولاد بھی عشرت آرا کے وجود کی نفی کرنے لگتی! حاجی صاحب کا بھرپور ساتھ صرف ان کی اہلیہ محترمہ دے رہی تھیں۔ ماں تھی آخر۔ اپنی کوکھ سے پھوٹی شاخ کو...... چاہے دیوانی تھی یا فرزانی...... مامتا کے پیڑ سے کاٹ کر کیسے پھینک دیتی! اس بے چاری نے تو نو برس پہلے اس وقت رو رو کر برا حال کر لیا تھا جب ڈاکٹروں نے عشرت آرا کو تیزی سے ''عشو پگلی'' بنتے دیکھ کر حاجی صاحب سے کہا

تھا کہ بیٹی کو آگرے کے مینٹل اسپتال میں داخل کرادو کہ شاید وہاں اس کی جنونی کیفیت ٹھیک ہو جائے یا کم از کم دھیمی پڑ جائے...... ورنہ خدشہ ہے کہ عشو بیٹی ذہنی عدم توازن کے اس مقام پر پہنچ جائے جہاں سے اسے واپس لانا ممکن نہ رہے گا' تاہم اماں بی کے واویلے اور آہ و فغان کے سامنے سب نے ہتھیار ڈال دیے۔ اماں بی نے بلک بلک کر کہہ دیا کہ اگر میری عشو کو میری نظروں سے دور بھیجا تو میں اپنا گلا گھونٹ لوں گی! ماں بے چاری نے اپنا کہا تو منوا لیا لیکن بیٹی کو روز بروز پاگل تر ہونے سے نہ روک سکی۔

1947ء تک مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ دیوانی جسے چند برس پہلے میں اپنے ہم عمروں کے ساتھ ''عشو پگلی' عشو پگلی'' کہہ کر چھیڑا کرتا تھا' ہمارے مدرسے کی گلی والے حاجی صاحب کی بیٹی ہے...... اور عشو پگلی کے پاگل پن کا پس منظر اپنی جگہ ایک المناک داستان ہے...... پہاڑ گنج' دہلی کے خوشحال تاجر کمال الدین کی حاجی حافظ نور محمد سے قرابت داری تھی۔ پنجابی سوداگران کی برادری میں دونوں گھرانے عزت کا مقام رکھتے تھے۔ کمال الدین دلی میں قطب روڈ پر سوت گولے کا تھوک کاروبار کر کے ''کھاتے پیتے'' کہلاتے تھے اور حاجی صاحب میرٹھ چھاؤنی کی ایک بڑی دکان چلا کر خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس وقت اس برادری میں لڑکیوں کو گھر پر ناظرہ قرآن اور تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا سکھا دینا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ اور لڑکوں کو محض چھٹی ساتویں جماعت تک اسکول کی شکل دکھا کر ''ابا جی'' اور ''دادا جی'' کے ساتھ دکان پر بٹھا لیا جاتا تھا! کمال الدین کا بڑا بیٹا فضل الدین چوتھی جماعت کو ہاتھ لگا کر ہی اسکول سے بھاگ نکلا تھا اور ابا جی کے ساتھ دکان پر بیٹھنے لگا تھا۔ تنومند' جوان' خوبرو اور لمبا تڑنگا...... جہاں باپ کے کاروبار میں طاق ہوتا جا رہا تھا وہاں کنکوئے اڑانا' تاش کی بازیاں جمانا اور چھپ چھپا کر دوستوں کے ساتھ چاوڑی بازار کے بکاؤ حسن کی جھلکیاں دیکھ آنا بھی سیکھ چکا تھا۔ وہ بائیس تیئس برس کا ہوا تو خیر خواہوں نے کمال الدین کو صلاح دی کہ لڑکے کو کسی کھونٹے سے باندھ دو مبادا زیادہ بگڑ جائے۔ سو ادھر دلی میں کمال الدین کو برادری میں کسی اچھی لڑکی کی تلاش تھی۔ ادھر میرٹھ چھاؤنی کے حاجی صاحب اور ان کی اہلیہ کو قد نکالتی ہوئی پہلوٹھی کی بیٹی عشرت آرا کی شادی کی فکر تھی جس کے مناسب اعضا اور کتابی چہرے کو آٹھ برس کی عمر میں چیچک کے داغ بھی نہ گہنا سکے تھے۔ عشو نے چھوٹی عمر ہی میں ناظرہ قرآن پڑھ لیا تھا بلکہ اپنے حافظ قرآن والد کی فرمائش پر چند بڑی چھوٹی سورتیں ازبر بھی کر لی تھیں۔ عشو کی تربیت دینداری کے ماحول میں ہوئی تھی مگر اپنی ہمجولیوں میں بیٹھ کر ہنس کھیل لینے یا نعتیں اور قوالیوں میں گائی جانے والی غزلیں گنگنا لینے سے بھی اسے کسی نے روکا نہیں تھا۔ اگر ایک طرف عشو ''میرے مولا بلا لو مدینے مجھے'' ''آمنہ کا لال دیکھ حوروں کی گودی میں کھیلے'' جیسی نعتیں بڑی دلکش آواز میں پڑھ کر بڑی بوڑھیوں کی فرمائش پوری کر دیتی تو دوسری طرف سکھیوں کی ٹولی میں بیٹھ کر کلن خان میرٹھی قوال کی گائی ہوئی

وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دست ناتواں سے
اسی دن کا آسرا تھا مجھے مرگ ناگہاں سے

اور ایسی ہی دوسری غزلیں بھی بڑی پرسوز آواز میں سنا دیتی۔

ان دنوں جب دلی والے اپنے بیٹے کے لیے اور میرٹھ والے اپنی بیٹی کے لیے رشتہ تلاش کر رہے تھے' دونوں گھرانوں کو علم نہ تھا کہ عشرت آرا نے ایک خوشی کی تقریب میں' جس میں کمال الدین اور حاجی حافظ نور محمد دونوں کے گھرانے شریک تھے' قوالی کی محفل کے دوران چقوں کے پیچھے بیٹھی

خواتین کے جھرمٹ میں شامل ہو کر قوال کی گائی ہوئی جگر مراد آبادی کی غزل۔

اے جذبہ دل جب میں چاہوں ہر چیز مقابل آ جائے
منزل کی طرف دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے

سنی تو اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کے سامنے آ گیا تھا۔ دلی کا بانکا' سجیلا جوان فضل الدین اپنے والد اور تایا کے ساتھ فرشی نشست پر قوالی پارٹی کے نزدیک بیٹھا تھا۔ صحن میں برقی بلب روشن تھے اور ان کی روشنی میں مرد سامعین کے چہرے چقوں کے پیچھے بیٹھی خواتین کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ فضل الدین ان لمحوں میں عشرت آرا کے دل میں گہرائی تک اتر گیا۔ اس نے ادھر ادھر سے سن گن لے رکھی تھی کہ ابا جی اور اماں جی اس کے بیاہ کے بارے میں باتیں کرنے لگے ہیں۔ سو اس کا جی چاہا اور تحت الشعور سے یہ دعا اور تمنا کی کونپل بھی پھوٹ پڑی کہ کاش دلی کے یہ رشتے دار اس دل میں کھب جانے والے خوبرو شہزادے کے لیے میرا ہاتھ مانگ لیں...... اور عشرت آرا کی دعا قبول ہو گئی! کمال الدین اور اس کی بیوی ایک دن میرٹھ چھاؤنی کے اس پارسا اور معزز گھرانے کے ساتھ سمدھیانے کا رشتہ جوڑ آئے۔ عشرت آرا کو گویا دونوں جہانوں کی دولت مل گئی! آنے والے حسین دنوں کے تصور میں کھو کر وہ اللہ کی رحمتوں کی پشت پناہی ہر دم اپنے ساتھ رکھنے کے لیے ایک سے ایک بڑھ کر نعت رسولؐ اور سہیلیوں پر اپنی مسرت کے اظہار کے لیے تازہ بہ تازہ اور مقبول غزلوں کو لہک لہک کر سنایا کرتی...... چند ماہ بعد عشرت آرا کی شادی اور رخصتی ہو گئی۔ اب وہ محاورے کے مطابق ''جنازہ اٹھنے تک'' پہاڑ گنج دہلی والی سسرال میں جا بسی تھی۔

لیکن عشرت آرا کو جناہ اٹھنے تک تو کیا' دو سال پورے بھی سسرال میں گزارنے نصیب نہ ہوئے...... فضل الدین کو قوالی کی اس رات ذرا بھی علم و ادراک نہ ہوا کہ چق کے پیچھے کوئی اپنی خرد و ہوش اس کی الفت میں مبتلا ہو کر لٹا بیٹھا ہے! وہ تو عادی تھا نئی دلی کے کناٹ پلیس میں گھومتی پھرتی بے حجاب ''تتلیوں'' کو دیکھنے کا...... چاندنی چوک میں اٹھلا اٹھلا کر چلنے والی بے باک رعنائیوں کا...... اور چاوڑی بازار کے توبہ شکن اور زہد دشمن عشووں غمزوں کا...... بھلا یہاں پردے کے پیچھے شرم و حیا سے ہنسی روکے' دم سادھے' دین سے لگاؤ رکھنے والی ان عورتوں میں کون اس کے معیار پر پورا اتر سکتی تھی۔ پر وہ زمانہ ایسا نہیں تھا کہ آج کی فلموں کی طرح جوان بیٹا یا بیٹی نظر میں نظر ڈال کر ماں یا باپ سے یہ کہہ سکتا:

''میں یہ شادی نہیں کروں گا!' یا کروں گی!''

فضل الدین کو دلی جیسے بڑے شہر اور انگریز حاکموں کے دارالسلطنت کا رشتہ میرٹھ چھاؤنی جیسی چھوٹی اور فرومایہ بستی کے ساتھ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا۔ یوں جیسے کوئی بڑے 'شہر والا' گاؤں میں برات لے کر آ جائے مگر اس سے زیادہ تحفظات اس کے ذہن میں اس بات نے پیدا کر دیے تھے کہ ہونے والی بیوی ایک دیندار گھرانے سے آ رہی ہے جہاں پردہ' شرم و حیا' پارسائی اور صوم و صلاۃ زندگی کے معمول ہیں۔ لیکن خیر خواہوں کے سمجھانے پر کہ وہ لوگ برادری کے معززین اور چار پیسوں والے ہیں اس نے چوں چرا نہ کی۔

لیکن گھر میں آتے ہی جہاں عشرت آرا نے صرف ایک پرستش کے سوا' ہر طرح فضل الدین پر دل و جان نچھاور کیے' وہاں خدائے مجازی نے پہلے دن ہی سے جی جان سے بیزاری کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ شادی سے پہلے اسے فراغت کے اوقات میں دوستوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے

یا ''باہر کی سرگرمیوں'' پر ٹوکا نہیں جاتا تھا لیکن اب ابا اماں اور ہر بڑا چاہتا تھا کہ دکان کے کاموں کے بعد اس کی مصروفیات محض گھر کے حوالے سے ہوں۔ رات دوستوں کے ساتھ کہاں رہے؟ دیر کیوں ہوئی؟ یہ سوال عشرت آرا کو تو پوچھنے کی جرأت ہی نہ ہوئی کہ شروع ہی سے فضل الدین نے کچھ ایسی خشمگیں نگاہیں بے چاری پر ڈال دی تھیں کہ وہ تہیہ کر چکی تھی کہ مارے چاہے بہلائے، فضل الدین میرے من مندر کا دیوتا ہے۔ مجھے مرتے دم تک اس کی پوجا ہی کرنی ہے۔ اس کی شان میں گندی کر کے اس کے قہر و غضب کو دعوت نہیں دینی مگر ماں باپ اور بڑوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ انہوں نے فضل الدین کو اپنی بیوی سے بیزاری تو قدرے سمجھ لی، مگر اسے گھر سے باہر کی طرف پہلے سے زیادہ راغب ہوتے دیکھا تو روک ٹوک اور جرح و تنقید شروع کر دی کہ اشراف کے بیٹے، عزت داروں کی بیٹیاں گھر لا کر ان کی توہین و تذلیل نہیں کرتے۔ فضل الدین پر ان باتوں کا اثر یہ ہوا کہ وہ عشرت آرا کو اور بھی زیادہ تنگ کرنے لگا۔ ڈانٹ ڈپٹ کے پیچھے عموماً یہی الزام ہوتا کہ تم میرے خلاف میرے ماں باپ کے کان بھرتی ہو۔ عشرت آرا مجازی خدا کے آگے ہاتھ جوڑتی کہ تم میری دنیا، میری زندگی کا محور اور میری کائنات ہو۔ دل سے نکالو یا نظروں سے گراؤ، میں نے تمہاری الفت کی چنگاری اپنے وجود میں، دل و دماغ اور روح میں سلگا رکھی ہے، اب وہ شعلہ جوالہ بن کر مجھے بھسم بھی کر ڈالے تو کوئی پروا نہیں۔ دنیا دیکھ لے کہ نور محمد کی چہیتی عشو نے فضل الدین پر اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا ہے! اور خدائے حقیقی کی بارگاہ میں عشرت آرا کی شبانہ روز یہی دعا ہوتی کہ مہر و محبت کی یہ آگ محض اس کے دل ہی میں نہ بھڑکتی رہے، اس کا کچھ سینک دوسری جانب بھی ہو جائے۔

بس ایک امید تھی...... عشرت آرا کو بھی اور فضل الدین کے بڑوں کو بھی۔ بہو کی گود ہری ہو جائے تو شاید اولاد کی محبت بیٹے کو بیوی کی طرف مائل کر دے۔ فضل الدین کی بے التفاتی سے سال سوا سال ایک کربناک انتظار میں گزر گیا۔ پھر نہ جانے دوستوں عزیزوں کی پر معنی طنز کرتی ہوئے نگاہیں کچوکے لگا گئیں، یا خود مردانہ غیرت نے مہمیز کیا۔ فضل الدین کی بیوی کے ہاں پہلے بچے کے آثار نمودار ہوئے، لیکن جس بات کی توقع ہر ایک کو تھی، جو تمنا عشرت آرا کے دل میں مچل رہی تھی، وہ پہلے سے زیادہ بے دردی کے ساتھ کچلی گئی! فضل الدین نے ماں باپ اور دوسرے چاہنے والوں سے کہہ دیا کہ تم مجھ سے اولاد کی توقع رکھتے تھے، سو میں نے پوری کر دی۔ اب تم سنبھالو عشرت آرا کو، اس سے پیدا ہونے والی اولاد کو! مجھے اس گنوار عورت سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا جسے نہ پہننے برتنے کا کوئی سلیقہ ہے، نہ سننے بولنے کا۔ بس ہر وقت اپنی نمازوں کا 'دینداری' کا ڈھونگ رچائے رکھتی ہے۔ شوہر کی انتہا پر پہنچی ہوئی بے اعتنائی عشرت آرا کے سچے اور معصوم جذبوں کو ہر لمحہ، ہر سانس، ہر پل، ہر قدم پر پیسے ڈال رہی تھی لیکن وہ اف تک نہ کرتی۔ اگر عشق واقعی کوئی امتحان ہے، کسی کی الفت کی آگ میں جل کر خود کو فنا کر لینا حقیقت میں سچے عاشقوں کی ریت ہے تو عشرت آرا اس امتحان میں پوری اتر رہی تھی، اس ریت کو نبھانے میں سو فیصد ثابت قدم تھی۔

لیکن عشرت آرا کو نہیں معلوم تھا کہ ابھی اور کون کون سی بجلیاں اس کے نشیمن پر کوندنے والی تھیں۔ جوں جوں ماں کا رتبہ پانے کے دن قریب آتے گئے، شوہر کی نگاہوں میں حقارت کی جھلسا دینے والی شعاعیں تیز ہوتی گئیں۔ فضل الدین کو رشتے کے ایک خالو کی شوخ اور چنچل بیٹی ثریا ایسی بھا گئی کہ اس نے ماں سے کہہ دیا کہ میں ہر قیمت پر ثریا سے شادی کروں گا۔ لڑکی بھی دل و جان سے راضی ہے اور اس کے ماں باپ بھی۔ انہوں نے یہ فرمائش بھی نہیں کی کہ پہلی بیوی کو طلاق دو، تب ثریا تمہاری ہو سکے گی...... اب اگر اماں، ابا اور دوسرے لوگ چاہتے ہیں کہ عشرت آرا اپنے ہونے

والے بچے کو لے کر اسی گھر میں پڑی رہے تو مجھے ثریا سے شادی کرنے دیں۔ اگر مزاحمت ہوئی تو تین بول بول کر اس ''مولوائن'' کو بھی گھر سے نکال دوں گا اور خود بھی نکل جاؤں گا۔

فوری ردعمل شدید تھا مگر کاروبار میں صلاحیت اور لیاقت سے ہاتھ بٹانے والے بیٹے کو ہاتھ سے جانے دینا کمال الدین کے لیے ممکن نہ تھا۔ پھر انہوں نے یہ کہہ کر بھی دل کو تسلی دے لی کہ عشرت آرا پر سوکن ہی تو آ رہی ہے کون سا اسے طلاق مل رہی ہے۔ تھوڑی سی مزاحمت کے بعد فضل الدین کی ضد مان لی گئی۔ وہ اپنی ضد آخر کیوں نہ منواتا۔ ثریا اسکول کی آٹھ جماعتیں دیکھے ہوئے تھی۔ شوخ وشنگ تھی۔ باوا انگریزوں کی فوج کے سپلائی ٹھیکیدار تھے۔ آج کلکتے' کل بمبئی اور پرسوں پونا میں۔ ثریا کو خود بھی' بمبئی کلکتے کی ہوا لگ چکی تھی۔ دلی والی مسلمان خواتین کے مخصوص پہناؤوں کے علاوہ اسے ساری دھوتی پہننا بھی آتی تھی۔ لب ورخسار کو غازہ لپ اسٹک سے گلنار کرنا بھی آتا تھا اور وقت کے مشہور فرانسیسی پرفیوم ''ایوننگ ان پیرس'' سے واقفیت اور موقع کی مناسبت سے اسے برتنا بھی جانتی تھی۔ ماں باپ نے برقع کی پابندی تو لگا رکھی تھی لیکن ہم عمر لڑکیوں اور لڑکوں میں چھوئی موئی بنا کر نہیں رکھا تھا۔

کناٹ پیلس نئی دہلی کی اک دکان پر خریداری کرتے ہوئے ثریا کے ساتھ آئے ہوئے اس کے بھائی اور اپنے خالوزاد کو فضل الدین نے پہچان لیا تھا۔ ثریا نے برقع کا نقاب الٹا ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے فضل الدین کی شکل سے آشنا تھی' چنانچہ وہیں فضل الدین کی دوسری شادی کا بیج پڑ گیا۔ اور یہ شادی عشرت آرا کے لیے عذاب بن گئی۔ ثریا نے پہلے دن ہی سے سوکن کو نوکرانی سمجھنا شروع کر دیا اور اس پر حکم چلانے لگی۔ باقی کی کسر فضل الدین نے پوری کر دی۔ پہلے صرف ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکیاں تھیں۔ اب گالیاں' بددعائیں اور کوسنے بھی ملنے لگے۔ اور پھر مار پیٹ کو بھی فضل الدین نے اپنی حد تک مباح سمجھ لیا۔ لیکن آفرین ہے عشرت آراء پر! اس اللہ کی بندی کے پائے ثبات میں کوئی لرزش نہ آئی۔ ساس سسر نے محض بیٹے کی خوشی دیکھی اور یہ محسوس کر کے مطمئن ہو گئے کہ اپنی پسند کی شادی نے کماؤ پوت سے باہر کی حرکتیں چھڑا دی ہیں۔ عشرت آرا کا کیا ہے' ماں بن جائے گی تو بچے سے دل بہلا لیا کرے گی۔ اور پھر اس گھر میں کوئی بھوکی تو مر نہیں رہی جو سمدھیوں کو شکوہ ہو...... مگر عشرت آرا کے رخساروں پر بڑے تھپڑوں کی نشان' اس کے بچے کے وجود سے بوجھل بدن پر پڑے چابکوں کے نیل...... اور سب سے بڑھ کر اس کی روح اور دل و دماغ پر لگے کچوکے کسی نے دیکھے نہ محسوس کیے۔

ہاں اگر دیکھا گیا اور شاید سسرال والوں میں بھی محسوس کیا گیا تو اس منحوس شام کا وہ اندوہناک آخری زخم تھا جو فضل الدین نے اپنی چہیتی ثریا کی خاطر عشرت آرا کو پاؤں میں پہنے جوتے کی زوردار ٹھوکر سے لگایا تھا جس نے حاجی حافظ نور محمد کی چہیتی عشو کو عشو پگلی بنا دیا......

میاں دکان سے لوٹتے وقت حسب معمول اپنی دلربا ثریا کے لیے موتیے کے پھولوں کے ہار اور گجرے اور ڈیڑھ پاؤ ربڑی کا دونا لے کر گھر آئے۔ چہیتی بیوی کے پاس بیٹھ کر عشرت آرا کو آواز دی کہ پلیٹیں اور چمچ لے کر حاضر ہو تا کہ وہ دونوں ربڑی نوش جان کریں اور پھر خوشبودار پان کی بیڑے کلے میں دبا کر رات کے کھانے سے پہلے لوڈو یا کیرم کی بازیاں لگائیں۔ اس شام عشرت آرا کو مغرب پڑھ کر اٹھنے میں دیر کیا ہوئی کہ میاں کے تیسری بار آواز دینے پر ہی پہنچ سکی۔ اور پھر تابڑ توڑ...... ثریا بیگم کی بددعائیں اور گالیاں' فضل الدین کی طرف سے تھپڑ' گھونسے اور وہ منحوس ٹھوکر جو

پہلو میں اس شدت سے لگی کہ عشرت آرا تیورا کر کمرے میں رکھی آہنی الماری کے نوکیلے کنڈے سے ٹکرائی۔ ٹھوکر نے کوکھ میں جلتی ہوئی جوت بجھا دی...... اور کنڈے کی نوک نے دماغ کی کائنات پلٹ دی......! عشرت آرا جلی ہوئی کوکھ اور لرزتا ہوا دماغ لے کر میرٹھ چھاؤنی کے میکے میں لا کر پھینک دی گئی۔ طلاق نامے اور اس الزام کے ساتھ کہ ہمارے پلے ایک پاگل لڑکی کو باندھ دیا تھا اس کے فریبی میکے والوں نے اور اس پاگل نے خود اپنی حماقتوں سے ماں بننے کی خوشی گنوا دی تو اب ہم مزید اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتے!

ہاں یہی وہ دور تھا جب میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ میرٹھ چھاؤنی کے صدر بازار کی سڑکوں پر ایک دیوانی عورت پر ہنس ہنس کر کنکر پھینکا کرتا تھا' اسے ''عشو پگلی' عشو پگلی'' کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ اشیائے تجارت کی ترسیل کے وقت پیکنگ کے کام آنے والی چیڑ کی لکڑی کی پیٹیوں کے گرد مضبوطی کی خاطر لپیٹنے والی آہنی پتریوں سے اپنے پھٹے پرانے کپڑوں کو کسے ہوئے...... میلے چیکٹ' جوؤں سے بھرے بالوں میں ہرے' نیلے پیلے ربن باندھے' سرکنڈے کے سرے پر رنگ برنگ کاغذی جھنڈیاں یا ہرے کپڑے کی کترنیں لٹکائے عشو پگلی لاکھ نگرانی کے باوجود نظر چوکتے ہی گھر سے نکل جاتی۔ پھر کبھی ڈاکٹر نصراللہ کیمسٹ کی دکان کے تھڑے پر' کبھی نورو دودھ والے کی بھٹی کے قریب' کبھی نند کشور عرف ننو حلوائی کی دکان پر اس سے شفقت کے ساتھ ملی ہوئی کچوری کھاتے ہوئے یا فقیر چند چاٹ والے سے ڈھاک کے پتے پر مفت کی آلو مٹر کی چاٹ لے کر' ہم شریر کے گھیرے میں بیٹھی ہمارے دھول دھپے کھاتی' آوازے سنتی اور ہنستی رہتی۔ وہ کبھی گالی نہ دیتی' کبھی کنکر نہ مارتی' کبھی ڈنڈا لے کر پیچھے نہ دوڑتی...... اس کے چند مخصوص موڈ تھے' طور تھے۔ اٹھ کر جانے لگتی...... آواز پڑتی! عشو پگلی۔ کہاں جا رہی ہے؟'' جواب دیتی: ''دلی...... اپنے میاں کے پاس۔''

پھر ایسا بھی ہوتا کہ کبھی لبوں پر نعت کے بول ہیں تو کبھی اختری بائی فیض آبادی کی گائی ہوئی غزل گنگنا رہی ہے ؎

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے
ورنہ کہیں تقدیر تماشا نہ بنا دے

اور یوں بھی ہوتا کہ ہم اسے کبھی کبھی مسجد کے (بغیر لاؤڈ سپیکر) آتی ہوئی اذان سن کر گلے میں جھولنے والے میلے کچیلے دوپٹے سے سر ڈھانپتا دیکھتے اور پھر وہ عشو پگلی رہتی نہ عشرت آرا بس ایک سوز و درد میں ڈوبی ہوئی آواز ہی رہ جاتی جس سے قرآن کی آیتیں پھولوں کی طرح جھڑنے لگتیں۔

اور اب جون 1947ء میں میرے والد اور والدہ گھر والے بھی پاکستان کو ہجرت کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہر طبقے اور برادری کے مسلمان گھرانے بود و باش کے برسوں پرانے درختوں کو جڑ سے نکال کر' نئی اسلامی ریاست سنہری خوابوں کی سرنگا پاکستان' از سر نو گاڑنے کے لیے بے تاب تھے۔ حاجی حافظ نور محمد کو یہی غم کھائے جا رہا تھا کہ چاہے ساری برادری' سب مسلمان پاکستان سدھار جائیں ان کے پیروں میں اس دیوانی بیٹی نے زنجیر ڈال دی ہے جو کٹ نہیں سکتی تھی اور اسے ہمراہ لے جا کر کے دوران ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے کھو جانے کا خطرہ' شفقت پدری نہ ماں کی ماتا مول لے سکتی تھی یہ اپنی بستی تھی۔ اپنے محلے کے جانے پہچانے لوگ تھے جو ان کی لاڈلی بیٹی کو پیار سے کھلا پلا بھی دیتے تھے رات پڑنے سے پہلے مل جاتی تو بہلا پھسلا کر گھر بھی پہنچا دیتے تھے۔ اجنبی راستوں میں وہ نکل پڑی تو نہ جانے واپس آ سکے گی یا نہیں؟

ان ہی دنوں مجھے اپنے دوست مہتاب کے ساتھ دہلی جانے کا اتفاق ہوا جو پنجابی سوداگران میں سے تھا اور اس کے والد بھی چھاؤنی میں جنرل سٹور چلاتے تھے۔ اس دوست سے عشرت آرا کی خانہ بربادی کی داستان سن رکھی تھی کیونکہ اس کے گھرانے کی نزدیکی رشتے داری دلی کے کمال الدین سے بھی تھی اور میرٹھ چھاؤنی والوں سے بھی۔ ہم دونوں دوست سیر و تفریح کے لیے دہلی گئے تو وہاں اس نے قطب روڈ پر فضل الدین سے بھی ملوایا جو رشتے میں اس کا ماموں لگتا تھا۔ دکان اور کاروبار ہر طرح سے عروج پر تھے۔ فضل الدین اور اس کے والد نے گھر بلایا مگر ہم نے ہیلے بہانے سے ٹال دیا۔

پھر اگست آ گیا۔ اور ساری دنیا نے نئی اسلامی ریاست پاکستان کو وجود میں آتے دیکھا۔ چودہ اور پندرہ کی درمیانی رات ''برٹش انڈیا'' آزاد ہو گیا اور بھارت کے مختلف خطوں سے مسلمانوں نے پاکستان کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ میرٹھ شہر اور چھاؤنی سے بھی روز بروز مسلمان خاندان غائب ہونے لگے۔ کوئی بھارتی (مشرقی) پنجاب سے ٹرین کے رستے جان و مال کا خطرہ مول لے کر، کوئی بمبئی سے بحری جہاز کے ذریعے، کوئی راجستھان کے صحرا کو عبور کر کے اور (پیسے والا ہوا) تو دلی اور بمبئی سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر پاکستان پہنچ گیا۔ ہجرت کی رفتار اور تعداد بڑھتی گئی۔ کوئی گھرانا ایک دم غائب ہو جاتا تو باقی مسلمان خوش بھی ہوتے اور اداس بھی کہ فلاں تو سلامتی کے ساتھ منزل مقصود کو پا چکا ہے لیکن ہم یہیں بیٹھے ہیں۔

حاجی حافظ نور محمد، ہندو ہمسایوں اور مسلمان ہجرت کرنے والوں کا سوال سن کر یہی جواب دیتے کہ ہمیں کہاں جانا ہے، یہاں مرنا جینا ہے۔ سب لوگ اس جواب کی وجہ جانتے تھے لیکن ان کے بیٹے والد کے جواب سے اتفاق نہ کرتے تھے۔ اور عشو پگلی نے بھی پاکستان کے نعرے سن سن کر مستی میں جھوم جھوم کر کہنا شروع کر دیا تھا: ''پاکستان زندہ باد''...... ''پاکستان جانا ہے۔!''...... ''کب جاؤ گی؟'' چھیڑنے والے اس کی پاکستان کی ترنگ سن کر پوچھتے...... ''جب میرے میاں بلالیں گے...... میں ریل میں بیٹھ کر ان کے پاس پاکستان چلی جاؤں گی!'' وہ کہتی اور دوبارہ زور زور سے ''پاکستان زندہ باد''...... ''پاکستان جانا ہے'' کے نعرے لگانے لگتی۔

ستمبر 1947ء کے آخری دنوں میں میرے گھرانے نے بھی میرٹھ چھاؤنی سے لاہور تک ہجرت کی۔ اس سے آگے عشو پگلی کی زندگی میں کیا ہوا، شاید مجھ کو کبھی خبر نہ ہوتی۔ اگر مجھے وہی پرانا دوست مہتاب نہ ملتا۔ میں نومبر 1976ء میں موئن جودڑو کے آثار قدیمہ دیکھنے کی خاطر سکھر گیا ہوا تھا جہاں سے براستہ لاڑکانہ ویگن میں آگے جانا تھا۔ لاہور ہی میں یہ تو برسوں پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ میرٹھ چھاؤنی کے بہت سے مسلمان سکھر میں آباد ہیں۔ اب جب میں خود وہاں موجود تھا تو شوق چرایا کہ پتہ تو کروں، شاید کوئی شناسا، اسکول کالج کے زمانے کا ساتھی مل جائے۔ جوئندہ یابندہ...... ایک اشارے سے دوسرا اشارہ...... اور ایک پتے سے دوسرا پتہ مل گیا۔ اور مہتاب سے ملاقات ہو گئی۔

باقی باتیں نظر انداز کر کے مجھے اس وقت صرف عشرت آرا عرف عشو پگلی کی کہانی مکمل کرنی ہے۔ مہتاب مجھے سکھر کی ایک عالیشان کوٹھی میں لے گیا۔ آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہوئے مہتاب نے ملازمہ سے کہا کہ قمو خالہ کو اطلاع دو کہ مہتاب میاں سلام کرنے آئے ہیں...... مہتاب نے وضاحت کر دی تھی کہ خالہ کا نام تو قمر النساء بیگم ہے، ہم انہیں قمو خالہ کہتے ہیں۔

دروازے کا پردہ ہٹا اور قمو خالہ ہماری طرف آئیں تو میری حیرت نے مجھے اتنا بوکھلا دیا کہ میں سلام کرنا بھی بھول گیا۔ خالہ نے مہتاب

کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور مجھے بھی دعائیں دیں۔ مہتاب نے میرا پس منظر بتایا نہ خالہ سے میرا تعارف کرایا' صرف اتنا کہا کہ لاہور کا ایک دوست ہے۔ کچھ دیر بعد قمو خالہ خاطر داری کا انتظام کرنے باہر نکلیں تو مہتاب کے چہرے پر ایک شدید مسکراہٹ دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھا: ''تم نے مجھ سے کیوں چھپایا تھا اور یہ قمو خالہ کا کیا قصہ ہے؟ میری نظروں نے ہرگز دھوکا نہیں کھایا۔ چیچک کے داغوں کے پیچھے میں نے لڑکپن کے دور کی عشو پگلی کو پہچان لیا ہے......یہ سب کیسے ہوا؟''

اسی شام لاڑکانے کی ویگن میں بٹھانے سے پہلے مہتاب نے عشو پگلی کی باقی داستان مکمل کر دی......

1947ء میں عشرت آراء کے گھر میں آئے دن یہ ناخوشگوار کیفیت رہنے لگی کہ باپ اور ماں ایک طرف اور بیٹے اور اس کی بیوی دوسری طرف۔ والدین عشو کو بے یار و مددگار چھوڑنے یا ساتھ لے کر پاکستان کا سفر کرنے پر تیار نہ تھے۔ بیٹیاں اپنے شوہروں کے ساتھ کراچی اور حیدر آباد پہنچ کر اپنے اپنے گھروں میں خوش باش تھیں' بیٹے کہتے تھے کہ یا تو اس دیوانی کو ساتھ لے جائیں یا تنہا چھوڑ جائیں' اب ہم زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گے......اور عشو تھی کہ ''پاکستان زندہ باد اور پاکستان جانا ہے'' ہے کی تکرار دن رات کرتی رہتی تھی۔

دسمبر 1947ء کی ایک نہایت سرد رات تھی۔ موسلا دھار بارش اور ژالہ باری کے بعد پہاڑوں کی طرف سے آنے والی سرد ہوا بدن کو کاٹے ڈال رہی تھی۔ اس رات عشو پگلی گھر سے نکلی اور کوئی بھی اسے گھر پہنچانے نہیں آیا۔ نہ کسی نے اسے دیکھا تمام رات کی تلاش اور پریشانی کے بعد اگلی صبح عشو کو چھاؤنی سے گزرنے والے نالے کے کنارے کیچڑ میں لت پت اور بیہوشی کی حالت میں پایا گیا ہر کسی کو گمان تھا کہ عشو زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہے' لیکن یہ کون جانتا تھا کہ عشو پگلی کو ابھی برسوں زندہ رہنا ہے اور پاکستان بھی جانا ہے! ڈاکٹروں کی لگاتار چھ ماہ کی جدوجہد' مصحف مقدس پر گرے ہوئے باپ کے آنسو اور پاکستان جانے کی آرزو کا کرشمہ! جب وہ طویل علالت کے خواب سے بیدار ہوئی تو عشو پگلی مر چکی تھی اور عشرت آرا دوبارہ زندہ ہو چکی تھی اور ہوش و خرد والی تھی۔

جنرل سٹور والے حاجی صاحب کا خاندان کراچی آ بسا۔ بڑوں نے ماضی کی بھیانک یادیں بھلانے کے لیے عشرت آرا کو قمر النساء (عرف قمو) کا نیا نام دے دیا اور برادری کے ایک تاجر پیشہ شخص سے اس کی شادی کر دی جو اب سکھر میں خاصے بڑے کاروبار کو تین بیٹوں کی مدد سے بڑی کامیابی سے چلا رہا ہے۔

سکھر ہی میں' میں نے مہتاب کے ساتھ ایک اور منظر بھی دیکھا......قطب روڈ دہلی کے سوت گولے کے کاروبار میں ہزاروں لاکھوں میں کھیلنے والا افضل الدین ان تین سڑکوں کے تکونے سنگم پر ٹاٹ کی گدی پر بیٹھا......چھوٹا سا کھوکھا ٹی سٹال پر لکڑی کے بنچوں پر بیٹھے گاہکوں کے لیے کیتلی سے گلاسوں میں چائے انڈیل رہا تھا۔

(محمود علی۔ اردو ڈائجسٹ۔ اگست 1997ء)

جھنگڑ و دھرمسال کا معرکہ

دسمبر 1947ء کی 23 تاریخ تھی۔ صبح صادق کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ فضا کہر آلود تھی اور سردی کی شدت سے دانت بج رہے تھے۔ مقبوضہ کشمیر کی مشہور چھاؤنی نوشہرہ سے پٹیالہ رجمنٹ کی ایک نامور بٹالین فوجی گاڑیوں میں سوار ہو کر جھنگڑ دھرمسال کیمپ کی طرف روانہ ہوئی۔ اس بٹالین کو جھنگڑ کوٹلی روڈ پر 24 دسمبر کو انڈین بریگیڈ کے ایڈوانس میں ہراول دستے کا کام کرنا تھا۔ سکھ سورماؤں نے کوٹلی کو فتح کرنے کے خواب دیکھے تھے اور وہ کامیابی کو یقینی سمجھتے تھے۔ اس مہم کے مقاصد کوٹلی میں محصور ڈوگرہ فوج کو محاصرے سے نکالنا اور اس کے بعد پیش قدمی کر کے دریائے جہلم تک کا کھویا ہوا علاقہ واپس لینا تھا۔ یہ مہم کئی مراحل میں طے ہونی تھی، مگر مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

بٹالین کی روانگی کے وقت نوشہرہ کی وادی پر گہری دھند چھائی ہوئی تھی اور چند گز سے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہراول میں ایک انفنٹری کمپنی تھی اور دو آرمڈ کاریں دندناتی ہوئی اپنی پہلی منزل مقصود کی طرف رواں دواں تھیں۔ اس کمک کے روانہ ہونے کی خبر ایک روز پہلے سرحدی مجاہدین کے کمانڈر کپتان خان محمد خان تک پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے بھارتی فوج پر ضرب کاری لگانے کا فیصلہ کیا اور ماتحت قبائلی لیڈروں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا اور جلد ہی پورے لشکر کو ہمراہ لے کر 24 میل کا پہاڑی سفر طے کر کے کلیساں گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہ گاؤں جھنگڑ نوشہرہ روڈ پر واقع ہے۔ اور یہاں آثار قدیمہ کے خزانے دفن ہیں۔ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر قبائلی لشکر کو موضع لنگر اور کلیساں کے درمیان اہم مقامات پر گھات میں لگا دیا۔ گھات کے انتظامات سے فارغ ہو کر کپتان خان محمد خان نے خود کشمیرا خان کے لشکر کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ کلیساں کے علاقے میں خونی خان کا لشکر تھا۔

گھات مکمل کر لینے کے بعد انتظار کی پرصعوبت گھڑیاں گنی جانے لگیں۔ وقت انتہائی سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ طویل اور صبر آزما انتظار ختم ہوا۔ کمانڈر نے جو نسبتاً ایک اونچے مقام پر تھے، دوربین لگا کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ جلد ہی انہیں نالا گھمبیر کے اس پار بھارتی کالم دکھائی دیا، لیکن وہ اس کی صحیح تعداد کا اندازہ نہ کر سکے۔ جونہی سورج نے مشرق سے سر نکالا، بھارتی کالم کا ہر حصہ صاف نظر آنے لگا۔ کمانڈر نے اپنے مخصوص اشارے سے پورے لشکر کو آگاہ کیا۔ مجاہدین، کمانڈر کے منہ سے کمنٹری (آنکھوں دیکھا حال) سن کر حملہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئے۔ بھارتی فوج کا یہ کالم جب لنگر سے دو فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تو تمام مجاہدین نے خود اپنی آنکھوں سے دشمن کو دیکھ لیا۔ رائفلوں کے بٹ کاندھوں میں دھنس گئے، شہادت کی انگلیاں ٹریگروں پر خود بخود پہنچ گئیں اور نگاہیں دشمن پر جم گئیں۔ وہ اپنے انجام سے بے فکر سڑک پر تین تین کی قطاروں میں آ رہا تھا۔ گھات کے پہلے مورچوں کے درمیان سے دونوں آرمڈ کاریں ایک دوسرے کے پیچھے گزر چکیں، تو پیدل کالم بھی ان کے نقش قدم پر گھات کے علاقے میں داخل ہونا شروع ہوا۔ مجاہدین بے حرکت اور مورچوں میں حکم کے انتظار میں خاموش تھے۔ تنفس کی آواز تھی یا پھر دلوں

کی دھڑکنیں۔

دُشمن بڑھتا رہا۔ کالم کا ہراول کلیساں کے ٹیلوں تک پہنچ گیا اور اس کی دُم لنگر سے آگے نکل آئی۔ کمانڈر کے اشارے پر یکبارگی مجاہدین کی رائفلوں کی نالیوں سے نکلی ہوئی گولیوں کی پہلی باڑھ نے دُشمن کو حیران وششدر کر دیا۔ بہت قریب سے اور شست لیے ہوئے فائر کے نتیجے میں دُشمن کی لاشوں کے انبار لگتے گئے۔ ''اللہ اکبر'' اور ''یا علی'' کے فلک شگاف نعروں کا شور بڑھتا گیا۔ دُشمن کی صفوں میں وہ بھگدڑ مچی کہ بدحواس بھارتی ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ سامان والا کالم' گاڑیوں پر سوار' عقب میں تھا۔ مجاہدین کے بے پناہ فائر سے وہ بھی گاڑیوں میں ڈھیر ہونے لگا۔

گھات کی کامیاب کارروائی کے بعد کمانڈر کے حکم سے مالِ غنیمت سمیٹا جانے لگا۔ تمام ہتھیار اور ایمونیشن جمع کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ لاتعداد دوسری چیزیں' مثلاً دستاویزیں' کاغذات' اور نقشے بھی ہاتھ لگے۔ ان کاغذات میں جھنگڑ سے کوٹلی تک پیش قدمی کے اوپریشن آرڈرز بھی تھے اور اوپریشن میں حصہ لینے والی بڑی اور چھوٹی یونٹوں اور امدادی ہتھیاروں کی مکمل فہرست (Orbat) کالم کا آرڈر آف مارچ اور فائر پلین' غرضیکہ وہ سب اطلاعات ملیں جن سے مجاہدین کو آئندہ فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

نوشہرہ چھاؤنی سے بھارتی فوج کا فوری ردِعمل متوقع تھا اور مجاہدین کو اپنی پوزیشنوں میں ڈٹا رہنا تھا۔ لیکن خدشہ یہ تھا کہ اگر لاشیں نہ ہٹائی گئیں' تو دوپہر تک فضا متعفن ہو جائے گی اور پھر وہاں ٹھہرنا ممکن نہ رہے گا۔ مجاہدین کی ایک پارٹی نے مقامی دیہاتیوں کی مدد سے دُشمن کی لاشوں کو ٹھکانے لگانا شروع کیا۔ دُشمن کی چھاؤنی میں پٹیالہ رجمنٹ کی مکمل تباہی کی اطلاعات پہنچیں' تو وہاں خوف و ہراس پھیل گیا' چنانچہ وہاں سے کوئی کمک نہ بھیجی گئی اور وہ نوشہرہ کو بچانے کی فکر ہونے لگی۔

کلیساں کی اس کامیاب گھات سے فارغ ہو کر کپتان خان محمد خان نے ریاست دیر کے رضا کار مجاہدین کے کمانڈر میجر تیمور خان کو اس کامیابی کی اطلاع اور ساتھ ہی دُشمن سے پکڑے ہوئے کاغذات بھی بھجوا دیے۔

ریاست دیر کے رضا کاروں کا یہ لشکر ہری پور کے علاقے میں تھا۔ منجن' کیری اور گاہی کے علاقہ میں کوٹلی بٹالین اور ٹاٹیں پہاڑی کے نصف علاقے پر سدھن فورس موجود تھی جس کی کمان کرنل شیر احمد خان کے ہاتھ میں تھی۔ کوٹلی بٹالین کے کمانڈر کرنل محمود خان تھے۔ یہ تینوں کمانڈر' دیر لشکر کے ہیڈ کوارٹر میں جمع ہوئے اور مصدقہ دستاویزی اطلاعات کی روشنی میں حالات کا جائزہ لینے لگے۔ فوجی نقطہ نظر سے سب اس نتیجے پر پہنچے کہ نوشہرہ چھاؤنی کمک بھیجنے کی پوزیشن میں نہیں' ممکن ہے جموں سے کوئی کمک پہنچ جائے' چنانچہ اس سے پہلے ہی دُشمن کے جھنگڑ گیرین پر تین مرحلوں میں حملہ کرنے کا فیصلہ ہوا:

پہلا مرحلہ

24-23 دسمبر کی درمیانی شب کے پہلے حصے میں تیمور فورس خاموشی سے پرستاون پہاڑ میں جمع ہو جائے اور صبح کاذب کے وقت پیش قدمی کر کے متلاشی پہاڑی پر تلواروں سے حملہ آور ہو اور اشد ضرورت کے بغیر فائر نہ کرے۔

دوسرا مرحلہ

کامیابی کے بعد بگل کے اشارے پر سدھن فورس ٹائیں پہاڑی کے اونچے حصے پر حملہ کر کے درہ پیڑ وخالی تک قبضہ کرے۔ اس دوران میں کوٹلی بٹالین پیش قدمی کر کے نہروون ٹیکری، ہوائی اڈے اور ڈاک بنگلے کے متصل ٹیکریوں پر قابض ہو جائے۔

تیسرا مرحلہ

جھنگڑ کیمپ پر قبضہ ہو جانے کے بعد کوٹلی بٹالین کی دو کمپنیاں دُشمن کے تعاقب میں کلیساں تک پیش قدمی کریں اور سدھن فورس سڑوکہ پہاڑی تک اور دیر تشکر مکڑی بھوانی تک پہنچ جائیں۔

پروگرام کے مطابق رات کے پہلے حصے میں تیمور فورس متلاشی پہاڑی کے دامن میں جمع ہوگئی اور آخر شب خاموشی سے پیش قدمی کر کے متلاشی پہاڑی پر قابض بھارتی بٹالین سیکنڈ پنجاب پر یکبارگی ٹوٹ پڑی۔ حملہ اچانک اور غیر متوقع تھا دشمن بوکھلا گیا اور مؤثر مدافعت نہ کر سکا۔ مورچوں سے باہر اور مورچوں کے اندر دست بدست لڑائی شروع ہوگئی۔ تیمور فورس کے شمشیر بدست قبائلی مجاہدین، دشمن کو گاجر اور مولی کی طرح کاٹنے لگے۔ دُشمن کا ایک بھی سپاہی جان بچا کر بھاگ نہ سکا۔ ایک زمین دوز کھلے بنکر میں، جو غالباً افسروں کی رہائش گاہ تھی، آٹھ بھارتی افسروں کی لاشیں پڑی ہوئی ملیں۔

ناگاہ بگل کی آواز نے پہاڑیوں میں گونج پیدا کی اور اس کے فوراً بعد جھنگڑ کی نواحی ٹیکریوں سے دشمن کی دوسری بٹالین نے فائر کھول دیا۔ کوٹلی بٹالین کیری اور گاہی کی ٹیکریوں سے پیش قدمی کرتی ہوئی آگے بڑھی، تو دشمن نے نہروون پکٹ سے مشین گنوں سے پوری وادی میں گولیوں کی دیوار کھڑی کر دی۔ اب کوٹلی بٹالین کے لیے کھلی وادی میں پیش قدمی مشکل ہوگئی۔ چنانچہ نالے میں تھوڑی دیر کے بعد رُک گئی۔ اب جب تک نہرو ٹیکری کی مشین گنیں خاموش نہ کی جاتیں، پیش قدمی ہلاکت خیز ثابت ہو سکتی تھی۔ اس مرحلے پر کرنل محمود خان کی اپیل پر تین رضا کار گرنیڈ اور رائفلیں لیے نہرو ٹیکری کی چوٹی کی طرف رینگنے لگے۔ ان جانبازوں میں ایک نو عمر لڑکا قاضی محمد جان بھی تھا جو چند دن پیشتر کوٹلی بٹالین میں شامل ہوا تھا (یہ کم عمر جوان آج کل میجر کے عہدے پر ہیں اور بفضل خدا آزاد کشمیر کے کسی محاذ پر کمان کر رہے ہیں)۔

یہ جانباز جب ٹیکری کی چوٹی کے قریب پہنچے تو مشین گن کی اصلی پوزیشن معلوم کرنے کے لیے جھاڑیوں میں دبک گئے۔ جلد ہی انہیں موقع مل گیا۔ قریب ہی ایک جھاڑی کے اندر مورچے سے مشین گن نے آگ اُگلی اور وادی پر ایک لمبا برسٹ فائر کیا۔ ان جانبازوں نے گرنیڈوں کے پن کھول دیے اور دوسرے لمحے مشین گن کے مورچے پر اس قدر زوردار دھماکے ہوئے کہ پہاڑی لرز اٹھی۔ مشین گن ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ دونوں جانباز مورچے میں کودے، گن ہاتھوں سے ٹٹولی لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکے، کیونکہ اس کا استعمال جانتے ہی نہ تھے۔ گن پارٹی مری پڑی تھی۔ ایک دوسرے مورچے سے دُشمن کی ایک برین گن سے، جو غالباً مشین گن پوسٹ کی حفاظت کے لیے تھی، فائر آیا۔ دونوں جانبازوں نے آڑ لے لی۔ تیسرے جانباز قاضی محمد جان نے جھاڑی سے نکل کر ایک لمبا چکر لگایا اور رینگتا ہوا برین گن والے مورچے کے قریب پہنچ گیا۔ گن کی

بیرل سوراخ سے آگے نکلی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ ادھر قاضی محمد جان بیرل سے دو فٹ نیچے پہنچ کر جھپٹا اور دائیں ہاتھ سے جلتی ہوئی بیرل پکڑ کر باہر کھینچ لی۔ ایک بھارتی، جو غالباً گن کا نمبر ٹو (معاون) تھا قاضی محمد جان پر جھپٹا، مگر اس نوعمر پھرتیلے مجاہد نے اس گرانڈیل بھارتی کو برین گن کے بٹ کی ضرب سے زمین پر گرا دیا اور پھر گولی سے اس کا بھیجا اُڑا دیا۔ قاضی محمد جان کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی جل گئی تھی، مگر اس نے اس کی پروا تک نہ کی۔ اس واقعے کے بعد بھارتی فوجی ٹیکری پر سے مورچے چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ ایک مجاہد نے اسی چھینی ہوئی برین گن سے بھاگنے والوں پر لگاتار فائر شروع کر دیا۔ اب کوٹلی بٹالین کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ مجاہدین نالے سے نکلے اور کھلی وادی میں آگے بڑھتے رہے۔ ایک کمپنی نہرو ویکٹ پر پہنچ گئی۔ صوبیدار سلطان محمد نے دشمن سے چھینی ہوئی مشین گن کا رُخ جھنگڑ کیمپ کی طرف پھیر دیا۔ مورچے میں لاتعداد ایمونیشن موجود تھا۔ اب کوٹلی بٹالین کو مشین گن کے فائر کی سپورٹ میسر آ گئی تھی پیش قدمی تیز تر ہو گئی۔ دو کمپنیوں نے بڑھ کر ہوائی اڈے کے ہائی گراؤنڈ پر زوردار حملہ کیا اور پندرہ منٹ کی مختصر سی جھڑپ کے بعد پوزیشن پر قبضہ کر لیا۔ دُشمن کی مدافعت برائے نام تھی چوتھی کمپنی نے جھنگڑ کیمپ پر حملہ کر کے دشمن کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

ادھر سدھن فورس، جس نے زبردست حملہ کر کے بٹائیں پہاڑی پر مکمل قبضہ کر لیا تھا'' درۂ پیٹرو خالی تک قابض ہو گئی تھی اور فلینک سے جھنگڑ کیمپ کے ملحقہ ٹیلوں پر مؤثر فائر کرنے لگی تھی۔ تیمور فورس اس اثنا میں جھنگڑ کیمپ پر بھی فلینکنگ فائر کرتی رہی اور باقی لشکر پہاڑی سلسلے پر آگے بڑھتے ہوئے ''مکڑی ہوائی'' کی ٹیکریوں تک پہنچ گئے۔ مجاہدین کے تینوں دستوں نے جھنگڑ سے پانچ میل آگے تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ سورج ایک ساعت اوپر آ چکا تھا۔ آسمان صاف تھا۔ مجاہدین نئے مقامات پر مورچے کھودنے لگے۔ اس اثنا میں دُشمن کے دو ہوائی جہاز جھنگڑ کیمپ کے اوپر سے گزرے اور پھر چکر لگا کر نوشہرہ کی طرف چلے گئے۔

جھنگڑ کیمپ پر فتح ہوتے وقت ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ جب مجاہدین بچے کھچے دشمن کا صفایا کر رہے تھے تو ڈاک بنگلے سے متصل کھلے کھیتوں میں لنگروں پر چولھوں میں آگ جل رہی تھی۔ چائے ابل رہی تھی اور کسی کسی چولھے پر بڑی بڑی کڑاہیوں میں جلی ہوئی پوریاں تیر رہی تھیں۔ بیچارے بھارتی سپاہیوں کو صبح کا ناشتہ نصیب نہ ہوا۔

کوٹلی بٹالین کو بقیہ دو کمپنیوں نے جھنگڑ کیمپ میں دُشمن کا چھوڑا ہوا فوجی ساز و سامان جمع کرنا شروع کیا جس میں وائرلیس سیٹ، تیل، پٹرول اور راشن کے سامان کے علاوہ گولہ بارود، خاردار تار کے بنڈل، اینٹی پرسنل اور اینٹی ٹینک بارودی سرنگیں شامل تھیں۔

جھنگڑ کیمپ میں موجود ایک سو چھتیس فوجی گاڑیاں اور چھ آرمڈ کاریں ہاتھ آئیں۔ پلٹن کی ضرورت کے لیے ایک دو گاڑیاں رکھ لی گئیں اور بقیہ گاڑیاں میرپور کی طرف بھیج دی گئیں۔ انہی گاڑیوں سے آزاد کشمیر فورسز کی پہلی جی۔ ٹی کمپنی قائم ہوئی۔ یہ گاڑیاں آج بھی بہ احسن ڈیوٹی دے رہی ہیں۔

اس فتح کے اثرات بہت دور رس ثابت ہوئے۔ جھنگڑ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور اس سے دشمن فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اب یہ کیمپ مجاہدین کے لیے فائدہ مند ثابت ہونے لگا۔ میرپور جھنگڑ روڈ پر سپلائی سسٹم باقاعدہ منظم کیا گیا اور اسلحہ بارود اور راشن باقاعدگی سے پہنچنے لگا۔ ہری پور کے مقام پر بریگیڈ ہیڈ کوارٹر اور پونا میں سپلائی کے گودام قائم کیے گئے۔ مختلف لشکروں کی مساعی میں مطابقت پیدا ہوئی۔ درے والی رائفلوں کی جگہ بھارتی فوج

سے چھینے ہوئے اسلحے نے لے لی۔

دُشمن کے سینک اپنی چھاؤنیوں میں بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے۔ اللہ کے سپاہی جو انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں ناموس دین مصطفیٰؐ بچانے کے لیے اُٹھے تھے، آج اس فتح عظیم کے انعامات سے مالا مال ہو رہے تھے۔

(میجر محمد اقبال اردو ڈائجسٹ نومبر 1968ء)

اُردو تنقید کا اصلی چہرہ

اردو تنقید کا اصلی چہرہ عارفہ صبح خان کا ایم فل کے لیے لکھا گیا ایک تحقیقی مقالہ ہے اور اس میں درج ذیل ابواب/موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ موضوع کا تعارف، مفروضات...... تحدید بندی، زیر تحقیق موضوع کی اہمیت، تنقید کی داغ بیل، ابتدائی تنقید کے نقوش، تنقید کے معانی و مقاصد، تنقید کی اقسام، تنقید کے بنیادی اصول، نقاد کا منصب، اردو تنقید کا آغاز و ارتقاء، اردو تنقید کا وجود، اردو تنقید کا منبع و ماخذ، اردو تنقید کے عناصر خمسہ، مولانا حالی...... اردو تنقید کے بانی، اردو تنقید کا چلن، اردو تنقید کا عبوری دور، عبوری تنقید کے سات برج، اردو تنقید انگریزی کے زیر اثر، اُردو تنقید کے دبستانوں پر تنقید، دبستان کی اصطلاح، ضرورت و اہمیت، تنقید کے مختلف طبقہ ہائے فکر، تنقیدی دبستانوں کی اقسام، عمرانی تنقید، تاثراتی تنقید، جمالیاتی تنقید، تاریخی تنقید، نفسیاتی تنقید، رومانی تنقید، مارکسی تنقید، تقابلی تنقید، تشریعی تنقید، اسلوبیاتی تنقید، ہیئتی تنقید، ساختیاتی تنقید، آرکی ٹائپل تنقید، تنقید کی منزلیں، ہندوستان میں تقسیم سے پہلے اور بعد کی تنقید، آزادی کے بعد پاکستان میں تنقید، اردو نقادوں کے رویے اور رجحانات، میراجی...... پیکر خاک میں لطیف روح اور تنقیدی ذہن، اختر حسین رائے پوری...... ادب، انقلاب اور ترقی پسندی کا داعی، محمد حسن عسکری...... نظریات پر نظر رکھنے والا مباحث کا خوگر!! کلیم الدین احمد...... مغربی تیشہ سے مشرقی ادب کھودنے والا، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی...... تنظیمی و تخلیقی اصولوں کا خالق، پروفیسر جیلانی کامران...... جدید اور قدیم علوم کے سنگم پر تنقید، ڈاکٹر وحید قریشی...... تنقید و تحقیق کا بہتا ہوا سرچشمہ، ڈاکٹر وزیر آغا...... سائنسی نقطۂ نظر اور نئے زاویے تراشنے والا، ڈاکٹر سلیم اختر...... نباض، نکتہ رس، دیدہ ور، نفسیات پسند، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ...... جدید ترین تنقید کا متعارف کنندہ، جدید ترین تنقید پر تنقیدی نشانات، ساختیات کی تعریف اور مباحث، پس ساختیات اور اس کے ادوار، تشکیل رد تشکیل، لسانیات اور شعریات، جدیدیت اور مابعد جدیدیت، تنقید...... حدود و امکانات، معیاری ادبی تنقید کی ضرورت، کیا اردو تنقید عالمی معیار پر پرکھی جا سکتی ہے؟ اردو تنقید اکیسویں صدی میں، کیا تنقید سائنس ہے......؟؟؟ اردو تنقید کا جائزہ اور نتائج

اس کتاب کو کتاب گھر کے تحقیق و تالیف سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہردوار میں ہندوانہ گھاتیں

میری نگاہ اردو ڈائجسٹ کے صفحات پر تھی، ورق الٹنے پر اچانک یاد پڑا کہ کسی زمانے میں، میں ٹنگ مرگ (کشمیر) کے پوسٹ آفس سے چندروز کی رخصت پر نکلا ہوا مسافر تھا۔ دفتر سے فارغ ہونے کے بعد براستہ بارہ مولا، اوڑی، چناری، دومیل، کوہالہ سے ہوتے ہوئے راولپنڈی تک کا سفر میں نے بس کے ذریعے طے کیا تھا۔ میری منزل ڈیرہ دون تھی۔ دوسرے روز پچھلے پہر لاہور ریلوے اسٹیشن سے میں کلکتہ میل میں سوار ہوا تھا۔ عادت کے مطابق سفر کے دوران میری نیند عنقا ہو جاتی ہے۔ میں خالق کائنات کی صناعی کے گرتے پڑتے ابھرتے پردوں میں کھو جاتا ہوں! کہاں گل مرگ، بن مرگ (کشمیر) سے نکل کر ٹنگ مرگ کی مخملی دھرتی پر بہتی ندی کے صاف، شفاف اور یخ بستہ پانی سے دل و دماغ کو تازہ کر دینے والے میٹھے گھونٹ اور کہاں چٹیل میدانوں میں اٹھتی ہوئی روح فرسا خشک ہوا؟ جانے کتنی مسافت طے ہوئی تھی کہ ایک جگہ گاڑی رکی۔ پتہ چلا کہ یہ لکسر نام کا جنکشن ہے جہاں سے مجھے اپنی منزل کے لیے دوسری ٹرین پکڑنا تھی...... آدھی رات بیت چکی تھی۔ لوگ اپنی اپنی منازل کو روانہ ہونے کے لیے پلیٹ فارم پر انتظار میں بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میں ایک ٹی اسٹال پر چائے پینے میں مشغول تھا کہ گڑگڑ کی سی آواز محسوس ہوئی۔ اور اندھیری رات کے سناٹے میں ریل کی پٹڑی چمکنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد ہلکی سی سیٹی بجی اور سامنے ایک گاڑی آ کھڑی ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ یہی ٹرین ڈیرہ دون جا رہی ہے۔ مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ اور میں جلدی سے اس نئی آمدہ گاڑی میں سوار ہو گیا۔

کالی سیاہ رات اور گاڑی کی کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کی آواز میں سفر جاری تھا کہ گاڑی کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ انجن کی بھاری بھرکم سیٹی بجی۔ ڈبے آپس میں ٹکرائے اور خفیف سے جھٹکے کے بعد گاڑی ٹھہر گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ ہندوؤں کے لیے انتہائی متبرک مقام ''ہردوار'' ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ یہاں سے ڈیرہ دون قریب نہ سہی مگر اتنا بعید بھی نہیں ہے۔ میرے بڑے بھائی کرامت اللہ صاحب نے تار کے ذریعے مجھے مطلع کر دیا ہوا تھا: ''گاڑی صبح نو بجے کے قریب پہنچے گی اور ہم لوگ ڈیرہ دون اسٹیشن پر انشاء اللہ موجود ہوں گے۔'' اس کا مطلب تھا کہ میں نے غلط گاڑی پکڑی تھی اور پو پھٹنے سے پیشتر ہی اپنی منزل پر پہنچنے والا تھا۔ معاً خیال گزرا وہاں پر انتظار کی گھڑیاں گننے کے بجائے کیوں نہ یہاں گنگا کا نظارہ کیا جائے۔

چنانچہ ٹک شاپ سے ملحق بنچ پر بیٹھ کر چائے اور کیک سے لطف اندوز ہونے کے دوران باتوں باتوں میں، میں نے ہردوار کے حدود اربعہ کے متعلق معلومات حاصل کر لیں۔ پھر نماز فجر پلیٹ فارم کی فرسٹ کلاس انتظار گاہ میں جا کر ادا کی۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد اپنا مختصر سامان کلوک روم میں جمع کرا دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے کروڑوں میل دور سے آفتاب عالم کی اٹھتی ہوئی سرخی مائل روشنی میں اسٹیشن سے باہر نکل کر ''پوتر'' گنگا کی طرف جانے والا راستہ دریافت کیا جو قریب ہی تھا۔ تھوڑا سا پیدل چلنے کے بعد اچانک زمین میں گڑے ہوئے آہنی ستونوں کی رکاوٹ سے بند

سڑک ختم ہوگئی۔ یہاں سے بڑی بڑی سیڑھیاں نیچے کی طرف اترتی تھیں۔ ان کے دونوں جانب بلند عمارتوں کے فرشی حصوں پر انتہائی خوبصورت کمرے بنے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

نیچے دریا کی طرف جاتے ہوئے زائرین کو ان کمروں کے مالک ’پنڈت‘ پروہت اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے نرم لہجے میں اپنا اپنا کمرہ کرائے پر اٹھانے کی دعوت دے رہے تھے۔ میں ان کی زبان تو نہ سمجھ پایا مگر مفہوم کچھ یوں تھا گویا کہہ رہے ہوں ”حسین اور پوتر صنم“ اپنی پوری روحانیت کے ساتھ کمرے میں موجود ہیں...... خیر سنی ان سنی کرتے ہوئے میں نیچے کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ ابھی تین چار سیڑھیاں باقی تھیں کہ گنگا اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ حد نگاہ تک دونوں بازو پھیلائے ہوئے جلوہ گر تھا۔ اس طائرانہ نگاہ میں‘ دریا کے عین وسط میں ایک ٹاپو پر نظر پڑی۔ یہ کوئی فرلانگ بھر لمبا اور چالیس فٹ چوڑا‘ پانی کی سطح سے کوئی دو فٹ اونچا بحر بیکراں میں بڑے سے جہاز کے عرشے کا سماں پیدا کر رہا تھا۔ عجیب پر لطف منظر تھا۔ خیر میں نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا جو پانی کے قریب تھی۔ آگے ندی کا کنارہ تھا۔ دریا کی بالائی طرف سے جدا ہو کر اچھا خاصا فاصلہ طے کرتی ہوئی ایک چھوٹی سی لکیر کی طرح یہ پیاری سی ندیا نیچے جا کر غالباً پھر سے دریا میں ضم ہو جاتی تھی۔ گویا اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن!! اس ندی کی چوڑائی کوئی بیس فٹ اور گہرائی دو فٹ ہوگی۔ دریا کے اندر واقع ٹاپو نما صحن پر پہنچنے کے لیے اس ندی پر کمان کی شکل کے بنے ہوئے پل عبور کرنا ہوتے ہیں۔ قارئین کرام! ندی کا تصور کرتے ہوئے خیال کریں گے کہ اس کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے پھول دراز درخت اور بید مجنوں کی نرم و نازک شاخیں‘ جھک جھک کر پانی سے اٹھکیلیاں کر رہ ہوں گی...... مگر ایسا ہرگز نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے مہاراجگان‘ پنڈتوں اور ہندو امراء کے تعمیر کردہ محل نما مکانات کے بیرونی صحنوں پر ہری بھری گھاس کے بجائے سفید سیمنٹ کا پختہ فرش بچھا ہوا ہے اور سطحی طور پر تمام برآمدہ نما صحن آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ گنگا کا ”پوتر“ پانی ان کو یکساں طور پر سیراب کرتے ہوئے تمام تر کثافتوں کو اپنے ساتھ بہائے لیے جاتا ہے۔ پاپ دھل جاتے ہیں اور صاحبان عمارات میلوں دوری پر بیٹھے بیٹھے‘ پاک وصاف ہو جاتے ہیں۔

کتنی ہی حسین وجمیل‘ نازک اندام اصناف ندی میں اشنان کر رہی تھیں۔ جب صاف وشفاف‘ شیشے کی طرح نیچے تہ تک نظر آتے پانی میں ڈبکی لگا کر ابھرتیں تو اپنے گھنے لمبے بالوں کو سنوارتے ہوئے‘ جل پریوں کا سا روپ دھار لیتی تھیں۔ پانی میں پیدا ہونے والا بھنور‘ مچل مچل کر رقص کناں ہو جاتا تھا اور ان کے پرتو سے حسن گزیدہ گرداب ہولے ہولے جھومتا ہوا گداز پنڈلیوں سے مس ہونے کے لیے دوبارہ ان کی جانب بڑھنے لگتا تھا۔ گنگا کا شاطر پانی‘ انتہائی قیمتی باریک ساریوں میں جذب ہو کر ان سرخ وسپید اجسام کی حرارت سے قطرہ قطرہ موتیوں کی طرح چمکنے لگتا تھا۔ اور یوں دور و نزدیک سے اس ”جاترا“ پر آئی ہوئی نازنیناں ہندا اپنے پاپوں کا کفارہ ادا کرتے ہوئے ”پوتر“ ہو جاتی۔ اور نئی زندگی میں قدم رکھتے ہوئے انتہائی مسرت محسوس کرتی تھیں۔ بجائے اسٹیج کے ہر روز پانی کے اندر کھیلے جانے والے اس مسحور کن اور انتہائی متاثر کن ”اندر سبھائی“ کھیل نے جانے کتنوں کو گھائل کر دیا ہوگا۔

ان منفرد دیدنی و نادیدنی نظاروں کا لطف اٹھاتے ہوئے معاً میں چونک پڑا اور کمان کی شکل کے بنے ہوئے پل کو عبور کر کے بڑے سے صحن میں جا داخل ہوا۔ یہاں کا ماحول توقع کے برخلاف انتہائی کثیف تھا جابجا وہی اور سندور سے پٹی پڑی سرخ اینٹیں نوحہ کناں تھیں۔ فرش پر جگہ

جگہ بکھرے ہوئے سروں سے تراشے گئے کالے اور سفید چکناہٹ زدہ بال تھے جن پر چلتے ہوئے اکثر انسان پھسل کر دور جا گرتے تھے۔ کسی صاف سی جگہ کا اندازہ کرتے ہوئے میں بجانب شمال صحن کے آخری کونے پر پہنچ گیا۔ یہاں ایک بوڑھا شخص پانی کے کنارے، مشرقی جانب، چڑھتے سورج کی طرف منہ کیے ہاتھ میں چھوٹی سی کتاب پکڑے کچھ پڑھنے میں منہمک تھا۔ میرے دل میں ایک ولولہ سا پیدا ہوا۔ کپڑے اتار کر لنگی لپیٹی اور اشنان کے لیے پانی میں اتر گیا۔ ابھی میں آٹھ دس فٹ تک تیرتا ہوا گیا ہی تھا کہ بوڑھے کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ چلایا: ''او بھئی! فوراً واپس آؤ، فوراً!!''

''غالباً پوتر پانی میرے وجود سے بھرشٹ ہو گیا ہے۔'' یہ خیال آتے ہی پلٹا اور ڈرتے ڈرتے بوڑھے کے قریب آ گیا۔ ''جلدی سے باہر نکلو۔'' وہ پھر سے دہاڑا: ''کہاں سے آئے ہو؟'' اس نے سوال کیا۔ ''جی کشمیر سے آیا ہوں۔'' میں نے جواباً عرض کیا...... ''اچھا تو یہ کشمیری دلیری ہی ہے جو تم کو ایسا کرنے پر اکسا رہی ہے۔'' اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

''جانتے ہو کتنے ہی مہا مگر مچھ، تم ایسے نادانوں کے منتظر اس گہرے پانی میں موجود ہیں! جاؤ!! تپسیا کرو!! دھان دو!! پرماتما کا شکر ادا کرو تم بچ گئے ہو۔'' بوڑھے نے یہ آخری فقرہ لرزتی زبان سے ادا کیا ہی تھا کہ میرے جسم پر تازہ پانی پسینے کے قطروں میں شامل ہو گیا۔ میں نے اس بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔

ایک لمبا عرصہ بیت چکا ہے مگر آج بھی جب کبھی گزرے ہوئے لمحات اور پوتر گنگا کی وسعتوں میں مہا مگر مچھ کی یاد آتی ہے تو میں تھر تھر کانپنے لگتا ہوں۔ ''پوتھی پڑھتے'' اس بوڑھے شخص کے کلمات مجھے آج بھی ازبر ہیں۔ اللہ کریم کا شکر ادا کرتے ہوئے، اپنی التجاؤں میں، اس کو کبھی نہیں بھول پایا۔

☆☆☆

میرے ایک پھوپھا زاد بھائی برما میں مقیم انگریزی فوج کے ٹھیکیدار تھے۔ وہ انتہائی ملنسار اور انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ علم دوست تھے۔ کبھی کبھی انگریزی میں شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ بڑے بڑے انگریز اور امریکی افسروں کو اپنا گرویدہ بنا لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ مذاہب عالم پر بھی نظر رکھتے تھے۔ اکیلا پن، ان کی طبیعت کو کبھی راس نہیں آیا، چنانچہ جتنا عرصہ گھر پر رہتے، عالم و فاضل دوستوں کا آنا جانا برابر جاری رہتا تھا۔ جنگ عظیم دوم کا زمانہ تمام ہوا تو پاکستان بننے پر گھر واپس آ گئے۔ ان دنوں مہاجرین کا سلسلۂ آمد جاری تھا۔ وہ کیمپوں میں جاتے اور مریضوں کی دیکھ بھال کرتے۔ اسی شوق میں شکار پور سندھ جا پہنچے اور وہیں کے ہو رہے۔ ایک عرصے بعد گھر آئے تو ان کے ساتھ ایک جرمن خاتون دیکھ کر گھر کے علاوہ دوست و احباب بھی حیران ہو گئے۔ دوسرے روز تھکان اتارنے کے بعد مجھے کہنے لگے: ''فلاں فلاں سے جا کر ملو اور کل اپنے ہاں کھانا تناول کرنے کے لیے کہو'، دوسرے روز پر تکلف دعوت ہوئی۔ آنے والے مقامی مہمانوں میں اچھے خاصے مذہبی شعور رکھنے والے بھی تھے چنانچہ کھانے کے بعد اس جرمن لیڈی کا تعارف کرایا گیا کہ دین اسلام کے متعلق کچھ جاننا چاہتی ہے۔ نام اس کا انگے شرام تھا۔

اسلام کے موٹے موٹے زریں اصول سنتے ہی وہ مبہوت ہو گئی۔ صاحب دیدہ و بینا تھی۔ جلد پسیج گئی اور دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑ کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر معاً آہ بھر کر گویا ہوئی: ''افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج تک کسی نے بھی مجھے اس دین حنیف کے متعلق کبھی کچھ نہیں بتایا۔ اب وقت کم

ہے' ویزا ابھی ختم ہو رہا ہے اور مجھے حسب وعدہ پروگرام کے مطابق انڈیا میں ہندو ''یوگا اکیڈمی'' رکھیگیش پہنچنا ہے۔'' چنانچہ دوسرے روز جب یہ پچاس سالہ خاتون بناؤ سنگھار کیے ہوئے رخصت ہوئی تو ہر کس و ناکس متحیر ہو کر رہ گیا۔ اور پھر جب واہگہ پہنچ کر اپنے مختصر سامان کے ساتھ اپنی ہی بائیک پر جو وہ آغاز سفر میں اپنے ساتھ لائی تھی' سرحد پار کر کے اس طرف گئی تو ہماری آنکھوں کے سامنے پنڈتوں' پروہتوں اور سرکار ہند کے اعلیٰ افسروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

لگتا تھا وہ کچھ رنجیدہ سی تھی اور اس نے آب دیدہ اور محبت بھری نظروں سے سرزمین پاک کو الوداع کہا تھا...... واپسی پر بھائی جان نے متحیر کن بیان بزبان جرمن لیڈی یوں دہرایا:

''جنگ عظیم میں میرے ماں باپ' بھائی بہن بلکہ پورا کنبہ ہلاک ہو گیا تھا' حتیٰ کہ میرا منگیتر بھی کام آ چکا تھا۔ میں کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔ گھومنا پھرنا اپنا شعار بنا لیا۔ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ ایک دفعہ ترکیہ میں درہ دانیال کے کنارے ہوٹل میں رہائش کے دوران' میں اپنے کمرے کے برآمدے میں بیٹھی کچھ مطالعہ کر رہی تھی کہ کچھ نوجوان مجھ پر فریفتہ ہو گئے۔ کئی روز تک یہ پرذوق تماشا ہوتا رہا۔ میں نے ان کی حرکات کا کبھی برا نہیں مانا تھا۔ ایک روز' بناؤ سنگھار کے بغیر حسب عادت میں آرام کرسی پر بیٹھی کارخانہ قدرت کی رعنائیوں پر سوچ میں گھوم تھی کہ ان نوجوانوں پر اوس پڑ گئی۔ ان میں ایک ہندو ''سندھی شکارپوری'' ڈاکٹر بھی تھا۔ وہ مجھ پر ٹوٹ کر مرتا تھا۔ چنانچہ دوسرے روز معذرت کرنے وہ میرے پاس چلا آیا۔ میری کہانی سن کر بڑا شرمندہ اور متاثر ہوا۔ پھر وقفے وقفے بعد میرے پاس چلا آتا اور ہندومت پر مجھے لیکچر دیتا رہتا تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ نہ صرف میرے ماں باپ اور احباب مجھے مل سکتے ہیں بلکہ میرا منگیتر مجھ سے باتیں بھی کر سکتا ہے' مگر اس عمل کے لیے مجھے ہندوستان کا سفر کرنا ہوگا۔''

بھائی صاحب نے مزید بتایا: ''یہ ہندو ڈاکٹر شکارپور میں میرا ہمسایہ تھا۔ اب غریب الوطن پر ڈورے ڈالنے کی بھنک جب میرے کانوں میں پڑی تو میں نے سوچا کیوں نہ اس بیچاری کو دین فطرت سے روشناس کرایا جائے؟ میں نے سوچا واہگہ بارڈر میرے گھر کے قریب ہے' میڈم کو وہیں سرحد پار کرنی ہے' لہٰذا اپنے ساتھ یہاں آنے کی ترغیب دی جو اس نے خوش دلی سے قبول کر لی۔'' بھائی نے آہ بھر کر کہا: ''افسوس وقت کی کمی آڑے آ گئی اور اسلام کی جھلک سے متاثرہ خاتون سرحد پار کر گئی۔'' دوسرے روز بھائی صاحب بھی واپس شکارپور چلے گئے۔ دو ماہ بیت گئے' پھر اچانک ایک روز بھائی کے نام کا ایک خط ملا......

''پیارے دوست! میں نے یہاں دہلی میں ایک تعلیمی ادارے میں جرمن زبان پڑھانے کا اہتمام کیا ہے۔ جونہی میرے پاس کچھ رقم جمع ہوتی ہے' میں جلد وطن مالوف لوٹ جاؤں گی۔ مجھے سفر ہند میں کیا کیا تجربات حاصل ہوئے ہیں' یہ ایک لمبی کہانی ہے جسے واپس جا کر قلمبند کروں گی اور تفصیلی طور پر کچھ کہہ سکوں گی۔ آپ کے ہاں سے ''دین فطرت اور اسلام ازم'' سے متعلق مختصر مگر روشن پہلو بہر حال میرے نہاں خانہ دل میں موجود ہیں جو آئندہ میرے اسباق میں شامل رہیں گے...... فقط...... ''انگے''

ڈیرہ دون کی طرف جاتے ہوئے سرسبز و شاداب اور انتہائی طلسماتی پہاڑوں کے اندر پوتر گنگا کے دامن میں رکھیگیش یوگا کالج ہے۔ یہ

واحد اکیڈمی یا ادارہ ہے جہاں جوگی بنانے اور پارسائی کی زندگی گزارنے کی منفرد اور اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ شنید ہے کہ یہاں بالخصوص ہندو معاشرے کی ستائی اور پٹی ہوئی مستورات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے؟ خدا جانے اس غریب الوطن جرمن دوشیزہ پر کیا گزری اور کیسا سلوک روا رکھا گیا اور پھر کن حالات میں اپنی جان بچا کر وہ دہلی پہنچ پائی ہوگی؟ حسب وعدہ وہ تفصیلی خط پھر کبھی نہ لکھ سکی اور یہ عقدہ حل نہ ہو سکا۔

(عزت اللہ ڈیر۔ اردو ڈائجسٹ نومبر 1998ء)

تساؤ کے آدم خور

تساؤ کے آدم خور...... شکاریات کے موضوع پر ایک مستند کتاب اور حقائق پر مبنی سچا واقعہ...... یوگنڈا (کینیا) کے دو خونخوار شیر جو آدم خور بن گئے تھے...... ایک سال کی قلیل مدت میں 140 انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے والے تساؤ کے آدم خور...... جنہوں نے یوگنڈا میں بچھنے والی ریلوے لائن کا کام کھٹائی میں ڈال دیا تھا۔ جو لومڑی سے زیادہ مکار تھے اور چھلاوہ کی طرح غائب ہو جاتے تھے۔ اس سچے واقعے پر انگلش فلم ”Ghost & The Darkness“ بھی بنائی گئی۔ جون ہنری پیٹرسن (فوجی اور ریلوے لائن کام کا انچارج) کی کتاب (The Man-Eaters of Tsavo) کا اُردو ترجمہ **کتاب گھر** پر **شکاریات** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

گلریا کا آدم خور

گلریا کا آدم خور برٹش آرمی کے ایک سابق بریگیڈئیر جمشید ارجاسپ خان کیانی کی آپ بیتی ہے، جسے عبیدہ اللہ بیگ نے کہانی کی شکل میں تحریر کیا ہے۔ **گلریا کا آدم خور** ۴۰ کی دہائی کی ایک شکاری مہم ہے جو ایک طرف اُس وقت کے راجھستان اور راجھستانی راجاؤں کی آن بان کی خوبصورت تصویر پیش کرتی ہے تو دوسری طرف تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کی راہ میں آنے والی سیاسی ریشہ دوانیوں اور ان دیکھی قوتوں کی پس پردہ سازشوں سے نقاب اُٹھاتی ہے۔ اس داستان میں بعض ایسے حقائق بیان کئے گئے ہیں جو اس خطہ کے جغرافیائی نقشہ کو کسی اور ہی رخ سے پیش کرتے ہیں۔ یہ ناول **شکاریات سیکشن** میں پڑھا جا سکتا ہے۔

خواب یہ ہم دیوانوں کے

بسی سرہند شریف کے مسلمانوں کی پرآشوب داستان ہجرت

ایک دن فراغت ملنے پر ابو جان کے پاس بیٹھے ہوئے میں نے یونہی باتوں میں ان سے کہا کہ ہمیں کوئی کہانی یا آزادی پاکستان کے بارے میں کچھ واقعات جو آپ کو یاد ہوں سنائیں۔ میری اس بات کی دوسرے بھائی بہنوں نے بھی پرزور تائید کی۔ والد صاحب کہنے لگے۔

”بیٹا! مجھے اپنے وہ دن آج بھی یاد ہیں جب میں چھوٹا سا بچہ تھا۔ میرے والد قصبہ بسی، سرہند شریف، ریاست پٹیالہ میں رہتے تھے۔ محنت مزدوری کر کے روزی کماتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ وہ اپنے بیٹے کو تعلیم ضرور دلوائیں گے تا کہ انہیں بھی قصبے کے دوسرے معززین کی طرح اپنی اولاد پر فخر ہو، چنانچہ اگلی صبح انہوں نے مجھے لے کر جا کر قریبی قصبے کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ میرے والد سارا دن بے حد خوش رہے کیوں کہ میری تعلیم کی ابتدا ہو چکی تھی۔

شام کو گھر میں ہمارے کئی رشتہ دار آئے جنہوں نے والد صاحب سے کہا کہ تم نے اپنے بچے کو اسکول میں کیوں داخل کروایا ہے حالانکہ تم اسے اپنے ساتھ کام پر لگا کر گھر کی غربت دور کر سکتے ہو، لیکن میرے والد نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اپنے بچے کو ضرور تعلیم دلواؤں گا خواہ اس کے لیے مجھے دوگنی محنت مزدوری کرنی پڑے۔

دن گزرتے رہے، میں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کر لی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے ملازمت حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی تا کہ مزید تعلیم کے ساتھ ساتھ بوڑھے والدین کا ہاتھ بھی بٹا سکوں، مگر ملازمت کا حصول کارے دار تھا۔ انہی دنوں میرے والد کا انتقال ہو گیا اور میں روزگار کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ خاصی جدوجہد کے بعد ایک عمر رسیدہ ہندو وکیل نے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ کچہری لے گیا۔ اس کے دفتر میں گنے چنے لین دین کے معمولی مقدمات ہی تھے۔ ایک دو مقدمات کی پیشی عدالت میں ہوتی جو اول وقت ہی نپٹا لیتے۔ باقی تمام وقت میں عدالت کے انچارج ریکارڈ روم شیخ صاحب کے پاس بیٹھ کر ان کا دفتری کام کرتا رہا۔ ان کے ہاں خاصا کام تھا، میں نے ہندو وکیل کی ملازمت چھوڑ دی اور شیخ صاحب کے ساتھ ریکارڈ روم میں کام کرنے لگا۔ مثلوں کا اندراج، گوشواروں کی ترتیب اور دیگر متعلقہ کام میرے ذمے تھے۔ اس کام کے دوران مجھے مقدمات کے بارے میں کافی معلومات ہو گئیں۔

گرمیوں کے دن تھے۔ ایک روز شیخ صاحب کے پاس تحصیل سمرالہ کے ایک گاؤں کا نمبردار اپنے مقدمے کی مثل دیکھنے آیا۔ اور اس نے

جاتے ہوئے شیخ صاحب کو دو روپے پیش کیے جو شیخ صاحب نے خاصی عذر خواہی کے بعد رکھ لیے۔ وہ نمبردار تو اپنا مقصد حاصل کر کے چلا گیا لیکن انہی دنوں یہ بات پھیلی کہ رشوت لینے والے سرکاری ملازموں کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی جائے گی اور انہیں فوری طور پر معطل کر دیا جائے گا۔ اس بات سے خوفزدہ ہو کر شیخ صاحب نے مجھے تخلیئے میں بلا کر کہا: ''میرا ایک نہایت ضروری کام کرو' تم نمبردار کے گاؤں سمرالہ جاؤ اور اس کے دیے ہوئے دو روپے واپس کر کے آؤ''

میں اگرچہ مذکورہ گاؤں اور اس کے اردگرد علاقے سے بالکل ناواقف تھا مگر اپنی فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے میں نے اس کام کی حامی بھر لی جس پر شیخ صاحب نے دو روپے کے ساتھ دس روپے سفر خرچ بھی دیا۔

دو دن کے سفر کے بعد میں نمبردار کے گاؤں پہنچا۔ وہ مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوا۔ میں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ خوب قہقہہ لگا کر ہنسا' پھر کہنے لگا۔ ''یار صدیق! شیخ صاحب بھی خوب آدمی ہیں۔ ذرا سی تو بات تھی جس کے لیے انہوں نے اس قدر تردد کیا۔ بہر حال اب تم یہاں آئے ہو تو دو چار دن یہاں رہ کر جاؤ۔'' میں نے اپنی مصروفیات گنوا کر معذرت چاہی۔ اس کے باوجود انہوں نے خوب میری خاطر تواضع کی اور مجھے گاؤں کے کئی لوگوں سے ملوایا۔ پھر میں نے واپسی کی اجازت چاہی اور میرے اصرار پر نمبردار نے اپنے لڑکے کو میرے ہمراہ کیا جو مجھے ایک آسان راستہ سے قریبی قصبے تک چھوڑ گیا۔ جہاں سے میں بذریعہ ٹرین واپس اپنے گھر پہنچ گیا۔

کچھ عرصہ بعد میں نے مولوی گل محمد وکیل کے ساتھ بطور کلرک کام شروع کر دیا۔ میں نے محنت و شوق سے کام جاری رکھا جس کی بناء پر ان کا کاروبار وکالت خوب چمک نکلا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے میں نے مولوی گل محمد صاحب کی اجازت سے ایک شخص بطور اسسٹنٹ اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ ایک روز سکھ سرکار کی طرف سے ایک فرمان جاری ہوا کہ تمام عدالتوں اور دفاتر میں لکھت پڑھت کا تمام کام اردو کی بجائے گورمکھی زبان میں کیا جائے۔ اس سکھ شاہی زبان سے ہندو' سکھ تو بہت خوش ہو گئے لیکن مسلمان وکلاء اور اہلکاروں پر اس کا بہت برا اثر پڑا اور انہیں اپنا کام جاری رکھنے کے لیے مجبوراً گورمکھی زبان سیکھنا پڑی۔ عدالتوں میں کام کرنے والے عمر رسیدہ کہنہ مشق اشخاص کو بھی گورمکھی کا قاعدہ ہاتھ میں لینا پڑا۔

انہی دنوں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کی وجہ سے شہر میں ہندو مسلم فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ہوا یوں کہ مولوی صاحب کو کسی مقدمے کی پیروی کے لیے سردار بدن سنگھ صاحب انریری مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ دوسرے فریق کی جانب سے لالہ گوردتہ مل وکیل جو ایک دیوہیکل شخص تھا' پیش ہوا۔ گواہ کے بیان پر جھڑپ ہو گئی اور ہوتے ہوتے ایک دوسرے کی ذاتیات پر رکیک حملے ہونے لگے جس پر مجسٹریٹ نے دونوں وکلاء کو سمجھا بجھا کر خاموش کر دیا۔ مولوی صاحب اگرچہ مجسٹریٹ کی ہدایت پر خاموش ہو گئے۔ لیکن ان کا غصہ بدستور قائم رہا۔ اور انہوں نے زینے سے نیچے اتر کر بیرونی صحن میں پہنچتے ہی لالہ گوردتہ مل کو للکارا: ''او موٹے کتے تو نے کیا بکواس کی تھی۔'' اور ساتھ ہی اسے اپنی چھڑی سے پیٹنا شروع کر دیا۔ لالہ گوردتی مل اپنے جسم اور ٹانگوں پر کئی ضربیں کھا کر غصے سے تلملا اٹھا اور اپنے موکل سے ایک بڑا لٹھ لے کر مولوی صاحب پر حملہ آور ہونے کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے اور اسسٹنٹ نے آگے بڑھ کر اس کا لٹھ پکڑ لیا۔ اس طرح مولوی صاحب اس کے لٹھ کی ضرب سے بال بال بچ گئے۔ اس دوران شور سن کر کچہری میں موجود لوگ اکٹھے ہو گئے اور معاملہ کو رفع دفع کروا دیا' لیکن لالہ گوردتہ مل کو وکیل مار کھانے پر سخت غصے میں بھرا

ہوا تھا اور اس نے اپنے مکان پر جاتے ہی یہ سارا قصہ اپنے نوجوان لڑکوں کو کہہ سنایا۔ اس کے دونوں لڑکے لالہ خوش بخت رائے اور لکھپت رائے بڑے طیش میں آئے۔ انہوں نے رات کو تمام ہندو نوجوان اکٹھے کر کے مولوی صاحب سے بدلے لینے کی ٹھان لی اور مولوی صاحب کے مکان پر حملہ کر کے ان کو ختم کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ کسی طرح مسلمان کو ان کے منصوبے کا علم ہو گیا‘ چنانچہ غلام مصطفیٰ خان‘ روح اللہ خان وغیرہ نے دیگر دلیر مسلمان نوجوان اکٹھے کر لیے اور مولوی صاحب کے مکان پر پہنچ گئے۔ انہوں نے بازاروں میں چکر لگا کر علی الاعلان کہا کہ اگر کسی ہندو نوجوان نے مولوی صاحب کے مکان کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ شہر میں اس وجہ سے امن وامان کی صورت حال بگڑنے کا خدشہ پیدا ہوا تو بڑے بوڑھے ہندو لیڈروں نے اپنے نوجوانوں کو روکا اور باہم صلح صفائی سے معاملہ رفع دفع کروا دیا۔

میں نے ملازمت کے دوران اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ جب میں وکالت کے امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھا‘ ان دنوں تحریک آزادی پاکستان بڑے زور وشور سے جاری تھی۔ مولوی گل محمد صاحب کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے مجھے تحریک آزادی کے کارکنوں میں شمولیت کا موقع ملا۔ مولوی گل محمد قصبہ بسی‘ سرہند شریف کی مسلم لیگ کے سرگرم لیڈر تھے‘ اس لیے ان کے ہمراہ میں بھی مسلم لیگ کے تمام اہم اجلاسوں میں شریک ہوتا۔ مجھے وہ دن آج بھی یاد ہیں جب ہم سب اپنے قائداعظم محمد علی جناح کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب ہوتے تھے۔ ہر کوئی اپنے محبوب قائد کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار رہتا۔

آخر کار آزادی پاکستان کے متوالوں کی خداوند تعالیٰ جل شانہ کے حضور میں سنی گئی اور 14 اگست 1947ء مطابق 27 رمضان المبارک کے دن قیام پاکستان کا اعلان ہونے پر ایک نئی مملکت خداداد کے وجود کا سورج طلوع ہوا۔ سب مسلمانوں نے رب العزت کے حضور سجدہ ریز ہو کر شکر ادا کیا۔ ہر کوئی خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ لیکن یہ خوشی حاصل ہو جانے کے ساتھ ہی مصائب وآلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ سکھ سرکار اگرچہ یہ اعلان بار بار کرتی رہی کہ موتیوں والی سرکار کے شہر (سرہند شریف) میں کچھ نہیں ہوگا اور مسلمانان بستی کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک دستہ اسکول کی عمارت میں پہنچ چکا ہے۔

ادھر ہندو لیڈروں نے سکھ رہنماؤں اور مہاراجہ پٹیالہ کو یہ جھانسا دیا کہ سکھوں کو کلیدی عہدے دے کر حکومت میں شامل کیا جائے گا اور مہاراجہ پٹیالہ کو پنجاب کی ریاستوں کا سرمکھ ٹھہرایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے سکھوں کو اکسا کر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کروا دیا تاکہ ادھر سے کوئی مسلمان صحیح سلامت پاکستان کی حدود میں داخل نہ ہو سکے۔ اس طرح پاکستان لاکھوں لٹے پٹے اور زخمی مہاجرین کے مسئلے سے دوچار ہو کر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے گا اور اسے مجبوراً جلد ہی اکھنڈ بھارت میں شامل ہونا پڑے گا۔

ہندوؤں سکھوں کی باہمی سازش کے مطابق سکھ درندے جتھوں کی شکل میں فوج کی امداد کے ساتھ ریاست پٹیالہ کے اندر اور قریبی علاقوں میں دندناتے ہوئے مسلمانوں کے دیہات اور قصبوں پر حملے کرنے لگے۔ وہ نہتے مسلمانوں کو بے دریغ قتل کر دیتے اور ان کے گھروں کو آگ لگا دیتے۔ بستی سرہند شریف کے مسلمانوں کو باہر کی وارداتوں سے بے خبر رکھنے کے لیے شہر میں غیر معینہ مدت کے لیے کرفیو لگا دیا گیا۔ شام کو صرف ایک گھنٹے کے لیے کرفیو ہٹایا جاتا تاکہ اس دوران مسلمان خوردونوش کی اشیاء بازار سے خرید سکیں۔ کرفیو کا نفاذ دو ماہ جاری رہا۔ تاہم اس دوران

اکا دکا مسلمان بچتے بچاتے شہر کی حدود میں داخل ہو کر سکھوں کے ظلم وستم کے واقعات سناتے جن سے سکھ سرکار کے امن وامان کے جھوٹے دعوؤں کا پتہ چلتا۔ بستی کے قریب مسلمانوں کے جو گاؤں تھے، سکھ درندوں نے حملے کر کے وہاں کے مسلمانوں مرد وزن اور بچوں کو نہایت بے دردی سے تہ تیغ کر دیا اور ان کے گھروں کو لوٹ کر آگ لگا دی۔ پتہ چلنے پر ہم مسلمان ان دیہات میں پہنچ کر شہداء کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرتے اور زخمیوں کو اٹھا کر اپنے شہر میں لے آتے جہاں ان کے لیے ایک کیمپ کھول دیا گیا۔ کیمپ میں ادویات اور خورد ونوش کا ہم نے انتظام کر رکھا تھا۔ مقامی مسلمان ڈاکٹروں اور نوجوانان شہر نے مل جل کر بے لوث خدمت انجام دی۔

انہی دنوں شہر روپڑ سے مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کا قافلہ قرالی کیمپ کے نزدیک پہنچا تو سکھ درندوں نے حملہ آور ہو کر ان کا قتل عام شروع کر دیا۔ ظالموں نے ننھے معصوم بچوں کو بھی نہ بخشا۔ انہیں ماؤں کی گودوں سے چھین کر ہوا میں اچھالتے اور پھر زمین پر گرنے سے قبل ہی تلوار کا وار کر کے ٹکڑے کر دیتے اور کہتے تھے کہ دیکھو یہ تمہارا پاکستان۔

مسلمانان بسی سرہند شریف پر جو گزری وہ ایک الگ داستان ہے۔ شہر میں لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم ہوا تو نفسا نفسی کے اس عالم میں سب اپنے عزیز واقارب سے بچھڑ گئے۔ لوگ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان کی طرف چل پڑے۔ تلواروں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے۔ کتنے ہی بھوکے پیاسے مر گئے۔ کتنے ہی دشمن کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

جب ہم لاہور جانے والی گاڑی پر سوار ہونے کے لیے ریلوے اسٹیشن پہنچے تو میری پیٹھ پر میری بوڑھی والدہ تھیں اور سب رشتہ دار ہمراہ تھے۔ گاڑی کے آس پاس سکھ فوجی کھڑے تھے۔ گاڑی کے اندر اور اوپر لوگ بے تحاشا سوار ہو گئے تھے۔ سکھ فوجی نئے آنے والوں کو گاڑی کے قریب نہ جانے دیتے۔ میں نے ایک سکھ فوجی کی منت سماجت کی کہ مجھے صرف اپنی بوڑھی والدہ کو گاڑی میں سوار کرانا ہے، اجازت دے دیں۔ اس نے کہا: ''چل جا فیر جا تو اپنی ماں نوں گڈی تے چڑھا دے۔'' وہ یہ کہہ کر دوسرے سکھ فوجیوں سے بات کرنے لگا۔ میں نے موقع غنیمت جانا۔ گاڑی کا دروازہ کھلنے پر جلدی سے والدہ کو سوار کرایا اور ساتھ ہی بیوی اور دیگر رشتے کو بھی اشارہ کیا۔ سب جلدی سے جہاں جگہ ملی گاڑی میں سوار ہو گئے۔

چار پانچ دن ہم گاڑی میں بیٹھے سفر کرتے رہے۔ گاڑی کا ڈرائیور سکھ تھا جو گاڑی بہت آہستہ چلاتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں جنگل بیاباں میں کئی کئی گھنٹے گاڑی روکے رکھتا تھا۔ دلوں میں انجانا خوف تھا۔ سب نے دعائیں مانگی جا رہی تھیں کسی طرح سب لوگ منزل تک پہنچ جائیں۔ میرے بہت سے رشتے دار جلدی میں زیادہ تر گاڑی کی چھت پر چڑھ سکے تھے اور انہیں جان کا زیادہ خطرہ درپیش تھا۔

اللہ اللہ کر کے مملکت خداداد پاکستان کی حدود میں داخل ہوئے تو ''نعرۂ تکبیر' اللہ اکبر' کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ اور ہم سب خدائے عزوجل کے حضور میں سجدہ ریز ہو کر شکر بجا لائے سرزمین پاک پر قدم رکھتے ہی ہر کوئی بے تاب ہو کر اسے چوم رہا تھا۔ سب ایک دوسرے سے گلے مل کر مبارکباد دے رہے تھے۔ عجب خوشی کا عالم تھا۔

لٹے پٹے مہاجروں کی آمد کا لامتناہی سلسلہ بدستور جاری رہا۔ لاہور کے تمام کیمپ مردوں، عورتوں اور بچوں سے بھر گئے۔ سینکڑوں لوگ کھلے آسمان تلے بے کسی کی حالت میں پڑے پائے گئے۔ ہر شخص اپنے عزیز واقارب کی تلاش میں سرگرداں اور پریشان نظر آتا تھا۔ مقامی لوگوں

نے مل جل کر ان کے دکھ سکھ بانٹے۔ ہر شخص اپنے حصے کا لقمہ دوسرے پاکستانی کو دینے پر آمادہ ہوتا تھا۔ آزادی کی خوشی نے سب دکھ بھلا دیے۔

بیٹے! یہ آزاد وطن ہمیں بڑی قربانیوں سے ملا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ خود کو دنیاوی خواہشات کے تابع نہ ہونے دیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے پیارے وطن پاکستان کی ترقی کے لیے کام کرتے رہیں اور آزادی کی قدر کریں اور اپنے عظیم رہنما قائداعظم محمد علی جناح کے سنہری اصولوں ''اتحاد، ایمان، تنظیم'' پر خود کو کاربند کر لیں۔ سب پاکستانیوں کی نجات اسی میں ہے۔ ہم دیوانے اس پاک وطن کو خوشحال، اسلام کا قلعہ اور دفاعی لحاظ سے انتہائی مضبوط بنانے کے خواب دیکھتے آئے ہیں کہ یہ برصغیر کے مسلمانوں کی آخری پناہ گاہ ہے۔ ہمیں اسے ناقابل تسخیر بنانا ہے۔

آؤ ہم سب مل کر کہیں ''پاکستان زندہ باد!''

(روایت محمد صدیق صدیقی، تحریر جاوید اختر صدیقی
اردو ڈائجسٹ۔ اگست 1997ء)

اُردو ٹائپنگ سروس

اگر آپ اپنی کہانی، مضمون، مقالہ یا کالم وغیرہ کسی رسالے یا ویب سائٹ پر شائع کروانا چاہتے ہیں لیکن اُردو ٹائپنگ میں دشواری آپ کی راہ میں حائل ہے تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔

☆ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر سکین کیجئے اور ہمیں بھیج دیجئے یا
☆ اپنی تحریر رومن اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیج دیجئے یا
☆ اپنا مواد اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے ہمیں ارسال کر دیجئے یا
☆ مواد زیادہ ہونے کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھی بھیجا جا سکتا ہے

اردو میں ٹائپ شدہ مواد آپ کو ای میل کر دیا جائے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ہماری اس سروس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ادائیگی کے طریقہ کار اور مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں۔

فون نمبر 0092-331-4262015, 0300-4054540
ای میل harfcomposers@yahoo.com

دو لاکھ مسلمانوں کی تڑپتی ہوئی لاشیں

''ہندوو! تمہیں تمہاری ماں کی قسم تمہارے لڑکے کی قسم، اپنے کرتویہ سے نہ ہٹنا اور اپنے جیون میں پانچ پانچ مسلمانوں کو قتل کر کے اپنے ایشٹ دیوتاؤں پر اپنے ہاتھوں سے چڑھاؤ، سارے دیش کا پیار تمہارے ساتھ ہے''

ایک ہینڈ بل جو فسادات سے پہلے الہ آباد میں تقسیم کیا گیا۔ بھارت میں مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہی ہے آبادشاد پوری اس کی بائیس سالہ روداد لکھ رہے ہیں۔

ستمبر کا تیسرا عشرہ شروع ہو چکا تھا بھارت کے سفارتی نمائندے رباط میں منعقد ہونے والی اسلامی سربراہوں کی کانفرنس میں شمولیت کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ یہ کانفرنس ایک خالص اسلامی اور مسلمان ملکوں سے تعلق رکھنے والے مسئلے پر غور و خوض کرنے کے لیے ہو رہی تھی، لیکن سیکولر بھارت اس میں شامل ہونے پر مصر تھا، اس کا سفارتی دباؤ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ عرب ملک بھی اس کے حامی تھے۔ ان کے پاس بھارت ہی کی سجھائی ہوئی ''زبردست'' دلیل تھی، بھارت میں چھ کروڑ مسلمان رہتے ہیں، انہیں اس کانفرنس میں نمائندگی ملنی چاہیے جو ملک اس کانفرنس کو صرف اسلامی ملکوں تک محدود رکھنا چاہتے تھے وہ سخت پریشان تھے، ان کے پاؤں تلے سے زمین بتدریج نکلتی جا رہی تھی۔ ٹھیک اس زمانے میں بھارت کے صوبہ گجرات کے دارالحکومت احمد آباد میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا ان کے گھر اور دکانیں نذر آتش کی جا رہی تھیں۔ بچوں، عورتوں اور مردوں کو زندہ جلایا جا رہا تھا، اس قتل عام کا آغاز 19 ستمبر کو ہوا۔ مسلمانوں کے نام پر اسلامی سربراہوں کی کانفرنس میں نمائندگی کی دعویدار سیکولر حکومت نے چار روز تک بیرونی دنیا کو اس کی ہوا تک نہ لگنے دی، لیکن جب آگ بڑھتی ہی چلی گئی، تو 22 ستمبر کو پہلی بار دنیا نے سنا کہ سیکولر بھارت کے شہر احمد آباد میں مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ 22 ستمبر کو ''ڈیلی ٹیلی گراف'' نے اپنے نمائندے ڈیوڈ لوشک مقیم نئی دہلی کا جو ڈسپیچ شائع کیا، اس میں کہا گیا تھا:

''گجرات کے دارالحکومت احمد آباد میں گزشتہ چار دن کے فسادات میں سرکاری اعلان کے مطابق 94 آدمی ہلاک اور ساڑھے تین سو زخمی ہو چکے ہیں غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہلاک ہونے والوں کی تعداد 120 سے زائد ہے دو بٹالین فوج طلب کی جا چکی ہے اور 36 گھنٹے کے کرفیو میں مزید 24 گھنٹے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔''

اسی روز ٹائمز (لندن) نے احمد آباد کے قتل عام کی خبر دیتے ہوئے لکھا:

''سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تقریباً ایک سو آدمی ہلاک ہو چکے ہیں لیکن گزشتہ تجربات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ہلاک ہونے

والوں کی تعداد دگنی ہے۔''

25 ستمبر کو ''ڈیلی ٹیلی گراف'' نے اطلاع دی: ''احمد آباد میں قتل وغارت اور آتش زنی کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ شہر میں پولیس کے پانچ ہزار سپاہی اور ایک ہزار فوجی جوان پہلے ہی موجود تھے۔ اب مزید دو ہزار فوج پہنچ گئی ہے اور مارشل لا کا گمان ہوتا ہے بایں ہمہ فسادات پر قابو نہیں پایا جاسکا۔ فسادات جمعرات کے روز شروع ہوئے تھے۔ ایک ہفتے میں 600 سے 1000 تک لوگ ہلاک ہو چکے ہیں جن میں 75 فیصد مسلمان ہیں۔''

27 ستمبر کو ''اکانومسٹ'' نے لکھا:

''سرکاری اعداد وشمار کے مطابق وسط ہفتے تک تین سو آدمی مارے جا چکے تھے۔ اصل تعداد کہیں زیادہ ہے۔ 1964ء کے بعد یہ بدترین فرقہ وارانہ قتل وغارت تھا۔''

''اکانومسٹ'' کے الفاظ میں بھارت میں فرقہ وارانہ کش مکش سال بہ سال بدتر صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 1968ء میں 346' 1967 میں 220 اور 1966ء میں 132 فسادات ہوئے سال رواں کی پہلی سہ ماہی میں 51 آدمی بھارت کی سیکولر دیوی کی بھینٹ چڑھے جبکہ 1968ء میں اسی عرصے میں 41 اور 1967ء کے انہی تین مہینوں میں 15 آدمی مارے گئے۔

ستمبر ختم ہوتے ہوتے ہلاک شدگان کی تعداد ایک ہزار سے اوپر ہوگئی۔ زخمیوں سے ہسپتال بھر گئے' تیس ہزار خاندان بے گھر ہو گئے۔

بیرونی ملکوں کے اخباری نمائندوں نے لکھا:

احمد آباد کے گلی کوچوں اور سڑکوں پر ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی ہیں' دھوئیں کے مرغولے اٹھ کر فضا کو تیرہ وتار بنا رہے ہیں' انہوں نے مزید لکھا کہ 1947ء کے بعد اتنے سنگین فسادات آج تک نہیں ہوئے۔ ہندو اکثریت کے بہیمانہ افعال نے 1947ء کی درندگی اور وحشت کی ہولناک یاد تازہ کر دی۔ ہندو بلوائیوں نے مسلمانوں کو چن چن کر مارا' عورتوں کی عصمت دری کی اور انہیں بچوں سمت زندہ آگ میں جلا دیا۔ بھارت کا وزیر داخلہ چاون احمد آباد پہنچا۔ تو ڈیوڈ لوشک کے بیان کے مطابق مسلمان رہنما بلکتے ہوئے اس کے قدموں پر گر پڑے اور التجا کی کہ فسادات ختم کرائے جائیں۔

یہ آگ بیس دن تک بھڑکتی رہی۔ پہلے احمد آباد کے نواحی گاؤں اس کی لپیٹ میں آئے پھر گجرات کے دوسرے شہر بڑودہ میں بھارت کے سرکاری اعلان کے مطابق دس آدمی مارے گئے' لیکن لوشک کا کہنا ہے کہ اصل تعداد کہیں زیادہ ہے۔ گجرات میں خدا خدا کر کے آگ ٹھنڈی ہوئی تو آسام میں بھڑک اٹھی۔

(2)

یہ آگ بھارت میں اُس دن سے بھڑک رہی ہے جب وہ آزاد ہوا تھا۔ اس میں جلنا بھارت کے مسلمانوں کا مقدر بن چکا ہے۔ بھارتی حکومت اور اخبارات اسے فرقہ وارانہ تصادم کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب کچھ یک طرفہ ہو رہا ہے۔ بعض سطح بین لوگ اس کی ذمہ داری قیام پاکستان پر عائد کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی یہ نفرت وعداوت اس لیے ہے کہ انہوں نے اپنے لیے

ایک الگ خطے کا مطالبہ کیا اگر بھارت اکھنڈ رہتا تو یہ روز و شب نہ ہوتے۔ یہ طرز فکر درحقیقت ہندو ذہنیت اور برصغیر کی تاریخ کے آخری دور سے بے خبری یا کوتاہ فہمی پر مبنی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو اکثریت نے اپنی قومی اور سیاسی زندگی کا آغاز ہی مسلمانوں کے ساتھ نفرت اور تصادم سے کیا۔ 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے فوراً بعد ان کی یہ ذہنیت سرگرم عمل ہو گئی تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں نیشنل کانگریس قائم ہوئی تو اس ذہنیت کو ایک پلیٹ فارم مل گیا چنانچہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو عملی زندگی کے ہر میدان سے نکالنے کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔

بیسویں صدی کے پہلے عشرے تک ہندو لیڈر اپنے عوام کو مسلمانوں سے متنفر کرنے اور اشتعال دلانے کے لیے باقاعدہ منصوبے بنانے لگے وہ جان بوجھ کر شرارتیں کرتے ہولی کے موقع پر مسلمانوں پر رنگ پھینکتے' مسجدوں کے آگے باجے تاشے بجا کر نکلتے' گائے کا گوشت مندر میں خود پھینکتے اور الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیتے غرض مسلمانوں کے ساتھ تصادم کے حیلے بہانے ڈھونڈتے۔ دوسرے عشرے میں انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا مسلمانوں کو الٹی میٹم دے دیا۔ ''ہندو دھرم قبول کر لو یا بھارت چھوڑ کر عرب چلے جاؤ ورنہ ہم زبردستی پھر عرب میں دھکیل دیں گے شدھی کی تحریک میں الٹی میٹم کے پہلے جز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وجود میں آئی دوسرے جز کی تکمیل کے لیے ہندو مہاسبھا نے جنم لیا جس کا لڑکا بازو اشٹریہ سیوک سنگھ تھا۔ تیسری طرف کانگریس نے متحدہ قومیت کی تحریک چلا کر مسلمانوں کو ہندو اکثریت میں سیاسی طور پر مدغم کرنے کی کوشش کی۔

ہندوؤں کے عزائم اس وقت بالکل بے نقاب ہو گئے جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت کانگریس نے برصغیر کے گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں وزارتیں بنائیں۔ کانگریسی صوبوں میں جگہ جگہ مسلم کش فسادات ہوئے اور مسلمانوں ہی کو ان کے جرم میں پکڑا گیا۔ مسلمانوں بچوں کو ذہنی طور پر شدھ کرنے کے لیے وارد ھا اور ودیا مندر ایسے تعلیمی منصوبے تیار کیے گئے۔ مسلمان بچوں کو بندے ماترم کا مشرکانہ ترانہ گانے پر مجبور کیا گیا۔ گائے کا گوشت بیچنے اور کھانے پر پابندی عائد کر دی گئی مسلمان خواتین کی عزت و آبرو ہندو غنڈوں کے ہاتھوں محفوظ نہ رہی' اردو کی جگہ ہندی مسلط کی گئی مسلمانوں کو ہندو ثقافت و تمدن کے رنگ میں رنگنے کے لیے انتظامیہ کو آلہ کار بنایا گیا۔

کانگریسی وزارتوں کے اس طرز عمل سے ہندو ذہنیت صاف آشکارا ہو گئی' چنانچہ مسلمانوں نے اپنے مذہب اور تہذیب و ثقافت کو محفوظ کرنے کے لیے پاکستان کا مطالبہ کیا۔ اگر وہ علیحدہ وطن کا مطالبہ نہ کرتے اور پاکستان وجود میں نہ آتا' تو آزاد اکھنڈ بھارت میں ہندو ذہنیت کے ہاتھوں 17 کروڑ مسلمانوں کا بھی وہی حشر ہوتا جو آج پانچ چھ کروڑ مسلمانوں کا ہو رہا ہے جس کی ایک ہلکی سی جھلک کانگریس نے اپنے زیرنگین صوبوں میں دکھا دی تھی۔

قیام پاکستان کے وقت ہندوؤں نے مسلمانوں کا وسیع پیمانے پر قتل عام کیا۔ مسلمان اکثریت کے علاقوں میں جہاں کہیں بھی فسادات ہوئے وہ محض اس قتل عام کا ردعمل تھے چنانچہ جونہی ہنگامی دور ختم ہوا' مسلمانوں کے بپھرے ہوئے جذبات پرسکون ہو گئے۔ گزشتہ 22 برس کے عرصے میں پاکستان میں ایک بار بھی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔ اس کے برعکس ہندو ذہنیت بدستور اپنے خونیں کھیل میں مصروف ہے وہاں اب تک ایک ہزار سے زیادہ مرتبہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا چکی ہے۔

(3)

بھارت میں مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہی ہے‘ اس کا چند صفحات میں مکمل جائزہ لینا ممکن نہیں۔ گزشتہ چند سال کے شب و روز پر ایک سرسری سی نظر ہی ڈالی جاسکتی ہے۔

بھارت نے 64ء کا آغاز کلکتے کے فسادات سے کیا‘ یہ فسادات نہایت سنگین اور لرزہ خیز تھے۔ 3 مئی 64ء کو بھارتی پارلیمنٹ کے ایک (مسلم لیگی) ممبر نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

’’میں کلکتے گیا تھا‘ وہاں میں نے دلدوز مناظر دیکھے میں نے ان لوگوں کو دیکھا جنہیں بستیوں سے اکھاڑ پھینکا گیا تھا۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے پڑے تھے‘ وہ بالکل بے گناہ تھے اور اس ملک کے شہری تھے...... مجھے اب تک یہی یقین ہے کہ ان فسادات کے لیے پہلے سے منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ میں نے مکانات پر نشانات لگے ہوئے دیکھے۔ مسلمانوں کے مکانوں پر M کا نشان لگا دیا گیا تھا۔ کلکتے میں جو کچھ ہوا باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہوا۔‘‘

کسی شہر میں قتل وغارت کا آغاز وحشی ہندو ذہنیت کے لیے ایک اشارہ ہوتا ہے‘ چنانچہ وحشت درندگی کا رقص جگہ جگہ ہونے لگتا ہے۔ کلکتے کا اشارہ پاتے ہی سندر گڑھ (اُڑیسہ) رانچی اور سنگھم (بہار) کانپور (اتر پردیش) اور اجین (راجستھان) میں لوٹ مار اور آتش زنی کی وارداتیں شروع ہوگئیں۔ مارچ کے مہینے میں ہندو ذہنیت کا رقص پورے عروج پر پہنچ گیا۔ اب اس کا اسٹیج رڑکیلا (اڑیسہ) اور جمشید پور (بہار) تھے یہ دونوں شہر فولاد کی صنعت کا مرکز ہیں۔ چند روز تک صورت حال فوج اور پولیس کے قابو سے بالکل باہر رہی۔ مسلمانوں کا نہایت بیدردی سے قتل عام کیا گیا۔ حالات اس قدر بگڑے ہوئے تھے کہ رڑکیلا کے فولاد کے کارخانے میں کام کرنے والے امریکی اور برطانوی ٹھیکیدار بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ انہیں بھارتی فضائیہ نے شہر سے نکال کر رانچی اور کلکتے پہنچایا۔ 16 مارچ سے 21 مارچ تک ہندو بلوائی جو کچھ کر سکتے تھے کر گزرے۔ آخر قتل وغارت کو ختم کرنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں فوج بھیجی گئی اور بڑی مشکلوں سے مسلمانوں کا کشت وخون رُکا۔ یہی حالت جمشید پور کی تھی بھارت کے وزیر داخلہ گلزاری لال نندہ کو پارلیمنٹ میں بیان دیتے ہوئے اعتراف کرنا پڑا کہ رڑکیلا اور جمشید پور میں دو سو آدمی مارے گئے۔ یہ سرکاری اعداد و شمار تھے۔ ہلاک شدگان کی صحیح تعداد کئی گنا تھی۔

1966ء میں مدھیہ پردیش ہندو ذہنیت کی شعلہ سامانی کا شکار رہا۔ بھارت کے ایک انگریزی ہفت روزے کے نمائندہ بھوپال کے مطابق مدھیہ پردیش میں مسلمانوں کے کشت وخون کے بغیر ہولی اور رنگ کے تہواروں کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ جبل پور میں مسلمانوں کے مال و جان پر ہندو فرقہ پرستوں نے جو تباہی نازل کی اس کی مفصل روداد اس زمانے میں پاکستان کے اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ مدھیہ پردیش کا وزیر اعلیٰ ڈاکٹر کے این کاٹجو اس ہولناک تباہی کو دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ مسلمانوں کے جلے ہوئے محلے شمشان بھومی کا منظر پیش کر رہے ہیں۔

’’ہندوستان ٹائمز‘‘ کے شائع کردہ اعداد و شمار کے مطابق 1967ء میں 209 ’’بلوے‘‘ ہوئے۔ ان میں چھ سو آدمی مارے گئے۔ زخمیوں کی تعداد تو ہزاروں تک پہنچ گئی۔ یہ بلوے زیادہ تر 1967ء کے عام انتخابات کے بعد ہوئے اور ان سے شاید ہی کوئی ریاست محفوظ رہ سکی۔ ان بلووں

کی نوعیت کا اندازہ صرف ایک واقعے سے ہو سکتا ہے:

نیپال کی سرحد کے ساتھ بہار کا ایک قصبہ سرسنڈ واقع ہے' یہاں 13 اکتوبر کو دسہرے کا جلوس نکالا گیا۔ جلوس سے چند روز پہلے قصبے میں ایک ہینڈ بل تقسیم کیا گیا جس میں لکھا تھا کہ راکشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلحے کے ساتھ جلوس میں شریک ہوں۔ جلوس نکلا تو آگے آگے درگا کی مورتی تھی اور اس کے پیچھے ایک ٹرک اینٹ پتھر سے بھرا ہوا تھا۔ جلوس مسلمانوں کے محلے کے پاس پہنچا' تو اس نے پتھراؤ شروع کر دیا' مسلمانوں کے دو مکان جلا کر اور دو سو آدمی زخمی کر کے جلوس آگے نکل گیا' لیکن ابھی خونی ہندو ذہنیت کی پیاس نہیں بجھی تھی۔ 5 اکتوبر کو پھر جلوس نکالا گیا۔ آگے آگے پولیس تھی اور پیچھے بلوائی جلوس مسلمان محلے میں سے گزرا اور اس پر ٹوٹ پڑا۔ آناً فاناً چار سو مکانات جلا دیئے' لوگوں نے مسجد میں پناہ لی' تو ان پر گولیاں برسائی گئیں۔ دو جواں سال لڑکیاں تو وہیں شہید ہو گئیں' ایک عورت نے ہسپتال جا کر دم توڑ دیا۔ تالاب' کنویں اور جنگلوں سے مسلمانوں کی 22 لاشیں ملیں جن لوگوں کو جلتی آگ میں ڈال دیا گیا اور ان کی کھوپڑیاں جلنے سے بچ گئیں' ان کی تعداد پانچ تھی۔ مسلمانوں کا ایک وفد یہ کھوپڑیاں لے کر وزیر اعلیٰ بہار کے پاس گیا اور اسے دکھائیں ایک سو سے زائد مسلمان لاپتہ تھے یا بعد ازاں زخموں کی تاب نہ لا کر ہسپتال میں چل بسے۔

1968ء کا آغاز بھی بلووں سے ہوا صرف جنوری کے مہینے میں 25 مقامات پر مسلمانوں کا کشت و خون ہوا۔ 28 جنوری کو میرٹھ میں قتل و غارت ٹھیک اس وقت ہوا جب کشمیری رہنما شیخ عبداللہ مسلمانوں کو خطاب کرنے والے تھے' پھر یہ آگ پھیلتی ہی چلی گئی۔ بسی' بھاگلپور' پٹنہ' کریم گنج' بلاسپور' رانچی' الہ آباد' بنگلور' تریوندرم اور مالابار ساحل تک اس کی زد میں آ گئے۔ اندر ملہوترا نامی ایک ہندو جرنلسٹ نے لندن کے اخبار گارجین کو مارچ کے مہینے میں جو ڈسپیچ بھیجا اس میں لکھا:

”حال ہی میں انڈیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے خلاف جو بلوے ہوئے ہیں جن میں کریم گنج کا بلوہ بالخصوص سب سے زیادہ سنگین ہے' ان پر سوچ بچار کرنے والے لوگوں کو نہایت دُکھ پہنچا ہے مسلمان اقلیت ہندوستان کی آبادی کا آٹھواں حصہ ہے' اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مسلمانوں سے دلچسپی رکھنے والے تمام لوگ ان کی اس حالت پر سخت پریشان ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہندوستانی کہا کرتے تھے کہ ہندو مسلم کشیدگی اور تشدد برطانوی پالیسی ”پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ کا نتیجہ ہے۔ انگریز چلا گیا' تو دونوں قومیں امن واماں اور اتفاق و محبت سے رہیں گی۔ ہندوستان نے اقتصادی ترقی اتنی نہیں کی جتنی کرنی چاہیے تھی' لیکن حالیہ سالوں میں سب سے زیادہ فرقہ وارانہ کشت و خون جدید ترین اور بڑے بڑے صنعتی کارخانوں والے شہروں مثلاً رڑکیلا' جمشید پور اور رانچی میں ہوا۔ رڑکیلا اور جمشید پور میں فولاد کے کارخانے ہیں اور رانچی میں بھاری مشینری تیار کرنے کا ایشیا میں سب سے بڑا کارخانہ ہے اندر ملہوترا نے مزید لکھا۔ ”رانچی اور کریم گنج کے بلووں کی ایک پریشان کن خصوصیت یہ ہے کہ ان میں تعلیم یافتہ' کوشحال اور متمول لوگ بھی لوٹ مار اور قتل و غارت میں اسی طرح بے شرمی سے شریک تھے جس طرح ان پڑھ غنڈے اور فسادی۔“

1969ء بھی مسلمانوں کے لیے کشت و خون کا پیغام لے کر آیا سال نو کا آغاز اندور میں مسلمانوں کے قتل عام سے ہوا۔ اردو پریس نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

”یہ نئے سال کا استقبال ہو رہا ہے' اگرچہ ہے افسوسناک۔“ اندور' جوئے اور سٹے کا گڑھ ہے۔ 27 دسمبر 1968ء کی رات کو ایک قمار

خانے میں جواری آپس میں لڑ پڑے۔ یہ ایک عام سا واقعہ تھا جو بدمعاشوں کی ٹولیوں میں اکثر رونما ہوتا ہے' لیکن یہاں بدقسمتی سے جواریوں کی ایک ٹولی ہندوؤں کی تھی اور دوسری مسلمانوں کی۔ اس لڑائی میں اوانتی سونکر نامی ایک ہندو جواری شدید زخمی ہو گیا اور 28 دسمبر کو ہسپتال میں مر گیا۔ ہندو اکثریت کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ وہ تو ہمیشہ ایسے مواقع کی منتظر رہتی ہے' چنانچہ جن سنگھ اور دوسری متعدد ہندو جماعتوں نے ہندو عوام کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ ادھر مقامی حکام سے مطالبہ کیا کہ اوانتی سونکر کی لاش ان کے حوالے کی جائے' وہ اس کی ارتھی جلوس کی صورت میں مرگھٹ تک لے جانا چاہتے ہیں۔ حکام نے گڑبڑ کے اندیشے کی بنا پر پہلے تو انکار کیا' مگر پھر ''بڑی توپوں'' کے دباؤ میں آ گئے اور لاش اس کے وارثوں کے حوالے کر دی۔ جلوس نکالنے والوں سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے یہ تحریری یقین دہانی حاصل کر لی کہ جلوس مقررہ راستوں سے گزرے گا' لیکن یہ یقین دہانی کاغذ کی زینت بن کر رہ گئی جلوس مقررہ راستہ چھوڑ کر مسلمانوں کے محلوں میں داخل ہو گیا اور پھر وہ سب کچھ ہوا جو بھارت میں اس قسم کے واقعات کی بھیانک خصوصیت بن چکی ہے۔

(4)

بھارت میں فسادات بالعموم تہواروں کے موقع پر ہوتے ہیں' خواہ یہ تہوار ہندوؤں کے اپنے ہوں یا مسلمانوں کے پچھلے بائیس برس کے عرصے میں کوئی تہوار ایسا نہیں گزرا جب ہندوؤں نے مسلمانوں کے لہو سے ہولی نہیں کھیلی۔ مسلمانوں کے خلاف بلوے کا آغاز عموماً افواہوں سے ہوتا ہے۔ مفسد ہندو سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق کوئی اشقلہ چھوڑ دیتے ہیں۔ فلاں گاؤں میں مسلمانوں نے گائے ذبح کی ہے' فلاں مقام پر مسلمان درگا مورتی کے جلوس پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ فلاں محلے میں ایک مسلمان نے ہندو لڑکی کو چھیڑا۔ یہ افواہ آناً فاناً پورے شہر اور گردونواح کے دیہات میں پھیل جاتی ہے' کوئی اس کی تصدیق کی ضرورت نہیں سمجھتا اور ہندو غنڈے غول در غول مسلمانوں پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ قتل و غارت کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ایک مدت پہلے منصوبہ بندی کی گئی تھی بس اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت تھی جو افواہ کی صورت میں گھڑ لیا گیا۔ گائے ذبح کرنے کی افواہ بہت زیادہ عام ہے۔ اتر پردیش مسلم مجلس مشاورت کی مجلس عاملہ نے جون 1967ء کے اوائل میں ایک یادداشت بھیجی جس میں مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کے لیے تجاویز پیش کیں۔ اس یادداشت میں کہا گیا تھا:

''مفسد اور شریر عنصر اس بہانے دیہات پر چڑھ دوڑتا ہے کہ مسلمانوں نے گائے ذبح کی ہے۔ مسلمانوں کے مکانات اور دکانیں لوٹ کر انہیں آگ لگا دی جاتی ہے اور بے گناہ مسلمانوں کو عورتوں اور بچوں سمیت بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا جاتا ہے۔ لوٹ مار اور آتش زنی کا ہر واقعہ خوب سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بدمعاش اور فرقہ پرست عناصر گردونواح کے دیہات میں پھیل جاتے ہیں اور گائے کے ذبیحے کی کہانی سنا سنا کر ہندوؤں کو اکساتے اور انہیں جمع کر کے تمام مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں' خواہ وہ اس حقیقی یا خیالی جرم میں شریک تھے یا نہیں۔ اتر پردیش میں جتنے مقامات پر بلوے ہوئے' وہاں یہی کچھ رونما ہوا۔''

تقریباً ہر بلوہ پہلے سے طے شدہ پروگرام اور منصوبے کے مطابق ہوتا ہے۔ 5 دسمبر 1966ء کو سیہور (بہار) کے قصبے میں ہندو ذہنیت نے اپنا خونیں رقص شروع کیا اس رقص کا آغاز بظاہر ایک اتفاقی حادثے سے ہوا لیکن درحقیقت اس اتفاقی حادثے کے لیے ہندو کئی روز سے تیاری کر

رہے تھے۔ ہوا یہ کہ بابولال اور سعید اللہ میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ تلخ کلامی کے بعد چاقو نکل آئے۔ بابولال کے ساتھیوں نے اسے ایک رکشا میں بٹھایا (جسے ایک مسلمان چلا رہا تھا) اور سارے شہر میں گشت کی' کچھ دیر بعد بدمعاش عنصر قصبے میں پھیل گیا اور یہ افواہ پھیلا دی کہ بابولال مر گیا ہے۔ ہندو نوجوان بازاروں میں نکل آئے اور اشتعال انگیز نعرے لگانے لگے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا۔ ان لوگوں کے پاس ہتھیار بھی تھے اور مٹی کے تیل کے پیپے بھی سینما کے قریب مسلمانوں کی چند دکانیں تھیں۔ اولین ہدف وہی بنیں۔ پہلے انہیں لوٹا گیا اور پھر آگ لگا دی گئی۔ اس اثنا میں مفسدوں نے گنج محلے میں تاج الدین نامی ایک مسلمان کو قتل کر دیا اور اس کی بیوی اور بیٹی کو اٹھا کر لے گئے۔ ان پر مجرمانہ حملے کرتے رہے اور پھر انہیں مار ڈالا۔ 12 گھنٹے کے بعد ان کی لاشیں ناگفتہ بہ حالت میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ملیں۔ اگلے روز پولیس کو تاج الدین کے جلے ہوئے مکان کی زمین دوز بدرو میں ایک بچہ روتا ہوا ملا۔ قصبے میں اور بھی کئی مسلمان شہداء اور ان کے مکانات جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ فائر بریگیڈ نے آگ بجھانے کی کوشش کی' تو جلوس میں شریک لوگوں نے بجھانے نہ دی۔ بہت سے مسلمانوں نے تھانے میں پناہ لے کر جان بچائی۔

ایک معمولی سے واقعے کو مشتہر کر کے ہنگامہ کھڑا کرنے اور مفسد عناصر کا ہتھیار اور مٹی کے تیل کے پیپے اٹھا کر بازاروں میں نکل آنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سیہور کے ہندو' فساد کا کئی روز پہلے منصوبہ باندھ چکے تھے۔ بابولال کا سعید اللہ سے جھگڑا اور تلخ کلامی محض کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ مزید برآں تاج الدین کے مکان کے ایک حصے میں یو۔ ڈی سکسینہ نامی ایک ہندو کرائے پر رہتا تھا۔ اس نے ہنگامہ کھڑا ہونے سے چند گھنٹے پہلے مکان چھوڑ دیا۔ پھر یہ کہ جلے ہوئے مکانات کے ملبے میں مقامی ساخت کے بموں کے خول بھی پائے گئے۔

بعض اوقات ہندو اکثریت کسی بہانے کا تکلف بھی نہیں کرتی۔ یکم اکتوبر 1968ء کو بہار کا قصبہ پڑی اسی وحشت و درندگی کا شکار ہوا۔ 22 ستمبر کو قصبے کے جن سنگھیوں نے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں پارلیمنٹ کے ممبر اور جن سنگھ کے لیڈر جگرامی یادو نے تقریر کرتے ہوئے اپیل کی کہ وہ میر جعفروں'' کو سبق سکھائیں۔ اس کے پیروکاروں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ یکم اکتوبر کو درگا مورتی کا جلوس نکلنا تھا۔ اسی روز جن سنگھ کے مقامی دفتر کا افتتاح ہوا۔ جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے غنڈے مہلک ہتھیاروں سے مسلح ہو کر قصبے میں گشت کرتے اور باؤلے بھیڑیوں کی طرح غراتے رہے۔ تین بج کر بیس منٹ پر درگا موتی کا جلوس نکلا جو پانچ بج کر 30 منٹ پر پرامن طور پر ختم ہو گیا۔ اہل جلوس منتشر ہو کر گھروں کو نہیں گئے بلکہ انہوں نے مسلمان محلے پر دھاوا بول دیا۔ رات گئے تک سات مسلمان شہید اور دس زخمی ہو چکے تھے اور ان کے مکانات سے دھوئیں کے مرغولے اور آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شعلے اٹھ رہے تھے۔

احمد آباد کے حالیہ قتل عام کے بارے میں ابھی تک یہ واضح نہیں ہو سکا کہ ہندو جاتی نے اس کا کیا بہانہ بنایا۔ غیر ملکی نمائندوں کا کہنا ہے کہ بلوہ جگدیش مندر کی آوارہ گایوں پر شروع ہوا۔ کچھ آوارہ گائیں ایک مسجد کے قریب سے گزریں جہاں مسلمان نماز پڑھ رہے تھے کسی شخص نے ایک گائے کے پتھر کھینچ مارا' اس پر فساد شروع ہو گیا۔ بنگلور کے اخبار ''پاسبان'' کی روایت ہے کہ ایک روز پہلے مندر جاترا میں کسی بدمعاش نے ایک لڑکی کو چھیڑا اس پر لوگ جھگڑ پڑے تاہم بیچ بچاؤ ہو گیا۔ دوسرے روز اچانک ہندو ذہنیت کا کھولتا ہوا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ یہ دونوں واقعات گھڑے گئے ہیں۔ پہلے روز ایک لڑکی کو چھیڑنے کا فسانہ گھڑ کر فساد کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی' لیکن تدبیر کارگر نہیں ہوئی تو دوسرے روز

گھوماتا کو مارنے کا شور مچا دیا گیا۔

بدقسمتی یہ ہے کہ مسلمانوں کے کشت وخون کے جتنے واقعات رونما ہوئے ہیں' مسلمانوں کے مطالبے کے باوجود ان میں سے کسی ایک کی بھی آج تک عدالتی تحقیقات نہیں کروائی گئی۔

(5)

یہ تو ان بہانوں کا ذکر تھا جو ہندو اکثریت گھڑ کر مسلمانوں کے قتل عام کا جواز پیدا کرتی ہے' اب ہم اس سوال کا جائزہ لیں گے کہ فسادات کا آخر مقصد کیا ہے؟

مغربی بنگال میں آج تک جتنے فسادات ہوئے ہیں ان میں مشرقی پاکستان سے جانے والے ہندو پیش پیش رہے ہیں۔ مقصد صاف ظاہر ہے' وہ مغربی بنگال کے مسلمانوں کو پاکستان میں دھکیلنا اور ان کے گھروں' زمینوں اور کاروبار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح ہندو بلوائیوں کا سب سے بڑا ہدف صنعتی علاقے بنتے ہیں۔ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کے ہر میدان سے نکالا جا چکا ہے ان کی بڑی تعداد مزدور ہے یا چھوٹا موٹا نجی کاروبار کرتی ہے۔ ہندو لیڈر' مسلمانوں کو اب اس میدان سے بھی نکالنا چاہتے ہیں اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہر چند ماہ کے بعد ان کا قتل عام کیا جائے تاکہ وہ دہشت زدہ ہو کر کارخانوں سے نکل جائیں۔ ہندو لیڈران صنعتی مراکز میں جو فضا پیدا کر رہے ہیں' اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جولائی 1969ء میں اندور کی ملوں اور کارخانوں کے ہندو مزدوروں نے دھمکی دی کہ وہ مسلمان مزدوروں کے ساتھ مل کر کام نہیں کریں گے۔

29,28 ستمبر 1968ء کو لکھنو میں فرقہ پرستی کے خلاف ایک کنونشن منعقد ہوئی جس میں مسٹر سرجو پانڈے نے (کنونشن بلانے والوں کے مقرر کردہ) کمیشن کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کنونشن کو بتایا۔ یو۔ پی کے مختلف اضلاع سے فرقہ وارانہ بلووں کی جو اطلاعات ملی ہیں' ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان بلووں کے پیچھے ایک منظّم ہاتھ تھا جو اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو تجارت اور کاروبار سے نکال دینا چاہتا ہے۔

تاہم یہ مقصد محض جزوی اور اصلی بڑے مقصد کا مرحلہ اول ہے۔ وہ بڑا مقصد کیا ہے؟ الہ آباد کے ایک ہندو مسٹر سریش رام کی زبان سے سنئے۔ موصوف سرودیا کوتی کے سرگرم کارکن ہیں اور جب اپریل 1968ء میں الہ آباد میں فسادات ہوئے' تو انہوں نے برت بھی رکھا تھا۔ مسٹر سریش رام بھارت کے ایک مسلمان ہفت روزہ (انگریزی) میں لکھتے ہیں:

''اپنے ساتھی کارکنوں کے ساتھ میں ایک ہندو محلے میں گیا۔ ہمارا گزر ایک مسجد کے پاس سے ہوا جسے خاصا نقصان پہنچا تھا۔ (اب اس کی مرمت ہو چکی ہے) میں نے اپنے ایک ہندو شناسا سے جو بڑا روشن خیال ہے پوچھا: اس محلے میں تو صرف چار مسلمان گھرانے رہتے ہیں اور وہ بھی مزدور اور محنت کش' پھر یہ شرارت کس لیے ہوئی؟ اس نے بتایا: ''قصہ یہ ہے کہ ایک روز ہمارے محلے کے لوگ جمع ہوئے اور یہ تجویز پیش کی کہ اس مسجد اور (مسلمانوں کے) ان چار مکانوں کو مسمار کر دیا جائے میں نے اس کی مخالفت کی۔ کچھ اور لوگوں نے بھی میری تائید کی چنانچہ یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا۔''

''پھر یہ سب کچھ کیسے ہوا؟'' میرے ایک ساتھی نے سوال کیا۔

''ذرا سنتے جایئے۔'' اس نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگلے روز پھر اجلاس ہوا جس میں پڑوسی محلے کے لوگ بھی شامل ہوئے اور اس مسئلے کو دوبارہ اٹھایا گیا۔''

''ان کا استدلال کیا تھا؟''

''جو دلیل انہوں نے پیش کی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنا پاکستان لے لیا ہے' انہیں وہاں چلے جانا چاہیے' لیکن اگر وہ یہاں رہنا چاہتے ہیں تو پھر ہماری شرائط ہی پر رہ سکتے ہیں۔ انہیں ہر جگہ مسجد کی کوئی ضرورت نہیں' اس لیے اس مسجد کو منہدم کر دینا چاہیے۔''

''اور تم راضی ہو گئے؟''

''میں کر بھی کیا سکتا تھا' ان کی مزاحمت کر کے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنا محض حماقت تھی' وہ بہت سے تھے اور میں اکیلا' چنانچہ وہ مسجد پر چڑھ دوڑے' خوش قسمتی سے پولیس موقع پر پہنچ گئی اور لوگ مسجد کو زیادہ نقصان پہنچانے سے پہلے ہی رفو چکر ہو گئے۔''

یہ وہی استدلال ہے جو ہندو مہاسبھا اور دوسری متعصب ہندو جماعتیں اور لیڈر قیام پاکستان کے مطالبے سے بہت پہلے پیش کیا کرتے تھے۔ اس وقت وہ کہتے تھے مسلمانوں کو عرب چلے جانا چاہیے جہاں سے وہ آئے ہیں' ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں تو ہندو دھرم اختیار کرنا ہوگا۔ پہلے وہ مسلمانوں کو عرب کے ریگزاروں میں دھکیلنا چاہتے تھے اور اب پاکستان میں۔ اس مقصد کے لیے خوف و دہشت کی فضا طاری کر کے مسلمانوں کو اخلاقی طور پر پست ہمت اور ان کے مال و متاع کو لوٹ کر اور آگ میں جھونک کر معاشی اعتبار سے اس قدر بدحال کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ یا تو اپنا دین اور زندگی بچانے کے لیے پاکستان بھاگ جائیں یا ہندو معاشرے میں مدغم ہو جائیں۔

(6)

بھارت میں مسلمانوں کے کشت و خون کی جب بھی کوئی لہر اٹھتی ہے' اس کا الزام یا پاکستان کے سر تھوپ دیا جاتا ہے یا خود بھارتی مسلمانوں کے۔ پاکستان پر الزام لگانے کی دو صورتیں ہیں۔ اول۔ پراپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کو مارا جا رہا ہے جن کا ردعمل بھارتی مسلمانوں کے کشت و خون کی صورت میں ہوا۔ اس سلسلے میں ہندوؤں کے قتل کی من گھڑت کہانیاں پھیلائی جاتی ہیں' حالانکہ مشرقی پاکستان میں ہندو نہ صرف محفوظ ہیں۔ بلکہ مسلمانوں کی مذہبی رواداری اور (غیر مسلموں کے مال و جان کے تحفظ کے بارے میں ان کی) قومی روایت سے بالکل غلط فائدہ اٹھانے میں مصروف ہیں۔

دوم: کہا جاتا ہے کہ ان فسادات کے پیچھے پاکستان کے ایجنٹوں کا ہاتھ ہے۔ احمد آباد کے حالیہ فسادات کے متعلق یہی الزام گھڑا گیا ہے۔ بے شرمی کی انتہا یہ ہے کہ یہ الزام بڑے دھڑلے سے عائد کیا جاتا ہے اور اپنے عوام اور دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکی جاتی ہے۔

1964ء کے اوائل میں کلکتے اور بیل گھوڑیا میں فسادات ہوئے مغربی بنگال اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے ڈپٹی چیف وہپ مسٹر جگیش سین نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

''بیل گھوڑیا میں یہ حملہ عین اس وقت ہوا جب پاکستان کے وزیر داخلہ مسٹر بھٹو' اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں تقریر کرنے والے تھے۔

گزشتہ جنوری میں ہونے والے کلکتے کے فسادات کا بھی یہی حال تھا۔ یہ فسادات ٹھیک اس وقت ہوئے جب سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر بحث ہو رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہاں ایسے منظّم ایجنٹ موجود تھے جو پاکستان کی طرف سے لوگوں کو اشتعال دلانے میں سرگرم عمل تھے۔''

برجیش سین کے اس الزام پر تبصرہ کرتے ہوئے بھارت کے ایک مسلمان ہفت روزہ اخبار نے لکھا:

''کانگریسی ممبر نے جو کچھ بیان کیا ہے، اگر درست ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی پارٹی کی حکومت خود قابل مذمت ہے۔ جب کوئی حکومت ایسے خطرناک ایجنٹوں کا کھوج نہیں لگا سکتی، تو اس کے انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں کیا رائے قائم کرنی چاہیے اور کیا ایسی نااہل حکومت کے ہاتھوں میں لاکھوں انسانوں کی قسمت سونپی جاسکتی ہے؟ پھر ایک ایسی قوم کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے جو اکثریت میں ہے اور جس کے نمائندے ملک کے دروبست پر قابض ہیں لیکن جس کے ہزاروں لاکھوں افراد ایسے ہیں جنہیں کوئی دوسری حکومت اپنا آلہ کار بنا سکتی ہے۔ کیا اس سے لوگ یہ نتیجہ اخذ نہیں کریں گے کہ ہمارا ملک احمقوں اور غداروں سے بھرا پڑا ہے، جس کی حکومت بے بس ہے اور جس کے عوام پر ایک غیر ملکی حکومت کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ وہ جب چاہے انہیں استعمال کر کے یہاں ایک طوفان کھڑا کر سکتی ہے اور پھر غیر ملکی حکومت بھی وہ جسے ہم اپنا دشمن نمبر ایک قرار دیتے ہیں۔''

1964ء میں بہار اور اڑیسہ کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرنے کے بعد سرودیا لیڈر جے پرکاش نرائن نے ایک بیان میں کہا:

''لوگوں کو یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دینا چاہیے کہ بھارت میں ہونے والے بلووں کے پیچھے پاکستان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ بلوے پاکستان میں نہیں خود بھارت میں منظّم کیے جاتے ہیں۔''

24 نومبر 1968ء کو جن سنگھ کے صدر اٹل بہاری دجپائی نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس بلائی جس میں ایک طویل دستاویز اشاعت کے لیے اخباری نمائندوں کو دی۔ یہ دستاویز درحقیقت اس سب کمیٹی کی رپورٹ تھی جو جن سنگھ نے ملک کے مختلف حصوں میں رونما ہونے والے حالیہ بلووں کی ''تحقیقات'' کے لیے قائم کی تھی۔ اس رپورٹ میں تمام بلووں کی ذمہ داری بھارتی مسلمانوں یا پاکستان پر ڈال دی گئی تھی۔ مسٹر تبو کا دورانے اس رپورٹ کے خدوخال بیان کرتے ہوئے لکھا:

''پوری رپورٹ سے اقلیتوں کے خلاف انتہا درجے کی اندھی نفرت اور شک و شبہ کی بو آ رہی ہے، رپورٹ میں مختلف بلووں کی پندرہ ''تحقیقاتی'' کہانیاں بیان کی گئی ہیں اور ہر کہانی میں ہندوؤں کو ''مسلمان بوچڑوں'' کا شکار بنایا گیا ہے۔ پاکستانی ایجنٹ مسجدوں کی دیواروں کے پیچھے چھپے بیٹھے ہیں۔ ہندو لڑکیوں کو اغوا اور گئو ہتیا کرنے والے آزاد پھر رہے ہیں۔ انسان کچھ یوں محسوس کرتا ہے کہ مسجدوں سے چھریاں چلنے...... گایوں کے تڑپنے...... ہتھیاروں کے کھڑکھڑانے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ رپورٹ خوفناک کہانیوں سے بھری ہوئی ہے۔

ہندو فرقہ پرست عناصر کے بارے میں ایک کہانی تو درکنار، ایک لفظ تک نہیں کہا گیا، حالانکہ غیر جانبدار تحقیقاتی اداروں نے اپنی رپورٹوں میں تمام بڑے بڑے فسادات منظّم کرنے کی ذمہ داری انہی عناصر پر ڈالی ہے جن سنگھ کی رپورٹ کے مطابق اس ملک میں ہندو فرقہ پرستی نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔''

(7)

بھارت میں آئے دن ہونے والے بلووں کے اصل ذمہ دار متعصب اور منتقم مزاج ہندو فرقہ پرست عناصر ہی ہیں۔ اس وقت بھارت میں تین بڑی متعصب ہندو جماعتیں سرگرم عمل ہیں: جن سنگھ، راشٹر یہ سیوک سنگھ اور ہندو مہا سبھا۔ کہیں کہیں رام راجیہ پریشد (مدھیا پردیش) کے طرز کی مقامی جماعتیں بھی ہیں۔ ہندو مہا سبھا اب زوال پذیر ہے اور عملی سیاست میں اس کا نام بہت کم سننے میں آتا ہے۔ انتہا پسند متعصب، تنگدل اور جنونی ہندوؤں کے لیے جن سنگھ میں زیادہ کشش ہے، چنانچہ اس کا دائرہ اثر روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ 1957ء کے عام انتخابات میں جن سنگھ کو 4 فی صد ووٹ ملے اور 1967ء میں یہ تعداد دُگنی ہو گئی۔ راشٹر یہ سیوک سنگھ عملاً جن سنگھ ہی کا فوجی بازو ہے۔ اس تنظیم کی بنیاد نازی خطوط پر رکھی گئی ہے۔ یہ باقاعدہ ’’فوجی مشقیں کرتی اور مسلمانوں کو منظم طور پر ہلاک کرنے اور ان کے مکانات اور دکانوں کو آگ لگانے کی تربیت ہندو نوجوانوں کو دیتی ہے۔

بھارت کے تمام غیر جانبدار اور منصف مزاج ہندو (اگرچہ ان کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے) اس بات پر متفق ہیں کہ بھارت میں جب بھی اور جہاں بھی مسلم کش بلوے ہوتے ہیں ان کے پیچھے ان دونوں تنظیموں کا منظم منصوبہ کارفرما ہوتا ہے، اس دعویٰ کا بین ثبوت پیش کرنا مشکل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت کی جن ریاستوں میں جن سنگھ اور راشٹر یہ سیوک سنگھ کی طاقت بہت زیادہ ہے وہاں شدید ترین بلوے ہوئے ہیں۔

مسٹر ایچ۔ کے ویاس کا ایک مضمون نیوایج میں 26 جنوری 1969ء کو شائع ہوا جس کا عنوان تھا: ’’فرقہ وارانہ بلووں کے پیچھے آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ کا ہاتھ ہے؟‘‘ اس مضمون میں انہوں نے رانچی، میرٹھ، اورنگ آباد اور کریم گنج کے بلووں کی تفصیلات بیان کیں اور واقعات سے ثابت کیا کہ ان سب کے پیچھے ان دونوں جماعتوں کی سازش کارفرما تھی۔ شیخ عبداللہ کی آمد پر 28 جنوری 1968ء کو جو بلوے میرٹھ میں ہوئے ان کے متعلق مسٹر ویاس، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن نئی دہلی کے ریسرچ افسر اشوینی کمار رائے اور انڈین کونسل آف ورلڈ افیئرز نئی دہلی کے ریسرچ افسر سوبھاش چکراورتی کی ایک رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

’’عمرانیات کے ان دو ماہر کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقلیتی فرقے کے لوگوں سے بھری ہوئی بسیں اور گاڑیاں جب شام کے سات بجے میرٹھ کے قریب پہنچیں، (یہ وہ بسیں تھیں جو لیٹ ہو گئی تھیں اور ان میں وہ لوگ سوار تھے جو شیخ عبداللہ کی تقریر سننے آ رہے تھے، اس جلسے کا انتظام جمعیت علمائے ہند نے کیا تھا) تو تھانہ صدر کی پولیس نے ان کا رُخ موڑ دیا اور ایک خاص راستے سے جانے کی ہدایت کی۔ اس راستے پر یوپی روڈویز ڈپو کے قریب سوڈیڑھ سو غنڈے چھروں اور خنجروں سے مسلح منتظر کھڑے تھے۔ جونہی یہ بسیں اور گاڑیاں وہاں پہنچیں یہ بدمعاش ان لوگوں پر ٹوٹ پڑے اور خنجر گھونپ کر انہیں زخمی اور قتل کرنا شروع کر دیا۔ بسوں اور گاڑیوں کے رخ کو ایک ایسے راستے کی طرف موڑنا جہاں غنڈے رات کی تاریکی میں کشت وخون کے لیے تیار کھڑے تھے ظاہر کرتا ہے کہ یہ پہلے سے ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔

جن سنگھ گزشتہ عام انتخابات میں اتر پردیش کی دوسری بڑی پارٹی کی حیثیت سے اُبھر آئی تھی۔ اتر پردیش کی وزارت میں نائب وزیر اعلیٰ اس کا آدمی تھا۔ بنا بریں اگر وہ اپنی سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سرکاری حیثیت استعمال کرنے میں کامیاب ہو گئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔‘‘

رپورٹ میں لکھا تھا: ''یہ بات حیرت انگیز ہے کہ جن سنگھ (میرٹھ چھاؤنی) کے صدر دھرماویر آنند اور نائب صدر ابے گپتا کو تو گرفتار کر لیا گیا' لیکن راشٹریہ سیوک سنگھ کے لیڈر کو جس نے اشتعال انگیز تقریریں اور جلوس کی قیادت کی تھی' یونہی چھوڑ دیا گیا۔ اس لیڈر نے ہمارے سامنے یہ اعتراف کیا کہ اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے تھے' لیکن وہ چرن سنگھ (نائب وزیر اعلیٰ) سے ملا اور وارنٹ واپس لے لیے گئے۔''

اورنگ آباد کے بلووں کے متعلق مسٹر ویاس مذکورہ بالا رپورٹ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اورنگ آباد میں ایک بالکل عام سا واقعہ پیش آیا تھا۔ اگر منظّم ہاتھ اس کے پیچھے نہ ہوتے تو فرقہ وارانہ آگ کبھی بھڑکنے نہ پاتی۔ ایک بیکری کے چبوترے پر ڈبل روٹیوں کی ایک ٹوکری رکھی تھی۔ بدقسمتی سے ایک گائے نے اس میں منہ ڈال دیا۔ بیکری کے ایک مسلمان ملازم نے جس کے ہاتھ میں ڈبل روٹی کاٹنے کی لمبی چھری تھی' گائے کو بھگانے کی کوشش کی اور وہی چھری چوڑائی کی طرف سے گائے کو ماردی جس سے اسے ہلکی سی خراش آ گئی پھر کیا تھا جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے غنڈے میدان میں آ گئے' شہر بھر میں یہ افواہ اڑا دی کہ ایک مسلمان نے گائے کا سر کاٹ ڈالا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ بھڑک اٹھی اور مسلمانوں کا گشت وخون شروع ہو گیا۔ رپورٹ میں اس قسم کے کئی اور واقعات بیان کیے گئے ہیں اور لکھا ہے کہ تمام فسادات پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ہوئے اور پوری بیدردی کے ساتھ مسلمانوں کے جان و مال سے کھیلا گیا۔ رانچی کے بلووں کا منصوبہ تیار کرنے میں بہار کی کولیشن وزارت کے دو جن سنگھی وزیروں نے براہ راست حصہ لیا۔''

(8)

مفسد ہندو ذہنیت مسلمانوں کے خلاف فضا کو ہر وقت مسموم اور مشتعل رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس مقصد کے لیے مسلسل اشتعال انگیز زہریلا پراپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ اس پراپیگنڈے میں ہندو لیڈر' اخبارات اور ریڈیو سب بڑھ چڑھ کر اپنے اپنے انداز میں حصہ لیتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات کی جھوٹی خبریں نشر کرتا ہے اسی طرح پارلیمنٹ میں جن سنگھی اور ہندو کانگریسی ارکان ان خیالی فسادات پر اشتعال انگیز تقریریں کرتے ہیں اور حکومت اپنے عوام کے سامنے ان بلووں کو اس انداز سے پیش کرتی ہے گویا ہندو اور مسلمان دونوں ان میں برابر کے شریک ہیں۔ حالانکہ ایک گروہ ظالم ہوتا ہے اور دوسرا مظلوم رہے جن سنگھی لیڈر اور بھارت کی صحافت' تو ان کا کام ہی آتش فشانی ہے۔

الہ آباد کے مسلم کش بلووں (1968) سے پہلے ہندی میں جو ہینڈ بل تقسیم کیا گیا۔ اس کے تیور ملاحظہ فرمایئے:

''آج تیرتھ راج پریاگ میں ایک انتہا سک چتر پھر ڈلسپتھت ہو گیا ہے' ہندوؤں کے ٹکڑوں پر پلنے والے ان نمک حرام مسلمانوں نے پھر سر اٹھایا ہے' کچل دو انہیں۔

اے ہندوؤ' اپنے ایشٹ دیوتاؤں کو ساکھی مان کر یہ قسم کھاؤ کہ ہم جب تک اس پوتر دھرتی کو مسلمانوں کے بوجھ سے ہلکا نہیں کریں گے تب تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ہندوؤ' تمہیں تمہاری ماں کی قسم' تمہارے لڑکے کی قسم اپنے کرتویہ سے نہ ہٹنا اور اپنے جیون میں پانچ پانچ مسلمانوں کو قتل کر کے اپنے ایشٹ دیوتاؤں پر اپنے ہاتھوں سے چڑھاؤ سارے دیش کا پیار تمہارے ساتھ ہے۔''

جن سنگھ کے نقیب اور ترجمان ''آرگنائزر'' نے اسی زمانے میں لکھا:

’’ایک ہندو، مسلمان کو ملیچھ اور مرتد سمجھتا ہے، جس نے اپنے باپ دادا کا مذہب چھوڑ کر باہر کے حملہ آوروں کا ساتھ دیا، ہمارے پاس ہندوستان میں صرف ایک ریاست ایسی ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور وہ بھی ہمارے لیے دردِ سر بنی ہوئی ہے.......... ہندوستان کا ہر مسلمان چاہے وہ تامل ناڈ کا باشندہ ہے یا کیرالہ کا، اردو کو قومی زبان تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور اسی کو وہ مادری زبان سمجھتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان گائے کے ذبیحے کو ضروری سمجھتا ہے جب کہ ہندوؤں کے نزدیک وہ ایک مقدس جانور ہے غرض ہندو مسلم دل کبھی نہیں مل سکتے، اس کا ایک ہی حل ہے، وہ یہ کہ مسلمان، ہندو ہو جائیں۔‘‘

اس زہریلے پراپیگنڈے میں سب سے زیادہ ہاتھ ہندو صحافت کا ہے اس کی کارکردگی کے پیش نظر فی الواقع اسے شیطانی صحافت کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہندو اخبارات ہیں جو بے سروپا افواہیں پھیلاتے، جھوٹی کہانیاں گھڑتے اور ہندو جاتی کے تنگ سینوں میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں۔ ہندو صحافت کا مکروہ چہرہ صرف ایک دو مثالوں کے آئینے ہی میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ 22 مارچ 1964ء کو دہلی کے ایک ہفت روزہ نے ’’عصر جدید‘‘ کلکتہ کے حوالے سے مندرجہ ذیل واقعہ شائع کیا:

’’پچھلے پیر کو ہندوؤں کی ایک برات کلکتہ سے روانہ ہوئی، جب گاڑی 78 میل دور سیہورا پھلی کے جنکشن پر پہنچی، تو براتی کسی بات پر مشتعل ہو گئے اور ایک فائر کر دیا جس سے ایک آدمی زخمی ہو گیا۔ اس پر چھ ہزار کے ایک ہجوم نے براتیوں کے دو ریزروڈبوں پر پتھر برسائے اور کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے۔ انہوں نے براتیوں کو ڈبے سے کھینچ کر باہر نکالا اور انہیں زدوکوب کیا، پولیس پہنچی تو اس پر بھی اینٹیں پھینکیں، چنانچہ پانچ سپاہی زخمی ہو گئے۔ بڑی مشکلوں سے براتیوں کی جان بچائی گئی۔

کلکتے کے انگریزی روزنامے ’’ہندوستان سٹینڈرڈ‘‘ اور اس کے بنگالی ہمزاد ’’آنند بازار پتریکا‘‘ نے اس خبر کو بڑی جلی سرخیوں کے ساتھ اس طرح شائع کیا کہ پاکستان کے ایجنٹ مسلمانوں کے درمیان گھوم پھر رہے ہیں اور انہیں ہنگامے برپا کرنے پر اکسا اور اس وقت کے لیے تیار کر رہے ہیں جب پاکستان کشمیر پر حملہ کرے گا۔‘‘

اورنگ آباد کے بلووں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، یہ یکسر یک طرفہ بلوے تھے جس میں مسلمان ہی زخمی اور قتل ہوئے اور انہی کے مکانات کو نذر آتش کیا گیا، لیکن جن سنگھ کے نقیب ’’آرگنائزر‘‘ نے 15 جون 1968ء کی اشاعت میں مندرجہ ذیل خبر شائع کی۔

’’8 جون کو تین بجے کے قریب امام خاں ولد یٰسین خاں نے ایک آوارہ گائے کو ذبح کر ڈالا، جونہی یہ واقعہ رونما ہوا، مسلمانوں کے گروہ مہلک ہتھیار اٹھائے اورنگ آباد کے گلی کوچوں میں گشت کرنے لگے وہ ’’اللہ اکبر‘‘ اور ’’پاکستان زندہ باد‘‘ کے نعرے لگا رہے تھے، مکانات جلا دیے گئے، لوگوں کو مارا پیٹا گیا، دکانیں لوٹ لی گئیں، حتیٰ کہ عورتوں پر مجرمانہ حملے کیے گئے، تقریباً 75 مکانات اور دکانیں جلا کر راکھ کر دی گئیں۔ بلووں میں 19 آدمی زخمی ہوئے جن میں 15 ہندو ہیں۔‘‘

(9)

بھارت کے ان مسلم کش بلووں میں پولیس اور انتظامیہ کیا کردار ادا کرتی ہے؟ اس کا ایک سرسری سا اندازہ ان واقعات سے بھی ہو سکتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں تاہم اس سوال کا قدرے مفصل جائزہ زیادہ مفید ہو گا۔ حکومت کے عمومی رویے کا تو اسی بات سے پتہ چلتا ہے کہ بھارت

میں آج تک کسی بلوے کے بعد اس نے کوئی سنجیدہ قدم نہیں اٹھایا، نہ مستقبل میں ''فسادات'' کی روک تھام کے لیے اور نہ مفسد عناصر اور قاتلوں کو قانونی سزا دلوانے کے لیے کچھ یہ بات نہیں ہے کہ ''فسادات'' آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح اچانک پھوٹ پڑتے ہیں۔ ان سے پہلے باقاعدہ ایک شیطانی مہم چلائی جاتی ہے، افواہیں اڑتی ہیں اور اشتعال انگیز ہینڈ بل، پوسٹر اور خبریں شائع کی جاتی ہیں مقامی مسلمان رہنما اور جماعتیں مقامی، ضلعی اور ریاستی سطح پر انتظامیہ کو اس زہریلے پراپیگنڈے اور مفسدانہ مہم کی جانب متوجہ بھی کرتی ہیں، مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اگر انتظامیہ میں کچھ افسر کوئی اقدام کرنا چاہتے ہیں۔ تو اوپر والے ان کے ہاتھ باندھ دیتے ہیں ہفت روزہ لنک (Link) نے 5 جنوری 69ء کو لکھا۔

''یونین کی وزارت داخلہ اور وزارت تعلیم کے بعض نوجوان افسر فرقہ پرستانہ رجحانات کو کچلنے کا کوئی طریقہ ڈھونڈنے کے بڑی بے چینی سے خواہش مند ہیں، مگر وہ اس لیے کچھ نہیں کر پاتے کہ جن سنگھ لیڈر بالاتر سطح پر ان دونوں وزارتوں کے سیاسی مشیر بنے ہوئے ہیں۔''

کلکتے میں 1964ء میں جو فسادات ہوئے ان کے متعلق بھارت کے مسلمان ہفت روزہ (Radiance) میں 9 فروری 1964ء کو ایک رپورٹ شائع ہوئی۔ (واضح رہے کہ اس رپورٹ میں مندرج واقعات کی مغربی بنگال کی حکومت نے کبھی تردید نہیں کی) اس رپورٹ میں لکھا تھا:

''پولیس اور انتظامیہ فساد کو روکنے میں نہ صرف ناکام رہی بلکہ اس کے رویے نے فسادیوں کی حوصلہ افزائی اور مدد کی۔ پولیس نے ہندوؤں کے ظلم وستم کے شکار مسلمانوں پر گولیاں چلائیں اور انہیں گرفتار کیا۔ بعض مقامات پر ہندو بلوائی اپنے منصوبوں کی تکمیل صرف اس وقت کر سکے جب تمام صحت مند مسلمانوں کو پولیس نے حراست میں لے لیا، گرفتار شدگان پر شدید مظالم ڈھائے گئے، ان میں سے اکثر کے جسم پر پولیس کے بے رحمانہ تشدد کے نشان ابھی تک موجود ہیں۔ پولیس کے بعض اعلیٰ افسروں نے ریاستی حکام کے احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی۔ پولیس کے معاندانہ رویے کی وجہ سے بہت سے لوگ اپنا گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔''

27 اپریل 69ء کو دہلی کے اخبار ''لنک'' نے بھارتی حکومت کی بے بسی (یا بے عملی) اور ریاستی حکومتوں کی بے اعتنائی اور فسادیوں کی حوصلہ افزائی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''ملک میں فرقہ وارانہ صورت حال وزارت داخلہ کے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے لیکن اس وقت مرکز اور ریاستوں کے درمیان ''دائرہ اختیار'' کے بارے میں جس نوعیت کے کشیدہ تعلقات ہیں، اس کی بنا پر وزارت داخلہ، ریاستوں کو سرکلر جاری کرنے اور امن وقانون کی بگڑتی ہوئی حالت کی طرف توجہ دلانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی ...... یہ ایک حقیقت ہے کہ مشرقی اتر پردیش کے شہر موناتھ بھنجن میں متعدد انسانی جانیں اس لیے ضائع ہوئیں کہ مقامی انتظامیہ نے شہر کے مشہور فرقہ پرستوں سے چشم پوشی کی اور انہیں فسادات کی آگ بھڑکانے کی کھلی چھٹی دے دی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتظامیہ کے اپنے رجحانات کتنی زبردست تباہی لا سکتے ہیں۔''

(10)

یہ تو تھی مسلم کش فسادات اور بلوؤں اور ان کے پیچھے کارفرما عناصر کے طرز عمل کی داستان بھارت میں مسلمانوں کی عام حالت بھی نہایت پریشان کن ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سپین میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہوئے، اس سے ملتے جلتے

حالات بھارت میں پیدا کیے جا رہے ہیں۔ ایک طرف مسلمانوں کی نسل کشی کا سلسلہ جاری ہے، دوسری طرف انہیں ملک کی اجتماعی زندگی کے ہر میدان سے نکالا جا رہا ہے۔ وہ ملک کی آبادی کا آٹھواں حصہ ہیں، انہیں آبادی کے مطابق کہیں بھی نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ بھارتی حکومت، دنیا خصوصاً عالم اسلام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ملک کے بعض کلیدی مناصب پر مسلمانوں کو فائز کر دیتی ہے اور مسلمان ملکوں میں مسلمان سفیر متعین کرتی ہے لیکن ملک کے اندر انہیں بالکل نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

68ء کے مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آبادی کے آٹھویں حصے اور ملک کی سب سے بڑی اقلیت کو اس کے حقوق سے کس طرح محروم کیا گیا ہے:

O مرکزی حکومت کے 460 افسروں میں سے صرف 8 مسلمان ہیں۔

O وزارت داخلہ میں اعلیٰ عہدوں پر کوئی مسلمان نہیں ہے۔

O پولیس کی مرکزی تنظیم میں اکا دکا مسلمان نظر آتے ہیں۔

O پوری ہندوستانی فوج میں صرف تین مسلمان بریگیڈیر جنرل اور ایک میجر جنرل ہے۔

رہی ریاستیں، تو وہاں صورت حال اور بھی تاریک ہے۔ نچلی سطح کے ملازمین خصوصاً پولیس میں تو مسلمان بہت کم ہیں۔ بعض ریاستوں میں تو پولیس میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔

مسلمانوں کے شخصی قانون میں مداخلت کی جا رہی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اسلامی کردار کو ختم کرنے اور اسے ہندو یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ بھارتی سپریم کورٹ تک نے حکومت کے اقدام کی توثیق کر دی ہے، اب عملی قدم اٹھانا باقی رہ گیا ہے۔

مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ادارے اور انجمنیں بناتے ہیں وہ کانگریسی ہندوؤں سے لے کر جن سنگھی تک اسے فرقہ واریت قرار دیتے ہیں۔ مسلمان اخبارات کے ایڈیٹروں نے اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے اپنی ایک جماعت بنائی تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک فرقہ پرست ہندو چیخ اٹھے کہ یہ فرقہ پرستی ہے۔

اسی طرح 1964ء میں مسلمان جماعتوں نے ایک کنونشن بلایا جس کے نتیجے میں کل ہند مسلم مجلس مشاورت وجود میں آئی۔ بھارتی ہندوؤں نے اس پر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

بھارت میں مسلمانوں کی ایک ایک تہذیبی نشانی کو مٹایا جا رہا ہے۔ 19 فروری 69ء کو مسٹر ابراہیم سلیمان سیٹھ نے بھارتی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: ''آپ لوگ جانتے ہیں یہاں دہلی میں کیا ہو رہا ہے؟ نظام الدین کے علاقے میں مسجدیں مسمار کی جا رہی ہیں، قبرستانوں کی بے حرمتی کی جا رہی ہے اور ان پر بلڈوزر چلائے جا رہے ہیں۔'' نہ جانے یہ ظلم کب تک ہوتا رہے گا۔

(نومبر 1969ء اردو ڈائجسٹ)

حضور جی

1947ء کے زہرہ گداز لمحات میں حضرت حافظ عبدالصمد خاں کی رہنمائی اور ایمان افروز قیادت کا مجاہدانہ کردار

تقسیم ملک کے اعلان کے بعد ضلع حصار کے مسلمانوں کو یقین تھا کہ اُن کا علاقہ اپنی سابقہ روایات کے مطابق پرسکون رہے گا اور وہاں کسی قسم کی غارت گری نہ ہوگی۔ شہر شہر امن کمیٹیاں قائم ہو چکی تھیں۔ ہندو قوم کے سر برآوردہ افراد نے قسمیں کھا کھا کر اس بات کا اعلان کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ امن و آشتی کے ساتھ رہیں گے اور اگر کسی عنصر نے ان پر دست درازی کی کوشش کی تو وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔ مگر یہ سب عہد و پیمان درندگی اور بہیمیت کے تند و تیز ریلے میں بے بس تنکوں کی طرح بہہ گئے۔

پہلی چنگاری

ضلع حصار میں قتل و غارت کی سب سے پہلی چنگاری سب تحصیل ڈبوالی میں 24 اگست 1947ء کو بھڑکی جس کی زد میں یہاں کے افسر اعلیٰ یعنی نائب تحصیلدار اختر حسین صاحب آئے۔ وہ علی الصبح ہیڈ کوارٹر یعنی سرسہ جانے کے لیے بس پر سوار ہوئے۔ وہ ریوالور سے مسلح تھے۔ ساتھ ایک ملازم تھا جس کے پاس بندوق تھی۔ بس کا ڈرائیور سکھ تھا۔ ابھی یہ بس شہر ڈبوالی کی حدود سے باہر ہی نکلی تھی کہ ایک درندہ صفت شخص نے پچھلی سیٹ سے پے در پے پستول سے فائر کر کے اختر صاحب کو موقع ہی پہ ہلاک کر دیا۔ بس رُک گئی۔ سب مسافر دہشت زدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگ گئے اور بس واپس اڈے پر چلی گئی۔ پھر اسی دن ڈبوالی میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔

اسی دن شام کو مغرب کی نماز کے بعد مرحوم کی میت سرسہ پہنچی۔ شیخ اللہ داد کی درگاہ کے احاطے میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ پھر وہیں قبرستان میں انہیں بطور امانت سپرد خاک کر دیا گیا۔

شہر سرسہ کے اور بہت سے مسلمانوں کے ساتھ میں نے بھی ان کی نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کی۔ اس وقت تمام حاضرین کے دل حالات کی سنگینی کے تصور سے پریشان تھے اور ہر شخص کی نگاہ اُفق پر منڈلاتے ہوئے خطرات کو دیکھ رہی تھی۔

شہر حصار میں فساد

جلال الدین قریشی ضلع حصار کے مشہور و معروف وکیل اور ضلعی مسلم لیگ کے سربرآوردہ لیڈر تھے۔ وہ حضرت صاحب کے دست حق پرست پر بیعت تھے۔ 29 اگست کو ان کی کوٹھی پر گولی چلائی گئی۔ اس حملے میں وہ بال بال بچ گئے لیکن اس کے فوراً بعد شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ کرفیو کا

نفاذ اس بات کا اعلان تھا کہ اب مسلمان اپنے گھروں میں مقید ہیں اور غیر مسلم غنڈوں کو اس بات کی کھلی چھٹی ہے کہ اب وہ جس طرح چاہیں بلا روک ٹوک مسلمانوں کا خون بہائیں اور ان کے گھروں اور محلوں کو آگ لگائیں، کیونکہ مسلمان اب ان کے مقابلے میں گھروں سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔

اسی رات ریلوے اسٹیشن کے قریب واقع محلّہ جوتی پورہ میں آباد مسلمان گھرانوں کا بڑی بے دردی سے صفایا کیا گیا۔ اس کام میں پولیس کے غیر مسلم اہل کار برابر کے شریک تھے۔ ان کی گولیوں کی بوچھاڑ اتنی شدید تھی کہ کسی کے لیے اپنی جان بچا کر نکل جانا ممکن نہ تھا۔

غنڈوں نے مسلم آبادیوں پر حملوں کا منصوبہ یوں تیار کیا تھا کہ سب سے آگے کلہاڑیوں، برچھیوں اور آتشیں اسلحہ سے لیس پارٹی ہوتی جو نہتے مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو بڑی سفاکی سے موت کے گھاٹ اتارتی۔ اس کے بعد دوسری پارٹی آتی جو ان کے مکانوں کا سامان لوٹ کر لے جاتی۔ اگر کسی مقام پر معمولی سی مزاحمت کا خطرہ ہوتا تو وہاں مکانوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی جاتی تا کہ ان کے مکین آگ کے شعلوں کی بھینٹ چڑھ جائیں۔

20 اگست کو مسلمانوں کے کئی محلوں کو نشانہ بنایا گیا۔ ہمارے بڑے بھائی گل حسن صاحب ان دنوں بسلسلہ ملازمت حصار میں تھے۔ انہوں نے رہائش کے لیے کالورام بلڈنگ میں ایک کوارٹر کرایے پر لیا ہوا تھا۔ اس بلڈنگ میں تقریباً بارہ کوارٹر تھے۔ اتفاق سے سبھی کرایہ دار مسلمان سرکاری ملازم تھے۔ بلڈنگ کے بڑے گیٹ پر ایک مضبوط آہنی دروازہ تھا جسے بند کر لینے کے بعد پوری عمارت ایک چھوٹے سے قلعے کی حیثیت اختیار کر لیتی تھی۔ بلوائیوں نے اس بلڈنگ کا محاصرہ کر کے فائرنگ شروع کر دی اور آخر کار تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ باہر نکلنے کی تمام راہیں مسدود تھیں اس لیے مجبوراً ایک کوارٹر کی عقبی دیوار سے کچھ اینٹیں نکال کر باہر جانے کا راستہ بنایا گیا پچھلی طرف جنگل تھا۔ ہر نکلنے والا شخص بھاگ کر جنگل میں چھپتا رہا۔ اس بلڈنگ سے خواتین اس حالت میں نکلیں کہ ان کے سروں پر دوپٹہ تھا نہ پاؤں میں جوتی جنگل سے ہوتے ہوئے یہ سب لوگ حضرت صاحب کی خانقاہ میں پہنچے۔

شہر حصار کے مسلمان جو تقریباً بیس ہزار کی تعداد میں تھے موت خوف و ہراس میں مبتلا تھے۔ سول انتظامیہ ان کے خون کی پیاسی ہو چکی تھی۔ مسلمان بالکل بے یار و مددگار تھے۔ اس عالم یاس میں قدرت نے ان کے دلوں میں یہ بات ڈال دی کہ وہ حضرت حافظ عبدالصمد کی خانقاہ میں پناہ حاصل کریں، چنانچہ شہر کے چاروں اطراف سے لوگ دھڑا دھڑ وہاں پہنچنے لگے۔ اس طرح خانقاہ اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ مسلمانان حصار کے لیے ایک غیر سرکاری حفاظتی کیمپ بن گیا۔ دو روز میں اس کے مکینوں کی تعداد پندرہ ہزار سے بھی زیادہ ہو گئی۔

حضرت کی دور اندیشی

حضرت صاحب نے اپنی خداداد بصیرت کی بدولت کئی مہینے پہلے ہی ان بھیانک حالات کا اندازہ کر لیا تھا، اس لیے ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے پہلے ہی کچھ ایسے دانشمندانہ اقدامات کر لیے تھے جن کی بدولت ان صبر آزما حالات میں عزم و استقامت کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنے میں بڑی مدد ملی۔

پہلا کام آپ نے یہ کیا کہ خانقاہ اور اس سے ملحقہ علاقے میں زمین دوز بیت الخلا تیار کرائے بعض لوگ آپ سے دریافت کرتے کہ حضرت صاحب ان کی کیا ضرورت ہے، آپ فرماتے ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب غلاظت اور گندگی صاف کرنے اور اٹھانے کے لیے کوئی خاکروب نہیں ملے گا۔ صفائی کے سلسلے میں حضرت صاحب کے اس اقدام نے پندرہ ہزار کی آبادی کے اس کیمپ کو ایک ایسی تکلیف سے بچا لیا جس کا اس وقت کوئی علاج نہ تھا۔

دوسرے اضلاع کی طرح حصار کے شہروں میں بھی راشن بندی کا نظام رائج تھا جس کے تحت بالغ افراد کو صرف پانچ چھٹانک یومیہ اناج ملتا۔ اب فسادات کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے یہ نظام بھی معطل ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کیمپ میں مقیم افراد کے لیے سب سے بڑا مسئلہ خوراک کا تھا۔ حکومت انہیں راشن دینے کے لیے اس لیے تیار نہ تھی کہ اس کے نزدیک یہ کیمپ غیر سرکاری بلکہ غیر قانونی تھا۔

ضلع حصار میں چنے کی فصل اپریل کے وسط ہی میں تیار ہو جاتی تھی۔ حضرت صاحب کی دور بیں نگاہوں نے شاید چار ماہ بعد پیش آنے والی صورت حال کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اس علاقے کا جو بھی زمیندار آپ کی خدمت میں آتا، آپ اسے یہی ہدایت فرماتے کہ لنگر کے لیے چنے بھیجو۔ اس طرح آپ کے ارادت مند چنے خاصی مقدار میں آپ کے پاس بھیجتے رہے راشن بندی کی وجہ سے کوئی زمیندار گندم کھلی مارکیٹ میں فروخت کے لیے شہر نہیں لا سکتا تھا۔ مگر چنے اس پابندی سے مستثنیٰ تھے یوں حضرت صاحب کے اس اقدام کی بدولت ایک ماہ پانچ دن تک کیمپ کے تمام مکینوں کو اپنے جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے خوراک ملتی رہی۔

غیر مسلم بلوائیوں اور غنڈوں کے لیے مسلمانوں کا مختلف محلوں سے نکل کر ایک علاقے میں جمع ہو جانا کسی طرح پسندیدہ نہ تھا۔ وہ تو چاہتے تھے کہ وہ مختلف علاقوں میں بکھرے رہیں تاکہ آسانی سے ان کی جانوں اور عزتوں کا شکار کر سکیں مگر انہی دنوں اسی ضلع کے شہر ہانسی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کا اکٹھا ہو جانا اپنے لیے نیک فال تصور کرنے لگے۔

ہانسی میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد آباد تھی۔ ان میں کچھ صاحب ثروت تھے اور ان کے پاس اسلحہ بھی کافی تھا۔ جب ضلع میں بلوے شروع ہوئے تو اس کے اثرات ہانسی بھی پہنچے۔ سربرآوردہ غیر مسلموں اور پولیس کے افسروں نے مسلمانوں کے اکابر کو یقین دلایا کہ اگر وہ اپنا اسلحہ جمع کرا دیں تو ان کی پوری طرح حفاظت کی جائے گی اور انہیں بخیریت پاکستان پہنچا دیا جائے گا۔ مسلمانوں پر اس وقت کچھ ایسی بے بسی طاری تھی کہ ان کے لیے ان یقین دہانیوں پر اعتماد کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اسلحہ جمع کرا دیا گیا۔

اب مسلمان بالکل نہتے تھے۔ ان کی قوت مدافعت ختم ہو چکی تھی۔ بلوائیوں نے حملے شروع کر دیے۔ مسلمانوں نے گھروں سے نکل کر خواجہ جمال الدینؒ کی درگاہ میں پناہ لی۔ درندہ صفت غنڈوں کو بہترین موقع ہاتھ آ گیا۔ وہ مسلح ہو کر چاروں طرف سے درگاہ پر ٹوٹ پڑے اور تمام مسلمانوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ یہ حملہ اتنا شدید اور قتل عام اتنا بھرپور تھا کہ شاید ہی کوئی زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوا ہو۔ ہانسی کے اسی تجربے کی بنا پر مسلم دشمن قوتوں کا خیال تھا کہ یہاں حصار میں بھی ایک جگہ جمع شدہ مسلمانوں کو آسانی سے تلوار کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے مگر یہاں معاملہ برعکس تھا۔ یہاں ایک ایسی شخصیت موجود تھی جو بارگاہ خداوندی میں مقبول اور مسلمانوں کی نگاہ میں محبوب اور محترم تھی۔

قیادت کا خلا

برصغیر کے مسلمانوں نے حصول پاکستان کی جنگ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے لڑی تھی اور اس کی قیادت پر اعتماد کا اظہار کیا تھا مگر حکومت برطانیہ کی طرف سے آزادی کا اعلان ہوتے ہی ضلع حصار میں اس جماعت کی قیادت بالکل غیر موثر ہو کر رہ گئی۔ کچھ رہنما تو پاکستان بنتے ہی خاموشی سے وہاں منتقل ہو گئے اور باقی تو روپوش ہو گئے یا ان کی قوت عمل مفلوج ہو کر رہ گئی۔ اب پورے شہر میں حضرت صاحب ہی کی ایک ایسی ذات تھی جو مسلمانوں کی امیدوں اور تمناؤں کا مرکز تھی۔

حضرت صاحب نے بھی حالات کا جائزہ لے کر ایک ایسی حکمت عملی تیار کی جس کے ذریعے شہر کے مسلمان موت اور حیات کی اس کشمکش اور حق و باطل کے اس معرکے میں سرخرو ہو کر نکلیں۔ اس حکمت عملی کے اہم نکات یہ تھے:

1۔ پریشان اور خوفزدہ مسلمانوں میں ایمان باللہ تازہ کر کے ان میں حوصلے اور جرأت کے جذبات ابھارے جائیں۔

2۔ لٹے پٹے اور بے گھر لوگوں کے لیے ان کی بنیادی ضروریات مثلاً خوراک اور رہائش کا بندوبست کیا جائے۔

3۔ جو مسلمان اب بھی غیر مسلموں کے علاقوں میں محصور ہیں انہیں وہاں سے بحفاظت نکال کر لانے کی تدابیر عمل میں لائی جائیں۔

4۔ ایک ایسا مضبوط دفاعی نظام کیا جائے جس کے ذریعے غیر مسلم حملہ آوروں کی یورشوں کو ناکام بنایا جائے۔

5۔ کیمپ کے مسلمانوں میں اسلامی اخلاق کی وہ خوبیاں اجاگر کی جائیں جن کے سہارے وہ تنگی اور سختی کے یہ اوقات عزت و وقار سے گزار سکیں اور ایسی قوت بن جائیں جسے سر کرنا کسی دُشمن طاقت کے بس میں نہ رہے۔

یہ حکمت عملی بظاہر بڑی سخت اور ان ہنگامی حالات میں ناقابل عمل نظر آتی ہے لیکن حضرت صاحب کی دانشمندانہ قیادت نے اس مشکل کو آسانی میں تبدیل کر دیا۔

حصار میں مسلمانوں کو یہ غیر سرکاری کیمپ خانقاہ کی وسیع و عریض مسجد لنگر کی دو منزلہ عمارت اور اردگرد کے کئی محلوں پر مشتمل تھا۔ دوسرے محلوں اور علاقوں سے بے گھر مسلمانوں کو ان گھروں میں جگہ دی گئی کچھ مکانات خواتین کے لیے مخصوص کر دیے گئے اور کچھ مردوں کے لیے گھر والوں نے بے گھروں کے لیے بڑی فراخدلی' ایثار اور محبت کا مظاہرہ کیا۔ مسجد کی پوری عمارت ہر وقت حاضرین سے بھری رہتی تھی۔

محصورین کا حفاظت سے نکلوانا

حضرت صاحب 1903ء میں حصار تشریف لائے تھے' اس لیے آپ شہر کے ہر حصے کے حالات سے اچھی طرح واقف تھے۔ شہر کا شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر شخص ہوگا جس سے آپ کی ذاتی شناسائی نہ ہو۔ اس لیے جب شہر میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر قاتلانہ حملوں کا سلسلہ شروع کیا اور تباہی و بربادی اور لوٹ مار کی اطلاعات آنے لگیں تو آپ اپنے ساتھیوں سے ایک ایک محلے کے حالات دریافت فرماتے اور مصیبت میں گرفتار لوگوں کی مدد کے بارے میں سوچتے 31 اگست کو آپ کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ پٹھانوں کے محلے میں مسلمان ابھی تک گھرے ہوئے اور

بلوائیوں نے آج شام چار بجے ان پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔ حضرت صاحب نے اپنے خصوصی رفیق خان نیاز احمد خاں ریٹائرڈ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کہا کہ اس محصورین کی جانیں بچانے کی تگ ودو کرو۔

اُن دنوں حصار کے سٹی تھانے کا انچارج بلدیو سنگھ تھا جو ڈپٹی صاحب کے پاس کسی زمانے میں ان کا ریڈر رہ چکا تھا۔ عبدالواحد خاں صاحب نے اس واقعے کی تفصیلات بتاتے ہوئے بتایا کہ ڈپٹی صاحب نے فوراً بلدیو سنگھ کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ ابھی خانقاہ سے باہر نہر کے پل پر آ کر ملے۔ بلدیو سنگھ ان کا پیغام ملتے ہی ملاقات کے لیے آ گیا۔ ڈپٹی صاحب اسے اپنے ساتھ خانقاہ کے ایک کمرے میں لے آئے اور ساری صورت حال اس کے سامنے بیان کر کے اس پر زور دیا کہ وہ محلّہ پٹھاناں میں گھرے ہوئے مسلمانوں کو سلامتی کے ساتھ نکالنے کی کوئی تدبیر کرے۔ اس پر اس نے کہا:

''خاں صاحب! آپ میرے بزرگ بھی ہیں اور محسن بھی ہیں آپ کے ہر حکم کی تعمیل اپنے لیے سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہوں۔ ویسے بھی مغربی پنجاب میں چند شریف مسلمانوں نے اپنی جانیں داؤ پر لگا کر میری جان بچائی ہے۔ میں اس کے بدلے میں یہاں کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ اپنی امکانی حد تک مروت واحسان کا سلوک کر کے اپنے بے چین ضمیر کو اطمینان کی دولت سے بہرہ ور کرنا چاہتا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ اس محلے پر حملے کا پروگرام بن چکا ہے۔ اگر شر پسندوں کو ذرا بھی شبہ ہو گیا کہ میں ان کے پروگرام میں خلل ڈالنے کی معمولی سی بھی کوشش کر رہا ہوں تو سب سے پہلے وہ مجھے ہی ختم کر کے رکھ دیں گے۔ بہرحال میں آپ کے اور حضرت صاحب کے ارشاد کے مطابق ان مسلمانوں کی جانیں بچانے کی پوری پوری کوشش کروں گا اور اس کی صورت یہ ہے کہ میں پورے ساڑھے گیارہ بجے پولیس کے ٹرک لے کر وہاں پہنچوں گا۔ محلے والے صرف پندرہ منٹ میں ٹرکوں پر سوار ہو جائیں۔ 11-45 پر وہاں سے ٹرک چل پڑیں گے۔ اگر اس وقفے میں کوئی سوار نہ ہوا تو اس کے ذمے داری مجھ پر نہ ہوگی۔ وقت کی پابندی کے لیے اپنی گھڑی میری گھڑی کے ساتھ ملا لیں۔''

اس پروگرام کے طے ہو جانے کے بعد اب سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ مذکورہ محلے کے مسلمانوں کو کس طرح پیغام پہنچایا جائے' کیونکہ اس کیمپ اور اس محلے کے درمیان ہندو آبادیاں موجود تھیں جن میں سے ایک مسلمان کے لیے گزرنا اپنی موت کو یقینی طور پر دعوت دینا تھا۔ اس کام کے لیے ایک نوجوان نے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس نے ہندوانہ لباس زیب تن کیا۔ حضرت صاحب نے اپنا ایک رومال اس کے حوالے کیا' تا کہ اسے دیکھ کر ان لوگوں کو یقین ہو جائے کہ واقعی یہ حضرت صاحب کا فرستادہ ہے۔

خدا کے کرم وفضل سے پیغام رسانی کی یہ مہم کامیاب رہی۔ وقت مقررہ پر بلدیو سنگھ پولیس کے ٹرک لے کر وہاں پہنچ گیا۔ پندرہ منٹ کے قلیل عرصے میں تمام مسلمان اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ ان میں سوار ہو گئے اور بحفاظت خانقاہ میں واقع کیمپ میں پہنچ گئے۔ اس طرح سینکڑوں مسلمانوں کی جانیں اور عزتیں قتل وغارت کی نذر ہونے سے بچ گئیں۔

ڈوگروں کے محلے پر حملہ

حصار شہر میں مسلمان ڈوگروں کا ایک محلّہ تھا۔ یہ محلّہ گلیوں کے ذریعے کیمپ کے ساتھ ملا ہوا تھا' لیکن تھا ایک طرف 30 اگست کو دوپہر کے

بعد مسلح غنڈوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ محلے والے جانیں بچانے کی خاطر اپنے گھر بار چھوڑ کر کیمپ کے اندرونی حصے یعنی خانقاہ کی طرف آ گئے حضرت صاحب نے انہیں سراسیمگی کی حالت میں دیکھ کر فرمایا:

”تم دشمن سے ڈر کر اپنے علاقے خالی کر کے کیوں آئے؟ اگر مسلمان اسی طرح ڈر کر بزدلوں کی طرح بھاگتے رہے تو انہیں کہیں بھی پناہ نہیں ملے گی۔ دشمن تو چاہتا ہی یہ ہے کہ وہ بتدریج ان کا گھیرا تنگ کر دے پھر آسانی سے انہیں اپنی درندگی کا نشانہ بنائے۔ حوصلہ کرو اور ہمت و جرأت کا دامن تھام کر اپنے محلے واپس چلو اور ڈٹ کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرو۔ میں خود تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

یہ کہہ کر حضرت صاحب نے اپنے سر پر پگڑ باندھا۔ ہاتھ میں بڑا سا لٹھ لیا اور چلنے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ یہ منظر دیکھ کر اس محلے کے نوجوانوں میں جو ابھی خوف و دہشت کی وجہ سے تھر تھر کانپ رہے تھے' شجاعت و بہادری کی ایک برقی رو دوڑ گئی۔ انہیں اپنی کمزوری کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ جمع ہو کر جتھے کی صورت میں آگے بڑھے اور حضرت صاحب سے عرض کی:

”حضور جی! ہم جیتے جی یہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے کہ آپ ناپاک اور ذلیل دشمن کے مقابلے میں تشریف لے جائیں۔ ہم آپ کے مشن کی تکمیل کریں گے۔ بس آپ ہمارے لیے دعا فرمائیں۔“

یہ کہہ کر نوجوان لاٹھیاں اور ڈنڈے اپنے ہاتھوں میں لے کر شیر کی سی چستی اور تیزی کے ساتھ اپنے محلے میں واپس پہنچے اس وقت لٹیروں کی ٹولیاں ان کے گھروں کا سامان لوٹنے میں مصروف تھیں۔ گو ان کے پاس کلہاڑیاں' برچھیاں اور بندوقیں موجود تھیں لیکن آنے والے مسلمانوں کے تیور دیکھ کر انہوں نے وہاں سے راہ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ مسلم نوجوانوں نے ان کا تعاقب کیا اور ان بھاگنے والوں میں سے دو لٹیروں کو پکڑ لیا۔ جنہیں بعد میں کیفر کردار کو پہنچایا گیا۔ اس واقعے کے بعد اس محلے کے مکین پھر اپنے گھروں میں آ کر آباد ہو گئے۔

کیمپ کے ناظم اعلیٰ

حضرت صاحب نے مسلمانوں کے اس کیمپ کا ناظم اعلیٰ اپنے خاص تربیت یافتہ شاگرد اور مرید مرزا مسرت یاب بیگ کو مقرر کیا۔ وہ نہایت محنتی اور انتھک کارکن تھے۔ قدرت نے بڑی فیاضی سے انتظامی صلاحیتیں اور قابلیتیں فطرت میں ودیعت کی تھیں۔ ان کا دماغ اتنا زرخیز تھا کہ وہ نازک موقعے پر بھی عمل کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتے تھے۔ مرزا صاحب نے یہ ذمے داری ایسی خوش اسلوبی سے انجام دی کہ پورے کیمپ کے ماحول میں نظم و ضبط اور سلیقے و قرینے کی ہمت افزا اور جرات آفریں فضا پیدا ہو گئی۔

یکم ستمبر 1947ء کو شہر حصار کی صورت حال یہ تھی کہ کیمپ کی حدود سے نکلنے والا مسلمان فوراً لقمہ اجل بن جاتا اور اسی طرح کسی غیر مسلم کی بھی یہ جرات نہ تھی کہ وہ کیمپ کی حدود میں قدم رکھ سکے خواہ وہ سول انتظامیہ کا افسر اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو۔ سول انتظامیہ کے افسران یا فوجی حکام جب کسی معاملے میں کیمپ کے ذمے دار افراد سے گفتگو کے لیے آتے تو وہ پہلے نہر کے پل کے قریب پہنچ کر اندر آنے کی اجازت طلب کرتے۔ اگر حضرت صاحب کی طرف سے اجازت مل جاتی تو وہ کیمپ کی حدود میں داخل ہو سکتے تھے۔

ستمبر کے ابتدائی دنوں میں بلوائیوں نے کئی دفعہ کیمپ پر مختلف اطراف سے یورشیں کی لیکن جب انہوں نے مسلمانوں کو مقابلے کے لیے تیار پایا تو ان کی ساری بہادری اور جنگ جوئی پر خاک پڑ گئی۔ حملے کی صورت میں حضرت صاحب خود اپنا عصائے صدیہ ہاتھ میں لے کر سب سے آگے ہوتے۔ آپ کے اس جرأت مندانہ اقدام سے نوجوانوں میں سرفروشی اور جانبازی کی عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی۔

جب بلوائیوں اور فسادیوں نے یہ محسوس کر لیا کہ براہ راست حملوں سے اس کیمپ کے فرزندان توحید کو زیر نہیں کیا جا سکتا تو انہوں نے کیمپ کے چاروں طرف مورچے سنبھال لیے اور وہاں سے اندھا دھند فائرنگ کا سلسلہ شروع کر دیا۔

ضلع کی انتظامیہ جو تمام تر غیر مسلمانوں پر مشتمل تھی، اس کیمپ سے بے حد خوفزدہ تھی۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس کیمپ نے ایک ایسے محفوظ جزیرے کی حیثیت حاصل کر لی ہے جہاں سے کسی وقت مسلح بغاوت کے ایسے شعلے بلند ہو سکتے ہیں جن پر قابو پانا شاید اس کے بس میں نہ ہو۔

انتظامیہ کی پیشکش

سات ستمبر 1947ء کو ضلعی انتظامیہ کا سربراہ جو سخت متعصب تھا۔ پولیس کے ایک مسلح دستے کے ہمراہ کیمپ کے قریب پہنچا اور باقاعدہ اجازت لے کر حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔

''انتظامیہ اس جگہ یعنی اس کیمپ میں آپ کی اور مسلمانوں کی حفاظت کی ذمے داری لینے سے قاصر ہے، اس لیے آپ سرکاری کیمپ میں تشریف لے چلیں جو جیل کے وسیع و عریض احاطے میں قائم کر دیا گیا ہے۔ وہاں آپ کو راشن بھی ملے گا اور آپ کی حفاظت کا معقول بندوبست بھی کیا جائے گا اور وہیں سے آپ لوگوں کو پاکستان بھیجنے کا بندوبست ہوگا۔''

ضلع کے سربراہ کی یہ باتیں سن کر آپ نے بڑے تحمل و بردباری سے جواب دیا:

''آپ میری حفاظت کی فکر نہ کریں میرا محافظ میرا اللہ ہے۔ میں تو اپنے مرشد کی خدمت میں بیٹھا ہوں۔ ان کی اجازت کے بغیر میں یہ جگہ نہیں چھوڑ سکتا۔ ہاں، اگر دوسرے مسلمان وہاں جانا چاہیں تو انہیں لے جائیں۔''

حضرت صاحب کے انکار پر کوئی مسلمان بھی اس بات پر آمادہ نہ ہوا کہ وہ اپنے محبوب و محترم قائد کو چھوڑ کر سرکاری کیمپ میں چلا جائے۔

اس پیشکش کے ٹھکرائے جانے کے بعد اب اس کیمپ کی پوزیشن میں نمایاں تبدیلی آ گئی۔ اب تک اس پر صرف ہندو اور سکھ بلوائیوں کی یلغار تھی جس میں پولیس کے اہلکار بھی شریک تھے مگر اب اس کے چاروں طرف فوجیوں نے اپنے مورچے قائم کر لیے، جن میں مشین گنیں نصب کر دی گئیں۔ کیمپ کے مشرقی سمت نہر کی پٹڑی پر ایک توپ بھی لگا دی گئی۔ اب وقفے وقفے سے فائرنگ ہوتی تھی۔ توپ سے گولے برسائے جاتے ہیں۔ مگر یہ گولیاں اور یہ گولے خدا کی رحمت سے جانی نقصان کرنے سے قاصر رہے۔ توپ کے گولوں سے دیواریں ٹوٹیں چھتیں اڑیں مگر انسانی جانیں محفوظ رہیں۔

اسی دوران میں فوجی کمان نے حضرت صاحب کو پیغام بھیجا کہ آپ فوری طور پر یہ علاقہ خالی کر دیں۔ ورنہ اتنی سخت کارروائی کی جائے گی

کہ سب کو تہس نہس کر کے رکھ دیا جائے گا۔

اس پر صبر و توکل اور تسلیم و رضا کے اس پیکر نے جواب میں کہلا بھیجا:

''تم سے جو ہو سکے کر لو مگر ہم اپنی جگہ نہ چھوڑیں گے۔''

توپ کی فائرنگ کا جواب دینے کے لیے کیمپ کے مکینوں نے بجلی کے کھمبوں سے توپ کا کام لیا۔ سابق فوجیوں نے اپنے تجربے اور مہارت کی بدولت بجلی کے کھمبوں سے گولہ باری کی اور یہ گولے جہاں پڑتے تھے تباہی مچا دیتے تھے۔ میرے دریافت کرنے پر کہ گولہ باری کے لیے بارود کہاں سے حاصل کی گئی عبدالجلیل صاحب اور شیخ خوشی محمد نے بتایا کہ توپ کے وہ گولے جو باہر سے آتے تھے کیمپ میں آ کر پھٹتے نہیں تھے۔ ہم انہیں اٹھا کر توڑ لیتے تھے جن سے بڑی مقدار میں ہمیں سکہ مل جاتا تھا۔ بارود ہم آتشبازوں کے گوداموں سے خفیہ طریقے سے نکال کر لے آتے تھے۔

توپ پر قبضہ

اس کے باوجود توپ کی گولہ باری سے کیمپ والے سخت پریشان تھے۔ عمارتوں کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔ ایک دن حضرت صاحب نے چند نوجوانوں سے کہا:

''ہمت کر کے توپ پر ٹوٹ پڑو اور اس پر قبضہ کر لو۔ اس کوشش میں دو چار جانوں کا نذرانہ دینا بھی پڑا تو یہ نقصان کا سودا نہ ہوگا۔ جان دینے والے شہادت کی خلعت سے سرفراز ہوں گے اور باقی ہزاروں مسلمان اس کی زد سے محفوظ ہو جائیں گے۔ قربانی دے کر ہی کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔''

حضرت صاحب کا یہ ارشاد سن کر آٹھ نوجوان اس مہم کو سر کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس کام کے لیے آدھی رات کے بعد کا وقت مقرر ہوا۔ مقررہ وقت پر سب نوجوان جمع ہوئے۔ ان میں سے ایک نوجوان، جسے لوگ پھالا کہہ کر پکارتے تھے اور جس کا تعلق ایک قصاب خاندان سے تھا، کہنے لگا تم سب یہیں رہو۔ میں اکیلا جاتا ہوں اور انشاءاللہ توپ لے کر آؤں گا۔ نوجوان کی یہ بات سن کر سب ساتھی حیران ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ اس کام کے لیے تم نے کیا تدبیر سوچی ہے۔ اس پر شوق شہادت سے سرشار اس نوجوان نے کہا:

''دیکھو میں یہ مضبوط اور لمبا سارا رسا لے کر آیا ہوں۔ میں اسے لے کر زمین پر رینگتے ہوئے توپ کے پاس جاؤں گا اور اس کا ایک سرا اس کے پہیے سے باندھ دوں گا۔ اس کے بعد میں جب رسے کو حرکت دوں تو تم اسے کھینچ لینا۔ اس طرح تم توپ کو کھینچ لو گے۔ اگر میں زندہ بچ گیا تو واپس آ جاؤں گا۔ ورنہ خدا حافظ اس طرح موت کے خوف سے بے نیاز وہ نوجوان رسے کا ایک سرا ہاتھ میں لے کر رینگتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ ہر طرف اتنا گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ بالآخر وہ توپ کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور بڑی احتیاط اور خاموشی سے رسے کا ایک سرا اس کے پہیے سے باندھ دیا اور ساتھ ہی ساتھیوں کو کھینچنے کا اشارہ کر دیا۔ توپ کی حرکت سے جونہی آواز پیدا ہوئی تو ایک پہرے دار نے جو اونگھ رہا تھا گھبرا کر آنکھ کھولی اور چیخ کر بولا کون؟ پھالا نے فوراً سامنے آ کر کہا مسلمان مجھے مارنے کے لیے میرے

پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ بڑی مشکل سے یہاں پہنچا ہوں۔ جلدی سے مجھے اپنی رائفل دو تاکہ میں ان کو ختم کر دوں۔ ساتھ ہی اس نے رائفل پر ہاتھ ڈالا۔ سپاہی نے اس پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ پھالا نے اسی رائفل سے فائر کر کے اس پہرے دار اور اس کے ساتھی کو ختم کیا۔ رائفل وہیں پھینک کیمپ کا رُخ کیا۔ جب پھالا کیمپ میں پہنچا تو توپ بھی وہاں پہنچ چکی تھی۔ حضرت صاحب نے اور دوسرے مسلمانوں نے پھالا کو اس کی اس محیر العقول کارکردگی پر شاباش دی۔

توپ کا معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ریاست پٹیالہ کی سرکاری توپ تھی جو یہاں مسلمانوں کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے لیے نصب کی گئی تھی۔

اس واقعے کے بعد چاروں طرف سے گولیوں کا مینہ برسنے لگا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

دیہات سے رابطہ

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ شہر حصار کی اس وقت ایسی حالت تھی کہ باہر سے کسی مسلمان کا شہر میں آنا یا کیمپ سے کسی کا باہر جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ چاروں طرف غنڈوں اور حملہ آوروں کا دور دورہ تھا۔ امن و امان قائم کرنے والی پولیس اور فوج بھی ان کی پشت پر تھی۔ ان خطرناک حالات کے باوجود جب اردگرد کے دیہاتیوں کو یہ معلوم ہوا کہ ان کے مرشد اس وقت دشمن کے گھیرے میں ہیں اور کسی وقت بھی کوئی دردناک حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ تو وہ سخت بے چین ہو گئے۔ ان دیہاتوں میں سابق فوجی بھی تھے اور ان کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ اس لیے انہوں نے پروگرام بنایا کہ ایک مسلح جتھے کی صورت میں شہر جا کر اپنے محبوب مرشد اور پیشوا کو گھیرے سے نکال کر لایا جائے اور ہر قیمت پر ان کی حفاظت کی جائے۔ اس موقع پر کچھ سمجھدار لوگوں نے مشورہ دیا کہ اس اقدام سے پہلے حضرت صاحب کی رائے حاصل کی جائے۔ وہ جو کچھ حکم دیں اس پر عمل کیا جائے۔

اس مشورے کو سب نے پسند کیا اور دو رُکنی وفد حضرت صاحب کی خدمت میں بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ اس وفد کے ارکان ایسے باہمت افراد تھے جو لڑنا اور دُشمن کے وار کا دفاع کرنا بخوبی جانتے تھے اور ساتھ ہی وہ شہر کے چپے چپے سے واقف تھے۔ مسلمان راجپوتوں کا یہ وفد بڑی ہشیاری سے اپنے آپ کو دشمن کی نظروں سے بچاتا ہوا اور پیچ در پیچ گلیوں میں سے ہوتا ہوا کیمپ میں پہنچ گیا اور حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے آنے کا مقصد تفصیل سے بیان کیا۔ آپ نے ان کے جذبہ خیر خواہی و وفا شعاری کی تحسین فرماتے ہوئے کہا:

”میری طرف سے اپنے سب ساتھیوں سے کہنا کہ وہ ہمت اور جرأت سے اپنی جگہ پر ڈٹے رہیں۔ حملے کی صورت میں دُشمن کا پوری پامردی سے مقابلہ کریں۔ شہر کی طرف ابھی رُخ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم خدا کے بھروسے پر اپنی دفاعی جنگ بطریق احسن لڑ رہے ہیں۔ اگر مدد کی ضرورت پیش آئی تو اطلاع کر دی جائے گی، اس لیے ہر وقت مستعد اور چوکنا رہیں۔ اللہ کی مدد اور نصرت تم سب کے شامل حال ہو۔“

حضرت صاحب کا یہ ارشاد سن کر ارکان وفد واپسی کے لیے تیار ہوئے، مگر پھر انہوں نے عرض کی کہ حضور! ہمیں کسی اور خدمت کا موقع دیں۔

اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر ہو سکے تو کچھ غلہ بھیج دو۔

وفد نے واپس جا کر اپنے علاقے میں حضرت صاحب کا پیغام پہنچا دیا۔ غلہ پہنچانے کے انتظامات پر غور وخوض ہونے لگا۔ فوراً پچاس

بوروں میں چنے بھرے گئے اور انہیں گڈوں میں لاد کر رات کی تاریکی میں سنسان اور غیر آباد راستوں سے شہر کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ حفاظت کے لیے بندوق بردار جوانوں کا ایک دستہ ساتھ کر دیا۔ رات کے گیارہ بجے کے قریب یہ لوگ اس اناج کو شہر کے باہر ایک ایسے باغ میں لے کر پہنچے جو اس وقت بالکل ویران تھا۔ اس باغ اور حضرت صاحب کی خانقاہ میں واقع کیمپ کے درمیان نہر حائل تھی۔ نہر پانی سے بھری ہوئی چل رہی تھی۔ اسکی پٹڑی پر دشمنوں کے مورچے قائم تھے۔ پہرے داروں کے پاس بندوقیں بھی تھیں، رائفلیں بھی برین گنیں بھی تھیں اور مشین گنیں بھی۔ اس لیے اناج کے بوروں کو لے کر مزید آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا' اس لیے دیہاتیوں نے اناج کے بوروں کا ڈھیر باغ کے ایک ایسے حصے میں لگا دیا جو گھنے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ ساتھ ہی حضرت صاحب کو اطلاع بھیج دی کہ غلہ باغ کے فلاں حصے میں پہنچا دیا گیا ہے۔ وہاں سے منگوانے کا بندوبست کر لیں۔

اس اطلاع کے موصول ہونے کے بعد حضرت صاحب مسجد کے صحن کے اس حصے میں تشریف لائے جہاں حوض تھا۔ حوض کے آس پاس بہت سے لوگ لیٹے ہوئے اور بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''جاؤ! سامنے باغ سے چنے لے آؤ۔''

نہر کو عبور کر کے باغ میں جانا اور وہاں سے اناج کے بھرے ہوئے بورے سر پر اٹھا کر لانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا مگر حضرت صاحب کا حکم سنتے ہی پچاس آدمی تیار ہو گئے۔ لنگر کے خصوصی خادم شیخ خوشی محمد صاحب بھی ان میں شامل تھے۔ ان کا بیان ہے کہ رات کے بارہ بجے ہم مسجد سے روانہ ہوئے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ایک کر کے نہر کی طرف بڑھا جس جگہ سے ہمیں نہر عبور کرنا تھی اس کے عین سامنے چالیس قدم کے فاصلے پر فوجیوں کا مورچہ قائم تھا اور اس مورچے کا رُخ بھی ہماری طرف تھا۔ میں نے جو ادھر دیکھا تو آدمی لیٹے ہوئے نظر آئے اور دو آدمی جو ہاتھوں میں رائفل تھامے ہوئے بظاہر ڈیوٹی پر تھے مگر اونگھ رہے تھے۔ ہم میں سے ہر شخص چلتی نہر کو عبور کر کے باغ میں داخل ہو گیا۔ وہاں اس جگہ کو تلاش کیا جہاں اناج کی بوریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس جگہ سے بوریاں اٹھا کر نہر کے مشرقی کنارے پر ترتیب سے اس طرح رکھنا شروع کر دیا کہ اگر دشمن کی طرف سے ایک دم فائرنگ شروع ہو جائے تو ہم ان کی اوٹ میں اپنی جانیں بچا سکیں۔ جب سب بورے نہر کی پٹڑی پر آ گئے تو چند نوجوان نہر میں قطار بنا کر کھڑے ہو گئے اور بوریاں دست بدست مغربی کنارے پر منتقل کی گئیں۔ یہاں بھی انہیں اسی انداز میں رکھا گیا کہ ضرورت پڑنے پر ان سے اوٹ کا کام لیا جائے۔ اس کے بعد ہر شخص ایک ایک بوری اپنی کمر پر اٹھا کر کیمپ کی طرف چل دیا۔ میں نے اپنے حصے کی بوری اٹھاتے ہوئے مورچے میں موجود پہریداروں کی طرف دیکھا تو وہ اب بھی حسب سابق اونگھ ہی رہے تھے۔

ہمارے سب آدمی ایک ایک کر کے مسجد میں پہنچ گئے۔ جونہی ہمارے آخری آدمی نے مسجد میں قدم رکھا مورچے سے دھواں دھار فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس پر حضرت صاحب نے فرمایا: ''اچھا' خواب غفلت سے آنکھ کھل گئی۔''

اس کے بعد مسلسل فائرنگ کا سلسلہ طلوع آفتاب تک جاری رہا۔ شاید انہیں کسی خطرے کا شدید احساس ہو گیا تھا۔ واپسی پر مسجد میں موجود لوگوں نے بتایا کہ جب تک اناج لانے کی مہم پر جانے والے سب بخیریت واپس نہیں گئے حضرت صاحب اس وقت تک حوض کے گرد چکر کاٹتے رہے اور ساتھ ساتھ کچھ پڑھتے رہے۔

عملی نمونہ

مسجد میں نمازیوں کا بڑا اژدحام ہوتا تھا۔ اس لیے پانی کی ضروریات بھی کئی گنا بڑھ گئی تھیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ پانی کی تنگی محسوس ہوتی تو حضرت صاحب خود کنوئیں سے پانی کھینچنا شروع کر دیتے۔ آپ کو اس کام میں مصروف دیکھ کر دوسرے لوگوں کا جذبہ خدمت بیدار ہو جاتا وہ آگے بڑھ کر اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور تھوڑی دیر میں پانی کا وسیع ذخیرہ جمع کر دیتے۔

ایک تھوڑے سے علاقے میں آبادی کی کثرت کی وجہ سے صفائی کا مسئلہ کیمپ میں بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ باہر سے کسی خاکروب یا خاکروبہ کے آنے کی کوئی صورت تھی ہی نہیں۔ برسات کا موسم تھا۔ اس موسم میں تھوڑی سی غلاظت بھی پورے ماحول کی متعفن اور بدبودار بنا کر متعدد وبائی بیماریوں کے پھیلانے کا موجب بن جاتی ہے ہمارے معاشرے میں دُشمن کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جانے کو تو ایک باوقار اور شریفانہ فعل تصور کیا جاتا ہے مگر انسانی صحت کے دشمن غلاظت اور گندگی کے ڈھیروں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرنا باعث ننگ و عار خیال کیا جاتا ہے۔ اس طرح جو نقصان کھلے میدان میں دشمن پہنچانے سے قاصر رہتا ہے وہ یہ جھوٹی انا آسانی سے بلا روک ٹوک پہنچا دیتی ہے' مگر حضرت صاحب جن کی سیرت اسوہ رسولؐ کی منور قندیلوں سے روشن تھی اور جن کے نزدیک اجتماعی فلاح و بہبود کا ہر کام اپنے ہاتھ سے انجام دینا خیر و برکت کا ذریعہ تھا' ضرورت کے وقت پھاوڑا یا کسی ہاتھ میں لے کر صفائی کا کام شروع کر دیتے۔ جسے دیکھ کر ہر شخص اپنی غفلت اور کوتاہی پر ندامت محسوس کرتے ہوئے آگے بڑھتا۔ اس طرح یہ مہم چند گھڑیوں میں سر ہو جاتی۔

ضلعی انتظامیہ اور علاقے کے غیر مسلم بلوائی مسلمانوں کے اس اجتماعی کیمپ کو مغلوب اور زیر کرنے میں بری طرح ناکام ہو چکے تھے۔ ان کی تمام دھمکیاں بے سود ثابت ہو چکی تھیں۔ شہر حصار کے مسلمانوں کی یہ استقامت دیکھ کر ارد گرد کے مسلمان دیہات بھی مورچہ بند ہو کر اپنی جگہ پر بڑی پامردی سے جمے ہوئے تھے۔ یہ صورت حال صوبائی حکومت کے لیے سخت پریشانی کا سبب بنی ہوئی تھی' کیونکہ دونوں حکومتیں یعنی پاکستان اور بھارت کی مملکتیں اپنے ایک مشترکہ اجلاس منعقدہ 29 اگست 1947ء میں یہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ مغربی پنجاب کی تمام غیر مسلم آبادی یہ علاقہ خالی کر کے مشرقی پنجاب کے جملہ اضلاع کی مسلم آبادی مغربی پنجاب کی طرف ہجرت کر جائے گی۔ اس فیصلے کے مطابق ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کے بڑے بڑے قافلے دوسرے اضلاع کی طرح حصار اور اس کے گرد و نواح میں بھی پہنچ گئے جن کی آبادکاری اب حکومت کی ذمے داری تھی۔ حصار کے ایک غیر سرکاری کیمپ میں مسلمانوں کی موجودگی اور دیہات میں مسلمانوں کی اپنی زمینوں پر رہائش اس مسئلے کے حل میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ ضلعی انتظامیہ اپنے خاص ذرائع سے یہ بھی معلوم کر چکی تھی کہ حصار کے قرب و جوار کے مسلم دیہات اس وقت تک خالی نہیں ہو سکتے جب تک حضرت صاحب اپنی خانقاہ میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ اگر حضرت صاحب کو خانقاہ چھوڑنے اور سرکاری کیمپ میں تشریف لے جانے پر راضی کر لیا جائے تو غیر مسلم شرنارتھیوں کی آبادکاری کا کام شروع ہو سکتا ہے۔

اس مقصد کے لیے ستمبر 1947ء کے اواخر میں ضلعی انتظامیہ نے اپنی سابقہ روش ترک کر کے افہام و تفہیم اور صلح و صفائی کی راہ اختیار کی اور

پیشکش کی کہ مسلمانوں کے نمائندے ضلعی انتظامیہ سے مذاکرات کے ذریعے حالات کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز پیش کریں اور باہمی مشورے سے کوئی ایسی راہ نکالیں جو طرفین کے لیے قابل قبول ہوں۔

حضرت صاحب بھی تازہ ترین صورت حال سے بخوبی واقف تھے۔ انہیں علم تھا کہ اب مسلمان بھارتی حکومت کے شہری نہیں، بلکہ اس وقت وہ ایک ایسی ریاست کے محصور شہری ہیں جس کی فوجی اور مادی مدد براہ راست ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ محاصرے کی اس حالت میں وقت کا غیر معین حصہ نہیں گزارا جا سکتا اور بالآخر سب مسلمانوں کو پاکستان کی طرف ہجرت کرنا ہوگی، اس لیے حضرت صاحب نے اپنے ساتھیوں کے مشورے سے مذاکرات کی یہ پیشکش قبول کر لی اور ساتھ ہی مذاکراتی ٹیم کے ارکان بھی نامزد کر دیے۔ ڈپٹی نیاز احمد خاں کو اس ٹیم کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ٹیم کے ارکان کو لینے کے لیے مسلح پولیس کی جیپیں کیمپ کی حدود کے باہر آ جاتی تھیں۔ میٹنگ کے بعد وہی انہیں کیمپ میں چھوڑ جاتی تھیں۔ ایک دن بلدیو سنگھ ایس ایچ او نے رازداری کے انداز میں خاں صاحب سے کہا کہ یہاں کی مقامی پولیس اور یہاں کے شرپسند عناصر آپ کی جان کے درپے ہیں۔ وہ اس گھات میں ہیں کہ کسی نہ کسی طرح آپ کے لہو سے اپنے ہاتھ رنگیں، اس لیے آپ محتاط رہیں اور کیمپ سے باہر اس وقت تک نہ نکلیں جب تک میں خود آپ کو لینے نہ آؤں۔ اگر کسی وقت حفاظتی دستے کے ساتھ میں نہ ہوں تو آپ میٹنگ میں شمولیت کے لیے ہرگز نہ جائیں۔ اس پر خاں صاحب نے فرمایا:

”موت کا ایک وقت معین ہے۔ کوئی طاقت اور کوئی تدبیر اسے آگے پیچھے نہیں کر سکتی، اس لیے اس سے کیا ڈرنا۔“

ستمبر کے آخری دن حفاظتی دستہ حسب معمول مذاکراتی ٹیم کے ارکان کو لینے کے لیے آیا، لیکن اس دستے کے ساتھ بلدیو سنگھ نہیں تھا۔ اس پر حضرت صاحب نے خاں صاحب ڈپٹی نیاز احمد سے کہا بھی کہ آپ نہ جائیں کیونکہ بلدیو سنگھ نہیں آیا ہے۔ خاں صاحب نے کہا کہ آج کی میٹنگ کی تاریخ اور اس کا وقت میری ہی تجویز پر مقرر ہوا تھا۔ اگر میں نہ گیا تو ڈپٹی کمشنر کہے گا کہ ایک مسلمان نے اپنی تجویز اور اپنی بات کی بھی لاج نہ رکھی۔ خاں صاحب چلنے کے لیے تیار ہو گئے، لیکن ان کا وجدان شاید گواہی دے رہا تھا کہ آج ان کی زندگی کا آخری دن ہے اور اس دنیا میں اپنے محبوب مرشد سے آخری ملاقات کر رہے ہیں، چنانچہ وہ حضرت صاحب سے بغل گیر ہو کر ملے۔ آنکھیں اشکبار تھیں اور طبیعت پر رقت طاری تھی۔ سب دوستوں کو سلام کر کے کیمپ سے نکلے اور جیپ پر سوار ہو کر حفاظتی دستے کی معیت میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر کی طرف چل دیے۔ میٹنگ میں شمولیت کی۔ اس کے اختتام پر ٹیم کے مختلف ممبران پولیس کی مختلف جیپوں میں سوار ہو کر کیمپ کی طرف پلٹے۔ سب بحفاظت وہاں پہنچ گئے لیکن خاں صاحب واپس نہ آئے۔

ڈپٹی کمشنر کا کہنا تھا کہ خاں صاحب کو میں نے خود مسلح پولیس کی حفاظت میں بھیجا ہے اور پولیس والوں کا بیان تھا کہ ہم نے انہیں کیمپ تک سلامتی سے پہنچایا ہے مسلمانوں نے انتظار بھی کیا، لیکن انہیں آنا تھا نہ آئے۔

ٹیم کے دوسرے ممبروں نے بتایا کہ جب ہم میٹنگ سے فارغ ہوئے تو ہم کمرے سے نکل کر پولیس کی جیپوں کی طرف بڑھے۔ عین اسی وقت ڈپٹی کمشنر صاحب نے خاں صاحب کو پھر اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ابھی ہم جیپوں پر بیٹھے ہی تھے کہ وہ کمرے سے برآمد ہوئے ساتھ ہی ڈپٹی کمشنر بھی تھا۔ اس نے اشارے سے پولیس والوں سے کہا کہ انہیں بھی لے جاؤ چنانچہ وہ بھی ایک جیپ کی طرف بڑھے اور اس پر سوار ہو گئے۔ اتنے

میں ہماری گاڑیاں چل دیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کی جیپ بھی سٹارٹ ہوگئی اور وہ بھی ہمارے پیچھے روانہ ہوگئی۔ سڑک کے ایک موڑ کے بعد جب ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو خاں صاحب کی جیپ ہمیں کہیں نظر نہیں آئی۔ ہم نے پولیس والوں سے اس کا ذکر بھی کیا تو انہوں نے کہا شاید اس گاڑی نے موڑ سے دوسرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں وہ بھی ہمارے ساتھ ہی کیمپ پہنچ جائیں گے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ پولیس کے حفاظتی دستے ہی نے خاں صاحب کو گولی مار کر شہید کر دیا تھا اور لاش کو کسی ایسی جگہ ٹھکانے لگا دیا جہاں سے کوئی نام ونشان نہ مل سکے۔

الغرض انتظامیہ کی طرف سے مختلف دلائل کے ساتھ ایک ہی تجویز مسلمانوں کے سامنے لائی جا رہی تھی کہ وہ اس غیر سرکاری کیمپ کو خالی کر کے سرکاری کیمپ میں منتقل ہو جائیں کیونکہ اب حکومت کی یہی پالیسی ہے۔ وہاں آپ کے لیے سرکاری طور پر راشن کا بھی بندوبست ہوگا اور بچاؤ کے لیے حفاظت کا معقول انتظام بھی۔ اس تجویز کو پیش کرنے میں دھمکی اور تہدید کے بجائے اب اس میں درخواست اور گزارش کی نرمی آ چکی تھی لیکن اب فیصلہ حضرت صاحب کے ہاتھ میں تھا ان کا فیصلہ ہی سب مسلمانوں کا فیصلہ تھا۔

حاجی نثار احمد مرحوم کی روایت کے مطابق یکم اور دو اکتوبر کی درمیانی رات حضرت صاحب نے خواب میں اپنے رُوحانی مرشد خواجہ مظفر علی خاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کی جو فرما رہے تھے: ''صمد! گھوڑے تیار کرو۔ ان پر زین کسو آؤ یہاں سے چلیں۔''

یہ اشارہ واضح طور پر اس بات کی اجازت دے رہا تھا کہ اپنے مرشد کی خدمت میں بیٹھنے والا خادم اب اپنے مرشد کے حکم ہی سے اس خانقاہ کو خالی کر دے۔ اس اشارے کے ملتے ہی آپ نے انتظامیہ کے افسران کو پیغام پہنچا دیا کہ ہم حکومتوں کے باہمی فیصلے کے مطابق یہ کیمپ خالی کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن ہمارے ساتھ بچے بھی ہیں اور باپردہ خواتین بھی کمزور اور ضعیف لوگ بھی ہیں اور بیمار وزخمی بھی۔ اس لیے یہاں سے سرکاری کیمپ تک جانے کے لیے سواریوں کا انتظام کیا جائے۔

حضرت صاحب کا پیغام ملتے ہی ضلعی انتظامیہ کی جان میں جان آ گئی۔ اس نے خوشی سے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ اس کیمپ کے تمام مکینوں کو سواریوں کے ذریعے منتقل کرے گا۔

اگلے روز تین اکتوبر کو صبح آٹھ بجے کے قریب ہی ٹرک کیمپ کے قریب پہنچ گئے۔ لوگ اپنے بال بچوں اور ضروری سامان کے ساتھ ٹرکوں پر سوار ہوگئے۔ وہ انہیں سرکاری کیمپ پہنچاتے رہے۔

ٹرکوں کی حفاظت کے لیے مسلح فوجیوں کی جیپیں تھیں۔ یہ سلسلہ سارے دن جاری رہا حتی کہ یہ کیمپ خالی ہوگیا۔ صرف حضرت موجود تھے اور آپ کے ساتھ چند درویش۔ اس وقت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے حضرت صاحب کے خادم خاص چودھری رسالدین صاحب نے بتایا:

''اس وقت خانقاہ کے پورے ماحول پر ہو کا عالم طاری تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جہاں ہر وقت چہل پہل اور گہما گہمی رہتی تھی۔ اب وہاں قبرستان کی سی خوفناک خاموشی نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا:

جس شخص نے سب سے آخر میں اس خانقاہ سے قدم باہر رکھا وہ حضرت صاحب تھے۔ اپنے پیر خانے سے رخصت ہوتے ہوئے آپ

کے قلب وروح میں حسرت وافسردگی کی جو کیفیت پیدا ہوئی ہوگی' اس کا اندازہ اس مردمومن اور اس کے رب کے سوا کون کرسکتا ہے لیکن آپ ضبط وبرداشت کا ایک کوہ گراں تھے' اسی لیے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس وقت بھی آپ کے چہرے پر بشاشت کی وہی نورانی سرخی جھلک رہی تھی جس سے پژمردہ اور اداس دلوں کو ہمیشہ طمانیت کی دولت ملتی رہی تھی۔

حضرت صاحب نے خانقاہ سے رخصت ہونے سے پہلے ہی اپنی لائبریری کی کتابیں ایک کمرے میں جمع کر کے اس کا دروازہ پختہ اینٹوں کی دیوار چنوا کر بند کر دیا تھا تا کہ بعد میں عام اوباش لوگ ان دینی کتابوں کی بے حرمتی نہ کرسکیں۔ اسی طرح لنگر کی دیگیں اور دیگر بھاری سامان خانقاہ کے تہ خانے میں رکھوا دیا تھا۔ آپ گھر کا تھوڑا سا سامان اور چند کتابیں اپنے ساتھ سرکاری کیمپ میں لے آئے۔

حضرت صاحب کے اس سرکاری کیمپ میں آنے سے وہاں کے مکینوں میں ایک حوصلہ پیدا ہوا۔ ان کی ڈھارس بندھی ویسے بھی ہزاروں مسلمانوں کی آمد سے اس کی رونق میں اضافہ ہو گیا تھا۔ حضرت صاحب کے غیر سرکاری کیمپ میں دوسرے ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ ہمارے خاندان کے بھی تین کنبے پناہ گزیں ہوئے تھے۔

3 اکتوبر 1947ء کو حصار شہر کے تمام بچے کھچے مسلمان اب سرکاری کیمپ میں موجود تھے جن کی تعداد بیس ہزار سے زائد تھی۔ راشن اور دیگر ضروریات زندگی کی سخت قلت تھی۔ اس پر دشمن کے حملے کا خطرہ ہر وقت سر پر سوار شہر کے مسلمانوں کے آنے سے اب کیمپ میں نظم وضبط کی کیفیت پیدا ہونا شروع ہوئی۔ حضرت صاحب کی رہنمائی میں پریشاں حال اور مصیبت سے ہلکان بندگان خدا کی دلجوئی اور ہمت افزائی کی مہم شروع ہوئی۔ شدائد ومصائب کو صبر سے برداشت کرنے کی عملی تلقین کی ابتداء ہوئی۔ ان تمام باتوں سے ٹوٹے ہوئے دلوں کو کچھ سہارا ملا۔

پاکستان پہنچنے کا انتظام

حضرت صاحب کے رفیق خاص میر عابد علی صاحب کے بڑے صاحبزادے سید توقیر علی صاحب ملک کی تقسیم سے پہلے ہی بسلسلہ ملازمت لاہور میں مقیم تھے۔ انہیں جب حصار کے حالات کا علم ہوا اور یہ بھی پتہ چلا کہ ان کے والد صاحب اور ان کے مرشد حضرت صاحب وہاں محاصرے کی تنگی میں گھرے ہوئے ہیں تو انہوں نے لاہور میں موجود ان مسلم لیگی لیڈروں اور سرکاری افسروں سے رابطہ قائم کیا جو حضرت صاحب کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ انہوں نے ایک فوجی کنوائے کا انتظام کر دیا کہ وہ حضرت صاحب اور ان کے متعلقین کو اپنی حفاظت میں حصار سے لاہور لے کر آئے۔ چنانچہ سید توقیر علی صاحب پانچ اکتوبر کو اس کنوائے کے ہمراہ حصار پہنچے۔ کیمپ پہنچ کر حضرت صاحب کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا کہ حکومت پاکستان نے ایک کنوائے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ اس میں تقریباً سو افراد کی گنجائش ہے اس لیے آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ پاکستان چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہاں پر حالات بڑے مخدوش ہیں اور آپ کی سلامتی آپ کے وابستگان کے لیے ازحد ضروری ہے۔ اسی لیے میں کوشش کر کے یہ کنوائے لے کر آیا ہوں۔ پاکستان میں آپ کے عقیدتمند آپ کے لیے چشم براہ ہیں۔ توقیر صاحب کی پرخلوص اور ہمدردی سے بھرپور باتیں سن کر ایک لمحہ توقف کیے بغیر آپ نے فرمایا:

آپ مجھے تو پاکستان لے جائیں گے لیکن یہ ہزاروں مسلمان جنہوں نے میرے پاس پناہ لی ہے کدھر جائیں گے؟ کیا انہیں پاکستان لے جانے کی سر دست کوئی انتظام ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر ان کا کیا بنے گا؟ میرے یہاں سے چلے جانے کے بعد ان کی ہمتیں ٹوٹ جائیں گی۔ ان کے دل شکستہ ہو جائیں گے۔ ان کے حوصلے جواب دے جائیں گے۔ میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی سلامتی کے لیے اپنے ہزاروں دینی بھائیوں کو موت کے منہ میں چھوڑ کر یہاں سے نکل جاؤں۔ انشاء اللہ العزیز اس جگہ سے اٹھنے والا میں آخری شخص ہوں گا۔’’

سید توقیر علی صاحب حضرت صاحب کے ارشادات سن کر اپنے والد سید عابد علی صاحب کے پاس گئے اور انہیں اپنے ساتھ پاکستان چلنے کے لیے کہا۔ اس پر میر صاحب نے فرمایا:

‘‘اس مرد درویش سے جو پیمان وفا باندھا ہے وہ میرے پاؤں کی بڑیاں بن چکا ہے۔ شدائد و مصائب کے اس دور میں اس نورانی صورت کو چھوڑ کر میں کہاں جا سکتا ہوں۔ ان سے جدا ہو کر میری زندگی تو میرے لیے ایک عذاب بن جائے گی' اس لیے تم زخمیوں کو لے کر پاکستان پہنچو۔ خدا کو منظور ہوا تو پھر ملیں گے۔’’

پدر بزرگوار اور مرشد مشفق کے فیصلے سے آگاہ ہو جانے کے بعد اب توقیر علی صاحب کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ کیمپ میں موجود زخمیوں کو اپنے ساتھ لے کر پاکستان کی طرف لوٹ جائیں۔

حضرت صاحب کو کیمپ میں تشریف لائے ابھی ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ حصار میں متعین مرہٹہ رجمنٹ کا افسر اعلیٰ چند سول افسروں کے ہمراہ کیمپ میں آیا۔ کیمپ کے راؤنڈ لگاتے ہوئے یہ ٹیم حضرت صاحب کے پاس بھی آئی فوجی افسر نے آپ سے کہا:

‘‘حضور جی! میں کافی دنوں سے آپ کے چرنوں میں پیش ہونے کی سوچ رہا تھا کیونکہ جب سے آپ کا ذکر سنا تھا دل میں آپ کی زیارت کا شوق بھڑک اٹھا تھا جس نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ آج بھگوان کی کرپا سے آپ کے قدموں کو چھونے کا موقع ملا ہے۔ آپ مجھے حکم دیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ اگر آپ جلد پاکستان جانا چاہیں تو مجھے اپنے خاص آدمیوں کی فہرست دے دیں۔ میں ایک دو روز ہی میں آپ کو وہاں پہنچانے کا انتظام کر سکتا ہوں۔ آپ کی حفاظت کے لیے فوج کے جوان آپ کے ساتھ ہوں گے۔’’

فوجی افسر کی یہ باتیں سن کر حضرت صاحب نے فرمایا:

‘‘ہمیں آپ سے کسی خدمت کی ضرورت نہیں۔ ہمارا اللہ ہماری ساری ضرورتیں پوری کر رہا ہے۔ جہاں تک پاکستان جانے کا تعلق ہے تو اگر اس کیمپ کے سب لوگ کو پہنچانے کا انتظام ہو سکتا ہے تو میں بھی تیار ہوں' کیونکہ یہ سب لوگ میرے خاص آدمی ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنا پیر مانا ہے اور مجھ پر بے پناہ اعتماد کیا ہے۔ پریشانی اور مصیبت کے وقت انہیں چھوڑ کر جانا مروت و احسان مندی کے سراسر منافی ہے۔ اس کیمپ میں پاکستان کی طرف جانے والا میں سب سے آخری شخص ہوں گا۔’’

اکتوبر کے آخری ہفتے میں محکمہ ریلوے نے اپنے ملازمین اور ان کے متعلقین کو پاکستان پہنچانے کے لیے ایک سپیشل ٹرین کا انتظام کیا۔ اس کیمپ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے حضرت صاحب کے کیمپ میں پناہ لے لی تھی۔ ان کا

جرم یہی تھا کہ وہ مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کے لیے متحد و منظّم کر رہے تھے۔ جب تک وہ خانقاہ میں رہے پولیس کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوئی کیونکہ اس غیر سرکاری کیمپ میں کسی کو اس کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی، لیکن سرکاری کیمپ میں آ جانے کے بعد ہر وقت یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر کسی نے ان کی موجودگی کی مخبری کر دی تو ان لوگوں کے راستے میں مصیبت کا پہاڑ کھڑا ہو جائے گا۔ اس لیے حضرت صاحب نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ کسی نہ کسی طرح ان کو ریلوے ملازمین کے ساتھ اس کیمپ سے نکال دیں تا کہ وہ سلامتی سے پاکستان پہنچ جائیں، چنانچہ ان لوگوں کو برقعے اوڑھا کر ریلوے کے ملازمین کی خواتین کے ساتھ اسٹیشن پر پہنچا دیا گیا۔ وہاں سے وہ سپیشل ٹرین میں سوار ہو کر اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ ہمارے ماموں زاد لئیق احمد صاحب ریلوے ملازم تھے، اس لیے ماموں خلیق احمد صاحب اور برادرم گل حسن صاحب کے کنبے کے تمام افراد اسی اسپیشل ٹرین کے ذریعے پاکستان پہنچے۔ برادرم گل حسن صاحب کا بیان ہے کہ روپوش افراد نے اپنے بال بچے حضرت صاحب کے سپرد کیے اور خود کیمپ سے نکل آئے۔ انہی میں حصار کے مشہور ایڈووکیٹ اور ضلعی مسلم لیگ کے ممتاز لیڈر حمزائی صاحب بھی تھے۔ انہوں نے ہمارے ڈبے ہی میں سفر کیا لیکن سارے راستے اپنے جسم کے کسی حصے کو بھی برقعے سے باہر نہیں نکالا تمام عورتیں آپس میں حیرت سے سرگوشیاں کرتی رہیں کہ یہ خاتون واقعی پردے کی سخت پابند ہے کہ اس نے برقعے کے کسی حصے کو بھی ذرا سی حرکت نہیں دی۔ منہ کھولنا تو در کنار اپنے ہاتھوں کو بھی اس سے باہر نہیں نکالا۔ آخر پاکستان پہنچ کر یہ معما حل ہوا کہ یہ شرم وحیا اور یہ تمام پردہ داری کن مصلحتوں کی مرہون منت تھی۔

حضرت صاحب نے کیمپ کے یہ سخت دن بڑے وقار اور متانت سے گزارے۔ دوسرے مسلمانوں کی دلجوئی اور ہمت افزائی کے لیے ہر ممکن تدبیر کرتے رہے۔ آپ کی محفل میں ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا۔ آپ انہیں مختلف طریقوں سے صبر وضبط اور تسلیم ورضا کی تلقین فرماتے اور خدا کی رحمت اور اس کے فضل پر مکمل بھروسے کا درس دیتے۔ آپ کی یہ ایمان افروز باتیں شکستہ دلوں اور مضطرب طبیعتوں میں ایمان وبقاء کی نئی حرارت پیدا کرتیں۔ یہ حرارت ہی اصل میں وہ قوت ہے جو انسان کو آخر دم تک جاندار فعال اور متحرک رکھتی ہے اس قوت سے محروم ہو کر انسان ایک بے بس تنکے کی طرح ہو کر رہ جاتا ہے جیسے ہوا کے تھپیڑے ادھر سے ادھر اڑاتے پھرتے ہیں۔ آپ تقریباً روزانہ کیمپ کے مختلف حصوں میں تشریف لے جاتے، بیماروں اور زخمیوں کی عیادت کرتے۔ ان مکینوں میں جس کا آخری وقت آ جاتا اس کی تجہیز وتکفین کے انتظامات میں برابر کا حصہ لیتے اور خود ہی اس کی نماز جنازہ پڑھاتے اور اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے۔

پاکستان کے لیے روانگی

2 نومبر 1947ء کی صبح کو کیمپ میں اعلان ہوا کہ آج تیسرے پہر کے بعد اس کیمپ میں مقیم تمام مسلمان سپیشل ٹرینوں کے ذریعے حصار سے روانہ ہوں گے۔ یہ اعلان سنتے ہی لوگوں نے تیاری شروع کر دی۔ کیمپ سے ریلوے سٹیشن کا فاصلہ تقریباً دو میل تھا اور وہاں تک سب کو پیدل جانا تھا، اس لیے کسی کے لیے بھی بھاری سامان لے کر چلنا ممکن نہ تھا، چنانچہ سب نے اپنے ساتھ ہلکا پھلکا بوجھ رکھنے کا اہتمام کیا۔ اس پر بھی مقامی پولیس نے یہ حکم سنا دیا کہ کوئی شخص یہاں سے سونے چاندی کے زیورات اور اسلحہ لے کر نہیں جا سکتا۔ اس بہانے سے اس نے مسلمانوں کی گٹھڑیوں اور

سوٹ کیسوں کی تلاشی لینا شروع کر دی اور جہاں اسے کوئی قیمتی چیز نظر آئی۔ بڑی پھرتی سے اُچک لی۔

اسی مہم کے سلسلے میں پولیس اور فوج کے کچھ مسلح آدمی اس مقام کی طرف بھی آئے جہاں حضرت صاحب تشریف فرما تھے۔ اور آپ کے قریب ہی لنگر کا کچھ سامان رکھا ہوا تھا یہ سامان اسٹیشن تک لے جانے کے لیے مختلف درویشوں کے ذمے لگا دیا گیا تھا۔ اس موقع کی کیفیت بیان کرتے ہوئے چودھری رسالدین بتاتے ہیں:

"کیمپ میں ہندو پولیس اور بھارتی فوج کے آدمی مسلمانوں کے سامان کی تلاشی لیتے پھر رہے تھے۔ وہ ہماری طرف بھی آئے۔ میرے پاس ایک لحاف اور گدا تھا جن میں لنگر کی کچھ رقم چھپا کر رکھی گئی تھی۔ ایک سپاہی نے انہیں اٹھانا چاہا' لیکن انہیں اس سے بچانے کے لیے میں ان پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ سپاہی نے اپنی رائفل کا بٹ میری کمر پر مارنے کے لیے اوپر اٹھایا۔ حضرت صاحب کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ آپ نے فوراً بٹ کے وار کو اپنے عصا پر لیا اور پر جلال انداز میں فرمایا:

"کم بخت' تیری یہ جرأت؟ دفع ہو۔ اگر تو نے اس شخص کو یا کسی اور چیز کو ہاتھ بھی لگایا تو تیری خیر نہیں۔"

وہ سپاہی آپ کی پر رعب اور پر جلال آواز سن کر کانپنے لگا۔ اتنے میں پیچھے سے ایک فوجی نے جو شاید اسی کا کمانڈر تھا چیخ کر آواز دی پیچھے ہٹ' وہ سپاہی پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بعد کسی نے بھی ہمارے سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

مسلمان اپنا سامان سروں پر اٹھا کر اسٹیشن کی طرف چل دیے۔ ڈپٹی کمشنر نے حضرت صاحب کو اسٹیشن تک پہنچانے کے لیے جیپ کا انتظام کیا اور آپ سب سے اخیر میں جیپ میں سوار ہو کر ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ یہاں مسلمانوں کے لیے چار اسپیشل ٹرینیں موجود تھیں۔ سب ان میں سوار ہو گئے۔ مقامی انتظامیہ نے حضرت صاحب کے لیے ایک اسپیشل ٹرین کی سب سے پچھلی بوگی میں جگہ مقرر کی تھی۔ آپ اپنے اہل وعیال کے ساتھ اس میں سوار ہو کر بیٹھ بھی گئے' مگر پلیٹ فارم پر ریلوے کے عملے اور سول حکام کے مابین ڈرامائی انداز میں کچھ ایسے اشاروں اور کنایوں کا تبادلہ ہوتے دیکھا گیا کہ حضرت صاحب کے قریبی ساتھیوں کو ان پر کچھ شبہ ہوا' چنانچہ مرزا مسرت یاب بیگ نے رسالدین کو خاموشی سے اشارہ کیا کہ وہ حضرت صاحب اور ان کے گھر والوں کو ان کے ڈبے سے اتار کر کسی اور ڈبے میں سوار کرا دے' چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ حضرت صاحب نے جونہی پائیدان پر قدم رکھا ٹرین چل پڑی۔ اس ٹرین کے ساتھ گورکھا سپاہیوں کا جو دستہ تھا ان کے افسر نے فاضلکا پہنچ کر ایک مسلمان کو بتایا کہ خدا کا شکر کرو کہ تم سب اپنے حضور جی کے ساتھ خیریت سے یہاں پہنچ گئے' ورنہ حصار میں جو جیپ حضرت صاحب کو کیمپ سے لینے گئی تھی اس کے ڈرائیور کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ انہیں اسٹیشن پر لے جانے کی بجائے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر لے آئے۔ وہاں درندہ صفت وحشیوں کا ایک گروہ پہلے ہی موجود تھا۔ جونہی وہ وہاں پہنچیں ان پر ایک دم قاتلانہ حملہ کر دیا جائے' مگر خدا کی قدرت دیکھیے کہ ڈرائیور کے ہوش وحواس پر نہ معلوم کیا وحشت طاری ہوئی کہ وہ حضرت صاحب کو سیدھا اسٹیشن پر لے کر آ گیا۔ جب ان ظالم غنڈوں کی یہ اسکیم ناکام ہو گئی تو اب انہوں نے ہندو افسروں اور ریلوے حکام سے مل کر یہ منصوبہ بنایا کہ حضرت صاحب کو ٹرین کی سب سے پچھلی بوگی میں بٹھایا جائے اور عین آخری وقت پر کسی بہانے اس بوگی کو ٹرین سے کاٹ دیا جائے۔ باقی مسلمانوں کو لے کر ٹرین چلی جائے گی اور حضرت صاحب بے یار و مددگار اور تنہا یہاں رہ جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ حصار کا مسلم دشمن عنصر اس بات کو بخوبی سمجھ گیا تھا کہ شہر حصار کے مسلمانوں کو تہس نہس کرنے کا جو خوفناک منصوبہ اس نے تیار کیا تھا اور جس کے لیے اسے کافی جانی نقصان بھی برداشت کرنا پڑا، اس کی کامیابی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ حضرت صاحب کی ذات تھی، اس لیے وہ ہر قیمت پر ان سے بدلہ لے کر اپنی انتقام اور انسان دشمنی کی بھڑکتی ہوئی آگ کی تپش کو کسی حد تک ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا، مگر سوائے ناکامی اس کی تمام عیاریاں اور مکاریاں قادر مطلق کے فیصلے کے سامنے بیکار ہو کر رہ گئیں۔

راقم الحروف اپنے گھر والوں کے ساتھ ضلع حصار کے شہر سرسہ کے کیمپ میں مقیم تھا۔ مسلمانوں کے لیے یہ سرکاری کیمپ ہمارے محلے سبزی منڈی میں قائم تھا۔ 2 نومبر کو صبح ہی یہاں بھی کیمپ میں پناہ گزین مسلمانوں کو بتایا گیا کہ وہ آج شام پاکستان جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن پہنچ جائیں پیچھے سے اسپیشل ٹرینیں آ رہی ہیں۔ انہیں بھی ان میں سوار کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ہم سرسہ کے مسلمان مغرب کی نماز سے پہلے اسٹیشن پر آ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حصار کی طرف سے ایک ٹرین آ کر رکی۔ مگر اس کے تمام دروازے اور اس کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ گاڑی میں سوار کسی شخص کو کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے کی اجازت نہ تھی اور نہ کسی کو باہر سے اس میں سوار ہونے کی۔ انجن نے پانی لیا اور گاڑی چل پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ٹرین اور آئی۔ ہمیں اس پر سوار ہونے کی اجازت ملی۔ گاڑی پہلے ہی بھری ہوئی تھی لیکن سرسہ کے مسلمان کچھ ڈبوں کے اندر اور کچھ ان کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ اس گاڑی میں پہلے سے سوار لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ حصار سے آ رہے ہیں اور حضرت صاحب اس سے آگے والی ٹرین میں موجود تھے۔

بہر حال ان گاڑیوں نے اپنے مسافروں کو فاضلکا کے اسٹیشن پر اتار دیا جہاں سے پاکستان کی اسپیشل ٹرینیں انہیں پاکستان پہنچا رہی تھیں۔

ہمارے سامنے جب پاکستان کی پہلی سپیشل ٹرین فاضلکا اسٹیشن پر آئی تو اس کے ساتھ حفاظت کے لیے بلوچ رجمنٹ کے چاق و چوبند نوجوان تھے۔ انہوں نے گاڑی سے اترتے ہی پلیٹ فارم پر موجود مسلمانوں سے سب سے پہلا سوال یہ کیا: ''حضور جی کہاں ہیں؟''

اس پر لوگوں نے بتایا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے پاکستانی اسپیشل ٹرین کے ذریعے پاکستان تشریف لے جا چکے ہیں۔

(تحریر حافظ افروغ حسن نومبر 1988ء اردو ڈائجسٹ)

ایمان، اُمید اور محبت

آج کے دور کی مقبول ترین مصنفہ عمیرہ احمد کا شہرہ آفاق ناول ایمان اُمید اور محبت

14 فروری (ویلنٹائنز ڈے) کو کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا۔ پڑھنا نہ بھولئے گا۔

ادارہ کتاب گھر

داستان آزادی کا شمشیر بکف باب

14 اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر پاکستان اُبھرا، تو ہندو کے دل و دماغ میں مسلمان دُشمنی کی صدیوں کی مسخ شدہ لکیریں اُبھر آئیں۔ اُس نے سرزمین ہند سے مسلمانوں کی سینکڑوں برس کی حکمرانی کے نشانات مٹانے شروع کر دیے۔ بربریت اور چنگیزیت کا مظاہرہ کیا، عصمتوں کے گوہر آبدار بے آب ہوئے، معصوم بچوں کی چیخیں فضاؤں میں بلند ہو کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئیں۔ بوڑھے باپوں نے اپنی نوجوان بیٹیوں کا گلا اپنے کانپتے ہاتھوں سے گھونٹ دیا۔ نوجوانوں نے سینے پر وار سہے۔ وہ داماں چاک اور سینہ فگار لے کر پاکستان پہنچے، لیکن اکبر پور بروٹہ نے ہندو حملہ آوروں کو ناکوں چنے چبوائے۔

اکبر پور بروٹہ، ضلع رہتک کا مشہور قصبہ ہے اور تحصیل سونی پت سے سات میل اور دلی سے تقریباً گیارہ میل شمال کی سمت آباد ہے۔ بروٹہ کا گاؤں قلعہ نما فصیل کے اندر تھا۔ فصیل کے اندر کی جانب چھوٹے چھوٹے رہائشی کمرے بنے ہوئے تھے۔ فصیل کے چار کونوں پر محل نما مکان تھے۔ گاؤں میں آمد و رفت کے لیے مشرق اور مغرب میں دو بڑے آہنی پھاٹک تھے۔

پٹھانوں کے بارہ گھرانوں کے علاوہ ساری آبادی مغل قبیلے پر مشتمل تھی۔ فصیل کی تعمیر کا اندازہ اور مغل ابادی کی کثرت اس امر کی غماز تھی کہ یہ قصبہ اکبر بادشاہ کے دور حکومت میں آباد ہوا۔ غالباً اکبر بادشاہ شکار کی غرض سے اپنے امرا اور عمائدین کے ساتھ یہاں پڑاؤ ڈالا تھا۔ پٹھان قبیلے کے سارے افراد محنت کش، سخت جان اور شکار کے دلدادہ تھے۔ رائفل ان کی زندگی کا سنگھار تھی، تو برچھی بھالے زیور، اکبر پور بروٹہ کے قرب و جوار کے تقریباً سارے دیہات ہندو آبادی کا مسکن تھے۔ پٹھان جوان شکار کھیلنے کے لیے دور دراز کے علاقوں میں نکل جاتے۔ بسا اوقات مارے ہوئے شکار پر ہندو جاٹوں سے جھگڑا ہو جاتا، لیکن پلہ ہمیشہ پٹھانوں کا بھاری رہتا۔

قیام پاکستان کے اعلان سے پہلے ہی سارے ملک پر کشیدگی کے تاریک سایے منڈلا رہے تھے۔ افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ ادھر تقسیم کا اعلان ہوگا ادھر ہندو مسلمان آبادیوں پر حملہ کر دیں گے۔ بروٹہ کے پٹھان تقریباً دو مہینوں سے بارود بناتے اور خالی کھوکھوں میں بھر کر رکھ دیتے تھے۔ انہیں فلیتہ بردار توپ بنانے کا تجربہ بھی تھا، چنانچہ انہوں نے ایسی دو توپیں تیار کر لیں۔ عموماً ایسی خود ساختہ توپوں کو درخت یا بیل گاڑی کے ساتھ باندھ کر توپچی کے لیے مورچہ بنا لیتے تھے۔ بارود بھر کر فلیتہ دکھاتے، تو بیرل ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف آئی۔ توپچی فلیتہ دکھانے کے بعد مورچے میں بیٹھ کر اپنی حفاظت کرتا۔

15 اگست 1947ء کا دن مسلمانوں کے لیے قیامت کا دن تھا۔ مسلمان آبادیوں پر ہندوؤں نے حملے شروع کر دیے۔ بروٹہ تباہ کرنے کے

لیے قرب وجوار کے 45 گاؤں کے ہندو جاٹ جمع ہو گئے۔ بروٹہ کو بھی خبر مل گئی۔ انہوں نے محل تمام ڈیوڑھیوں پر چڑھ کر حملہ آوروں کا جائزہ لیا۔ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بروٹہ کو جوش انتقام کی لہروں میں بہا لے جانا چاہتا تھا۔ گاؤں بھر کے نوجوان جمع ہوئے۔ سولہ پٹھان تھے اور پانچ مغل۔

21 جوانوں کی نفری ہندوؤں کے سیل بے پناہ کے مقابلے میں بظاہر تنکے کے برابر تھی۔ کمانڈر خاں محمد کو مقرر کیا گیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا بارعب پٹھان اور ماہر نشانچی تھا۔ علاقے بھر میں اس کی جرأت اور دلیری کا چرچا تھا۔ مشکل سے مشکل لمحات میں بھی گھبراہٹ اور پریشانی کو قریب نہ پھٹکنے دیتا۔ اس نے خان حمید خاں اور خان رشید کو اپنا نائب مقرر کیا۔ خان رشید بہادر اور سجیلا جوان تھا۔ خطرات سے نبرد آزما ہونا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ خان حمید فوجی نوجوان تھا اور چھٹی پر آیا ہوا تھا۔

منصوبے کے مطابق دونوں صدر دروازوں پر خود ساختہ توپیں نصب کر دی گئیں اور جوان فصیل کے ساتھ والی چھتوں پر مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ ہندوؤں نے مشرقی دروازے سے حملہ کیا۔ وہ لاٹھیاں، برچھیاں، بھالے اور کرپانیں لے غیر منظم طریقے سے بڑھے چلے آتے تھے۔ جونہی توپ کی زد میں آئے، توپچی نے فائر کر دیا۔ ادھر مورچہ بند جوانوں نے اپنی اپنی رائفلوں کی باڑھ ماری۔ ہندوؤں کے لیے ایسا استقبال قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ ایک دوسرے کو کچلتے پیچھے کی طرف بھاگے۔ کچھ بارہ سے اور کچھ بھگدڑ میں پاؤں تلے آ کر مر گئے، لیکن پچھلی صفوں نے بھاگنے والوں کو فرار کا راستہ نہ دیا اور انہیں پھر آگے دھکیل دیا۔ ان کا بڑھتا ہوا ریلا ایک بار پھر پھاٹک تک پہنچا تو دوبارہ باڑھ پڑی۔ ایک بڑی تعداد گولیوں کا نشانہ بن گئی تو سارا ہجوم بھاگ کھڑا ہوا۔ خان محمد نے اپنے جوانوں کو باہر نکل کر لڑنے کا حکم دیا۔ بھاگتے ہوئے آدمی کے قدم مشکل ہی سے جمتے ہیں۔ بروٹہ کے نوجوان ہندوؤں کے تعاقب میں دور تک چلے گئے۔ میدان لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔

ہندوؤں نے ریڑھے (ٹیلے کا نام) کے عقب میں جا کر دم لیا۔ مسلمان نوجوان واپس آ گئے۔ ظہر کے وقت ہندو جتھے غربی دروازے کی طرف بڑھنے لگے مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ہندو بغیر کسی منصوبے کے لڑ رہے تھے۔ وہ باری باری صدر دروازوں پر حملہ کرنے اور لاشوں کا ڈھیر چھوڑ کر پسپا ہو جاتے، بروٹہ پر مغرب سے حملہ ہوا تو چند نوجوانوں کا ایک دستہ اس طرف مورچہ بند ہو گیا۔ یہاں بھی ہندوؤں کا وہی حشر ہوا جو مشرقی دروازے پر ہوا تھا۔ خان محمد کے دستے نے دشمن کی نقل وحرکت دیکھ کر غربی دروازے کے دائیں بائیں چھتوں پر پوزیشن لے لی تھی۔ دشمن کا ریلا اتنا زوردار تھا کہ دروازہ ڈھائے دیتا تھا۔ یہاں بھی مسلمانوں کی خود ساختہ توپ کام آئی۔ دشمن کی صفوں میں اس نے تباہی مچا دی۔ پھر مسلمانوں نے خان محمد کے منع کرنے کے باوجود فرط جوش میں گیٹ کھول دیا اور ہندوؤں پر ٹوٹ پڑے۔ ہندو بھاگ کھڑے ہوئے۔ غروب آفتاب سے پہلے مسلمان تعاقب سے پلٹے۔ ان کا ذرا بھی نقصان نہ ہوا تھا۔

ہندوؤں نے دور جا کر بچی کھچی نفری اکٹھی کی اور کمک کے لیے مختلف مقامات پر آدمی بھیج دیے۔

دوسرے روز دشمن اکا دکا حملے کرتا رہا۔ شاید اسے مطلوبہ کمک نہ پہنچی تھی۔ مسلمان اگرچہ پورے جوش وخروش سے نبرد آزما تھے لیکن خطرے کی سنگینی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا اور سب چھوٹے بڑے گاؤں کے دفاع میں شریک ہو گئے تھے۔ تیسرے دن ہندوؤں نے میر عابد کی ڈیوڑھی کے دروازے کی طرف سے حملہ کیا۔ میر صاحب نے یہ دروازہ فصیل میں سے آمد و رفت کی آسانی کے لیے خود نکلوایا تھا۔ یہ حملہ غیر متوقع اور زوردار تھا۔

توپیں لا کر یہاں نصب کرنے کا وقت نہ رہا تھا۔ خان محمد نے اپنے جوانوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بانٹا اور ان کا کمانڈر حمید خان، خان رشید، محبوب بیگ کو مقرر کر دیا۔ ہندوؤں کی اگلی صفیں پیچھے والوں کے دباؤ سے میر صاحب کے دروازے سے ٹکرائیں تو فصیل کی دیواروں میں جیسے زلزلہ سا آ گیا ہو۔ حملہ آوروں نے دروازہ توڑ دیا اور اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔ خان محمد اپنے جانبازوں کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے پہلے ہی تیار کھڑا تھا۔ دروازہ تنگ تھا۔ ہندو داخل ہونے کی کوشش کرتے تو مسلمانوں کی تلواریں چشم زدن میں ان کی گردنیں کاٹ دیتیں۔ فصیل پر مورچہ بند مسلمان اینٹ پتھر اور گولیاں برسا رہے تھے۔ دشمن نے جو یوں موت کی گرم بازاری دیکھی تو دہشت زدہ ہو گیا اور اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ خان محمد نے عام حملے کا حکم دے دیا۔ کسے ہوش تھا کہ مٹھی بھر سپاہ کا اندازہ کرتا۔ ہندو گڑھی اور شفیع آباد کی طرف سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ کئی گرتے اور گر گر کر اٹھتے بہت سوں میں گر کر اٹھنے کی ہمت نہ رہتی اور مارے جاتے۔ بہت سے ہاتھ جوڑنے لگتے۔ ہندوؤں کو مارتے مارتے مسلمانوں کے بازو شل ہو گئے۔ آخر خان محمد نے واپسی کا حکم دیا۔

گڑھی، ہندوؤں کا گاؤں تھا۔ مکان موجود تھے، لیکن خوف و دہشت سے بھاگ گئے تھے۔ بہاری لعل بینا جو اس علاقے کا امیر کبیر آدمی تھا، اپنی حویلی پولیس کے دستے کے حوالے کر گیا تھا تا کہ بروقت بلوائیوں کو مدد دی جا سکے۔ حویلی میں 26 جاٹ اور 13 پولیس کے آدمی تھے۔ اس تعداد کا پتہ مسلمانوں کو معرکہ سر کرنے کے بعد چلا۔ خان محمد اور اس کے ساتھی لوٹ رہے تھے کہ بہاری لعل کی کوٹھی سے فائر ہوا۔ سارے لوگ دیوار کی آڑ میں ہو گئے۔ خان بہادر کے لیے یہ بہت بڑا چیلنج تھا۔ اس نے خان حمید کو حویلی کا جائزہ لینے کی ہدایت کی۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ رینگتا ہوا دوسری سمت نکل گیا۔ وہاں سے اس نے جونہی سر اونچا کر کے اندر جھانکا، پولیس اور جاٹوں نے اسے دیکھ لیا اور خان حمید پر فائرنگ شروع کر دی۔ خان حمید بھی موقع پا کر اکا دکا گولی چلاتا رہا۔ تھانیدار صاحب سنگھ کوٹھی کے پچھواڑے کا جائزہ لینے باہر نکلا۔ خان محمد اس کی تاک میں تھا۔ اس کی رائفل نے آگ اُگلی۔ تھانیدار بھاگتے ہوئے ڈھیر ہو گیا۔ صاحب سنگھ کی چیخ سن کر ہری سنگھ حوالدار باہر لپکا۔ وہ بھی خان محمد کے ایک ساتھی کا نشانہ بن گیا۔ کچھ جاٹوں نے دہشت زدہ ہو کر عقبی دیوار پھاندنے کی کوشش کی لیکن خان حمید اور محبوب بیگ کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ آخر کار انہوں نے بھاگ کر کمرے میں پناہ لی اور دروازے بند کر لیے۔ ان کا قصہ چکائے بغیر لوٹ جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ خان محمد نے محبوب بیگ کو ہدایت کی کہ وہ پڑوس کے مکان کی چھت پر چڑھ جائے گاہے گاہے مکان کی کھڑکیوں اور دروازوں پر گولیاں چلاتا رہے تا کہ ہندو سر نہ اٹھا سکیں۔ محبوب بیگ کی مسلسل فائرنگ سے ہندو جاٹ اور پولیس کے چند سپاہی ایک کونے میں سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئے۔ اب خان محمد حویلی میں داخل ہوا اور سیڑھیاں پھلانگ چھت پر چڑھ گیا۔ خان حمید بھی اس کے پیچھے پیچھے پہنچ گیا۔ انہوں نے چھت اکھیڑ کر آگ لگانے کی کوشش کی، لیکن بے سود۔ لوہا اور اینٹیں کب آگ پکڑتی ہیں۔ خان محمد اور خان حمید نے قریبی مکانوں سے کوڑا کرکٹ اکٹھا کیا اسے آگ لگائی اور مکان میں پھینکنے لگے۔ آگ تو کیا لگتی سارا مکان دھوئیں سے بھر گیا۔ وہ ایک خوفزدہ ہو کر باہر بھاگے۔ حمید بیگ اور محبوب نے انہیں ڈھیر کر دیا۔ اسی افراتفری میں خان محمد کو محبوب بیگ کے پستول کے چھرے لگے تاہم زخم خطرناک نہ تھے۔

شام ڈھلے خان محمد کو خبر ملی ہندو پھر بروٹہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس نے خان حمید، محبوب بیگ اور حمید بیگ کو آپریشن مکمل کرنے کے

لیے وہی چھوڑا اور خود کمان سنبھالنے بروٹہ پہنچ گیا۔ خان حمید ہر قیمت پر پولیس والوں کا اسلحہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ چھت سے نیچے اترا اور بلند آواز سے پکارا جان کی خیر چاہتے ہو تو جو ہتھیار بھی تمہارے پاس ہیں انہیں برآمدے میں رکھ دو اور ہاتھ اوپر اٹھا کر گیٹ پر آ جاؤ‘ ورنہ مٹی کا تیل منگوا لیا ہے اسے چھڑک کر آگ لگا دیں گے اور تم لوگ اندر ہی بھسم ہو جاؤ گے۔“

اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ سب سے پہلے پریم ناتھ بہاری لعل کا بھانجا اندر سے نکلا۔ پھر ایک ایک کر کے نو آدمی اور باہر آئے اور سب نے اپنے آپ کو خان حمید کے حوالے کر دیا۔ حمید بیگ نے اپنی پگڑیوں سے ان کی مشکیں کسیں‘ ہانک کر بروٹے لے آیا جہاں انہیں قتل کر دیا گیا۔ اندھیرا اچھیل چلا تھا اندیشہ تھا دشمن کا کوئی آدمی چھپا نہ بیٹھا ہو اور بے خبری میں حملہ نہ کر دے‘ اس لیے حویلی کی تلاشی نہ لی اور صرف تین رائفلیں‘ چند برچھیاں اور بارود کے بنڈ دلیر ہاتھ لگیں۔

بروٹہ میں خان حمید کے قتل کی خبر مشہور ہو چکی تھی۔ سارے گاؤں میں کہرام مچا ہوا تھا۔ خان زندہ سلامت آ پہنچا تو ہر طرف اطمینان اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

تین دن کے تھکے ہارے کھانے کے چند نوالے حلق سے اتار کر گہری نیند سو جانا چاہتے تھے کہ خبر پھیل گئی فوج بروٹہ کا محاصرہ کرنے آ رہی ہے۔ پنچایت بیٹھی اور گاؤں خالی کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ وہ رات اکبر پور بروٹہ میں قیامت کی رات تھی۔ وہ عورتیں جنہوں نے ساری زندگی دہلیز سے باہر قدم نہ رکھا تھا‘ ننگے پاؤں‘ ننگے سر بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔ نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ہر ایک کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے ایسے خوف و ہراس کے سمے کون کسی کو سنتا ہے جس کی جدھر سینگ سمائے چلا گیا۔ پٹھان گھرانہ خان محمد کی رہنمائی میں پورے نظم و ضبط کے ساتھ بیل گاڑیوں اور اونٹوں پر اپنی ضرورت کا سامان لاد رہا تھا۔ وہ چیز اٹھائی جو آسانی سے اٹھائی جا سکتی تھی۔ ہر چیز کو جوں کا توں چھوڑا۔ برسوں کے آباد مسکن کھلے پٹ چھوڑے اور منزل مراد پاکستان کی طرف چل کھڑے ہوئے۔

بروٹہ سے پانچ میل دور سونی پت تھا جہاں اہل قافلہ کے کچھ رشتے دار آباد تھے۔ شام ہی سے کالی گھٹائیں چھا گئی تھیں اور اب موسلا دھار مینہ برسنے لگا تھا۔ ایک ایک قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ میل ڈیڑھ میل جا چکے تھے کہ امیر قافلہ کو رپورٹ ملی خان حمید خاں کی سات سالہ بھانجی چمنیا کہیں بروٹہ ہی میں رہ گئی ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب بڑی بڑی قیمتی جانیں ضائع ہو رہی تھیں۔ حالات کے پیش نظر سات سال کی بچی کا قافلے سے بچھڑ جانا کوئی بڑا سانحہ نہ تھا‘ لیکن خان حمید کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہ اپنی بھانجی کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ وہ الٹے پاؤں بھاگا۔ لاشیں پھلانگتا شرقی دروازے سے گاؤں میں داخل ہوا۔ ایک دیوار کے ساتھ اسے گٹھڑی سی پڑی نظر آئی۔ وہ آگے بڑھ گیا‘ لیکن پھر کچھ خیال آیا۔ واپس آیا بجلی چمکی تو دیکھا ایک بچی دیوار کے ساتھ لگی سو رہی ہے۔ ماچس جلائی تو پہچان لیا۔ وہ چمنیا تھی اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں اس بات کی شاہد تھیں کہ چمنیا اپنے قافلے سے کھو کر روتے روتے سو گئی ہے۔ خان حمید نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور قافلے سے جا ملا۔

بارش تھم گئی۔ مطلع صاحب ہو گیا‘ لیکن سونی پت اب بھی کالے کوسوں دور لگ رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر خان محمد کا اونٹ خطرے کا احساس کر کے رُک گیا۔ اس نے بھی خطرے کی بو پائی‘ قافلے کو رک جانے کا اشارہ کیا۔ خود گروہ پیش کا جائزہ لینے لگا۔ دو تین فرلانگ آگے میدان میں ہندوؤں

کا جم غفیر پڑا سو رہا تھا۔ غالباً اس ٹڈی دل کی صبح بروٹہ پر حملہ کرنا تھا۔ دشمن سے نبرد آزمائی کا وقت نہ تھا۔ خان محمد واپس آیا اور قافلے کو چپ چاپ مڑنے کا حکم دیا۔ قافلہ خاصا لمبا چکر کاٹ کر صبح سویرے سونی پت کے قریب پہنچا۔ سونی پت ہندو جتھوں کے نرغے میں تھا۔ قافلہ رک گیا۔ تھوڑی دیر غور و خوض ہوتا رہا۔ کوٹ (سیدوں کا محلّہ) کی سمت محفوظ نظر آئی۔ قافلے نے ایک بار پھر رخ بدلا اور کیچڑ میں لت پت ماموں کا بھانجا شہید کی درگاہ کے راستے سونی پت کے محلّہ کوٹ میں داخل ہو گیا۔

ٹھیک اسی وقت ہندوؤں نے سونی پت پر یلغار کر دی۔ خان محمد کے دستے نے اپنے اونٹ ایک جگہ بٹھا دیے اور عورتوں کو اپنے عزیزوں کے ہاں بھیج دیا۔ سونی پت کی آدھی آبادی ہندو جاٹوں ار پنیوں پر مشتمل تھی۔ وہ بھی حملہ آوروں کے ساتھ مل گئے تھے۔ حملے کا زور محلّہ گوسیاں اور جٹ والہ پر تھا۔ خان محمد اور اس کے جواں سال ساتھی سونی پت کی مسلمان آبادی کے لیے غیبی مددگار ثابت ہوئے۔ خان محمد نے یہاں بھی منصوبہ بندی سے ہندوؤں کا حملہ روکا۔ اس نے ساری آبادی کے نوجوانوں کو اہم مقامات کی چھتوں پر تعینات کر دیا۔ ہندو بڑے جوش و خروش سے بار بار حملہ کرتے۔ ان کی کوشش تھی مسلمانوں کے محلوں میں داخل ہو کر مکانات کو آگ لگا دیں، لیکن مسلمانوں نے ان کے حملوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ گلیوں میں دست بدست لڑائی بھی ہوئی۔ مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔ محلّہ جٹ والہ کے کچھ مسلمان نوجوان شہید ہوئے ایک سکھ پختہ چوبارے میں بیٹھا رائفل سے آگ برسا رہا تھا۔ خان رشید اور خان حمید نتائج کی پرواہ کیے بغیر مکانوں کی منڈیروں پر سے رینگتے ہوئے چوبارے کے قریب جا پہنچے اور دو مختلف سمتوں میں پوزیشن لے لی۔ خان رشید نے خان حمید کو سامنے والی کھڑکی پر فائر کرنے کا حکم دیا اور خود چوبارے کے عقب میں جا پہنچا۔ اتفاق سے سکھ نے اپنا عقب محفوظ سمجھ کر کھڑکی کھلی چھوڑ دی تھی۔ خان رشید نے نشانہ باندھا۔ گولی رائفل سے نکلی، ایک چیخ بلند ہوئی اور سکھ ڈھیر ہو گیا۔ خان رشید دوڑ کر چوبارے میں داخل ہوا، سکھ کی رائفل پر قبضہ کیا اور پھر وہ دونوں اپنے مورچوں میں واپس آ گئے۔

دوپہر کے بعد دشمن کے حملے کا زور ٹوٹ گیا اور اس کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ خان محمد اور اس کے ساتھی کھلے میدان میں نکل آئے۔ یہ دیکھ کر ہندو بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے کچھ دور تک تعاقب کیا۔ باقی لوگ تو واپس آ گئے، لیکن خان حمید اور گھنور (ضلع کرنال) کے لطیف آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ کوئی پچاس ہندوؤں کا ایک جتھا تقریباً چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک ٹیلے کے دامن میں بیٹھا سستا رہا تھا۔ یہ اچانک اس کے سر پر جا پہنچے اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ ہندوؤں میں افراتفری پھیل گئی۔ کئی گولیوں کا نشانہ بن گئے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ دونوں جیالے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں چھپتے چھپاتے آگے بڑھے اور حاجی بندو کے باغ میں پہنچ گئے۔ یہاں ہندو حملہ آوروں نے باقاعدہ کیمپ لگا رکھا تھا۔ کچھ آرام کر رہے تھے کچھ تاش کھیل رہے تھے کچھ درختوں پر چڑھے پھل کھا رہے تھے۔ کچھ سونی پت کی پسپائی کا بدلہ لینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ باغ کے سامنے والے کنارے پر ایک خودساختہ فلیتے دار توپ نصب کر رکھی تھی اور توپچی اس میں بارود بھر رہا تھا۔ خان حمید نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس پر فائر کر دیا۔ توپچی کی چیخ فضا میں بلند ہوئی، وہ زمین پر گرا اور تڑپ کر مر گیا۔ ہندوؤں نے خیال کیا اچانک دھاڑ پڑ گئی۔ دہشت زدہ ہو کر بھاگے افراتفری میں بہت سے درختوں سے ٹکرا کر اور بہت سے آپس ہی میں الجھ کر زخمی ہو گئے۔ وہ ایسے بدحواس تھے کہ انہوں نے مڑ کر یہ تک نہ دیکھا کہ حملہ آور ہیں کتنے۔

یہ ایک غیبی تائید تھی، ورنہ سینکڑوں ہندوؤں کے مقابلے میں دو مسلمان کب تک لڑ سکتے تھے؟ خان حمید اور لطیف سونی پت پہنچ گئے۔ اس کامیابی سے سونی پت کے جوانوں کا حوصلہ بڑھ گیا۔ سارے جوان جائے معرکہ پر پہنچے اور بہت سے ہتھیار اور خودساختہ فلیتہ دار توپیں ان کے ہاتھ لگیں۔

تیسرے دن ایک فوجی دستہ حفاظت کی غرض سے آ پہنچا جس کا کمانڈر ایک ہندو میجر تھا۔ علاقے بھر کے ہندو بروٹہ اور سونی پت کی شکست کے زخم چاٹ رہے تھے۔ ہندو اپنی ناکامی کا بڑا سبب خان محمد کو سمجھتے تھے۔ انہوں نے ہندو میجر کو اپنی مظلومیت اور خان محمد کی قاتلانہ سرگرمیوں کی داستان سنائی اور خان محمد کو گرفتار کرنے کا مطالبہ کیا۔ مسلمانوں کو اس سازش کا قبل از وقت علم ہو گیا۔ انہوں نے خان محمد کو عورتوں والے کپڑے اور برقع پہنایا اور عورتوں میں بٹھا دیا۔ میجر نے گھر گھر کی تلاشی لی، لیکن خان محمد ہاتھ نہ آیا۔ آخر میجر نے مصالحانہ انداز میں خان محمد سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ مسلمانوں نے مشہور کر دیا کہ خان محمد تو بروٹہ ہی میں شہید ہو گیا تھا۔ میجر ابھی کوئی اور اقدام نہ کر پایا تھا کہ اس کا تبادلہ ہو گیا اور اس کی جگہ ایک انگریز کرنل پٹ نے لے لی۔

ہندو میجر کے تبادلے سے جل بھن گئے۔ ان کے جتھے چاروں طرف سے جمع ہونے لگے اور پھر ایک بہت بڑا لشکر سونی پت کی طرف بڑھا۔ کرنل پٹ نے ہندوؤں کو سمجھانے اور قتل و غارت سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر وہ کسی صورت ٹلتے نظر نہ آتے۔ آخر کرنل نے ایک کیپٹن کو حکم دیا کہ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کر دو ہندو پندرہ منٹ کے اندر اندر منتشر ہو جائیں، ورنہ گولی چلا دی جائے گی، مگر انہوں نے سنی ان سنی کر کے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ کرنل نے فوجی دستے کو فائر کھولنے کا حکم دیا جس سے کئی ہندو مارے گئے بہت سے زخمی ہوئے اور باقی رفو چکر ہو گئے۔ فائرنگ کی خبر نئی دہلی میں پنڈت نہرو کو ملی تو کرنل پٹ کو فوراً واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ ایک سکھ آ گیا۔ بلاشبہ وہ ایک شریف اور فرض شناس انسان تھا۔ اس نے پوری کوشش کی مسلمانوں پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

سونی پت میں تقریباً تین مہینے ٹھہرنا پڑا۔ پھر ایک اسپیشل گاڑی مسلمانوں کو پاکستان پہنچانے کے لیے پہنچ گئی۔ خان محمد اور اس کے ساتھی رائفلوں کے بغیر سفر کرنے کو غیر محفوظ سمجھتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ اسلحہ پاس رکھتے تو پکڑے جانے کا اندیشہ تھا۔ فوج اور پولیس ہر دم تلاشی لے رہی تھی۔ آخر خان محمد کو ایک تدبیر سوجھی۔ وہ لوگ جس حویلی میں مقیم تھے وہ ذوالفقار نامی ایک جاگیردار کی تھی۔ ذوالفقار خود اہل وعیال سمیت اعلان آزادی سے پہلے ہی ہوائی جہاز سے پاکستان چلا گیا تھا۔ یہاں ایک بڑا سا بکس پڑا تھا۔ خان محمد نے اس بکس میں رائفلیں اور پستول رکھے اور لکڑی کا تختہ جڑ دیا اور بالائی خانے میں گرہستی کا سامان بھر دیا۔ دو جوان صندوق گاڑی تک لے گئے۔ فوجی سپاہیوں نے حسب دستور تلاشی لی۔ بکس میں کھانے پینے کے برتن بھرے دیکھ کر لے جانے کی اجازت دے دی۔ صندوق گاڑی میں رکھ دیا گیا، لیکن راستے میں کہیں بھی رائفلوں اور بندوقوں کی ضرورت نہ پڑی۔ یہ مہاجرین کا واحد قافلہ تھا جس نے سینکڑوں ہندوؤں کو موت کے گھاٹ اتارا، مگر خود ذرہ برابر نقصان اٹھائے بغیر صحیح سلامت پاکستان پہنچ گیا۔

(روایت۔ حمید نظامی۔ ڈائجسٹ)

روداد چمن 47ء کی

آگ اور خون کے اس ہولناک سیلاب کا آنکھوں دیکھا احوال جب مشرقی پنجاب میں اسلام کے نام لیواؤں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی مگر پنجاب کی مسلم قیادت بے خبری کے مزے لوٹ رہی تھی

پنجاب کی ''خچر وزارت''، جو مسلمان عوام میں خضر حیات ٹوانہ اور لالہ بھیم سین سچر کے ناموں سے موسوم تھی، جب مسلم لیگ کے تہلکہ خیز ایجی ٹیشن کی تاب نہ لا کر مستعفی ہو گئی تو 3 مارچ 1947ء کو گورنر پنجاب نے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کو وزارت سازی کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی۔ اسی روز اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے اسمبلی ہال کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر شمشیر برہنہ لہراتے ہوئے پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی کی اور ہندو سکھوں نے پنجاب میں مسلم لیگی حکومت کے قیام کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ شروع کر دیا جس کے نتیجے میں لاہور، امرتسر اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں صورتحال سخت کشیدہ ہو گئی۔ 4 مارچ کو لاہور میں چوک دالگراں، رام گلی اور موچی دروازہ کے آس پاس فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں کچھ لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ یہ پہلی چنگاری تھی جس نے پنجاب کے خرمن امن میں شعلے بھڑکا دیئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہندو سکھوں نے ان فسادات کے لیے منظّم تیاری کر رکھی تھی۔ مسلمانوں نے تحریک کے دوران جس نظم وضبط کا مظاہرہ کیا تھا وہ بے مثال تھا۔ انہیں اشتعال بھی دلایا گیا۔ ان پر خشت باری بھی ہوتی رہی مگر انہوں نے امن وسلامتی کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا۔ اس کے برعکس ہندو، سکھ رہنماؤں نے موقع آنے پر ایک دن کی بھی تاخیر نہ کی اور ابھی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر نے وزارت سازی کی دعوت ہی قبول کی تھی کہ انہوں نے فسادات کا بازار گرم کر کے پرامن انتقال اقتدار کو دشوار بنا دیا۔ انگریز کے لیے یہ بہانہ کافی تھا، چنانچہ پنجاب میں فوری طور پر اسمبلی معطل کر کے گورنر راج کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔

پنجاب میں فسادات کے لیے ہندوؤں اور سکھوں کی منظّم تیاری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ 4 مارچ کو لاہور میں فساد ہوا اور اسی شب کو آگ اور خون کا یہ کھیل امرتسر میں شروع کر دیا گیا۔ اس کا آغاز چوک پراگ داس کی ایک مسجد سے بعد نماز عشاء نمازیوں پر حملے سے کیا گیا۔ یہ علاقہ شہر کے وسط میں ہندو اور سکھ آبادی میں گھرا ہوا تھا۔ مسجد کے بعد مسلمانوں کے گھروں پر حملے ہوئے۔ مسلمان عورت، مرد، بچہ، بوڑھا جہاں ملا، شہید کر دیا گیا۔ عورتوں کی بے حرمتی بھی کی گئی۔ چوک پراگ داس کے آس پاس مسلمانوں کو نشانہ ستم بنانے کے بعد اگلے ہی روز سکھ جتھوں نے منظّم طور پر مسلمان آبادی (لوہ گڑھ، ہاتھی دروازہ، کٹڑہ مہان سنگھ وغیرہ) پر حملے کر دیئے۔ امرتسر کے بارونق ترین کاروباری مراکز کٹڑہ جیمل سنگھ، چوک فرید اور آس پاس کے علاقے لوٹ مار کے بعد نذر آتش کر دیئے گئے۔ یہ غارت گری بڑی منظّم طور پر کی گئی تھی اور اس کے لیے قرب وجوار کے دیہات

سے سکھوں کے جتھے امرتسر منگوائے گئے تھے۔ کٹڑہ جیمل سنگھ' امرتسر کا تجارتی مرکز تھا جہاں مسلمان تاجروں کی بڑی بڑی دکانیں' قالینوں' کراکری اور کپڑے وغیرہ کی تھیں۔ باہر سے آنے والے سکھ جتھوں نے ان دکانوں کے مال ومتاع کو رات بھر میں لوٹ کر چھکڑوں اور ٹرکوں میں لادا اور اپنے اپنے دیہات کو بھیج دیا اور خالی دکانوں اور آس پاس کے مکانوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔

یہی کچھ کٹڑہ کنہیاں' چوک فرید اور ہال بازار کے بعض حصوں میں ہوا۔ کٹڑہ مہان سنگھ' لوہ گڑھ' ہاتھی دروازہ کے اندر دور دور تک مسلمانوں کی آبادی تھی۔ جب ان محلوں پر سکھوں کے جتھوں نے حملے شروع کئے تو مدافعت کے لیے کچھ جی دار مسلمان نوجوان سر پر کفن باندھ کر' جو کچھ ڈانگ سوٹا کسی کے ہاتھ لگا' لے کر نکل آئے اور اس بے جگری سے انہوں نے منظّم طور پر مسلح سکھوں کا مقابلہ کیا کہ ان کا منہ پھیر دیا۔ اس طرح امرتسر کے گنجان آباد مسلم علاقے چند نوجوانوں کی سرفروشی اور جانثاری کی بدولت غارت گری اور قتل عام سے بچ گئے۔ ان نوجوانوں میں کچھ میرے شناسا بھی تھے۔ انہی میں حامد پہلوان امرتسر ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر تھے۔ اس محاربے میں ان کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔

امرتسر میں رزم آرائی کا یہ سلسلہ دو روز تک بلا روک ٹوک جاری رہا۔ گاڑیوں کی آمدورفت معطل ہو گئی تھی اور سول انتظامیہ اور پولیس کی مدد کے لیے فوج بلالی گی 7 مارچ کو دوپہر دو بجے سے شہر میں 48 گھنٹے کے لیے مسلسل کرفیو لگا دیا گیا۔ اور اس کے بعد پانچ روز تک بیس بیس گھنٹے روزانہ کا کرفیو نافذ کیا گیا۔ جس میں صبح دس بجے سے دوپہر دو بجے تک صرف چار گھنٹے ضروریات زندگی کے حصول کے لیے نرمی کی گئی۔

میں اپنے رفیق رؤف انور کے ہمراہ 3 مارچ کی رات کو لاہور سے ٹرین پر سوار ہو کر نصف شب کے بعد بٹالہ پہنچا تھا۔ اگلے روز شام کو لاہور میں برپا ہونے والے فساد کی اطلاع مل گئی اور 5 مارچ کی صبح کو اخبارات کے ذریعے اس کی کچھ تفصیل بھی معلوم ہوئی مگر امرتسر میں جو طوفان اٹھا اس کے بارے میں کچھ لوگوں کی زبانی اطلاعات پہنچیں جو تشویش انگیز تھیں مگر مفصل نہیں تھیں اور اسی روز سے بٹالہ' امرتسر اور لاہور کے درمیان آمدورفت کے سلسلے بھی منقطع ہو گئے۔ صرف ریڈیو پر سرکاری بلیٹن کے ذریعے کچھ خبریں مل رہی تھیں یا اکا دکا کسی نہ کسی طرح آنے والے کے ذریعے کچھ غیر مصدقہ حالات معلوم ہو رہے تھے مگر بھیانک تفصیلات سے ہم بے خبر تھے۔ صرف یہ معلوم ہوا کہ امرتسر جل رہا ہے اور فوج کی آمد اور کرفیو کے مسلسل نفاذ نے بھی صورتحال کی سنگینی کا احساس دلا دیا۔ اب موقع پر پہنچ کر صورتحال معلوم کرنے کے لیے صرف 9 مارچ کو امرتسر پہنچنے کی امید تھی اور وہ بھی ایسے وقت جب صبح دس بجے سے دوپہر دو بجے تک کرفیو میں چار گھنٹے کا وقفہ دیا جانا تھا۔ یہ دو تین روز ہمارے بڑے اضطراب میں گزرے۔

9 مارچ کو علی الصباح میں اپنے دوست رؤف انور کو ساتھ لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچا کہ شاید ٹرین کی آمدورفت بحال ہو گئی ہو۔ سوئے اتفاق پٹھان کوٹ سے پہلی ٹرین صبح سویرے آ گئی جسے لاہور تک آنا تھا۔ ہم اس پر سوار ہو گئے۔ ٹرین میں بہت کم لوگ تھے' تاہم وہ مقررہ وقت پر تقریباً 9 بجے بٹالہ سے روانہ ہوئی اور دس بجے امرتسر پہنچ گئی۔ اس وقت کرفیو میں وقفے کے سائرن بج رہے تھے۔ ہمارے پاس صرف چار گھنٹے تھے۔ ہم ٹرین سے اترتے ہی فوراً شہر کی طرف پیدل روانہ ہو گئے۔ فٹ برج سے گزر کر سیدھے ہال بازار کے اندر داخل ہوئے اور سکھوں کی گول ہٹی تک پہنچے جو جل کر ملبے کا ڈھیر ہو چکی تھی۔ وہاں سے ہم واپس ہو کر ایم اے او کالج اور پہلے ہسپتال کی طرف سے ہوتے ہوئے چوک فرید پہنچے جسے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ اس بارونق چوک کی جگہ ملبے اور جلی ہوئی چیزوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر تھا آس پاس کی دکانیں اور مکانات بھی جل کر راکھ کے تودے

بن چکے تھے۔ ان ٹیلوں ٹبوں کے اوپر سے بمشکل گزر کر ہم کٹڑہ جیمل سنگھ پہنچے۔ یہ بازار خاصا کشادہ اور بارونق ہوا کرتا تھا۔ کاروباری لحاظ سے یہ لاہور کے انار کلی بازار کی طرح مگر انار کلی سے زیادہ کشادہ تھا۔ ایک طرف ہال بازار اور کوتوالی سے ملا ہوا اور دوسری طرف کرموں ڈیوڑھی اور دربار صاحب کی طرف جاتے ہوئے بازاروں سے متصل۔ مگر اب اس بارونق بازار کا پہچاننا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی دورویہ سب دکانیں جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکی تھیں اور آس پاس کے مکانات بھی ساتھ ہی جل کر خاک سیاہ ہو چکے تھے۔ جلے ہوئے ملبے پر چلتے ہوئے ہم کرموں ڈیوڑھی کی طرف روانہ ہوئے۔

تھوڑی دور چل کر بائیں ہاتھ کی جلی ہوئی دکانوں سے قیاساً اس مقام کا جائزہ لیا جہاں شہاب الدین پہلوان کی فالودے اور کھیر کی مشہور دکان ہوا کرتی تھی۔ ہم اکثر گرمیوں میں یہاں فالودہ نوش جان کرنے اور سردیوں میں کھیر اور گجریلا کھانے کے لیے آیا کرتے تھے۔ اب اس جگہ دکان کا نام ونشان بھی نہیں تھا' البتہ ایک جلی ہوئی دیوار کے ساتھ ایک زنجیر لٹک رہی تھی جس کے ایک سرے پر کچھ جلی ہوئی ہڈیاں نظر آتی تھیں جو غالباً کسی دنبے یا بکرے کی ہوں گی۔ کھیر والے پہلوان کو بھی میرے والد صاحب کی طرح قربانی کے دنبے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ تو قربانی کا یہ بے زبان دنبہ بھی اس فسادکی آگ کے الاؤ میں جل کر قربان ہو گیا تھا اور اس کی چند جلی ہوئی ہڈیاں اور وہ زنجیر جس سے وہ بندھا ہوا تھا' شہابو پہلوان کی دکان کے اجڑنے کا فسانہ سنا رہی تھیں۔

اب ہم کرموں ڈیوڑھی کی طرف روانہ ہوئے اور بلاخوف وخطر اس مقام سے بھی آگے نکل گئے جہاں چاولہ کلاتھ ہاؤس (مسلمان بزار کی دکان) واقع تھا۔ یہ وہی مرکز تھا جہاں سے 1941ء میں ہم نے فرسٹ ائیر میں آنے کے بعد پی فار پاکستان کے بیج لیے تھے۔ اب یہ دکان بھی لٹ چکی تھی مگر یہاں آتش زنی کا کھیل نہیں کھیلا گیا تھا کیونکہ باقی سب دکانیں ہندوؤں کی تھیں اور اردگرد ہندوؤں اور سکھوں کے مکانات تھے۔ ہم کرموں ڈیوڑھی سے کچھ زیادہ دور نہیں تھے۔ ہم نے محسوس کیا کہ اردگرد کی گلیوں' محلوں اور مکانوں سے ہم دونوں کو حیرت سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہمارے علاوہ وہاں اور کوئی آ' جا نہیں رہا تھا۔ ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہم بلا سوچے سمجھے' اپنے خیالوں میں گم سم دور تک ایسے مقام پر آ گئے ہیں جہاں چاروں طرف دشمن کی نگاہیں ہمیں گھور رہی ہیں۔ اس خطرناک مقام پر پہنچ کر ہمیں تشویش تو ہوئی مگر ہم نے اپنے حواس بجا رکھے اور گھبراہٹ کے شائبے تک کا اظہار نہ ہونے دیا اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر سینہ تانے آہستہ آہستہ اس طرح چلتے رہے جیسے موقع ومحل کا معائنہ کر رہے ہوں۔ ہماری یہ حکمت عملی کامیاب رہی۔ بند دروازوں اور کھڑکیوں کی اوٹ سے اکثر نگاہیں ہماری نقل وحرکت کا جائزہ تو لیتی رہیں مگر کسی کو سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ہم نے آگے دربار صاحب کی طرف جانا مناسب نہ سمجھا۔ کرفیو کا وقفہ بھی تھوڑا رہ گیا تھا' لہٰذا واپسی کا سفر شروع کیا اور محتاط انداز میں گردوپیش سے چوکنے رہتے ہوئے آہستہ خرام واپس ہوئے حتیٰ کہ ہم دوبارہ کٹڑہ جیمل سنگھ کے ویرانے میں پہنچ گئے۔ اب ہم خطرے کے زون سے باہر آ گئے تھے۔ وقت دیکھا تو ایک بج چکا تھا۔ کرفیو کا وقفہ ختم ہونے میں ایک گھنٹے سے بھی کم وقت رہ گیا تھا۔ یہاں سے ہم تیز قدم اٹھاتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ پلیٹ فارم پر قدم رکھا تو کرفیو کا وقت شروع ہونے کے سائرن بج رہے تھے۔ ہم اس چار گھنٹے کے دوران کسی سے مل سکے نہ باتیں کر سکے البتہ مشاہدے میں بہت کچھ آ گیا۔ بقیہ وقت ریلوے اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں گزرا اور شام کی ٹرین سے ہم واپس بٹالہ پہنچ گئے۔

امرتسر محاذ جنگ بن چکا تھا۔ ہم سوچ رہے تھے آتش و آہن کی یہ برکھا کیا اب بٹالہ کا رخ کرے گی جو امرتسر سے 24 میل کے فاصلے پر تھا۔ بٹالہ کا دفاع ہماری ذمے داری تھی۔ مقامی طور پر تو ہمیں وہاں برتری حاصل تھی مگر باہر سے مسلح جتھے آ کر حملہ آور ہوں تو معاملہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ بہرحال، ہمیں ہر صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا تھا۔

امرتسر کی اس خونریز معرکہ آرائی سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آئی کہ اس تباہی میں ہندو پس منظر میں تھے اور سکھ آگے آگے تھے۔ اس موقع پر مقامی سکھوں کے علاوہ اردگرد کے دیہات سے بھی سکھوں کے منظّم جتھے شریک تاخت و تاراج ہوئے۔ غیر منظّم مسلمانون کے لیے یہ ایک اچانک حادثہ تھا جس کا خمیازہ انہوں نے چوک پراگ داس میں بھگتا۔ بعد کے حملوں میں مسلمانوں نے مدافعت میں جانیں لڑا دیں اور ثابت کر دیا کہ انہیں دبانا اتنا آسان نہیں۔

امرتسر میں اس منظّم پیمانے پر قتل و غارت گری کے بعد اکا دکا وارداتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جس نے ایک مقابلے کی صورت اختیار کر لی۔ اس مقابلے میں زیادہ تر نقصان سکھوں کا ہو رہا تھا، خصوصاً ان کے جو گروہ بیرون جات سے آتے انہیں ہال بازار سے گزر کر شہر کے اندر جانا ہوتا تھا اور اگرچہ وہ کرپانوں سے مسلح ہوتے تھے مگر خوفزدہ لرزتے کانپتے وہاں سے گزرتے تھے کیونکہ اطراف میں آبادی زیادہ تر مسلمانوں کی تھی اور کچھ مسلمان جیالے متصل گلیوں میں اپنے شکار کی تلاش میں مستعد ہوتے تھے اور اچانک ان جتھوں پر حملہ آور ہو کر بعض اوقات انہی کی کرپانوں سے دو، تین کا صفایا کر کے آناً فاناً غائب ہو جاتے تھے۔

آتش زنی کے واقعات بھی روزمرہ کا معمول بن گئے تھے جس میں زیادہ نقصان ہندوؤں کا ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کے جو محلے ہندوؤں کے محلوں سے متصل تھے وہاں اکثر رات کو مسلمانوں کے مکانوں پر دستی بم گرائے جاتے تھے۔ جواباً مسلمانوں نے بھی اس کا کچھ توڑ کیا مگر اسلحے کی سپلائی اور وسائل کے معاملے میں ان کی حالت ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں بہت پتلی تھی۔ شہر کی مضافاتی بستیوں مثلاً شریف پورہ، ڈیم گنج وغیرہ میں مسلمان نسبتاً محفوظ تھے اور اندرون شہر کے مخدوش علاقوں سے اکثر مسلمان خاندان وہاں منتقل ہو گئے تھے۔ یہ مختصر صورتحال ہے مارچ کی معرکہ آرائی سے لے کر جولائی کے آخر اور اگست کے شروع تک کی۔ اس عرصے میں میرا قیام زیادہ تر امرتسر میں رہا۔

مارچ 1947ء اس لحاظ سے ایک فیصلہ کن مہینہ تھا کہ اس میں کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ برصغیر کی تقسیم ناگزیر ہے۔ مسئلہ صرف جزئیات طے کرنے کا رہ گیا تھا۔ تقسیم کو ناگزیر دیکھ کر ''ہندو بنیا'' ڈنڈی مارنے کی اپنی مخصوص عادت پر اتر آیا تھا۔ برطانیہ کی لیبر حکومت سے کانگرس کے دیرینہ روابط کا خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کا یہ ایک نادر موقع تھا۔ پہلے تو لارڈ ویول کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے اسے برطرف کرایا گیا اور اس کی جگہ لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن کا تقرر ہند کے آخری گورنر جنرل اور وائسرائے کے طور پر کروایا گیا۔

شاہی خاندان کا یہ فرد پنڈت نہرو کا ذاتی دوست بھی تھا۔ اس نے 22 مارچ کو ہندوستان پہنچ کر اپنے نئے عہدے کا چارج لیا۔ اسے خصوصی اختیارات دے کر ہند بھیجا گیا تھا۔ اس کی آمد سے دس بارہ روز قبل کانگرس کمیٹی نے ملک کی تقسیم کو ناگزیر سمجھتے ہوئے بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کر دیا اور ہندو ذرائع ابلاغ نے اس مطالبے کے حق میں زمین آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیئے اور ساتھ ہی مغربی پنجاب سے اکثر

ہندو خاندان اپنے ساز و سامان سمیت، مشرقی پنجاب کا رخ کرنے لگے۔

ان دنوں میں اپنے کام سے فارغ ہو کر زیادہ تر وقت امرتسر ریلوے اسٹیشن پر گھومنے پھرنے میں گزارتا۔ میں لاہور کی طرف سے آنے والی ان میل اور ایکسپریس ٹرینوں کو دیکھتا جو جالندھر، لدھیانہ، انبالہ وغیرہ سے ہوتی ہوئی دہلی، بمبئی یا کلکتہ کی طرف جاتی تھیں۔ ان ٹرینوں میں ہندو لالاؤں کا مع ساز و سامان غیر معمولی رش ہوتا۔ اس کے مقابلے میں جالندھر کی طرف سے آنے والی ٹرینوں میں معمول کے مسافر ہوتے۔ انخلا کا یہ سلسلہ مارچ کے دوسرے ہفتے ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ جالندھر کی طرف جانیوالی ٹرینوں میں سکھ بہت کم ہوتے تھے۔ زیادہ تر ہندو لالے اپنے اہل و عیال اور قیمتی ساز و سامان کے ساتھ سفر کر رہے ہوتے۔ ہندوؤں کا مغربی پنجاب سے یہ انخلا ظاہر کرتا تھا کہ وہ کسی منصوبے کے تحت پنجاب کی تقسیم چاہتے ہیں۔ سکھ اس منصوبے میں شریک نہیں تھے۔ شاید ان کے پیش نظر کوئی اور منصوبہ ہو جس کا اظہار ماسٹر تارا سنگھ 3 مارچ کو پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں میں اپنی ننگی کرپان لہرا کر کر چکے تھے۔

پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے مطالبے پر دوسرے مسلم رہنماؤں کا ردعمل تو ابھی سامنے نہیں آیا تھا لیکن پنجاب کے ایک مسلمان لیڈر ملک فیروز خان نون نے جو 58-1957ء میں پاکستان کے وزیر اعظم بنے، دہلی سے بیان دیتے ہوئے یہ عجیب و غریب اعلان کیا کہ ”اگر پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی گئی تو ہم ہلاکو اور چنگیزی کی روایات تازہ کر دیں گے؟“ چیفس کالج کے فارغ التحصیل اس انگریز پرست لیڈر کو شاید یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ چنگیز اور ہلاکو ہماری تاریخ کے ہیرو نہیں بلکہ ولن ہیں۔ مگر جن لوگوں نے ہلاکو اور چنگیز کی روایت کو دہرانا تھا وہ پوری طرح تیار تھے۔ اور جب اگست، ستمبر میں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا تو انگریزی چتر کے سائے تلے پلا ہوا ہمارا یہ جاگیردار لیڈر کسی سرد خانے میں محو استراحت تھا، بقول اکبر۔

رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ!

مارچ کے دوسرے ہفتے میں رفتہ رفتہ امرتسر میں کرفیو آرڈر کی پابندی کم ہوتی گئی اور اس کا نفاذ رات کے اوقات میں ہونے لگا۔ ان دنوں میرا معمول یہ تھا کہ میں بٹالہ سے صبح کی ٹرین میں سوار ہو کر دس بجے امرتسر پہنچتا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں اپنا اکاؤنٹس کا کام ختم کر کے باقی وقت زیادہ تر اسٹیشن کے مختلف پلیٹ فارموں پر گھوم پھر کر ٹرینوں کی آمد و رفت اور مسافروں کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتا۔ کبھی کبھی شہر میں گھومنے کے لیے چلا جاتا اور شام کی ٹرین سے واپس بٹالہ پہنچ کر اپنے دوستوں سے ملتا۔ مسلم نیشنل گارڈ کے مختلف مرکزوں میں بھی التزام سے جاتا۔ میرے رفیق رؤف انور میرے ساتھ ہوتے۔

مارچ کے آخری ایام میں ہمیں ایک قابل اعتماد ذریعے سے معلوم ہوا کہ سکھ اپنے منظم جتھوں کو حرکت میں لانے کے لیے کچھ وقت انتظار کریں گے۔ کٹائی کا موسم سر پر آ گیا تھا اور سکھ کاشت کار بیساکھی کا تہوار منانے کے بعد کٹائی شروع کرتے ہیں، چنانچہ سکھ رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ ان ایام میں ہل چل نہ کی جائے، البتہ اناج سنبھال لینے کے بعد موقع کی مناسبت سے یلغار کا آغاز ہو۔ اس فیصلے کے بارے میں گفتگو لاہور سے دہلی جاتی ہوئی ایک سرکاری موٹر کار میں دو تین اونچے سکھ سرداروں کے مابین ہو رہی تھی جن میں ایک غالباً وزیر دفاع تھا۔ اتفاق سے گاڑی کا باوردی شوفر

مسلمان تھا اور اس کا تعلق بٹالہ سے تھا جس نے چند روز بعد گھر آنے پر یہ خبر ہم تک پہنچائی۔ قرائن اس خبر کی تصدیق کرتے تھے۔

ہم نے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ اس گھناؤنی سازش کی اطلاع فوری طور پر صوبائی مسلم لیگ کے ذمے دار رہنماؤں تک پہنچائی جائے تاکہ متوقع خطرے کا سامنا کرنے کے لیے بروقت تیاری کی جا سکے‘ چنانچہ اگلے روز ڈاکٹر فقیر محمد نے ایک موٹر کار کا بندوبست کیا اور ڈاکٹر صاحب‘ رؤف انور اور میں‘ ہم تینوں لاہور روانہ ہوئے (ڈاکٹر فقیر محمد قیام پاکستان کے بعد لائلپور (حال فیصل آباد) میں ہیلتھ آفیسر رہے۔)

جب ہم امرتسر کی محصول چونگی پر پہنچے تو ہماری گاڑی چیکنگ کے لیے روک لی گئی۔ ایک مسلح فوجی دستہ اپنے انگریز کمانڈر کے ہمراہ یہاں مامور تھا کہ کوئی شخص اسلحہ لے کر امرتسر کی حدود میں داخل نہ ہو۔ ہم باہر نکلے تو موریس منی کار کی ڈکی‘ ڈیش بورڈ اور دوسرے حصوں کی جانچ پڑتال کی گئی۔ لیکن وہاں کیا رکھا تھا‘ گاڑی سے فارغ ہو کر فوجی جوانوں نے ہماری ذاتی تلاشی لینی شروع کر دی۔ ہمارے پاس کوئی پستول وغیرہ نہیں تھا‘ البتہ میرے کوٹ یا شاید پتلون کی جیب میں ایک چھوٹا سا خوبصورت شکاری چاقو تھا جو میرے ایک وزیر آبادی دوست رحمت اللہ نے بطور تحفہ دیا تھا۔ یہ کوئی ایسا ہتھیار بھی نہیں تھا جو کسی کو ہلاک کر سکے مگر اسے دیکھ کر تلاشی پر مامور فوجی جوان کی (جو ایک مسلمان سپاہی تھا) باچھیں کھل گئیں اور وہ خوشی خوشی اسے اپنی کارکردگی کی داد وصول کرنے کے لیے اپنے افسر کے پاس لے گیا۔ افسر نے یہ چاقو مال غنیمت میں شامل کر لیا۔ عین اس وقت سامنے سے دو سکھ نوجوان گزرے جن کے کمر بندوں کے ساتھ لمبی لمبی کرپانیں لٹک رہی تھیں اور وہ قبضوں پر ہاتھ رکھے بے خوف گزر گئے۔ ان مسلح سکھ نوجوانوں کو کسی نے روکا نہ ٹوکا‘ کیونکہ یہ ان کا ”مذہبی حق“ تھا۔ انگریزی عدل وانصاف کا یہ جیتا جاگتا تضاد اس وقت ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔

بارہ ایک بجے کے درمیان ہم لاہور پہنچ گئے۔ پہلے انارکلی میں دہلی مسلم ہوٹل پہنچے تاکہ دوپہر کا کھانا کھا سکیں۔ انارکلی بازار میں مسلمانوں کی گنی چنی دکانوں میں سے ایک یہ ہوٹل بھی تھا جس کا کھانا اچھا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں اس کا ڈائننگ ہال بازار سے متصل تھا جہاں اب ایک بنک کی شاخ کام کر رہی ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم رائل پارک میں صوبائی مسلم لیگ کے دفتر پہنچے۔ دفتر کھلا تھا مگر وہاں کوئی ذمہ دار رہنما موجود نہیں تھا۔ مسلم نیشنل گارڈز کے صوبائی ناظم سید امیر حسین شاہ بھی لاہور سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ اس زمانے میں میاں افتخار الدین سے مل کر پروگریسو پیپرز لمیٹڈ قائم کر چکے تھے جس کا دفتر صوبائی مسلم لیگ کے دفتر کے نیچے تھا۔ یہاں سے نکل کر ہم نے ڈیوس روڈ کا رخ کیا اور دس پندرہ منٹ میں ممدوٹ ولا جا پہنچے جو اس وقت سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔

ممدوٹ ولا کے وسیع لان میں شامیانے لگے ہوئے تھے اور یہاں خاصی گہما گہمی دیکھنے میں آئی۔ اکثر مسلم لیگی لیڈر آ جا رہے تھے۔ نواب افتخار حسین آف ممدوٹ (جو نوابی کا خطاب واپس کرنے کے بعد اب خان افتخار حسین آف ممدوٹ کہلاتے تھے) اپنے حجرہ خاص میں لوگوں سے مل رہے تھے۔ ہم نے بھی اطلاع بھجوائی۔ خاصی دیر انتظار کیا۔ آخر خان صاحب سہ پہر کے وقت حجرے سے باہر نکلے اور لان میں رونق افروز ہوئے۔ وہیں شامیانے کے نیچے ہماری ان سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے حاصل کردہ معلومات ان کے گوش گزار کیں۔ خان صاحب پان چبا رہے تھے اور بظاہر ہماری باتیں سن رہے تھے مگر ان کا ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ ان کا چہرہ کسی تفکر اور ردعمل سے خالی نظر آ رہا تھا۔ بہرحال انہوں نے ہم پر یہی ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ ساری صورتحال سے باخبر ہیں اور فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم نے اپنی تیاری کا تذکرہ کیا اور انہیں اسلحے کی ضرورت کا

احساس دلایا۔ خان صاحب نے فرمایا کہ اس کا بھی انتظام ہو جائے گا مگر ایسی خالی خولی باتوں سے ہماری کیا تسلی ہو سکتی تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ یہ باتیں ان ناتجربہ کار لیڈروں کی طفل تسلیوں سے زیادہ نہیں جن کی سیاست کا محور ڈرائنگ روم سے آگے نہیں ہوتا۔ چند روز کی جیل یاترا سے ان کے مزاج اور اذہان بدل نہیں جاتے۔

صوبائی مسلم لیگ کے نوجوان جاگیردار قیادت وزارت سازی سے مایوسی کے بعد کسی اور خوش آئند وقت کی انتظار میں تھی۔ جب قلمدان وزارت ان کے سامنے اور دستار فضیلت ان کے سر پر ہوگی۔ یہ وقت کب اور کیسے آئے گا؟ یہ انہیں بھی معلوم نہیں تھا۔ پھر بھی ان نوجوانوں کے جذبہ ایثار کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آخر یہ لوگ انہی نوابوں اور جاگیرداروں کے سپوت تھے جنہوں نے اس خطے میں انگریزی راج سنگھاسن کو اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا اور انگریزی استعمار کے چتر کے سائے تلے میاں فضل حسین کی تخلیق کردہ یونی نسٹ پارٹی کے دست و بازو بھی یہی جاگیردار بنے تھے۔ اب انہی جاگیرداروں کی اولاد مسلم لیگ کا پرچم تھامے تحریک پاکستان کی انقلابی جدوجہد میں اپنی آسائش و عافیت کو نج چکی تھی۔ آسائس پسند طبقہ جدوجہد آزادی کے عوامی ریلے کا ساتھ دینے پر مجبور تھا لیکن اس سے کسی کڑی آزمائش کے موقع پر انقلابی رہنمائی کی توقع عبث تھی۔

پنجاب کے مسلم عوام اور ایثار پیشہ سیاسی کارکن اور رضا کار سپاہی اپنے اپنے طور پر جہاں بھی تھے، طوفان کی آمد سے قبل حتی المقدور مقابلے کی تیاری کر رہے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ قیادت کی بالائی سطح پر آنے والے طوفان کا احساس و ادراک پوری طرح نہیں کیا جا رہا تھا اور اسے معمولی فسادات کی صورت میں دیکھا جا رہا تھا، جبکہ پنجاب میں خانہ جنگی کا مکمل ساز و سامان اکٹھا ہو رہا تھا اور صوبے کی تقسیم کے مطالبے نے، جس کی پشت پناہی برطانوی سامراج کی طرف سے ہو رہی تھی، خانہ جنگی کے خطرے کو حقیقی صورت دے دی تھی۔ فی الحال محاذ جنگ امرتسر میں تھا جہاں مسلمانوں کے جیالے اور سرفروش نوجوان بے سروسامانی کے عالم میں بھی حیرت انگیز کارنامے سرانجام دے کر دشمن پر ہیبت طاری کیے ہوئے تھے۔

امرتسر سے چوبیس میل پرے بٹالہ بظاہر پرسکون تھا لیکن یہاں بھی کھچاؤ موجود تھا اور کوئی چنگاری وقت بھی خرمن امن کو جلا کر خاکستر بنا سکتی تھی۔ بہرحال ہم اپنے طور پر کچھ دفاعی سامان فراہم کر رہے تھے جو زیادہ تر تلواروں، برچھیوں، کلہاڑیوں وغیرہ کی شکل میں تھا۔ آتشیں اسلحے میں سوائے کچھ بندوقوں اور چند پستولوں کے (وہ بھی لائنس یافتہ) ہماری پہنچ میں اور کچھ نہیں تھا۔ اس بے سروسامانی میں ہمیں ان مسلح جتھوں کا، جن کے ساتھ ریاستی سپاہ بھی شامل ہوتی، مقابلہ کرنا تھا۔ اور یہ جتھے اپنے سرپرستوں کے منصوبے کے مطابق جون یا جولائی تک میدان عمل میں نکلنے والے تھے۔

اپریل کے مہینے میں میرا معمول یہ ہو گیا کہ ہفتے میں دو تین روز امرتسر میں قیام کرتا اور تین چار دن کے لیے بٹالہ چلا جاتا اور وہاں سے صبح دس بجے امرتسر ڈیوٹی پر آتا اور سہ پہر تک واپس بٹالہ پہنچ جاتا اور رات وہیں گزارتا۔ اس طرح اپنے ساتھیوں سے ملنے اور حالات کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں کافی وقت مل جاتا۔ امرتسر میں میرا قیام شریف پورہ میں اپنے بڑے بھائی کے ہاں ہوتا جو سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ شریف پورہ کے دفاعی استحکام میں میرے بھائی میاں محمد طفیل خاصا سرگرم حصہ لے رہے تھے اور وہاں قیام پذیر پولیس ملازمین کے ساتھ مل کر نوجوانوں کو تربیت دینے کے علاوہ دفاعی مورچوں میں بھی فرائض انجام دیتے تھے۔

شریف پورہ کے ساتھ ساتھ جالندھر کو جانے والی شاہراہ اعظم گزرتی تھی۔ آگے کھلا میدان تھا جس کے دوسرے کنارے پر شہر کی سرکلر

روڈ تھی اور اسی میدان میں مہان سنگھ دروازے کے پاس پھولا سنگھ کا برج تھا جو اکالی سکھوں کا قلعہ تھا۔ اس مورچے سے آمنے سامنے کی فائرنگ بھی ہوتی رہتی تھی۔ جالندھر کی طرف جانے والی ریلوے لائن کے ساتھ شریف پورہ کے بعد تحصیل پورہ مسلمانوں کی آبادی تھا جس سے آگے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پہلا ریلوے سٹیشن جنڈیالہ گورو آتا تھا جو سکھوں کا گڑھ تھا۔ دوسری ریلوے لائن جو چالیس کنوؤں کے پاس جا کر پٹھانکوٹ کی طرف مڑ جاتی تھی اس پر اگلا ریلوے جنکشن ویرکا تھا جس سے متصل سکھوں کا گوردوارہ تھا اور وہاں سکھوں کے جتھے موجود رہتے تھے۔ یہ مقام شریف پورہ سے تقریباً تین میل دور تھا۔ اس طرح شریف پورہ اور تحصیل پورہ کی مسلم آبادیاں تین اطراف سے سکھوں کے نرغے میں تھیں اور چوتھی طرف ریلوے لائن تھی جس سے آگے باغات تھے۔ فوری طور پر تو یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا مگر ڈیڑھ دو ماہ بعد جنڈیالہ گورو اور ویرکا کی طرف سے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دشمن کی یلغار کا امکان تھا' چنانچہ شاہراہ اعظم کے علاوہ اس سمت پر حفاظت انتظامات پر خصوصی توجہ کی گئی تھی۔

3 جون کے اعلان کے روز میں امرتسر میں تھا۔ اس کے مطابق پنجاب کی تقسیم عمل میں آنی تھی مشرقی اور مغربی پنجاب کے اضلاع مسلم اور غیر مسلم آبادی کے لحاظ سے دونوں صوبوں میں تقسیم کیے جانے تھے۔ امرتسر مشرقی پنجاب میں اور گورداسپور مغربی پنجاب میں شامل کیے جانے تھے اور ساتھ ہی قطعی تقسیم کے لیے حد بندی کمیشن کے تقرر کا فیصلہ ہوا تھا۔ یہ اعلان خاصا تشویش انگیز تھا۔ سرحدوں کا تعین کس اصول کی بنا پر ہوگا اور آبادیوں کے تبادلے کی کیا صورت ہوگی؟ یہ امور مبہم رکھے گئے تھے۔

(ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ اردو ڈائجسٹ دسمبر 1997ء)

گلدستہ اولیاء

اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات و واقعات پر مشتمل ایک گرانقدر تصنیف جو اسلم لودھی کی عالمانہ عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں، حضرت رابعہ بصریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ، حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ، حضرت شاہ قبول اولیاؒ، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، حضرت سلطان باھوؒ، حضرت حافظ محمد عبدالکریمؒ (موہری شریف)، حضرت خواجہ صوفی نواب الدین (موہری شریف)، حضرت الحاج محمد معصومؒ (موہری شریف)، حضرت شاہ کمالؒ بخاری، حضرت مخدوم حسامؒ الدین ملتانی، حضرت حافظ محمد اسحاقؒ قادری نقشبندی، حضرت سید سلطان احمد سخی سرور، عاشق رسول حضرت صوفی بندے حسن خان، مبلغ اسلام حضرت مولانا محمد الیاس قادری کے حالات زندگی رقم ہیں۔ گلدستہ اولیاء کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **تحقیق و تالیف** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

دلی کی بپتا

1947ء کے پرآشوب دور میں مسلمانوں پر ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں جو بیتی، وہ تاریخ کا ایک المناک اور خونیں باب ہے۔ شاہد احمد دہلوی مرحوم نے اس خونیں باب کو ''دلی بپتا'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ نقادانِ فن کا فیصلہ ہے کہ فسادات 1947ء پر اس سے بہتر رپورتاژ کسی نے نہیں لکھا۔ ان صفحات میں اس رپورتاژ کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔

اگست 1947ء میں کٹی ہوئی ریلیں دلی آنے لگیں۔ مسلمان مسافر چن چن کر قتل کیے جانے لگے۔ 12 اگست سے لاہور کی حالت بگڑی اور ایسی بگڑی کہ تین دن میں لاہور میں سکھ اور ہندو نام کو نہیں رہا۔ نہ امرتسر مسلمانوں سے خالی کرایا جاتا، نہ لاہور پر آفت آتی۔ لاہور کے بعد سارے مشرقی پنجاب میں قتل و غارتگری وبا کی طرح پھیل گئی۔ اس کا اثر مغربی پنجاب پر پڑنا ضروری تھا۔ وہاں بھی کشت و خون شروع ہو گیا۔ ریلوں اور ہوائی جہازوں سے لاکھوں آدمی ادھر کے ادھر اور ادھر کے ادھر آنے لگے۔ دلی میں شرنارتھیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ دم گھٹنے لگا۔ خنجر زنی کے واقعات شروع ہو گئے اور ریلوں میں خون ہی خون دکھائی دینے لگا۔ مہینوں سے دفعہ 144 کا نفاذ ہو گیا تھا۔ اب سخت سے سخت کرفیو لگائے جانے لگے۔ بیس بیس گھنٹے کے کرفیو تو لگا ہی کرتے تھے اب چھیاسی چھیاسی گھنٹے کے کرفیو لگنے لگے۔ ہر محلے پر مضبوط دروازے محلے والوں نے چندہ جمع کر کے چڑھوا لیے تھے۔ راتوں کو محلے والے باری باری پہرہ دیتے۔ شہر پر عجیب بدرونقی چھا گئی اور جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر لگنے لگے۔ جب کرفیو کھلتا تو لوگ بدحواس ہو کر ضروری سامان خریدنے بازاروں میں نکلتے اور دکانوں پر وہ ریل پیل ہوتی کہ کمزور آدمی تو دکاندار تک پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ حد یہ کہ راشن ملنا بھی دشوار ہو گیا۔ دو ہفتے میں ایک ہفتے کا راشن بمشکل ملا وہ بھی اس خوبی کا کہ آٹا نہیں ہے گیہوں لو۔ آٹا پیسنے کی چکیاں اول تو کھلتی نہیں اور جو کبھی کوئی کھل گئی، تو اس پر ایک میل لمبی قطار کھڑی ہوتی۔ کرفیو صرف چار گھنٹوں کے لیے کھلتا اور کرفیو کے بعد کوئی باہر ٹھہرا، تو اسے گولی مار دینے کا حکم۔ ناچار لوگوں نے چکیاں خود پیسیں۔ جنہیں چکی میسر نہ آتی، انہوں نے سل بٹے پر گیہوں پیسا اور پھر اُبال اُبال کر کھانے لگے۔

5 ستمبر جمعے کے دن میں اپنے دفتر پہنچا۔ ضروری خطوں کے جواب لکھ کر محلے کی مسجد میں دو بجے نماز پڑھنے گیا۔ دفتر واپس آیا اور اپنے کمرے میں پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک زور کا دھماکا سنائی دیا۔ سامنے فتح پوری مسجد کی طرف دیکھا، تو سینکڑوں کبوتر اڑتے نظر آئے۔ اس کے بعد ایک دل ہلا دینے والا شور برپا ہوا۔ غور سے سننے پر معلوم ہوا کہ اللہ اکبر کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ کسی نے فتح پوری کی مسجد میں بم پھینکا ہے۔ سارے بازار چشم زدن میں بند ہو گئے اور خوف کے مارے سب اپنے اپنے گھروں کو بھاگنے لگے۔ ہمارے گھر سب سے زیادہ خطرے میں تھے کہ محلّہ سارا ہندوؤں کا تھا، مگر انہوں نے کچھ نہیں کیا نہ کہا: تاہم جتنے بھی آس پاس کے مسلمان تھے سب مع بال بچوں کے ہمارے زنانہ گھر میں آ گئے تھے۔

دروازہ بند کر لیا گیا۔ میں چھت پر سے ہو کر اندر گیا' تو عجیب منظر دیکھا' پچاس ساٹھ عورتیں دالانوں میں بھری ہوئی ہیں سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ صحن اور چھوٹے دالان میں مرد کھڑے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں چھری ہے' تو کسی کے ہاتھ میں لکڑی۔ ایک صاحب کے ہاتھ میں دونالی بندوق کوئی پتھر پر چھری رگڑ رہا ہے اور کوئی سیخ کی نوک تیز کر رہا ہے۔ ہر شخص تیار کھڑا ہے کہ اب حملہ ہوا۔ تہہ خانے میں سے چند بڑی بوڑھیاں جھولیوں میں اینٹیں بھر بھر کر لا رہی ہیں اور خالی اور ٹوٹی ہوئی بوتلیں جمع کی جا رہی ہیں۔ کوئی مٹی کے تیل کا کنستر سنبھالے ہوئے ہے اور کوئی مرچیں ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ میں نے کوٹھے پر سے یہ سارا منظر دیکھا اور پھر چاروں طرف ہندوؤں کے مکانوں پر نظر ڈالی۔ سب اپنے اپنے گھروں میں خاموش کھڑے تھے اور تیور حملہ کرنے کے نہیں تھے۔ گلی میں سے مسلمان بھاگے چلے جا رہے تھے۔ اسی روز ہم بھی وہاں سے نکلے اور بچتے بچاتے مسلمانوں کے محلے میں خیریت سے پہنچ گئے۔

مسلمانوں میں اس قدر سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی کہ ذرا سے کھٹکے پر سب کے کان کھڑے ہو جاتے۔ ہمارا محلّہ مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی کے قلب میں تھا اور خود ہمارے محلے میں ساڑھے تین ہزار آدمی بستے تھے جن میں ایک بھی ہندو نہیں تھا۔ محلے میں داخل ہونے کے صرف دو راستے تھے جن پر ہم نے چندہ جمع کر کے لوہے کے دروازے چڑھوا دیے تھے۔ یہاں بندوق والوں کو مامور کیا۔ جدھر جدھر سے حملے کا اندیشہ تھا' ادھر ادھر دس بیس بیس کے دستے بٹھا دیے اور ایک ایک بندوق والا۔ دور دور تک کے مسلمانوں نے صلاح کر کے اوپر کوٹھوں پر لال اور سبز بتیاں بجلی کی لگائی تھیں کہ اگر حملے کا اندیشہ ہو' تو اسی سمت کی لال بتیاں روشن کر دیں اور سب تیار ہو جائیں۔ اگر خطرہ گزر جائے تو سبز بتیاں روشن ہو جائیں۔ یہ انتظام بہت عمدگی سے کیا گیا تھا' لیکن خوف اور افواہوں کی وجہ سے بتیوں کا استعمال بڑا غلط ہوتا رہا اور اس سے خواہ مخواہ ہراس بڑھتا رہا۔

5 ستمبر کے بعد دلی میں شاید ہی کوئی ایسا خوش نصیب ہوگا جو آرام کی نیند سویا۔ اول تو ہر گھر کی چھت پر دو دو چار چار آدمی جاگتے رہتے' پھر کوئی بتی سرخ ہو جاتی اور ہوشیار ہوشیار کی آوازیں آنے لگتیں۔ مرد گھروں سے ہتھیار لے کر نکل آتے اور مورچوں کی طرف دوڑتے۔ پھر تھوڑی دیر بعد لال بتیاں بجھنی شروع ہو جاتیں اور سبز روشن ہونے لگتیں۔ رات بھر یہی ہوتا رہتا۔ ان ہولوں نے سب کا لہو پی لیا۔ عورتیں اور بچے رونا شروع کر دیتے۔ یہ بے چینی دیکھی نہ جاتی تھی اور ہم سب سوچتے تھے کہ ایک دفعہ جی کھول کر مقابلہ ہو جائے' مگر دشمن تو اعصاب کی لڑائی لڑ رہا تھا۔

چھ ستمبر کو خبر آئی کہ سکھوں اور ہندوؤں نے قرول باغ میں مسلمانوں کے جتنے گھر تھے سب لوٹ لیے اور بعض گھروں میں آگ لگا دی۔ کئی دن پہلے سے مسلمانوں کے گھروں پر نشان لگائے جا رہے تھے۔ جامعہ ملیہ کی لائبریری اور سکول کی عمارت سب جل گئی۔ ایک سکول میں میٹرک کا امتحان ہو رہا تھا جس میں پچاس مسلمان لڑکے بھی شریک تھے۔ امتحان شروع ہونے سے پہلے سپروائزر نے سب کی حاضری لے کر مسلمان لڑکوں کو ایک علیحدہ کمرے میں بٹھا دیا اور جب انہوں نے پرچہ شروع کر دیا ان بچوں پر سکھ تلواریں لے کر ٹوٹ پڑے۔ دو بچے کسی طرح جان بچا کر اپنے گھر پہنچ سکے' باقی سب شہید کر دیے گئے۔

قرول باغ کی تباہی کے بعد خبر آئی کہ لودھی روڈ کالونی میں جتنے مسلمان باقی تھے سب شہید کر دیے گئے۔ دلی پولیس نے مسلمان ملازموں سے ہتھیار لے لیے گئے تھے اور وہ نوکریاں چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ مسلمانوں کے ہتھیار ضبط کیے جا رہے تھے اور ہندوؤں کو لائسنس

دیے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمان سب کے سب تقریباً نہتے ہو گئے اور ہندو سارے مسلح سکھوں کی کرپانیں بڑھ کر تلواریں بن گئی تھیں اور مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود کوئی باز پرس نہیں ہوئی۔

سنہری منڈی مالدار ارائیوں کی بستی تھی۔ یہاں ایک دم سے بڑا حملہ کیا گیا۔ حملہ آوروں کی خاکی وردیاں تھیں اور ان کے پاس بندوقیں تھیں، لیکن منڈی والوں نے ان کا ایسا گرما گرم خیر مقدم کیا کہ جلد ٹھنڈے ہو گئے۔ روایت یہ ہے کہ حملہ آور یہاں ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے اور ایک گھر پر بھی قبضہ نہ کر سکے۔ مسلمانوں کے پاس اسلحہ کافی تھا اور انہوں نے باقاعدہ مورچے بنا لیے تھے اور فوجی تنظیم کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے۔ سبزی منڈی میں بعض بہت اچھے لوہے کا کام بنانے والے بھی تھے اور انہوں نے اپنی ہنرمندی سے برین گنیں اور سٹین گنیں بنا لی تھیں، لیکن قضائے مبرم کی طرح حکومت کی فوج تیسرے دن نمودار ہو گئی اور منڈی والے ان سے بھی مقابلہ کرتے رہے، مگر تھوڑی ہی دیر میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور ان کے قدم اکھڑ گئے۔ ایک ہنگامہ ستخیز برپا ہو گیا۔ بھاگتے ہوئے آدمی اس طرح بھن رہے تھے جیسے بھاڑ میں مٹر سینکڑوں مر کھپ گئے لکھ پتی کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ جن عورتوں نے گھر کی دہلیز سے باہر کبھی قدم نہ نکالا تھا، دربدر خاک بسر ماری ماری پھر رہی تھیں۔ مال، متاع، عزت و آبرو سب گئی۔ سبزی منڈی میں مسلمانوں کا ایک بچہ تک باقی نہ رہا۔

سبزی منڈی کے ختم ہوتے ہی پہاڑ گنج کی باری آئی۔ پہاڑ گنج کے مسلمانوں نے حملہ آوروں کو اس طرح مارا کہ کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ حملہ آور بندوقوں سے مسلح اور خاکی وردی پہنے ہوئے تھے۔ دو دن تک یہی کیفیت رہی۔ تیسرے دن معلوم ہوا کہ حکومت کی ملٹری جنگ کے جدید ترین ہتھیاروں سے لیس، مارتی چلی آ رہی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں پہاڑ گنج میں خون کی ندیاں بہنے لگیں اور مسلمان ایک گھر سے دوسرے گھر میں دیواریں توڑ توڑ کر بھاگنے لگے، لیکن فوجی شکاری کتوں کی طرح ان کے پیچھے لگے رہے۔ گولیاں گھروں کے اندر اور باہر اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔ فوج کے ساتھ لٹیرے بھی بندوقیں اور تلواریں لیے گھروں میں گھس رہے تھے۔ مال کے ساتھ آبرو بھی لٹ رہی تھی اور آبرو بچانے کی خاطر مسلمان اپنا روپیہ اور زیور پھینک پھینک کر بھاگ رہے تھے کہ یہ لوٹنے میں لگیں، تو بچ کر نکل جائیں۔ عورتوں کی تلاشی لینے میں انہیں ننگا کر کے چھوڑا گیا۔ کوئی خاندان ایسا نہیں بچا جس کے پانچ دس آدمی مارے نہ گئے ہوں یا پورے پورے خاندان ہی ختم ہوئے۔ ہمارے محلے میں ایک عورت پہنچی جس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے اور کئی زخم کمر اور پیٹ پر تھے۔ یہ غریب اپنے گود کے بچے کو لے کر پہاڑ گنج کے مکانوں میں چھپتی پھری لیکن ایک سکھ نے اسے دیکھ لیا اور سمجھا کہ اس کے پاس کوئی قیمتی چیز ہے اس نے تلوار سے وار کیا تو بچے کو بچانے کے لیے عورت نے وار کو ایک ہاتھ پر روکا، ہاتھ کٹ گیا۔ دوسرے وار کو دوسرے ہاتھ پر روکا، وہ بھی کٹ گیا۔ اس کے بعد وہ بیہوش ہو گئی اور اس کا بچہ روتا رہا اور لاشوں میں اپنی ماں کو ٹٹولتا رہا۔ یہاں تک کہ کئی گھنٹے کے بعد بچے کے رونے کی آواز سن کر کسی بھلے مانس نے ادھر کا رخ کیا اور دونوں کو بہزار وقت شہر پہنچایا۔ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو پہاڑ گنج کے مسلمانوں پر نہ توڑا گیا ہو اور کوئی ذلت ایسی نہ تھی جو ان پر پوری نہ کی گئی ہو۔

اس عرصے میں قطب صاحب، روشن چراغ دہلی، خدا نما، رسول نما، امام باڑہ اور دوسری درگاہیں اور بستیاں اجاڑی جا چکی تھیں۔ مزارات منہدم اور قبریں برابر کر دی گئی تھیں۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ یوں بچی کہ آس پاس کے سارے مسلمان سمٹ سمٹا کر اس میں جمع ہو گئے تھے

اوراس وجہ سے بھی کہ ایک لاکھ مسلمان پرانے قلعے میں اوراس سے کچھ کم ہمایوں کے مقبرے اور مور سرائے میں پڑے ہوئے تھے۔ جامع مسجد میں پچیس ہزار سے کم آدمی نہیں تھے۔

مسلمان اپنے گھروں سے نکل کر صرف جامع مسجد تک سودا سلف خریدنے آسکتے تھے۔ آگے گئے اور لوٹ کر نہیں آئے۔ خنجر زنی شباب پر تھی اور سڑک پر بیسیوں لاشیں پڑی رہتی تھیں۔ ڈاڑھی والا مسلمان تو بچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے ڈاڑھیاں منڈنی شروع ہوگئی تھیں اور لباس بھی ایسا ہوگیا تھا کہ مسلمان نہ معلوم ہوں۔ مسلمانوں کی پہچان کے لیے اب دشمنوں نے ایک نئی ترکیب نکالی۔ سڑکوں پر قرآن شریف کے اوراق پھیلا دیے۔ جوان سے بچ کر نکلتا' اس کے چھرا گھونپ دیا جاتا۔ سب سے زیادہ خنجر زنی اسٹیشن پر ہوئی۔ اول تو ریلوں ہی میں مسلمانوں کو قتل کر دیا جاتا۔ دوسرے اگر کوئی بچ کر دلی پہنچ جاتا تو اسٹیشن پر اس کا بچنا ناممکن تھا۔ پلیٹ فارم پر شرنارتھی ہزاروں کی تعداد میں آباد تھے۔ ادھر کوئی گاڑی آ کر رکی اور چھانٹ چھانٹ کر مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ڈال دیا۔ یہ سلسلہ دنوں نہیں ہفتوں چلا اور پردیسی مسلمان جو اس زمانے میں دلی آیا' ایک بھی زندہ نہیں بچا۔

9 ستمبر کو گاندھی جی دلی پہنچ گئے۔ ان کی پرارتھنا ریڈیو پر روزانہ نشر ہونے لگی۔ گاندھی جی کے آنے کے بعد شہر میں کوئی بڑا ہنگامہ نہیں ہوا' لیکن چھرے بازی ہوتی رہی اور مسلمانوں کے مکان اور دکانیں لٹتی رہیں۔ گاندھی جی ہر پرارتھنا میں یہی کہتے رہے:

''مسلمانوں نے مغربی پنجاب میں بڑے بڑے ظلم کیے ہیں' لیکن ہندوؤں اور سکھوں کو اس کا بدلہ نہیں لینا چاہیے۔ مسلمانوں نے تمہاری عورتیں چھین لی ہیں' مگر تم تو بہادر ہو۔ ان کی عورتیں تم مت چھینو۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے سارے ہتھیار حکومت کو دے دیں اور وفادار بن کر رہیں۔''

بے چارے مسلمانوں کے پاس دھرا ہی کیا تھا جو حکومت کے حوالے کرتے؟ رہی وفاداری' سو آج تک معلوم نہ ہوسکا کہ انہوں نے کب اور کہاں غداری کی۔

12 ستمبر کو اعلان کیا گیا کہ جامع مسجد خالی کر دی جائے اور مہاجرین پرانے قلعے میں چلے جائیں۔ عبادت گاہوں میں رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ پرانے قلعے میں راشن بھی ملے گا' چنانچہ جامع مسجد خالی ہوگئی اور بارش میں بھیگتے بھاگتے یہ مسلمان پرانے قلعے میں پہنچ گئے۔ پرانا قلعہ کیا کھلا' دلی والوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے قلعے کے اندر اس قدر تکلیفیں تھیں کہ اکثر آدمی وہاں سے لوٹ آئے کہ اپنے گھر ہی میں مرجانا اچھا۔ بہرحال ہم بھی قلعے میں پہنچ گئے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ دلی کے بھاڑ سے تو نکلے۔ اب پرانے قلعے کے جہنم کو بھگتا جائے گا۔ پرانا قلعہ حشر کا میدان بنا ہوا تھا۔ جب ہم پہنچے ہیں' تو اس میں اسی ہزار آدمی تھے۔ فصیلوں اور برجیوں میں بھی آدمی بھرے ہوئے تھے۔ قلعہ اتنا بھر گیا کہ ایک اور کیمپ مقبرے میں کھول دیا گیا۔ یہ وہی مقبرہ تھا جہاں دلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے پناہ لی تھی۔ بارش نے سب کو الٹا رکھا تھا۔ روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا سارے قلعے میں صرف ایک نل تھا جس کی دھار بھی پتلی تھی اور اس پر چوبیس گھنٹے دو لمبی لمبی قطاریں لگی رہتیں۔ ایک مردوں کی' ایک عورتوں کی۔ آٹھ آٹھ گھنٹے قطار میں کھڑے ہونے کے بعد ایک بالٹی پانی لینے کا نمبر آتا۔ اس سے زیادہ پانی کوئی نہیں لے سکتا تھا۔ ہر وقت سر پھٹول ہوتی۔ عورتوں میں بھی وہ مار پیٹ ہوتی کہ خونم خون ہو جاتیں۔ قلعے کے دوسرے سرے پر کچھ جھاڑیاں تھیں جن میں رفع حاجت کے لیے قلعے کے اسی ہزار آدمی

جاتے تھے۔ یہ ایک بڑا عبرت کا مقام تھا۔ پیچش کا مرض عام تھا اور ہیضہ بھی پھیل رہا تھا۔ قدم قدم پر نجاست تھی اور اس درجہ مجبوری کی ستر اور پردے کا کسی کو ہوش نہیں رہا۔ دلی کے شریف گھروں کی عورتیں جو بارہ برس کے لڑکے سے بھی پردہ کرتی تھیں، بدحواس پھرتی تھیں اور رات کو کسی وقت انہی غلیظ جھاڑیوں میں جاتیں۔ پہلے تو قلعے کے باہر قبریں بنائی جاتی تھیں، پھر اندر ہی بننے لگیں۔ شاید ہی کسی مردے کو پورا کفن ملا ہو۔ کسی چادر یا دری میں لپیٹا اور قبر میں اتار دیا اور بعض لوگوں کو اس کی بھی توفیق نہ ہوئی اور ان کے مردے بے گورو کفن پڑے رہے۔

18 ستمبر کی رات کو گیارہ بجے معلوم ہوا کہ کل پہلی گاڑی سے ہمیں جانا ہے اور صبح پانچ بجے ٹرک لگ جائیں گے۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ قلعے کے جہنم سے چار ہی دن میں نجات مل گئی۔ رات جاگ کر گزاری۔ پانچ بجے ٹرک آئے۔ سامان دو قلیوں کی مدد سے پہنچایا۔ ایک گھنٹے میں باہر نکلے۔ اسٹیشن کے باہر کئی ہزار آدمی پڑے تھے۔ ہم ٹرکوں میں سے اترتے ہی رہے اور انہوں نے جھٹ پٹ اپنا سامان ریل میں بھر خود بھی پھیل پھیل کر بیٹھ گئے۔ آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد ہم بھی ایک ڈبے میں زبردستی گھسنے میں کامیاب ہوئے۔ لوگ برابر آتے رہے اور اپنا سامان کھڑکیوں میں سے اندر پھینکتے رہے۔ کسی کا مغز پھٹا، کسی کا ہاتھ ٹوٹا، مگر اس وقت تک در آمد کا سلسلہ بند نہیں ہوا جب تک کسی ڈبے میں اتنی جگہ باقی رہی کہ کوئی کہیں کھڑا ہی ہو جائے۔ ہمارا ڈبا 32 مسافروں کے لیے تھا، مگر اس میں سوسوا آدمی تھے۔ گرمی کے مارے دم گھٹا جاتا تھا۔ دس بجے گاڑی یہاں سے چلی اور نئی دلی پر ٹھہری۔ یہاں بے شمار سکھ کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر مسافر سہنے لگے اور بعض نے ڈر کر کھڑکیاں بھی چڑھا لیں۔ پندرہ منٹ بعد گاڑی یہاں سے چھوٹی، تو دلی کے اسٹیشن سے گزرتی ہی چلی گئی۔ اسٹیشن سنسان پڑا تھا اور جا بجا فوجی پہرہ لگا تھا۔ شاہدرہ نہیں ٹھہری، غازی آباد پر رُکی، تو یہاں بھی الو بول رہا تھا۔ یہاں دس منٹ رک کر خوب تیز رفتار سے چلتی رہی۔ میرٹھ پہنچی تو اسٹیشن پر چند آدمی چلتے پھرتے دکھائی دیے۔ ریل گاڑی سے اترنے کا کسی کو حکم نہ تھا۔ پانی تک لینے کی اجازت نہ تھی۔ ظفر نگر ٹھہری، تو دیکھ کر تعجب ہوا کہ نوجوان لڑکے بالٹیاں اٹھائے پھر رہے ہیں اور سب کو پانی پلا رہے ہیں اور چپکے چپکے کہہ رہے ہیں۔ راستے کے لیے پانی بھر لو۔ ان کے بعد ایک اور ٹولی آئی اس نے ساری ریل کو بھنے ہوئے چنے بانٹے۔ ان کا لباس کانگریسیوں جیسا تھا، مگر یہ دراصل مقامی مسلم لیگ کے کارکن تھے۔ سہارنپور کے بعد جب راجپورہ کی گاڑی پہنچی، تو شام ہو رہی تھی، مگر گاڑی یہاں ایسی جمی کہ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پلیٹ فارم اور پل پر سکھ بے چین پھر رہے ریل میں سب گھبرا رہے تھے۔ ریل کھسکی، تو مسافر خانے میں سے بندوق چلنے کی آواز آئی اور پے در پے چھ فائر ہوئے۔ ہمارے ساتھ جو فوجی دستہ تھا اس میں بیشتر سکھ اور ہندو تھے۔ شاید کوئی مسلمان بھی ہو۔ اس کی طرف سے الگ بے اعتباری تھی۔ ریل چلتی رہی۔ ایک فائر ہمارے محافظ دستے نے بھی کیا۔ اگلے سٹیشن پر سکھ کپتان نے اتر کر ہر ڈبے سے دریافت کیا کہ کوئی زخمی تو نہیں ہوا۔ معلوم ہوا کہ برابر کے ڈبے میں ایک بچہ مر گیا ہے اور ایک عورت زخمی ہو گئی ہے۔ مرہم پٹی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ عورت کا خون یونہی بہتا رہا۔

رات ہو گئی۔ ریل میں روشنی نہیں تھی۔ باہر ملگجی چاندنی تھی۔ مسافروں کو مسلسل پریشانیوں نے اس قدر چڑچڑا بنا دیا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر الجھنے لگتے۔ خود غرضی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ مجھ سمیت کسی کو سوائے اپنے آپ کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ گرمی کے مارے سب کا فشار نکلا جا رہا تھا۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا اور سب سے چھوٹا بچہ میری گود میں تھا۔ ریل چلتی اور رکتی رہی۔ سب بیٹھے بیٹھے اونگھتے رہے اور سونے لگے میں بھی

کھڑکی سے سر باہر نکالے اونگھ رہا تھا۔ دو بج رہے تھے اور لدھیانہ آنے والا تھا۔ گاڑی خوب تیز چل رہی تھی کہ ایک دم سے جھٹکا کھا کر رک گئی۔ ساری گاڑی میں شور برپا ہو گیا۔ جھٹکوں سے جامنیں سی کھل گئیں۔ سمجھ میں نہ آیا کیا ہوا۔ کسی نے کہا ٹکر ہو گئی۔ کسی نے کہا بم لگا دیا۔ عورتوں اور بچوں نے رونا شروع کر دیا۔ کسی نے رو رو کر کلمہ اور کسی نے دعائیں پڑھنی شروع کر دیں۔ باہر سے کسی فوجی کی آواز آئی: ''کھڑکیاں بند کر دو۔'' تمام کھڑکیاں چڑھ گئیں اور بعض نے اپنے ٹرنک اور بستر ے ان میں اڑا دیے۔ ہمارے پاس اتنی جگہ بھی نہ تھی کہ پہلو ہی بدل لیں۔ میں اپنی سیٹ پر کھڑا ہو گیا اور بچوں کو پنکھا جھلنے لگا۔ اتنے میں فوجی موٹروں اور جیپوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اب سب کو معلوم ہو گیا کہ ریل پر حملہ ہونے والا ہے۔ مسافروں میں سے کسی کے پاس چھڑی تک نہ تھی۔ بھیڑ بکریوں کی طرح سب بھرے ہوئے تھے اور انہی کی طرح سب کو مرنا تھا۔ عورتیں چیخیں، تو مردان سے زیادہ چیختے کہ خاموش رہو ورنہ سب مارے جائیں گے۔ وہ سہم کر چپکی ہو جاتیں اور پھر اللہ کو یاد کرنے لگتیں، مگر بچے کیسے چپکے ہوں۔ انہیں تو گرمی اور اندھیرے نے الٹا دیا۔ ڈبے کا پانی ختم ہو چکا تھا اور جس کے پاس تھوڑا سا باقی تھا، وہ کاہے کو دیتا۔ بچے پیٹے گئے اور زور سے روئے تو ان کے گلے گھوٹے گئے۔ محمود جب چمکار پچکار سے چپ نہیں ہوا، تو میں نے طیش میں اسے اس زور سے پٹخا کہ وہ دھم ہو کر رہ گیا اور سسکیاں لینے لگا۔ بیوی قلت خون کی مریضہ، اسے غش آ گیا۔ دور سے گولیاں چلنے کی آواز آ رہی تھی اور نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ ہمارے محافظ دستے نے بھی اتر کر گولیاں چلانی شروع کر دی تھیں۔ ہم سب اپنی موت کے منتظر تھے کہ اب گولی لگی یا اب دروازہ اور کھڑکیاں توڑ کر سکھ داخل ہوئے۔ باہر کسی فوجی کے بولنے کی آواز سنائی دی، تو ایک صاحب نے ہمت کر کے پوچھا: ''ہم اتر کر کہیں بھاگ جائیں؟'' فوجی نے کہا۔ ''تم ریل میں بیٹھے رہو، جب تک ہم زندہ ہیں، تم نہیں مر سکتے۔'' اس سے بڑی ڈھارس بندھی، مگر کھڑکی کا تختہ بھلا رائفل کی گولی کو کیسے روک سکتا ہے اور باہر گولیاں برس رہی تھیں۔ خدا جانے باہر اور آگے ریل پر کیا گزر رہی تھی۔ یہاں تو اپنے سامنے موت کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ بے کسی کی موت کیا خبر تھی کہ یوں مارے جائیں گے ورنہ دلی سے ہرگز نہ نکلتے اور اب یہ لڑکی ماری جائے گی اور اس لڑکی کو سکھ کھینچ لے جائیں گے اور ان کے برچھے ہمارے سینے توڑ کر پار ہو جائیں گے۔ یا اللہ، تو اس بے عزتی سے پہلے مجھے موت دے دیجیو۔

ایک گھنٹے تک دونوں طرف سے گولیاں چلتی رہیں اور شور مچتا رہا۔ یہ ایک گھنٹہ قیامت کا دن ہو گیا۔ پھر گولیاں کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئیں اور موٹروں کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی فوجی کی آواز سنائی دی: ''بھاگ گئے حرامزادے۔'' ایک گھنٹے میں ڈبا تپ کر تنور بن گیا تھا اور پسینہ چوٹی سے ایڑی تک بیسویں دفعہ آ چکا تھا، کپڑے ایسے ہو گئے کہ انہیں نچوڑ لو۔ ریل چل دی۔ لدھیانہ آیا اور چلا گیا۔ چار بجے جالندھر پہنچ کر گاڑی کھڑی ہوئی اور کپتان نے پہرہ لگوا کر اعلان کر دیا کہ اب صبح کو چلے گی۔ جو اترنا چاہے، پلیٹ فارم پر اتر سکتا ہے اور پانی لے سکتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے پاؤں جڑ گئے تھے اور اس گھنٹے میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم سب برسوں کے بیمار ہیں اور ہم میں سکت ہی باقی نہیں ہے۔ دروازے تو کیا کھل سکتے تھے کہ چھت تک سامان چنا ہوا تھا، البتہ کھڑکیوں میں سے کود کود کر ہم سب مرد باہر نکلے اور پانی پر ٹوٹ پڑے۔ عورتوں اور بچوں کو پانی دیا اور تاکید کی کہ تھوڑا تھوڑا پئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ طبیعت بگڑ جائے، پھر خود پیا، منہ ہاتھ دھویا اور جب اوسان بحال ہوئے، تو آگے کے ڈبے دیکھنے چلے کہ ان پر کیا گزری۔ راستے میں سکھ کپتان ملا۔ یہ کوئی بھلا آدمی تھا۔ اس نے بتایا کہ لائن پر پتھر ڈال دیے گئے تھے اور انجن ڈرائیور نے ریل کو الٹنے سے

بچالیا۔ ڈرائیور بھی سکھ تھا اور وہ چاہتا تھا کہ انجن نکال کر لے جائے، مگر کپتان نے فوراً آ ایک آدمی دوڑایا کہ انجن جانے نہ پائے۔ ممکن ہے حملہ آوروں سے ڈرائیور کی سازباز ہو۔ بہر حال انجن نہ جاسکا، ورنہ ساری ریل کاٹ کر ڈال دی جاتی۔ حملہ آور ہزاروں کی تعداد میں آئے تھے۔ ان میں گولیاں چلانے والے اور تھے، برچھے مارنے والے اور، اور سامان اٹھانے والے اور بڑے انتظام سے آئے تھے اور بڑی باقاعدگی سے لوٹ مار کر چلے گئے۔ کپتان کا اندازہ تھا کہ حملہ آوروں میں سے پانسو مارے گئے، مگر یہ مبالغہ ہے۔ ہم سے دو ڈبے آگے حملے کا پورا زور رہا اور تین ڈبے بالکل خالی ہو گئے۔ ان میں لاشیں پڑی تھیں اور باہر پلیٹ فارم پر بیسیوں زخمی مرد اور عورتیں پڑی تڑپ رہی تھیں۔ سینکڑوں مسافر لاپتہ تھے۔ بہت سے گھبراہٹ میں اتر کر بھاگ گئے اور پھر واپس نہ آ سکے۔ انہیں بھی مردہ ہی سمجھنا چاہیے۔ وہ کیا بچے ہوں گے۔ زخمیوں کی مرہم پٹی بالکل نہیں ہو سکی۔ وہ یوں ہی تڑپتے، سسکتے لاہور تک لائے گئے۔ جالندھر پر گاڑی دس بجے تک کھڑی رہی۔ عذر یہی تھا کہ لائن صاف نہیں ہے۔ دس بجے جالندھر سے روانہ ہوئے اور مانوالہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی کی رکی رہ گئی۔ معلوم ہوا کہ انجن بارہ گھنٹے سے زیادہ کام کر چکا ہے اور آگے نہیں جا سکتا۔ اب دوسرا انجن منگایا ہے جو اسے آ کر لے جائے گا۔ اتنی اجازت مل گئی کہ جو نیچے اترنا چاہے، اتر آئے۔ پانی پھر ختم تھا۔ صراحی میں جو پانی باقی تھا، وہ چھوٹے بچوں کو بطور دوا کے دیا جا رہا تھا۔ اسٹیشن کے پاس ایک کنواں تھا، لیکن سب کو اندیشہ تھا کہ اس میں زہر نہ ڈال دیا گیا ہو، اس لیے کسی نے اس میں سے پانی لینے کی ہمت نہ کی، مگر جب پیاس نے بہت بے چین کیا، تو سارے جوہڑ میں جو برسات کا پانی بھرا ہوا تھا، اسے چند آدمیوں نے سونگھا، چکھا اور پینے لگے۔ انکی دیکھا دیکھی ساری ریل نے وہی مٹیالا پانی پیا۔

چار گھنٹے بعد ایک چھوٹا انجن آیا اور ریل مریل چال سے روانہ ہوئی۔ امرتسر پر خوب گہما گہمی تھی۔ ہزاروں شرنارتھی پڑے ہوئے تھے اور ان کی ریلیں بھر بھر کے جا رہی تھیں۔ سکھ ہر جگہ تلواریں لیے پھر رہے تھے، لیکن کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ ریل تمام اسٹیشنوں سے خیریت کے ساتھ گزر گئی۔ اٹاری ہندوستان کا آخری سٹیشن بھی آ گیا۔ یہاں حفاظتی دستہ بھی ہمیں اللہ کے سپرد کر کے رخصت ہو گیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد یہاں سے گاڑی روانہ ہوئی، تو جیسے مردوں میں جان پڑ گئی۔ پاکستان زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگنے شروع ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ ہم پاکستان کی سرحد میں داخل ہو چکے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پاکستان کا پہلا سٹیشن جلو آ گیا۔ یہاں سینکڑوں آدمی ریل کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ریل کے رکتے ہی ہر ڈبے پر کئی آدمی آ گئے اور سب کو روٹیاں، دال اور اچار تقسیم کرنے لگے۔ دو دن کے بھوکے ان روٹیوں پر اس طرح گرے جیسے کبھی روٹی دیکھی ہی نہ تھی۔ ایک ایک آدمی دس دس روٹیاں ہو کے میں دبا کر بیٹھ گیا۔ ایک گھنٹے بعد گاڑی روانہ ہوئی اور ساڑھے نو بجے لاہور پہنچ گئی۔ اسٹیشن پر جہاں تک نظر کام کرتی تھی، آدمی ہی آدمی دکھائی دیتا تھا۔ جو ریل سے اترتا وہیں پڑا رہتا۔ تعفن کے مارے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ ریل سے اترنے بھی نہ پائے تھے کہ کئی آدمی پوچھتے ہوئے آئے، حملہ کہاں ہوا ہے اور کتنے آدمی مارے گئے۔ پھر یہ کہتے چلے گئے کہ ٹھہر جاؤ، ابھی تمہارے سامنے بدلہ لیے لیتے ہیں، چنانچہ رات کو کوئی گاڑی مشرقی پنجاب جانے والوں کی باغبان پورہ پر روک لی گئی اور سارا قرض مع سود چکا دیا گیا۔

……

دلی چھوڑنے کے بیس دن بعد تک کوئی خط دلی سے نہیں آیا۔ ایک دن اچانک میرے دفتر کے ایک منشی کا خط آیا، تو اتنی خوشی ہوئی کہ جیسے کوئی

بڑی نعمت مل گئی ہو۔ ڈاک کھلنے کے بعد معلوم ہوا کہ کون کون کہاں ہے؟ کئی عزیز جو 21 ستمبر کی ریل سے چلے تھے مارے گئے اور لاپتہ ہیں۔ اس گاڑی میں صرف دو سو آدمی زندہ پہنچے تھے۔ ایک دوست جو لاہور پہنچے ان کی حالت یہ تھی کہ سارے کپڑے خون میں لت پت تھے اور وہ پاگلوں کی طرح چیختے تھے کہ میں نے مردوں کا پاؤ بھر خون چاٹا ہے۔ یہ لاشوں کے نیچے دب رہ گئے تھے اور پیاس بجھانے کے لیے خون چاٹتے رہے۔ ان کی خون آشامی کی کیفیت سن کر بہار کی ایک پاگل عورت یاد آتی تھی جو سب سے یہی کہا کرتی تھی کہ میں نے اپنے سات بچوں کا خون پیا ہے۔ اس کے سات بچے اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کیے گئے اور سب کا خون اسے زبردستی پلایا گیا۔ اس قسم کے سینکڑوں روح فرسا واقعات ہیں جن کا بیان یہاں بے محل ہوگا۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اتنے بڑے آشوب میں سے زندہ سلامت نکل آئے۔ مالی نقصان کا کیا ہے؟ زندہ رہیں گے تو بہت کچھ پھر کما لیں گے البتہ دلی چھٹنے کا داغ دل پر ہمیشہ رہے گا۔ دلی اب بھی باقی ہے اور وہاں مسلمان بھی بستے ہیں لیکن اب وہ دلی کہاں؟ دلی مر گئی۔

(تحریر شاہد احمد دہلوی۔ اردو ڈائجسٹ اگست 1967ء)

آپریشن بلیو سٹار

نوجوانوں کے پسندیدہ ترین مصنف طارق اسماعیل ساگر کا کتاب گھر پر پیش کیا جانے والا دوسرا ناول **آپریشن بلیو سٹار** کہانی ہے ایسے سرپھرے آزادی کے متوالے لوگوں کی جو اپنی حریت اور آزادی کی سانس کے بدلے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہیں۔ ہندوستان میں سکھوں کے خالصتان کی تحریک کو کچلنے کے لیے کیا گیا بدنام زمانہ فوجی ایکشن جسے آپریشن بلیوسٹار کا نام دیا گیا تھا، اسی آپریشن کے بعد ہندوستان کی سابقہ وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کو اسکے اپنے سکھ باڈی گارڈز نے گولیوں سے اُڑا دیا۔ ہندوں اور سکھوں کی باہمی چپقلش اور کشمکش کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول جلد ہی کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا۔

کریک ڈاؤن

طارق اسماعیل ساگر کا ایک بہترین ولولہ انگیز، خون گرما دینے والا ناول۔ کشمیر حریت پسندوں اور سیاچن گلیشئرز پر لڑی جانے والی جنگوں کے پس منظر میں لکھا گیا بہترین ناول۔ جلد کتاب گھر پر آرہا ہے، جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکے گا۔

1947ء کے ناقابلِ فراموش مناظر

اُردو افسانے میں جناب جیلانی بی اے کا نام سدا زندہ رہے گا۔ انہوں نے اتنے خوبصورت اور اس قدر پاکیزہ افسانے لکھے ہیں کہ ہر بار پڑھنے سے ایک نیا لطف آتا ہے۔ آزادی پر ان کی یہ کہانی شاید اردو ادب میں بالکل منفرد ہو۔

دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں چار گھڑ سوار سکھ نہر کے پل پر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے جو فربہ اور معمر تھا، اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ کپاس کے قریبی کھیت میں ایک کاشتکار نلائی کر رہا تھا۔ چاروں نے اپنے گھوڑوں کا رخ اس طرف پھیر دیا۔

فربہ اور معمر سوار نے شریفانہ انداز میں کاشتکار سے کہا:

''بھائی! ہمیں پینے کے لیے پانی مل جائے گا؟''

نلائی کرنے والے نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ دل میں ڈرا۔ اس نے کھرپی پھینک دی اور بڑے ادب سے کہا: ''جی ہاں! سائے میں بیٹھیے، میں ابھی پانی لائے دیتا ہوں۔''

چاروں سکھ گھوڑوں سے اتر آئے اور سائے میں کھڑے ہو گئے۔ ان کے پاس لمبے لمبے نیزے تھے۔ ان کے اعلیٰ نسل کے دراز قد گھوڑے ہنہناتے ہوئے زمین پر اپنے سم پٹخ رہے تھے۔

پانی پینے کے بعد انہوں نے احسان مند نگاہوں سے پانی پلانے والے کو دیکھا اور اس کا نام پوچھا۔ کاشتکار نے اپنا نام غلام حسن بتایا۔

پھر سواروں میں سے ایک نے سوال کیا: کہو بھائی! تمہارے گاؤں میں تو خیریت ہے نا؟''

غلام حسن نے ان کی طرف دیکھا اور کہا: ''جناب! اس وقت تک تو خیریت ہے، اگلی گھڑی کا علم نہیں۔''

فربہ اور معمر آدمی نے اسی شریفانہ انداز میں کہا: ''بھائی، امن اور خیریت ہی کی دعا کرنی چاہیے۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے فائدہ کیا؟''

اس کے بعد جب سوار جانے کے لیے تیار ہوئے تو غلام حسن نے یہ سوچ کر کہ ان سے پوری واقفیت تو حاصل کر لینی چاہیے، سوال کیا:

''آپ کہاں سے آرہے ہیں؟''

''ہم چک نمبر 125 سے آرہے ہیں۔''

''اور کدھر کا ارادہ ہے؟''

سب سے اگلے سوار نے کچھ جواب دیا، مگر غلام حسن سمجھ نہ سکا اور وہ چلے گئے۔

گھاس کھودنے سے فارغ ہونے کے بعد جب غلام حسن چھکڑا لیے گاؤں کی طرف لوٹ رہا تھا اسے ابراہیم ٹھیکیدار کے مربع کے قریب فقیر ارائیں ملا۔ علیک سلیک کے بعد گفتگو شروع ہوئی تو غلام حسن نے سواروں کا واقعہ سنایا۔ قصہ سننے کے بعد فقیر نے وہی سوال کیا جس کا جواب خود غلام حسن بھی معلوم نہ کر سکا تھا۔

غلام حسن نے کہا: ''میرا خیال ہے وہ چک نمبر 243 کی طرف چلے گئے ہیں۔''

فقیر نے تعجب اور گھبراہٹ سے پوچھا:

''چک نمبر 243 کی طرف؟ وہاں تو سکھوں کا بہت بڑا جلسہ ہو رہا ہے۔''

جب یہ گاؤں میں پہنچے تو چکی کے پاس آلہ بخش اور صالح کھوجی آپس میں ایک بچھڑے کا سودا کر رہے تھے بچھڑا الہ بخش کا تھا اور صالح کھوجی خریدار تھا۔

''تم جانتے ہو میں اسے پورے ایک سال سے پال رہا ہوں۔ یہ مجھے اپنی جان سے بھی عزیز ہے۔''

''کھوجی نے ذرا تیزی سے کہا: ''پاگل اسی لیے تو میں بھی اڑھائی سو روپے سے دے رہا ہوں۔''

فقیر بھی اس پر لذت گفتگو میں شریک ہو گیا۔ ایک کاشتکار کے لیے اس سے زیادہ پر لطف موقع کیا ہو سکتا ہے؟ بیلوں کا موضوع ہو اور کوئی کاشتکار اس میں حصہ نہ لے بھلا یہ کیونکر ممکن ہے؟

جب بہت بحث و تکرار کے بعد بھی الہ بخش تین سو روپے سے ایک دمڑی کم لینے پر راضی نہ ہوا تو صالح نے تنگ آ کر کہا: ''بڑے ضدی ہو، خدا جانے کل کیا ہو جائے! کمبخت سکھوں کے معلوم نہیں کیا کیا خطرناک ارادے ہیں۔''

اس پر فقیر بولا۔

''تم نے سنی وہ بات؟ آج غلام حسن کو چار سکھ ملے۔ وہ برچھیوں، بندوقوں اور پستولوں سے لیس تھے۔ چک نمبر 243 کی طرف گئے ہیں جہاں سکھوں کا ایک بھاری جلسہ ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں وہ کسی حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔''

''اور تم کیا سمجھتے ہو؟ کیا وہ غافل بیٹھے ہیں؟ وہ مسلمانوں کی طرح لاپرواہ نہیں۔ آج افضل نے خبر سنائی کہ سکھوں نے ہوشیار پور کے قریب مسلمانوں کے چار گاؤں بالکل خاکستر کر دیے اور مسلمانوں کے دودھ پیتے بچوں کو مار ڈالا ہے۔''

اتنے میں مستری نور بھی دکان سے باہر نکل آیا۔ وہ ابھی ابھی ایک تلوار بنا کر آیا تھا۔ بھٹی کے سامنے بیٹھے بیٹھے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا جب اس نے غلام حسن کا واقعہ سنا تو وہ تیز ہو کر بولا۔ ''ہوس کی دوا کرو! سکھ حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور اگر انہوں نے حملہ کر دیا تو یاد رکھو وہ مسلمانوں کو (اپنی ہتھیلی اوپر اٹھاتے ہوئے) یوں ہتھیلی پر اٹھا لیں گے۔''

صالح بولا:

”میری بات سنو میں تمہیں بتاتا ہوں“

لیکن مستری اپنے جوش میں بولتا گیا:

”مسلمان تو ہتھیار بنوانے سے بھی بیزار ہیں۔ غور کرو، تلوار بنانا کتنا کٹھن کام ہے! اس کی اجرت کیا دس روپے زیادہ ہے آج عبداللہ نے تلوار بنوائی۔ صبح سویرے سے لے کر دوپہر تک بھٹی کے سامنے بیٹھے بیٹھے میرا جسم بھی کوئلہ ہوگیا، اور وہ پانچ روپے پھینک، تلوار لے چلتا بنا۔“

چکی کے پاس لوگ برابر جمع ہوتے جارہے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ سیاست حاضرہ کا موضوع زیادہ سرگرمی سے کھنگالا جانے لگا۔ مجلس معلوم نہیں کتنی دیر تک ختم نہ ہوتی اگر قریب کے جوہڑ میں دو بھینسیں آپس میں گتھم گتھا نہ ہو جاتیں۔ دونوں کے سینگ لڑتے لڑتے ایک دوسرے میں الجھ گئے تھے۔ اسمعیل نے فقیر کو آواز دی، وہ جوہڑ کی طرف لپکا اور اس کے پیچھے دوسرے لوگ بھی ادھر دوڑے بڑی تگ و دو کے بعد ان لوگوں نے بھینسوں کو علیحدہ کیا اور اس کے بعد ان کی لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر جب نمازی مسجد سے نکلے تو مہر شہاب دین نے امام صاحب سے کہا:

”میاں جی! آپ نے سنا، غلام حسن کو آج چار سکھ ملے۔ انہوں نے اسے پستول دکھا کر ڈرایا اور کہا تیار ہو جاؤ! ہم حملہ کرنے والے ہیں۔“

یہ خبر واقعی بڑی تشویش انگیز اور خطرناک تھی۔ شام کے وقت جب یہ خبر گلاب خاں تک پہنچی تو اس نے اپنے سر سے پگڑی اتار کر کھٹیا کے پائے پر رکھ دی اور کہا:

”بس اب خاتمہ سمجھو۔“

گلاب خاں اس وقت گنگا رام کی دکان کے سامنے بیٹھا تھا۔ فضل قصائی بھی وہیں موجود تھا اور اللہ دتا بھی۔ گلاب خاں کے الفاظ نے سب پر مایوسی طاری کر دی کچھ دیر تک وہ چپ بیٹھے حقہ پیتے رہے۔ آخر فضل نے سلسلہ کلام شروع کیا: ”مسلمانوں واقعی اسی لائق ہیں۔“

اللہ دتا یکایک بولا:

”لیکن مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ کیا ہے۔“

گلاب خاں کی آنکھیں حسب معمول جوش میں سرخ ہوگئیں۔ اگرچہ شام کا اندھیرا گہرا ہوتا جارہا تھا تاہم اس کے چہرے کا بھورا رنگ تاریکی میں نمایاں تھا۔ اس نے رقت آمیز انداز میں کہا: ”سچ پوچھو تو یہ ہمارے ایمان کی کمزوری کا نتیجہ ہے خدا کو حاضر ناظر جان کر کہو ہمارا کوئی عمل اسلام کے مطابق ہے جھوٹ ہم بولتے ہیں، دغا کرنے سے ہم باز نہیں آتے، چوری کرنے سے ہم نہیں ٹلتے، شرابیں ہم پیتے ہیں، جوا ہم کھیلتے ہیں۔ رنڈی بازی مسلمان کے دم قدم سے آباد ہے۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک کوئی بھی مسلمان اسلام کا پابند ہے؟ پھر بھی ہم خدا سے رحمت کی توقع رکھیں تو کیا یہ بے حیائی نہیں؟“

اندھیرے میں گلاب خاں کی آواز لرز رہی تھی۔ اس کی آواز میں اثر اور درد تھا۔ معلوم ہوتا تھا یہ باتیں اس کے دل کی گہرائی سے نکل رہی تھیں۔

فضل قصائی گلاب خاں سے ٹھٹھا مذاق کرنے کا عادی تھا یکایک وہ بولا: ”آیا بڑا مولوی! تم خود کیا کرتے ہو؟ بتاؤ تو سہی۔

گلاب خاں نے تیزی سے جواب دیا: میں بھی تو انہی مسلمانوں میں سے ہوں اور تم کیا کم ہو؟“

اتنے میں مسجد کی دائیں طرف سے ایک سائیکل کی کھڑک سنائی دی۔ برکت ماشکی شہر سے آ رہا تھا گلاب خاں نے جلدی سے آگے بڑھ کر پوچھا: ''اخبار لائے۔''

برکت نے ہینڈل کے ساتھ لٹکے ہوئے تھیلے میں ایک اخبار نکالا اور کہا:

''ظلم کی انتہا ہو گئی ہے۔ ہوشیار پور اور لدھیانے میں لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ مسلمانوں کے گاؤں کے گاؤں جلائے جا رہے ہیں۔ دودھ پیتے بچے تک قتل کیے جا رہے ہیں۔ بھوکے پیاسے اور بیمار مسلمانوں کا عضو عضو کاٹ کر انہیں مارا جاتا ہے۔ ان کی عورتیں چھینی جاتی ہیں اور ان پر ایسے ایسے ستم ڈھائے جاتے ہیں جن کے تصور ہی سے روح کانپ جاتی ہے۔

ایک لمحے کے لیے ایسا معلوم ہوا گویا تمام کائنات سناٹے میں آ گئی۔ گلاب خاں نے ضبط سے کام لیا اور دکان کے اندر آیا۔ گنگا رام دکان میں دیے کے سامنے اپنی ہی کھولے حساب کر رہا تھا۔ گلاب خاں نے غم و غصے میں گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''گنگا رام! ذرا دیا لانا۔ گنگا رام نے گلاب کے چہرے کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ تازہ اخبار آیا ہے۔ اس کے دیا دکان کی ڈھیٹر پر رکھ دیا۔ گلاب خاں اخبار الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اخبار سکھوں کے منظم حملوں اور پٹیالہ فوج کے ظلم و ستم کی داستانوں کی تفصیل سے پر تھا۔

فضل قصائی نے کچھ انتظار کے بعد کہا: ''خاں جی! ہمیں بھی سنائیے''

گلاب خاں نے ٹھنڈی آہ بھری اور کہا: ''اخبار پڑھا نہیں جاتا'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں دیے کی مدھم لو میں پرنم دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے بعد اس نے کہا: ''فضل میرا ارادہ ہے۔ عشا کی نماز کے بعد تمام گاؤں کو بلا کر اخبار سنایا جائے۔''

عشا کی نماز سے پہلے ہی گاؤں کے چاروں گوشوں سے لوگوں کی ٹولیاں نکل کر مسجد سے پرے ریت کے ٹیلے کی طرف جا رہی تھیں۔ ٹیلے پر لوگوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ مجمع کے چاروں طرف برچھے زمین میں گڑے ہوئے تھے اور بیچ میں ایک مدھم لالٹین کے سامنے گلاب خاں اخبار پڑھ کر سنا رہا تھا۔ اس نے اس وقت عینک لگا رکھی تھی۔ یہ عینک گنگا رام کی تھی جو گلاب خاں اکثر پڑھنے کے لیے اس سے مستعار لے لیا کرتا تھا۔ رات اندھیری تھی۔ سیاہی مائل کھیت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور تاریک افق کے کنارے درختوں کے جھنڈ کالی روشنائی کے دھبوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ گلاب خاں روتی ہوئی آواز میں خبریں سنا رہا تھا۔ ظلم کے ہر واقعے کی اطلاع وہ دہرا دہرا کر پڑھتا۔ مجمع میں سے وقتاً فوقتاً ٹھنڈی آہ یا ہائے ہائے کی آواز بے اختیار اٹھتی۔ اخبار کا ایک صفحہ پڑھنے کے بعد گلاب خاں کی زبان لڑکھڑا گئی اور لفظ الٹ پلٹ نکلنے لگے۔

مجمع سکوت غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب گلاب خاں نے اخبار پڑھنا بند کیا تو ایک مغلظ گالی ہوائی کی طرح چھوٹی۔ لوگوں میں تشویش اور حیرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ گلاب خاں نے لالٹین اٹھا لی اور تمام حاضرین کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔

''میرے خیال میں رات کو ہمیں تمام گاؤں کے گرد پہرہ بٹھا دینا چاہیے۔''

کئی آوازیں ابھریں۔ ''ضرور! ضرور!''

اس کے بعد گلاب خاں نے چوکیدار سے کہا:

''غلام محمد! دیکھو تم ہر گھر سے ایک نوجوان ہر رات لے لیا کرو اور تمام گاؤں کا چکر لگایا کرو۔''

اس رات وسطی کنوئیں پر پانچ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور ان پر نوجوان دراز تھے۔ ایک ماہیا گا رہا تھا۔ دوسرا لطیفے لیٹے ہی تال دے رہا تھا اور غلام محمد گاؤں کا چوکیدار اپنے برچھے سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔

حملہ

''پیارے دوست! ہمارے قریبی شہر میں فساد کی چنگاری بھڑک اٹھی ہے۔ لوگ گھبراتے ہیں تو مجھ سے پوچھتے ہیں ان کا کیا بنے گا اور امن کب ہوگا۔ میں چپ ہو جاتا ہوں۔ آخر میں ان سوالوں کا کیا جواب دے سکتا ہوں؟ جو کچھ ہو رہا ہے جن کو معلوم نہیں چپ ہیں اور جن کو معلوم ہے ان کے لبوں پر بھی مہر خاموشی ہے۔ واقعات کی اس عظیم رو کی انتہا کیا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔''

چودھری منصور نے خط لکھتے ہوئے کاغذ سے نظریں ہٹا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ چار دن کی متواتر بارش کے بعد مطلع صاف ہوا تھا تو دھوپ کس قدر چمکیلی اور نکھری ہوئی تھی گویا پانی سے دھل گئی ہو۔ سامنے بوڑھے پیلو کے درخت پر ننھی منی چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور کچھ دیر کھڑکی کے سامنے کھڑا رہ کر کتابوں کی الماری کی طرف مڑا۔ میز پر وہ کتاب ابھی تک کھلی پڑی تھی۔ جسے وہ کل پڑھتے پڑھتے چھوڑ گیا تھا۔ وہ کل کتنی لذت سے اس کتاب کو پڑھ رہا تھا، لیکن اس وقت اس کا جی اسے دیکھنے کو بھی نہ چاہ رہا تھا، اس نے الماری سے دو چار کتابیں نکالیں۔ ان کی ورق گردانی کی اور انہیں پھر وہیں رکھ دیا۔

کمرے میں امس سی پیدا ہو گئی تھی۔ سورج جوں جوں بلند ہو رہا تھا۔ گرمی بڑھ رہی تھی اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی چیز اس کی توجہ کو اپنی طرف نہ کھینچ سکی۔ اس پر اس نے اپنی چھڑی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

احاطے میں اس کی تاکید کے باوجود کوئی شخص موجود نہ تھا۔ اس نے احاطے کے وسط میں کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ ایک چھپر کے نیچے کرم دین لنگڑا اور شہادت علی بڈھا بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں عمر کی آخری منزل کو پہنچ چکے تھے۔ وہ بڑے سکون سے حقہ پیتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے قریب اندھی گدھی گھر کے سامنے گھوڑے کے ڈھیر پر منہ مار رہی تھی۔ جب انہوں نے چودھری کو اپنی طرف آتے دیکھا تو دونوں چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کرم دین نے بڑی محبت سے اپنے نوجوان مالک کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔

چودھری نے کہا:

''بیٹھو بابا! بیٹھو...... باقی لوگ کہاں گئے؟''

کرم دین نے لجاجت سے کہا: ''چودھری جی! وہ سب کھالا صاف کرنے گئے ہیں، ابھی لوٹ آئیں گے۔''

چودھری کا غصہ قدرے فرو ہوا۔ اس نے اپنی چھڑی گھمائی اور جانے کے لیے مڑا۔

شہادت علی نے حقے کی نے کرم دین کی طرف پھیرتے ہوئے کہا: چودھری جی! سنا ہے سکھ حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

نوجوان چودھری نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا:

’’اگر وہ حملہ کریں گے تو منہ کی کھائیں گے۔ دن میں سینکڑوں بار اس سے یہی سوال کیا جاتا اور وہ یہی جواب دیتا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ اس قسم کے جواب خوفزدہ دلوں کو سہارا دینے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔‘‘

گاؤں کے جوہڑ میں ڈھور ڈنگر کلیلیں کر رہے تھے۔ اس سے پرے گنے کے کھیت افق تک پھیلے ہوئے تھے۔ چودھری کھیتوں کے درمیان بل کھاتی پگڈنڈی پر ہولیا۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف جوار کے کھیت کھڑے تھے۔ جب وہ بڑے کھالے پر پہنچا تو تمام مزارع اسے صاف کرنے میں مصروف تھے۔ چند پھاوڑے سے ریت نکال نکال کر ٹوکریوں میں بھرتے جاتے‘ باقی ریت کی بھری ہوئی ٹوکریاں باہر سڑک پر پھینکتے جاتے۔ ان کے جسم پسینے سے شرابور تھے۔ چودھری کو دیکھ کر مزارعوں نے کام چھوڑ دیا‘ لیکن چودھری نے اس طرف مطلق توجہ نہ کی اور کھالے کے کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ کھالے کے کنارے کنارے نہر تک شیشم کے درختوں کا ایک سلسلہ چلا گیا تھا۔

’’میری تاکید کے باوجود تم سب احاطہ خالی چھوڑ کر کیوں چلے آئے۔‘‘

چودھری نے اپنے چہرے پر غصے کی مصنوعی علامتیں پیدا کر لیں۔ اس کی تیوری چڑھی ہوئی تھی اور اس کے باریک نتھنے بھی کچھ پھولے ہوئے تھے۔ اس سوال پر کامل خاموشی چھا گئی۔ تمام مزارع نگاہیں جھکائے زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صرف نہر کے کنارے ایک اونچے درخت پر کسی پہاڑی کوے کی بھدی کائیں کائیں سنائی دے رہی تھی۔

’’تم لوگ واقعی اجڈ ہو۔ خود ہی سوچو تم ان کھالوں اور کھیتوں کو کیا کرو گے؟ اگر زندگی ہی باقی نہ رہی۔ بتاؤ؟ اگر اس وقت گاؤں پر حملہ ہو جائے تو کیا ہو؟‘‘

ان میں سب سے بوڑھا اور مدبر ابراہیم مزارع تھا۔ وہ اگرچہ سیاہ فام تھا؟ تاہم اس سے بڑھ کر بات کرنے کا سلیقہ کسی کو نہ تھا۔ اس نے اپنی بھوری اور چمکیلی آنکھیں اٹھا کر چودھری کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی بڑا چھوٹے کی طرف دیکھتا ہو۔

اگر عرض کرنے کی اجازت ہو تو کچھ کہوں؟ ابراہیم نے کچھ اس لجاجت سے یہ الفاظ کہے کہ چودھری کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس پر دوسرے مزارعوں کی جھکی ہوئی گردنیں بھی اٹھ گئیں۔

’’اگرچہ میں نے احاطے سے نکلتے ہوئے ان سب بیوقوفوں سے کہا بھی تھا کہ صرف چند آدمی چلیں‘ باقی احاطے ہی میں رہ جائیں‘ لیکن جب میں یہاں پہنچا تو دیکھا سب کے سب موجود ہیں۔ اب کی بار تو معاف کیا جائے۔ آئندہ غلطی ہوئی تو سزا دی جائے۔

چودھری نے باوقار سکوت کے ساتھ ان کی طرف دیکھا اور بچھے ہوئے صافے پر بیٹھ گیا۔ اب سورج شیشم کے بلند درختوں کی چوٹیوں پر پہنچ گیا تھا اور کھیتوں میں ہلکی سی سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ مزارعوں نے کھالا پوری طرح صاف کر لیا تھا اور اب وہ صافوں سے اپنے چہرے کو پونچھ رہے اور اپنی جوتیاں جھاڑ رہے تھے۔

ایکا ایکی نہر کے کنارے غبار کا ایک بگولا سا اٹھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ سب مزارعوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ چودھری بھی

اٹھ کھڑا ہوا۔ جب غبار چھٹا تو سواروں کی صورتیں دکھائی دیں۔ وہ جنگلی لوگ تھے۔

چودھری نے ایک لڑکے سے کہا:

''اسمعیل! انہیں بلاؤ تو۔'' لڑکا حکم پاتے ہی اٹھ دوڑا اور سب سے اگلے سوار کی لگام تھام لی' پھر انہیں چودھری کے پاس لے آیا۔ یہ چار سوار تھے' معمولی حیثیت کے مزارع۔ انہوں نے نیلے رنگ کے تہبند باندھ رکھے تھے اور اپنے چہروں کو ڈھاٹوں سے لپیٹ رکھا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے برچھے تھے۔ چودھری کو دیکھ کر وہ کچھ ڈرے' لیکن جب چودھری نے کہا۔ بھائی! کوئی خبر سناؤ تو وہ ڈھب سے اپنی کاٹھیوں پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک جو دراز قد اور جوان تھا بولا: ''ہم چک نمبر 25 کی طرف سے آ رہے ہیں۔ ہمیں اس چک سے پرے چک نمبر 60 کو جانا تھا' لیکن اس کے رجبہا پر سکھوں کے ایک جتھے نے ہمیں لوٹا دیا۔ ہم نے کوئی مزاحمت نہ کی اور واپس چلے آئے۔''

جب چودھری اپنے مزارعوں کی معیت میں واپس آیا تو گاؤں سنسان پڑا تھا۔ ان کے آگے چند چارے سے لدے چھکڑے گاؤں میں داخل ہوئے چودھری نے ابراہیم سے کہا: ''دیکھا یہ لوگ کتنے احمق ہیں بار بار کہنے کے باوجود تمام لوگ گاؤں چھوڑ کر کھیتوں میں نکل گئے ہیں۔ افسوس ہے ان پر!''

گھر پہنچا تو اسے خوب بھوک لگ رہی تھی۔ وہ کھانا کھا کر لیٹ گیا اس کے تھکے ہوئے اعضا میں نیند آہستہ رچنے لگی۔ اونگھ میں اس نے محسوس کیا گویا وہ بادلوں کی سفید چٹائی پر پہنچا ہوا ہے۔

اسے نیند کا ایک جھونکا ہی آیا تھا کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ ''کون ہے؟ نوجوان چودھری جھنجھلا کر اٹھا اور کھڑکی میں سے جھانکا۔ دروازے پر محمد علی مزارع کھڑا تھا۔ اس کی پگڑی سر سے لٹک کر گلے میں پھندا بن گئی تھی اور وہ کھڑا کانپ رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' چودھری نے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

چودھری کو دیکھتے ہی اس نے ہاتھ اٹھائے اور دہائی دی۔ ''چودھری جی! چک نمبر 52 اور 35 کو سکھوں نے ملیا میٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب وہ چک نمبر 67 کی طرف بڑھ رہے ہیں اتنا کہتے ہی وہ دوڑتا ہوا صدر دروازے سے باہر نکل گیا۔

چودھری کی پتلیاں پھیل گئیں اور اس نے ایسا محسوس کیا اب کی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں کوئی شے رینگ رہی ہو۔ جملہ اس نے آہستہ سے کہا۔ اس کا دل کانپنے لگا۔ اتنے میں نقارے پر چوٹ پڑی اور تمام گاؤں بھنبھناہٹ سے بھر گیا۔ اس کی بندوق دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اور اس کے اوپر کھونٹی میں گولیوں کا وزنی تھیلا لٹک رہا تھا۔ اس نے سوچا ہر کام کے لیے ایک وقت ہوتا ہے اب اس کا وقت بھی آ گیا ہے۔

منصور نے جلدی سے اپنی قمیض کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ اسے سوائے بندوق اور گولیوں کے کسی اور شے کی حاجت نہ تھی۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلا تو دو بوڑھی عورتیں اس کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتی آ رہی تھیں۔ ان کے لہنگے پھیل کر چھتری کے مانند ہو گئے تھے۔

''بیٹا چودھری! ہمارا کیا بنے گا؟'' ایک بوڑھی نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

''چھی چھی! بینا کیسی بات کر رہی ہو؟ سکھ کبھی حملہ کر سکتے ہیں؟ اطمینان سے گھروں میں بیٹھی رہو۔''

چودھری انہیں پیلو کے نیچے ہائے ہائے کرتے چھوڑ کر چلا گیا۔ احاطے سے کھٹ کھٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تاجو کے چھپر کے نیچے چار لڑکے برچھے لیے کھڑے تھے۔ محمد علی اور احمد دین دوڑتے ہوئے اس کے سامنے سے گزر گئے۔ لیکن ابراہیم کہیں دکھائی نہ دے رہا تھا۔ چودھری تیزی سے احاطے سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے ابراہیم کی آواز آئی: ''چودھری جی! رُکیے'' اس کے ساتھ شمو اور لال دین تھے۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو اس نے بڑے ادب سے کہا: ''چودھری جی! آپ جہاں بھی جائیں اپنے آدمیوں کو ساتھ لیتے جائیں۔''

گاؤں میں ایک افراتفری مچی تھی۔ لوگ سڑکوں پر ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ عورتیں اور بچے چھتوں پر چڑھ کر چلا رہے تھے۔ چودھری وسطی کنوئیں کی طرف بڑھا۔ کنوئیں کے سامنے گنگا رام کی دکان پر گلاب خاں پستول میں گولیاں بھر رہا تھا۔

چودھری نے اسے دیکھتے ہی پوچھا: ''معاملے کا صحیح علم بھی ہوا ہے یا نہیں؟''

گلاب خاں کے بدن پر ہلکا سا رعشہ طاری تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اسنے پستول بھر کر اپنی دھوتی کے پلو میں باندھ کر اسے اپنی کمر میں اڑس لیا۔

''عبدالکریم نے بتایا ہے کہ چک نمبر 66 سے ایک شخص آیا ہے جس نے اطلاع دی ہے کہ چک نمبر 67 والوں نے مدد طلب کی ہے۔

چودھری کو دیکھ کر دو چار مزارع اور مسجد کے میاں جی بھی آ گئے۔ ''جب تک کوئی مستند اطلاع نہ ملے' اس وقت تک آپ لوگ خواہ مخواہ کیوں گھبرا رہے ہیں۔؟''

نقارہ زور سے بج رہا تھا اور گاؤں کے چاروں گوشوں سے گیدڑوں جیسی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ جنگلی لوگوں کی مدد کی پکار تھی۔ چھکڑے کھڑکھڑاتے ہوئے گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ گاؤں کی بیرونی سڑک پر غبار کے بادل اٹھ رہے تھے۔ اتنے میں مسجد کے عقب سے تین سوار نمودار ہوئے۔ ان کا دم پھولا ہوا تھا' اور ان کے چہروں سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ انہوں نے چودھری کے پاس پہنچ کر گھوڑے روک لیے اور کہا: ''ہم چک نمبر 26 سے آ رہے ہیں' چک نمبر 67 پر واقعی حملہ ہو گیا ہے' اس لیے اپنے کچھ آدمی مدد کے لیے بھیجیے۔ اب ہم چک نمبر 70 کی طرف جا رہے ہیں۔''

ایک مزارع نے پوچھا: ''بھائی! لسی پانی پیو گے؟''

''نہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے گھوڑوں کا رخ پھیرا اور گھوڑا ایڑ لگائی۔ چند ہی لمحوں میں وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اور صرف غبار باقی رہ گیا۔

ان سواروں کے جاتے ہی گاؤں میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ آناً فاناً یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ عورتوں کے بین کی آوازیں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ نقارے پر چوٹ اس قدر زور سے پڑنے لگی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ منشی کرم دین مسجد سے بھاگا بھاگا نکلا اور لوگوں کے مجمع میں آ گیا' وہ حسب معمول دھوتی اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔

اس نے چلا کر کہا: ''یہ کون نقارہ بجا رہا ہے؟ بند کرواسے فوراً بند کرو۔''

تھوڑی دیر بعد نقارہ بند ہو گیا اور اسمعیل کی بلند آواز یہ کہتے سنائی دے رہی تھی۔ ''تم نے کسی کی اجازت سے نقارہ بجانا شروع کیا تھا؟''

نقارے کے بند ہوتے ہی گاؤں میں قدرے سکون ہو گیا۔ لوگ رفتہ رفتہ چودھری کے گرد جمع ہوئے تھے۔ وہ مختلف تجویزیں پیش کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا ابھی جتھا بند ہو کر چک نمبر 67 کی طرف چلا جائے' دوسرے کہہ رہے تھے یہ طریقہ صحیح نہیں' گاؤں کو یوں خالی چھوڑ کر جانا سخت حماقت ہے۔ عورتیں بھی گھروں سے نکل نکل کر کنوئیں کی جانب آ رہی تھیں۔ ان کی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی۔ یکا یک منشی کریم دین کا غصہ دبی ہوئی چنگاری کی طرح بھڑک اٹھا اور وہ باؤلے کتے کی طرح عورتوں پر گرجا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی؟ گھر میں امن سے بیٹھ نہیں سکتیں؟'' منشی کو دیکھتے ہی عورتیں بھاگ گئیں۔

چودھری منصور خاموشی سے مجمع کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لوگوں کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ ایک اپنی بات پوری نہ کرنے پاتا کہ دوسرا بیچ میں بول اٹھتا۔ پھر ہر شخص ایک دوسرے سے بڑھ کر بلند آواز سے بولنے کی کوشش کرتا۔ بالآخر چودھری نے ہاتھ سے سب کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا: ''یہ وقت باتوں میں ضائع کرنے کا نہیں ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔''

مجمع میں پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ اس پر مستری نور کو غصہ آ گیا: ''تم لوگ کیسے گنوار ہو! ایک بات کرے تو سب کو چپ ہو جانا چاہیے۔''

چودھری نے اپنی تقریر پھر شروع کی: ''گاؤں خالی کر کے جانا سخت حماقت ہے۔ ہمیں گاؤں کے چاروں ناکوں پر پہرہ بیٹھا دینا چاہیے اور باقی لوگ نہایت ہوشیاری سے اپنے اپنے گھر کے آگے کھڑے ہو جائیں۔

مستری نور محمد نے پوچھا: ''چک نمبر 67 میں کتنے آدمی بھیجنے چاہئیں؟''

''میرا خیال ہے فی الحال پانچ شخص گھوڑیوں پر بھیج دیں۔ وہ چک نمبر 66 پہنچیں اور وہاں سے صحیح صحیح حالات معلوم کر کے اپنے میں سے ایک شخص کو یہاں بھیج دیں۔ اگر کچھ اور مدد کی ضرورت ہوئی تو ہم اور آدمی بھیج دیں گے۔''

''تین چار آوازیں بلند ہوئیں' بالکل ٹھیک ہے۔

''چک نمبر 66 کون کون جائے گا؟'' لوگوں میں پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ چودھری نے بلند آواز سے کہا: ''کون کون جائے گا؟''

پھر مستری نور نے بلند آواز سے پوچھا: ''بتاؤ بھائی چک نمبر 66 کون کون جائے گا؟''

لوگوں نے چودھری اور مستری کی طرف دیکھا۔ لیکن پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ گاؤں سے باہر قدم رکھنے میں ہچکچا رہے ہیں۔

گلاب خاں جو دیر سے چپ کھڑا تھا' تیزی سے بولا: ''یار تم لوگ عجب احمق ہو! باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو۔ رحیم! تم تیار ہو کر جاؤ۔ اللہ دتا! تم بھی جاؤ۔''

رحیم چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد سفید گھوڑی پر سوار ہو کر آ گیا۔ اس کے ساتھ اللہ دتا بھی۔ جب وہ چک نمبر 66 کی طرف چلنے کو تیار ہوئے تو ان کے ساتھ لوگوں کی ایک بھیڑ تھی۔

منشی کرم دین تیزی سے چلایا: ''ہمارا گاؤں کتنا بے وقوف ہے! پہلے کوئی چلنے کو تیار نہ ہوتا تھا اور اب چلے ہیں تو سبھی ساتھ ہو لیے ہیں۔

صرف پانچ چاؤ باقی لوٹ آؤ۔"

جانے والوں کو پیچھے سے لوٹ آؤ' لوٹ آؤ کی پکار سنائی دی۔ کچھ لوگ لوٹ آئے باقی چلتے ہی گئے۔

چودھری نے اپنی بندوق کندھے پر رکھ لی اور کہا: "اب پہرے بیٹھ جائیں۔ میں تمام گاؤں کا چکر لگاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ چلا اور اس کے ساتھ منشی کریم دین مستری نور اور محمد صدیق ٹھیکیدار کا چھوٹا بھائی ہو لیے۔ گلاب خاں وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

گاؤں کے چاروں ناکوں پر پہرے بیٹھ گئے۔ مغربی ناکہ جو چک نمبر 66 اور نمبر 67 کے رخ پر واقع تھا۔ گاؤں کے منتخب جوانوں نے سنبھال لیا تھا۔ کھالے کی پلیا سے لے کر اسکول تک برچھا برداروں کا ایک جم غفیر کھڑا تھا۔ مشرقی ناکہ بھی بہت مضبوط تھا۔ یہ پکی مسجد کے ساتھ تھا۔ یہاں ایک شیشم کا درخت تھا جس کے سائے نے بہت سے پہرے داروں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہاں پہرے دار ایک پرے کی شکل میں کھڑے تھے۔ جنوبی اور شمالی چوکیاں زیادہ مضبوط تھیں۔ اس جانب حملے کا امکان بھی کم تھا' اس لیے یہاں بلغمی اور سوداوی طبائع کے پہرے دار متعین تھے۔ وہ کم گو تھے۔ اگر وہ فسادات پر گفتگو کر رہے تھے تو نہایت غیر جانب داری سے۔ ان کی بات چیت کا سب سے بڑا موضوع "پانی بندی" تھا اور یہ کہ سکھوں نے نہر کو جگہ جگہ سے کاٹ دیا ہے۔ اس کے برخلاف مغربی اور مشرقی محاذ اپنے جوانوں کے جوشیلے پن اور سرگرم گفتگو سے ہنگامہ خیز بنے ہوئے تھے۔ ہندوستان کی خبروں پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ چند لوگ تو اس قدر جوش میں آ گئے کہ اپنے دشمنوں کو بے نقط سنانے لگے۔ چودھری منصور نے ہر ناکے پر صبر اور تحمل کی تلقین کی۔ وہ خبروں اور اخباروں کے نقطہ نگاہ سے کچھ مختلف خیالی ظاہر کر رہا تھا۔ امن وامان کی تعلیم میں وہ ان سے الگ رائے رکھتا تھا جو ہر خبر کو منتقانہ پیرائے میں بیان کرنے کے عادی تھے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک ناکے سے دوسرے کی طرف جا رہا تھا۔ گاؤں کے گرد اگرد یہ اس کا تیسرا چکر تھا۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک پسینے میں شرابور تھا۔ اس کے ساتھی مستری نور منشی کرم دین اور محمد صدیق تھک کر گنگا رام کی بیری کے نیچے چارپائی پر بیٹھ گئے' جہاں ان سے قبل گلاب خاں محفل جمائے بیٹھا تھا' لیکن نوجوان چودھری اسی طرح قدم اٹھائے جا رہا تھا جیسے اس کے دل میں کوئی آگ سلگ رہی ہو۔ اس کے خوبصورت چمکیلے بال پریشان ہو کر اس کی پیشانی پر گر رہے تھے اور پسینے کی دھاریں اس کے سر سے پھوٹ پھوٹ کر اس کے سینے تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کی قمیص اس کے جسم کے ساتھ چپک گئی تھی اور اس کا تہبند بار بار اس کی ٹانگوں میں الجھتا۔ اب وہ مغربی ناکے پر پہنچ گیا۔ وہ پہرے داروں میں تکان کی علامات دیکھ رہا تھا۔ باتوں میں اب ویسی گرم جوشی نہ تھی۔ چند پہرے دار بیٹھے جمائیاں لے رہے تھے۔ وہ دیر کے گھروں کو چلے گئے ہوتے اگر وہ اپنے گاؤں کے جواں سال زمیندار کو یوں سرگرم اور پرجوش نہ پاتے۔ اس نے پلیا کے اوپر کھڑے ہو کر چک نمبر 66 کی طرف دیکھا۔ کھلی سڑک کے کنارے کیکروں کی مسلسل قطار چلی گئی تھی۔ وہ ایک چھکڑا آہستہ آہستہ ان کے گاؤں کی طرف چلا آ رہا تھا۔ دھوپ کی تیزی میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ ایک مزارع نے پوچھا: "چودھری جی! چھتری لے آؤں۔"

چودھری نے انکار کر دیا: "دنیا میں ایک وقت آرام کا ہوتا ہے تو ایک تکلیف کا بھی ہوتا ہے ہمیں سخت کوش بننا چاہیے۔"

مزارع جوان چودھری کی بات سن کر دل ہی دل میں خوش ہوا: "چودھری جی! آپ تو باغ کے پھول ہیں کہیں کملا نہ جائیں۔ ہم تو جھاڑ کے کانٹے ہیں کہ جنگل کی نرمی سختی سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔"

چودھری مسکرا کر چل دیا۔ ایکا ایکی وسطی کنوئیں سے ایک لمبی دردناک چیخ سنائی دی۔ اور ایک دم پورے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ پہرے پر بیٹھے ہوئے سارے لوگ اٹھ بھاگنے کو تیار ہوئے لیکن چودھری نے چلا کر کہا: ''اپنا محاذ مت چھوڑو! اگر ضرورت پڑی تو تمہیں بلا لیا جائے گا۔'' اتنے میں گاؤں سے ایک ٹھگنے قد کا شخص نکلا اور اس نے چلا کر کہا: ''چودھری جی! بھاگیے! چک نمبر 70 کے سکھوں نے ہلہ بول دیا ہے۔'' یہ چک مشرقی ناکے کے رخ پر واقع تھا۔ مکانوں کی چھتوں پر عورتیں اور بچے چڑھ گئے اور زور زور سے چلانے لگے۔ عورتوں کے رونے اور بچوں کے چیخنے کی آوازیں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ چودھری کے منع کرنے کے باوجود تمام پہریدار بھاگنے لگے۔ گاؤں کے چاروں گوشوں سے لوگ مشرقی ناکے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ قوت اور ہمت کے باوجود چودھری نے محسوس کیا اس کی ٹانگیں سن ہوتی جا رہی ہیں۔ اس نے تھیلا کھول کر گولیاں نکالنی چاہیں، لیکن اس نے دیکھا اس کی انگلیاں کانپ رہی ہیں۔ اسے تھیلے کا بکسوا کھولنے میں وقت لگا۔ اس کے قریب سے لوگ دوڑتے جا رہے تھے۔ ان کی رفتار ظاہر کر رہی تھی کہ موت کا کوئی خوف بھی ان کے اعصاب شل نہیں کر رہا۔

جب وہ گاؤں میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اسے ایک بڈھا نظر آیا جو چھت پر کھڑا زور سے چلا رہا تھا: ''جانے نہ پائیں! لوگ گھروں سے برچھے لیے مشرقی محاذ کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ایک شخص چلایا: ''چودھری جی! اب کیوں آہستہ چل رہے ہو؟ یہی تو دوڑنے کا وقت ہے۔'' اس پر چودھری نے تیز قدم اٹھائے لیکن اس نے محسوس کیا کہ یہ کوشش بے کار سی ہے، کیونکہ اس کی ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔ اس کے دل میں یک لخت ایک خیال ابھرا: ''میرے لیے مرنا کیا ضروری ہے؟ مجھے اپنے آپ کو بچانا چاہیے میں دنیا میں جو کام کرنا چاہتا ہوں، وہ ادھورا ہی رہ جائے گا۔ مجھے قدرت کی طرف سے جو عالی دماغ ملا ہے اس کی کرشمہ سازیاں بے نمود ہی رہ جائیں گی۔ میرے خیال میں جو کام میں کرنا چاہتا ہوں وہ کل نوع انسانی کی بہبود کے لیے ہے۔ اگر میں قتل ہو گیا تو اسے کون مکمل کرے گا؟ نفسانیت کے اس جذبے پر وہ خود ہی شرما گیا۔

اس کے باوجود وسطی کنوئیں تک پہنچتے پہنچتے وہ بے دم سا ہونے لگا۔ مسجد کے قریب ایک شخص اپنا صافہ ہلا رہا تھا اور با آواز بلند پکار رہا تھا: ''کوئی خطرہ نہیں، کوئی خطرہ نہیں یہ سنتے ہی اس کے جسم میں گویا جان سی پڑ گئی اور رکا ہوا خون پھر چلنے لگا۔ وہ تیزی سے بڑھا اور مسجد تک پہنچا۔ مسجد کے سامنے لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ چودھری کو دیکھ کر تمام لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''کیا معاملہ تھا؟''

الہ بخش بولا: ''ایک سکھ یہاں سے گزرنے لگا کہ لڑکے اس کے پیچھے لگ گئے۔ وہ اپنی کرپان پھینک، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ ہم نے انہیں واپس بلا لیا ہے۔''

چودھری نے غصے میں پوچھا: ''کون کون تھا وہ؟''

''ایک نائی تھا اور دو ارائیں لڑکے تھے۔''

چودھری نے تیوری چڑھا کر ان کی طرف دیکھا: ''بے وقوفو! تمہاری ایک غلطی سے لاکھوں جانیں تلف ہو سکتی ہیں۔ اب وہ اپنے گاؤں پہنچ کر کیا خبر سنائے گا؟ اگر یہ جگہ میدان جنگ بن جائے تو یہ مت سمجھو کہ یہیں خون بہے گا۔ اس خون کا رنگ تمام ملک کو اپنے رنگ میں رنگ لے گا۔

ہم یہاں ایک سکھ ماریں گے تو وہ لوگ ہمارے دس بھائی وہاں قتل کر دیں گے۔ اگر تمہیں ان پر ترس نہیں آتا تو اپنے بھائیوں ہی پر رحم کرو۔“

مستری نور جو چودھری کی پشت پر کھڑا تھا۔ نہایت طیش سے آگے بڑھا اور نائی کو گریبان سے پکڑ کر بولا: ”تمہیں کس نے پردھان بنایا؟“ دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ اسے سخت سست کہنے لگے لیکن منشی کرم دین ان سب پر برس پڑا ”یار تم عجیب لوگ ہو! جب سکھ کے پیچھے بھاگے تھے اس وقت تم انہیں روک نہیں سکتے تھے؟“

دور کھیتوں کے درمیان ایک شخص گھوڑی پر ’لادی‘ لادے آ رہا تھا۔ ”وہ کون ہے؟“

سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک لڑکے نے کہا: ”چک نمبر 14 کا کھتری ہے اور شہر سے سودا سلف لیے آ رہا ہے۔“

منشی کریم دین نے اسمٰعیل سے کہا: ”جاؤ اس سے کہو کہ بے خطر چلا آئے۔“

لڑکا اس کی طرف لپکا۔ گھوڑی والے نے جونہی اس ہجوم کو دیکھا۔ فوراً اپنی گھوڑی کا رخ پھیر لیا اور اسے ایڑ پر ایڑ لگانے لگا لیکن گھوڑی تھکی ہوئی تھی وہ اڑ گئی۔ لڑکے کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کھتری نے گھوڑی سے چھلانگ لگا دی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ لڑکے نے آواز دی: ”لالہ گھبراؤ نہیں‘ چلے آؤ۔“ اس پر دو چار لڑکے اور بھی اس کے پیچھے بھاگے مگر اس نے ایک نہ سنی اور سرپٹ بھاگتا رہا۔ لڑکے بھی اس کے پیچھے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ لالہ ایک کھالا پھلانگنے لگا کہ پاؤں رپٹ گیا اور منہ کے بل زمین پر آ گرا۔ لڑکوں نے اوپر سے جا لیا اور اسے پکڑ کر اٹھایا۔ لالہ بری طرح ہانپ اور ہکلا رہا تھا: ”میں شہر گیا تھا۔ ہاں میں شہر گیا تھا۔ سودا لانے“ لڑکے زور زور سے ہنسنے لگے اور لالہ اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ چودھری بھی موقع پر پہنچ گیا۔ اس نے لالے کو تسلی دی۔ لالے کا دم میں دم نہ آ رہا تھا۔ اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا: ”برا ہو زمانے کا! آجکل ساجن بھی دشمن دکھتا ہے۔“

چودھری نے لالہ کو گھوڑی پر سوار کیا اور اسے خود مغربی چوکی تک پہنچا آیا۔

مغربی چوکی کے پہرے داروں نے چودھری کے لیے دودھ کی لسی تیار کر رکھی تھی۔ وہ چودھری کی دوڑ دھوپ کو شکریے اور احسان کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ مغربی چوکی پر پہنچا تو ایک مزارع نے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کشاں کشاں اس چارپائی کی طرف لے گیا جو کیکروں کے سائے میں بچھی تھی۔

”چودھری جی! ذرا ستا لیجئے۔ سب پہرے دار اس کے گرد گھیرا ڈال کر زمین پر بیٹھ گئے اور چودھری لسی پینے لگا۔ اس نے لسی کا گلاس پیا ہی تھا کہ دور چک نمبر 66 کی طرف سے دو گھڑ سوار آتے دکھائی دیے۔ کسی نے کہا سفید گھوڑی تو رحیم کی ہے یہ دوسرا کون ہے؟“

الہ بخش نے نظر پر زور ڈال کر دیکھا: ”یہ حسن بلوچ تو نہیں؟ گھوڑا تو اسی کا ہے۔“

الہ بخش کا قیافہ درست نکلا۔ رحیم چودھری کو دیکھتے ہی گھوڑی سے اتر آیا: ”کوئی فکر کی بات نہیں۔ بالکل خیریت اور امن و امان سے سکھوں نے کوئی حملہ نہیں کیا۔ چک نمبر 52 کے سکھوں اور جنگلیوں کے درمیان ایک بھینس کے سودے پر تنازع ہو گیا تھا۔ لیکن چند بزرگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔“

حسن بلوچ کا بلند قامت اور مضبوط گھوڑا زور زور سے ہنہنا رہا تھا وہ اسے ایک جگہ کھڑا کرنے کے لیے باگیں کھینچ رہا تھا‘ لیکن پوری قوت سے وہ چک پھیریاں لینے لگا۔ حسن بلوچ ایک مضبوط اور طاقت ور جوان تھا۔ اس کی کمر کے ساتھ پستول‘ چرمی خول میں لٹک رہا تھا۔ اور اس کے

بائیں ہاتھ میں ایک لمبا نیزہ تھا۔ اس نے پہرے داروں کو مخاطب کیا: ''شاباش جوانو! یہ کفر و اسلام کی جنگ ہے۔ اپنے گھروں کی حفاظت کے لیے جانیں ہتھیلی پر رکھ لو!''

کفر و اسلام کے الفاظ چودھری کے دل میں ترازو ہو گئے، وہ خاموش نگاہوں سے بلوچ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چودھری اس کی طرف دیکھتا رہا تا آنکہ وہ گھوڑے کی ٹاپوں سے اڑتے ہوئے غبار میں گم ہو گیا۔

چودھری گھر پہنچتے ہی بے بس ہو کر چارپائی پر گر پڑا۔ وہ تھکن سے اس قدر چور ہو گیا تھا کہ اسے کروٹ لینا بھی گوارا نہ تھی۔ وہ کامل سکون چاہتا تھا۔ اس کی والدہ اس کے لیے دودھ کا پیالہ لائی، لیکن اس نے پینے سے انکار کر دیا، وہ صرف سکون اور تنہائی چاہتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ ہلکی ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ باہر آسمان پر بادلوں کے چند آوارہ ٹکڑے تیر رہے تھے اور ڈوبتے سورج کی کرنیں پیلو کے پتوں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ وہ دیر تک غمگین خیالات میں ڈوبا رہا۔

زندگی کے تاریک پہلو اس کے سامنے پرے باندھے آ رہے تھے اور شام کے پردے آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔ پیلو کی سبزی سیاہی مائل ہو رہی تھی اور پرندوں کے غول اپنے آشیانوں کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ نوجوان مفکر کے جسم کی تکان اب میٹھے سکون میں تحلیل ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن و خیالات کی تیزی اور ہیجان قدرے کم ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ ان مسائل کے عمل کی امید ابھی باقی ہے۔ مسجد سے شام کی اذان کی آواز آئی۔ چودھری جلدی سے اٹھا اور مسجد کی طرف چل دیا۔ جب وہ ٹھنڈے پانی سے وضو کر رہا تھا تو اسے قرآن کی بتائی ہوئی ایک حقیقت یاد آئی۔ الابذکر اللہ تطمئن القلوب۔ (آگاہ رہو کہ خدا کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے)

انتقال

شام کے قریب الہ بخش نے کرتار سنگھ کو رجہا کے کنارے اپنے بال بچوں سمیت جاتے دیکھا۔ اس نے اپنا جیل رجیہا میں دھکیل دیا اور کرتار سنگھ کی طرف بڑھا۔ کرتار سنگھ نے چھکڑا روک لیا وہ الہ بخش کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا اور اس کی بیوی رونے لگی۔

الہ بخش نے نزدیک آتے ہوئے کہا: ''مجھ سے ڈر نہیں، ہم وہی ہیں جو اکٹھے بھیڑیں چراتے اور خزانچی کے باغ سے مالٹے توڑتے تھے۔''

کرتار سنگھ نے اپنی قـــــــــچھ سے رکھدی اور پگڑی کا پلو آنکھوں پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ الہ بخش ضبط نہ کر سکا اور اس کی چیخیں نکل گئیں۔

کرتار سنگھ نے روتے ہوئے کہا: ''یہ تقدیر ہے، یہ موت ہے۔ کون جانتا تھا کہ ہم ہرے بھرے کھیت چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ کون جانتا تھا کہ بچوں کے شور و غل اور میاں بیوی کی محبت سے منور گھر تج کے ہمیں جانا پڑے گا۔ اسے ڈھور ڈھکانے والے! ہم سے پوچھ موت کیا ہے۔ ہم سے پوچھ دل پر پتھر رکھ کر زندگی چھوڑنا کیا ہے۔''

کرتار سنگھ کی بیوی کا سر چھکڑے کے بانسوں پر رکھا تھا۔ اس کا چہرہ بے رنگ تھا۔ وہ ایسے نظر آتی تھی جیسے آسیب زدہ ہو۔ پتھرائی ہوئی

آنکھوں سے اس نے الہ بخش کی طرف دیکھا اور پھر اپنے گاؤں کی سمت دیکھنے لگی۔ دونوں وقت مل رہے تھے اور بجھے ہوئے افق سے سیاہی کے راتا آہستہ آہستہ ابھر رہے تھے۔ الہ بخش نے ڈھور ڈنگر مٹی ہوئی چری کی ٹھنٹیوں پر منہ مار رہے تھے۔

”بھائی! اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو لے لینا۔ اگر چاہو تو کولہو منگوا لو۔ اگر تمہیں بھینس کی ضرورت ہو تو وہ لے لو۔ ایک سیاہ رنگ کا گھوڑا پچھلے مہینے خریدا تھا وہ بھی تمہاری نذر ہے۔“

کرتار سنگھ اپنی ناک جھاڑ رہا تھا' لیکن الہ بخش چپ کھڑا سرخ آنکھوں سے چھکڑے کے پہیے دیکھ رہا تھا' وہ سوچ رہا تھا کیا ایسے دکھی لوگوں کا مال جائز ہے؟ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں! جس مال نے ان سے وفا نہیں کی وہ کسی دوسرے سے کب وفا کرے گا؟ بیلوں نے سر ہلائے اور گھنٹی کی ٹن ٹن نے کوچ کا پیغام سنایا۔ کرتار سنگھ نے قـــــــــچڑھائی لوہی بیلوں کو ہانکنے لگا: ”ہماری قسمت میں کسی کے کرموں کا پھل چکھنا تھا اچھا! رب نے چاہا پھر ملیں گے۔“

کرتار سنگھ کی آنکھیں پھر ڈبڈبا آئیں۔ اس نے الہ بخش کی طرف دیکھا۔ لیکن جلدی سے بیلوں کی طرف مڑا اور انہیں ٹٹکائے ہوئے ہانک دیا۔ چھکڑے کے پہیے چر چرانے اور اسی لکیر پر چلنے لگے جو اس سے پہلے گزرے ہوئے چھکڑوں کے بوجھ تلے سے گہری ہو چکی تھی۔

بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ یہ چھکڑ بوڑھے کیکر کے پاس پہنچ گیا تھا۔ الہ بخش نے اپنے بیل کی طرف دیکھا جو رجیہا کے چلتے ہوئے پانی میں زور زور سے سانس لے کر پانی پی رہا تھا۔ اس کا دل غمگین تھا۔ اس نے ایک بار پھر مڑ کر چھکڑے کی طرف دیکھا۔ چھکڑے سے سسکیوں کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔

الہ بخش نے ٹھنڈی آہ بھری اور اپنا بیل رجیہا سے نکالا جب وہ پٹڑی سے نیچے اتر رہا تھا تو اس کے منہ سے بے تحاشا نکل گیا: ”کلجگ ہے میاں' کلجگ!“ جب وہ اپنے کھیتوں میں پہنچا تو ڈھور ڈنگر گھر کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے اپنے بچھڑے کو ہالا جسے وہ پورے ایک سال سے اس امید پر پال رہا تھا کہ ایک دن وہ بیل بن جائے گا اور اس کے کام آئے گا' لیکن وہ چلنے کے بجائے زور سے پھنکارا۔ الہ بخش کے دل میں جس قدر غم بھرا ہوا تھا۔ اسی قدر طیش بھر گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' اس پر تابڑ توڑ چھڑیاں برسانی شروع کر دیں۔ بچھڑا گھبرا کر بھاگا اور اس کے ساتھ تمام چوپائے بھاگتے ہوئے کپاس کے کھیت میں گھس گئے۔ اس نے سرعت سے ان کا رخ پگڈنڈی کی طرف پھیرا۔ جب وہ گاؤں پہنچا اور کھیتوں سے دوسرے چوپائے بھی لوٹتے دیکھے تو ایکا ایکی اس کا جی چاہا کاش! میں کرتار سنگھ کے ڈھور ڈنگر ہی لے لیتا۔

گدھ

علی الصباح پو پھٹنے کے قریب دو گولے چھوٹنے کی آواز آئی۔ ایک گولہ اس وقت چھوٹا جب مرغ نے پہلی بانگ دی اور دوسرے گولے کی اس وقت آواز آئی جب میاں جی نے اذان دی۔ اس کے بعد کامل خاموش رہی۔ مسجد میں مستری نور اور الہ بخش بھی آ گئے۔ اور فتح محمد نے ڈول کنوئیں میں اتار دیا۔ نماز سے فارغ ہو کر جب نمازی باہر نکلے تو چک نمبر 68 کی جانب سے نور دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ دور ہی سے اپنا صافہ ہوا میں لہرا

رہا تھا۔ مستری نور گھبرا کر شیشم کے درخت سے لگ گیا جو مسجد کے صدر دروازے کے عین سامنے تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اور اس کا دل اس طرح دھک دھک کر رہا تھا گویا وہ پکار رہا ہو: ”حملہ! حملہ۔“

غلام حسن اور ابراہیم بھی باہر نکل آئے۔ نورا اب قریب آ گیا تھا، مستری نے ہکلاتے ہوئے پوچھا: ”کیوں؟ کیوں؟ کیا ہے؟“

”چک نمبر 68 بالکل خالی ہو گیا ہے۔“

نورے کا سانس پھولا ہوا تھا، مگر وہ ہراساں نہ تھا۔

مستری نے پوچھا: ”کیا مطلب؟“ وہ پورا معاملہ سمجھنے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا۔

”انہوں نے گاؤں خالی کر دیا ہے۔ وہ چلے گئے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

الہ بخش نے پوچھا: ”تم اس وقت کہاں تھے؟“

”میں صبح سویرے اسمٰعیل کے مربع میں گھاس کھودنے گیا تھا کہ میں نے چھکڑوں کی کھڑ کھڑاہٹ سنی۔ سمجھا کہ سکھ حملہ کرنے آئے ہیں۔ میں نے پہلے تو ارادہ کیا کہ بھاگ جاؤں، پھر سوچا اصل بات تو معلوم کر لوں، چنانچہ سرکنڈوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ ان کے چھکڑے ایک قافلے کی صورت میں گاؤں سے نکل رہے تھے اور وہ زار و قطار رو رہے تھے۔“

اتنا کہہ کر نورا تیزی سے چلا گیا، لیکن وہ ایسی بات کہہ گیا جسے دل فوراً قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو رہے تھے۔ مستری نور کا دل قدرے ٹھنڈا ہوا تو اس نے تھوکتے ہوئے کہا: ”یہ دھوکا ہے سکھ، گاؤں خالی کر کے کبھی جا ہی نہیں سکتے، یہ ایک چال ہے۔“

لیکن الہ بخش معاملے کو راست دیکھنا پسند کرتا تھا: ”انہوں نے گاؤں ضرور خالی کر دیا ہے۔ پرسوں کرتار سنگھ مجھے جاتے ہوئے ملا۔ اس نے خود مجھے بتایا۔“

مستری نے تیزی سے کہا ”میاں! کچھ ہوش کی دوا کرو کبھی یہ بھی ممکن ہے۔“

اس گفتگو میں فضل بھی شریک ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ پہلے چپ کھڑا سنتا رہا، لیکن جب اس نے مستری کی ہٹ دھرمی دیکھی تو اس نے بھی غیر جانبداری کا دامن چھوڑ دیا۔

”چچا! تم کیسی باتیں کرتے ہو؟ اس قوم کو ہمارا ملک چھوڑنا ہی تھا۔ جس طرح انہوں نے ہمارے بھائیوں کو ان کے گھروں سے نکالا اسی طرح وہ بھی نکالے جائیں گے۔“

مستری اس کا جواب دینے ہی والا تھا کہ سب کی نظریں رحمت کے چھکڑے کی طرف اٹھ گئیں جو بڑی تیزی سے بھگائے لا رہا تھا۔ وہ بیلوں کے کولھوں میں زور زور سے قمچیاں چبھوتا ہوا پکار رہا تھا: ”گاڑی چلی ہے، مال لانے“ اس کے پیچھے نور گدھی پر پالان ڈالے چلا آ رہا تھا۔ وہ گدھی کو چک نمبر 68 کی طرف کھینچ رہا تھا لیکن وہ اپنے گاؤں ہی میں رہنے پر مصر تھی۔ نور نے غصے میں اس کی دم مروڑی پھر گویا اسے کوک لگ گئی۔ وہ نہایت پھرتی سے چلنے لگی۔ اس کے بعد دو تین اور مزارع نمودار ہوئے۔ وہ سب چک 68 کی طرف رخ کیے ہوئے تھے۔

”یہ عجیب تماشا ہے!“ مستری کا غصہ حیرت میں ڈوب گیا۔ ایکا ایکی فضل بھی اچھلا اور گھر کی طرف اٹھ دوڑا۔

مستری زور سے پکارا: ”فضل! او فضل! مت جاؤ خطا کھاؤ گے۔“

الہ بخش نے بھی آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف قدم اٹھائے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ کرتار سنگھ سے کوٹھو لے لیتا تو کیا حرج تھا اس کا سیاہ گھوڑا کتنا خوب صورت تھا۔ اور خیال میں اس نے اپنے تئیں سیاہ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار اپنے مربع کا چکر لگاتے دیکھا۔ دل نے کہا اب بھی موقع ہے چک نمبر 68 ضرور جانا چاہیے۔ مستری اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا اور اس کی آواز ابھی تک سنائی دے رہی تھی ”یہ چال ہے' یہ چال ہے۔“

الہ بخش گھر آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ہر جگہ نمبر 68 کی باتیں ہو رہی تھیں۔ احاطے میں ایک حقے کے گرد مجمع لگا تھا اور کریم نائی کہہ رہا تھا:

”گولے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میرے قریب میرا لڑکا لیٹا ہوا تھا۔ وہ ڈر گیا۔ میری بیوی کہنے لگی کمبخت سکھ کہیں حملہ تو نہیں کرنے والے؟“

صالح کھوجی نے حقے کا کش لگایا اور نہایت سکون سے ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگا: ”ابھی تارے مغرب کی طرف جھکے نہیں تھے۔ جب میری آنکھ کھلی' بھینس چونی کے پائے کے ساتھ سینگ مار رہی تھی۔ کھٹ کھٹ سے نیند اچٹ گئی۔ میں نے اسے کھول کر الگ کھونٹے پر باندھا۔ اس وقت رمضان چلم بھرنے کے لیے آگ سلگا رہا تھا۔ میں پھر لیٹ گیا۔ ابھی لیٹا ہی تھا کہ گولہ چلنے کی آواز آئی۔ میں نے کہا: ”یہ کیا؟“ رمضان بولا: ”یہ بم ہے جو مسلمانوں کو ڈرانے کے لیے پھینکا گیا ہے۔“

صالح کے پاس ایک دبلا پتلا نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ ٹھیکیدار ابراہیم کا بیٹا تھا۔ اس نے مڈل تک تعلیم پائی تھی۔ اس نے کہا: ”سکھ واقعی جا رہے ہیں' لیکن کیوں؟“

صالح نے پوچھا: ”کیا تمہیں معلوم نہیں؟ لڑکے نے کہا: ”وہ اپنے کرتوتوں کے خوف سے بھاگ رہے ہیں۔ جانتے ہو انہوں نے وہاں کیا کیا؟ ان کے ادنی سے ادنی جاروب کش سے لے کر بڑے سے بڑے افسر تک مسلمانوں کو وطن بدر کرنے پر تلا ہوا ہے اور وہ سب ایک منظّم سازش کے تحت کام کر رہے ہیں۔ ان کی فوج مسلمانوں کو قتل کرنے میں پیش پیش ہے۔ اب وہ اپنے انجام کے خوف سے پہلے ہی بوریا بستر گول کر کے جا رہے ہیں۔ انہیں کسی نے نکالا تو نہیں۔

اسی لمحے احاطے میں رحمت کا چھکڑا داخل ہوا جو گندم کی بوریوں' چارپائیوں' کرسیوں اور میزوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ تمام لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ حقہ چھوڑ کر رحمت کے چھکڑے کی طرف لپکے: ”کیا سکھ واقعی جا چکے ہیں؟“

”تمام گاؤں خالی پڑا ہے۔ گندم کی بوریوں کے انبار لگے ہیں گڑ کے ڈھیر لگے ہیں' شکر بازاروں میں مٹی کی طرح بکھری ہوئی ہے۔ ڈھور ڈنگر کھیتوں میں آوارہ پھر رہے ہیں۔“ پھر رحمت نے اپنے بھائی اللہ دتے کو پکارا اس کی بیوی اور بہن تیزی سے باہر نکلیں اور چھکڑے سے کرسیاں کھینچ کھینچ کر اتارنے لگیں۔

اس کے ساتھ ہی کھٹ کھٹ کی آوازیں بلند ہونی شروع ہو گئیں۔ بیلوں کی گھنٹیاں ایک مسلسل شور کے ساتھ بجنے لگیں اور اس کے چند لمحوں بعد ایک زبردست کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ چند چھکڑے احاطے سے باہر نکل رہے تھے۔

الہ بخش بے چینی کے عالم میں اپنے گھر کے سامنے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ اس کی بیوی رحمت کا سامان دیکھنے گئی تھی وہ سوچ رہا تھا چک نمبر 68 میں جانا خالی اور خطر ہے یا پر از خطر۔ شاید یہ واقعی سکھوں کی چال ہو۔ وہ گاؤں سے نکل کر قریب کے کھیتوں میں چھپ گئے ہوں کہ جونہی مسلمان آئیں ان کا قلع قمع کر دیں۔ لیکن چھکڑوں کی کھٹا کھٹ اس کے دل پر ہتھوڑے کی ضربوں کی طرح پڑ رہی تھی۔ اس کے پاؤں گھر کے آنگن میں گڑے ہوئے تھے' مگر اس کا تخیل چک نمبر 68 کی گلیوں میں گندم کی بوریوں اور گڑ شکر کے ڈھیروں کو روندتا ہوا جا رہا تھا۔ اتنے میں اس کی بیوی بھی آ گئی اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے اور خشک تھے۔ وہ بہت گندی عورت تھی: ''تم نہیں جاؤ گے؟''

بیوی کے اس سوال پر اس کا دل مردانگی سے بھر گیا: اس نے سوچا مجھے ضرور جانا چاہیے۔ گھر میں گندم کی آخری بوری ختم ہونے کے قریب ہے۔ اگر میں آج نہ گیا تو کل گندم کہاں سے آئے گی۔ ہم غریبوں کی امیدوں کا آخری سہارا گنگا رام بھی سدھار چکا ہے۔ اب میں کس کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہوں؟

اس کی بیوی چیخی: ''تم تو سدا سوچ ہی میں ڈوبے رہو گے اچھا بیٹھے رہو' میں جا رہی ہوں۔''

الہ بخش کا سویا ہوا غصہ جاگ اٹھا۔ دروازے سے چلایا: ''چڑیل کہیں کی! مت جاؤ۔''

''کیوں؟ اور یہاں بیٹھ کر تمہارا منہ دیکھوں؟ میں جا رہی ہوں۔

''بیوقوف! یہ بھی سکھوں کی ایک چال ہے۔ وہ دیکھ کے کھیتوں میں چھپے بیٹھے ہیں اور موقع پا کر نکل آئیں گے۔''

لیکن اس نے الہ بخش کے غصے کو ذرا وقعت نہ دی اور چلی گئی۔ پھر الہ بخش کے دل میں خیال آیا رحمت اتنا سامان لے آیا تھا۔ مگر اسے راہ میں ٹوکنے والا کوئی نہ ملا۔ اس کے بعد اس نے اپنا حقہ اٹھایا اور گاؤں کے چوک کی طرف چل دیا۔

چوک میں گنگا رام کی اجڑی ہوئی دکان کے سامنے چارپائیوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ چودھری منصور ان کے درمیان ایک بڑی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے چوک میں سے گزرتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ گلاب خاں بھی موجود تھا۔ وہ بھی گاؤں کا سربرآوردہ تھا۔ اس مجلس میں وہی گفتگو ہو رہی تھی۔ لوگ قدرتی طور پر چودھری کے خیالات معلوم کرنے کے خواہاں تھے کیونکہ وہ گاؤں کا چودھری تھا اور نیک آدمی تھا۔

(تحریر جیلانی بی اے۔ اردو ڈائجسٹ' اگست 1983ء)

آپ کے اشتہار / پیغام کی جگہ

کیا آپ کتاب گھر ذریعے ہزاروں لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانا چاہتے ہی؟؟؟ کیا آپ اس جگہ پر اپنا اشتہار/ پیغام دیکھنا چاہتے ہیں؟؟؟ آپ اپنی کتاب، ویب سائٹ، فورم (میسیج بورڈ) کاروبار یا کسی بھی قسم کے اشتہار/ پیغام کے لیے رابطہ کر سکتے ہیں۔ رابطہ کے لیے kitaabghar.com پر موجود Contact Us فارم استعمال کیجیے یا پھر kitaab_ghar@yahoo.com پر ای۔میل کیجیے۔

طلوعِ آزادی کی چند یادیں

میں نے جون کا مہینہ علی گڑھ میں گزارا۔ ان دنوں ہم قانون کے امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ امتحانات جولائی میں ہونے والے تھے۔ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں سہ فریقی فیصلہ ہو چکا تھا‘ اس لیے 3 جون 1947ء کو آل انڈیا ریڈیو پر وائسرائے ماؤنٹ بیٹن‘ پنڈت نہرو‘ قائداعظم محمد علی جناح اور سردار بلدیو سنگھ کی تقریروں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اکثر لوگوں کے پاس ریڈیو نہ تھے‘ اس لیے سرِ شام ہی یونیورسٹی کے باہر بازار اور کیفے کے پاس اساتذہ‘ طلبہ اور مسلمان شہریوں کا اجتماع ہونے لگا۔ لوگ بے چینی سے تقریریں سننے کا انتظار کر رہے تھے۔ سب سے زیادہ خوشی قائداعظم کی تقریر سن کر ہوئی۔ انہوں نے اپنی تقریر کے اختتام پر پاکستان زندہ باد! کہا تو ہم سب نے بھی تائید میں یہی نعرہ بلند کیا۔

قائداعظم کی تقریر کے بعد اب پاکستان ایک حقیقت بن گیا تھا۔ مسلمانانِ ہند اپنی کامیابی پر نازاں تھے اور بارگاہ رب العزت میں سربسجود!

امتحانات سے فارغ ہو کر میں اپنے قصبے ٹوہانہ (مشرقی پنجاب) پہنچا تو حالات بالکل ٹھیک تھے۔ ہندو اور مسلمان وہاں پرامن طریقے سے رہ رہے تھے۔ قصبے میں آبادی مسلمانوں کی زیادہ تھی‘ لیکن دیہات میں ہندو اکثریت کے حامل تھے۔ شمال‘ مشرق اور جنوب کی طرف دیہات ہندو اکثریت کے تھے۔ البتہ مغربی جانب کے دیہات میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور اس کا سلسلہ پاکستان کے موجودہ علاقوں تک چلا گیا تھا۔ جولائی میں وسطی ہند اور پنجاب کے بعض علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے تھے‘ مگر ان سے ہمارا علاقہ متاثر نہ ہوا تھا۔ موسم گرما کی تعطیلات ہو چکی تھیں۔ میرے اکثر دوست کالجوں اور اسکولوں سے گھر آئے ہوئے تھے۔ کچھ دوست جو فوج یا دوسرے سرکاری محکموں میں ملازمت کر رہے تھے‘ وہ بھی چھٹی منانے ٹوہانہ چلے آئے تھے۔ ہم نے حفظ ماتقدم کے طور پر یہ پروگرام بنایا کہ نوجوانوں کو جسمانی تربیت دی جائے۔ تجویز معقول تھی‘ بڑوں نے بھی تائید کی۔ ویسے تو ہم نے اپنے قصبے میں شام کے وقت ہلکی پھلکی کھیلوں مثلاً والی بال‘ کبڈی اور گھوڑا کبڈی وغیرہ کا بندوبست کر رکھا تھا‘ مگر اب ہم نوجوانوں کو صحیح قسم کی تربیت دینا چاہتے تھے تاکہ بوقت ضرورت اپنا دفاع کر سکیں۔ قصبے سے باہر ایک نسبتاً پرسکون جگہ کا انتخاب ہوا جہاں علی الصبح جسمانی تربیت‘ شمشیر زنی اور نیزہ بازی سیکھنے کا پروگرام بنا۔ خود ہی استاد بنے اور شاگرد بھی۔ جسمانی تربیت دینے کی خاصی مشکل ذمے داری میرے حصے میں آئی۔ اس تربیت کے ساتھ ساتھ اکثر نے نیزے بنوا لیے۔ نیزوں کے علاوہ مضبوط لاٹھیاں بھی تیار کر لی گئیں۔

آزادی ہند کا اعلان ہو چکا تھا اور تاریخ کا تعین بھی حالات ابھی تک پرسکون تھے۔ ہمارے قصبے میں اخبارات تو باقاعدگی سے آتے تھے‘ مگر ان دنوں ریڈیو صرف دو یا تین گھروں میں تھے جہاں لوگ تازہ خبریں سننے اہتمام سے جمع ہو جاتے۔ خبروں کے بعد گپ شپ اور تبصرہ ہوتا۔ ہمیں باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ مردم شماری اور پچھلے تمام ریکارڈ کی بنا پر یقین تھا کہ ہمارا علاقہ پاکستان میں شامل ہوگا۔

البتہ اخبارات کی خبریں اور ہندوؤں کے تبصرے نئے نئے خدشات کو جنم دے رہے تھے‘ اس لیے ہم چاہتے تھے کہ جتنی جلد ممکن ہو نئی مملکت کی سرحدیں متعین ہو جائیں۔ سرکاری اداروں میں افسروں کے تبادلے ہو رہے تھے۔ ہمارے مسلمان پوسٹ ماسٹر صاحب اگست کے پہلے ہفتے مغربی پنجاب میں تبدیل کر دیے گئے۔ مسلمان ڈاکٹر بھی ساہیوال چلے گئے۔ تھانیدار سید عنایت اللہ اور ہیڈ ماسٹر صاحب انسپکٹر کوآپریٹو سوسائیٹیز اور کچھ دوسرے اہل کار مسلمان تھے۔ ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین اور تین ارکان بھی مسلمان تھے جبکہ دو ممبر ہندو تھے‘ مسلمان اہل کاروں کے تبادلے ظاہر کر رہے تھے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

رمضان المبارک اپنی برکتوں کے ساتھ ہماری ہمت افزائی کا موجب بنا رہا۔ نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ نماز جمعہ کے لیے مسجدوں میں جگہ تک نہ ملتی۔ رات کو نماز تراویح کے لیے لوگ جوق در جوق مسجدوں کا رُخ کرتے اور بڑے خشوع و خضوع سے دعائیں مانگی جاتیں۔

14 اگست کا تاریخی دن بھی ہمیشہ یاد رہے گا۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ایک باوقار تقریب میں پاکستان کا گورنر جنرل بننے کا اعلان ہو گیا۔ ہم نے اس روز پاکستان کے استحکام اور سلامتی کی دعائیں مانگیں‘ بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ افطاری کے موقع پر مٹھائی تقسیم ہوئی۔ خبریں سنتے رہے۔ 14 اگست کو بھی ہم نے باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کا شدت سے انتظار کیا۔

15 اگست کو آزادی ہند کا باقاعدہ اعلان ہونا تھا۔ نائب تحصیلدار ہندو تھا۔ اس نے ہمارے چند بزرگوں کو پیغام بھجوایا کہ آزادی کی پرمسرت تقریبات میں حصہ لینے آئیں۔ چند نوجوانوں نے مخالفت کی‘ مگر آخر یہی فیصلہ ہوا کہ تقریبات کا بائیکاٹ نہیں کرنا چاہیے۔ اس وقت بھی ہمیں یقین تھا کہ ہمارا علاقہ پاکستان ہی کا حصہ بنے گا۔ بزرگ حضرات گئے۔ کانگرس کا ترنگا تحصیل کی عمارت پر لہرا دیا گیا۔ عین اس وقت اسکول کے مسلمان بچوں نے اکٹھے ہو کر سبز جھنڈا ہاتھ میں لیا اور میرے خالہ زاد بھائی شوکت علی خاں کی رہنمائی میں ایک چھوٹا سا جلوس نکالا۔ یہ جلوس تمام شہر میں گشت کرتا پھرا۔ وہ ہندو اکثریت کے علاقے میں بھی گئے اور پاکستان زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کے نعرے بلند کیے اس مختصر سے جلوس نے ہندو آبادی میں خوف کی لہر دوڑا دی۔ ہم نماز جمعہ کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے کہ تھانیدار عنایت شاہ صاحب آئے اور میرے تایا بزرگوار سے کہا کہ مصلحتاً بچوں کو جلوس نکالنے سے منع کیا جائے۔ تایا صاحب نے فرمایا کہ انہیں کسی نے نہیں اکسایا۔ مسلمانوں کی طرف سے جوش و عقیدت کا اظہار اقبال بعید تھا۔ نماز جمعہ کے بعد خشوع و خضوع کے ساتھ پاکستان کے حق میں دعا مانگتے رہے۔

میں اپنے چند احباب کے ساتھ قصبے سے باہر چلا گیا۔ موسم انتہائی خوشگوار تھا اور بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہم سب روزے سے تھے‘ صرف وقت گزاری کے لیے باہر نکلے تھے۔ اس اثنا میں ہم نے کچھ لوگوں کو ہندو آبادی کی طرف جاتے دیکھا۔ نزدیک پہنچے تو دیکھا کہ سب ہندو لڑکے ہیں۔ دو ایک ادھیڑ عمر آدمی بھی تھے۔ میرا ایک اہم جماعت بھی ان میں شامل تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر حیران اور متذبذب ہوئے۔ ان کے رویے سے ہمارے خدشات میں اضافہ ہو گیا۔ یہ لوگ ہندو دیہات کی طرف سے آ رہے تھے۔ شاید مسلمانوں کے خلاف کسی خفیہ منصوبے پر عمل ہونے والا تھا۔

17 اگست کو نئی مملکتوں کی حد بندی کا اعلان ہونے والا تھا۔ اس شام افطاری کے بعد ہم سیر کرتے ہوئے ہندو آبادی کی طرف نکل گئے۔ خبروں کا وقت ہو رہا تھا۔ ہم ایک ہندو دوست کے گھر ریڈیو پر خبریں سننے بیٹھ گئے۔ ہمیں تو خبروں کا سخت انتظار تھا۔ مگر ہندو حضرات بالکل مطمئن

تھے۔ توقع تھی کہ ہمارا مسلم اکثریت کا علاقہ پاکستان کا حصہ بنے گا مگر ریڈکلف نے گہری سازش میں ملوث ہو کر نہایت ہی غیر منصفانہ فیصلہ کیا اور بہت سے مسلم اکثریتی علاقے بھارت میں شامل کر دیے۔ ہمارا علاقہ بھی پاکستان کا جزو نہ بن سکا۔

اعلان آزادی اور سرحدوں کا تعین ہونے کے بعد حالات خراب ہونا شروع ہو گئے۔ 26 اگست کو میرے والد بزرگوار جس ریل گاڑی سے سفر کر رہے تھے۔ اس میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ بحمد اللہ والد صاحب بخیریت گھر پہنچ گئے۔ 23 تاریخ کو چند مسلمان فوجی قتل کر کے ان کی لاشیں ٹرین سے باہر پھینک دی گئیں۔ ان میں افسران بھی تھے۔ ٹوہانہ کے مسلمانوں نے انہیں احترام سے دفن کر دیا۔

31 اگست کو میرے تایا زاد بھائی سلطان احمد خاں کو دھوری اسٹیشن پر شہید کر دیا گیا۔ وہ اپنی پولیس کی ملازمت مکمل کرنے کے بعد پنشن پر گھر آ رہے تھے۔ ہمارے قصبے کے سب سے پہلے شہید سلطان بھائی تھے۔ ان کی شہادت کی خبر قصبے میں پہنچی تو ایک کہرام سا مچ گیا۔ تمام بازار جس میں زیادہ تر دکانیں ہندوؤں کی تھیں' بند کر دیا گیا اور ہر طرف خوف و ہراس کی فضا مسلط ہو گئی۔ اگلے روز تھانیدار عنایت شاہ صاحب تبدیل کر دیے گئے۔ اور ان کی جگہ ایک ہندو تھانیدار تعینات ہوا۔ بعد میں عنایت شاہ صاحب کے بارے میں پتہ چلا کہ انہیں ہندو بلوائیوں نے ان کے اہل خانہ سمیت شہید کر دیا۔

21 اگست تک امن و امان کی صورت حال بے حد بگڑ گئی۔ مسلم اکثریت کے محلوں میں کچھ ہندو آباد تھے اور ہندو اکثریت کے علاقے میں چند مسلمان گھرانے رہتے تھے۔ جوں جوں حالات خراب ہوتے گئے ہندو' ہندوؤں کے علاقے میں اور مسلمان' مسلمانوں کی آبادی میں چلے گئے۔ گویا چھوٹے سے قصبے میں پاکستان اور بھارت کا نقشہ بن گیا۔ مسلم نوجوانوں کی تربیت جاری رہی۔ اب اسلحہ حاصل کرنے کی تگ و دو شروع ہوئی۔ بڑی جدوجہد سے لوگوں نے چند توڑے دار بندوقیں' لوکل توپیں اور دیگر اسلحہ اکٹھا کیا۔

انہی دنوں پتہ چلا کہ والد صاحب کے مکان کو جہاں وہ اپنا سارا سامان چھوڑ آئے تھے' ہندو غنڈوں نے لوٹ لیا ہے' البتہ والد صاحب کی بندوق سے ہمارے کچھ عزیزوں نے کام لے کر اپنی جانیں بچائیں اور ہندو حملہ آوروں کا منصوبہ ناکام بنایا اور ان کا جانی نقصان بھی کیا۔

اب مغرب کی جانب دیہات سے مسلمانوں نے ہجرت کرنا شروع کر دی اور اہم چاروں طرف سے دشمن کے نرغے میں پھنس کر رہ گئے۔ دیہات سے بعض مسلمان جانیں بچا کر ہمارے قصبے میں آ رہے تھے اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان کو جائے پناہ ملی اور ہمیں ان کی تعداد سے اپنی قوت میں اضافے کا احساس ہوا۔ مشرقی پنجاب میں اب ہر جگہ فسادات کی آگ پھیل رہی تھی۔ مجھے علی گڑھ جانا تھا' کئی بار اسٹیشن گیا' مگر ٹرین سروس معطل تھی' اس لیے اپنے اعزہ و اقارب کے ساتھ آزمائش کے یہ دن وہیں گزارے پھر موقع ملنے پر ہم پاکستان چلے آئے۔

(تحریر کرنل ریٹائرڈ محبوب حسین خاں لودھی اردو ڈائجسٹ اگست 1983ء)

گل آزادی

ان گنت گلاب لہو میں نہا گئے اور لاکھوں کلیاں دُشمن کی خوں آشامیوں نے پامال کر ڈالیں تب کہیں پاکستان وجود میں آیا۔ مشکور حسین یاؔد نے ایک ایسے ہی گلاب کی داستان خونچکاں خاص آزادی نمبر کے لیے رقم کی ہے۔

میں جب بھی گلاب کا پھول دیکھتا ہوں مجھے اپنی شہید ممانی صابرہ یاد آ جاتی ہیں۔ اسی طرح جب ممانی صابرہ یاد آتی ہیں' تو میری آنکھوں کے سامنے خود بخود ایک تروتازہ سا گلاب کا پھول کھل اٹھتا ہے۔ قصہ دراصل یوں ہے کہ قیام پاکستان یعنی اگست 1947ء سے چند روز پہلے ہی ہمارے ماموں سید یاور حسین کی شادی ہوئی تھی۔ برات منڈی ڈبرالی ضلع حصار سے کرنال گئی تھی اور کرنال سے ہم ممانی صابرہ کو بیاہ کر لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے میکے میں ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ادھر ہمیں یہ شوق تھا کہ ممانی کو جلد از جلد دیکھا جائے' مگر کوئی تدبیر نہیں سوجھ رہی تھی کہ جس کے سہارے ہم موصوفہ کی زیارت سے مشرف ہو سکتے۔ راستے میں کسی اسٹیشن غالباً بھٹنڈہ جنکشن پر ہمیں گاڑی تبدیل کرنے کے لیے کچھ دیر قیام کرنا تھا۔ موقع غنیمت جان کر ہم ممانی کے پاس آئے۔ امی سے کہا کہ ہم دلہن کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ امی نے جواباً ڈانٹ پلائی: ''برخوردار! دُلہن کی رونمائی کا تم نے یہ کونسا وقت نکالا ہے؟'' ہم خاموش ہو گئے لیکن ابھی ہم اپنی جگہ سے ملنے والے ہی تھے کہ ایک ہوا کا تیز سا جھونکا آیا جس نے ممانی کے رخ سے قدرے نقاب الٹ دی۔ بس گلاب ایسا ہی تو ان کا چہرہ تھا سرخ اور سفید...... یہ گلاب کس طرح خون میں نہایا یہ تفصیل سننے سے پہلے ذرا ممانی صابرہ کے بارے میں دو چار باتیں سن لیجئے۔

آج کل ممانی صابرہ کے والدین کرشن نگر لاہور میں رہتے ہیں اور ان کی ایک چھوٹی بہن ڈاکٹر زاہدہ یوسف' نکلسن روڈ' قلعہ گوجر سنگھ میں پریکٹس کرتی ہیں۔ ممانی صابرہ کی والدہ سے میں پہلے بھی ایک دو بار مل چکا ہوں' لیکن اس بار ممانی صابرہ پر یہ مضمون لکھنے کے لیے میں ان سے ملا' تو ان کے ساتھ ڈاکٹر زاہدہ بھی تھیں' بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کے مکان پر ہی ملاقات ہوئی۔ پاکستان کو بنے 29 سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور 29 سال ہی ممانی صابرہ کو شہید ہوئے بیت گئے' مگر ان دونوں خواتین کے دلوں پر ممانی صابرہ کا زخم بالکل تازہ نظر آ رہا تھا۔

میں نے ڈاکٹر زاہدہ سے سوال کیا: ''ممانی صابرہ آپ کی بڑی بہن تھیں۔ آپ کو جب ان کا خیال آتا ہے' تو ان کی کون سی بات آپ کو فوراً یاد آتی ہے۔؟''

''بھیا! مجھے ان کا بھولپن یاد آتا ہے۔ وہ بہت ہی بھولی بھالی لڑکی تھیں۔ ہم مذاق میں جو چاہے ان کو کہتے وہ بلا جھجک ہماری بات مان

لیتیں۔'' ڈاکٹر زاہدہ کے اس کہنے پر مجھے خیال آیا کہ واقعی ممانی صابرہ بے حد بھولی تھیں۔ ممانی صابرہ کی ساس یعنی میری نانی نے بھی سب سے پہلے اپنی بہو کی' اسی صفت کی تعریف میری والدہ کے روبرو کی تھی۔ نانی میری امی سے کہہ رہی تھیں ''بانو! میری بہو صابرہ تو بہت ہی بھولی ہے۔ اسے جس طرح بھی یہ بچے کہتے ہیں وہی کرنے بیٹھ جاتی ہے۔ کسی کا دل بھی تو نہیں توڑتی۔''

غالباً آپ میری اس بات کی تائید کریں گے کہ بھولے بھالے لوگ ایثار پسند ہوا کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہر وقت کسی نہ کسی کے کام آنے کے لیے تیار رہتے ہیں اور ممانی صابرہ کو تو بہت بڑی قربانی دینا تھی' اپنے وطن پر قربان ہونا تھا' بھلا وہ کیسے بھولی نہ ہوتیں۔ ممکن ہے آپ کو خیال آ رہا ہو۔ وطن عزیز پر قربان ہونے کے ضمن میں صرف میں اپنی ممانی صابرہ کا ذکر کر رہا ہوں اور ان ہزاروں لاکھوں صابراؤں کو فراموش کر رہا ہوں جو میری ممانی صابرہ کی طرح نہایت بھولپن کے ساتھ 1947ء میں شہید ہو گئیں۔ نہیں صاحب ایسی بات نہیں' اپنی ممانی صابرہ کے ذکر سے میرا مقصد بھی یہی ہے کہ میں آپ کو اُن اَن گنت صابراؤں کی یاد دلاؤں جن کا شاید آج کوئی ذکر کرنے والا بھی موجود نہ ہو۔ ممانی صابرہ کے حوالے سے ان سب صابراؤں کو ہمارا اور آپ کا سلام پہنچے جنھوں نے آزادی کی راہ میں اپنے جیتے جاگتے خون کی قربانیاں دیں۔

ڈاکٹر زاہدہ اور ان کی والدہ نے بتایا کہ صابرہ بہت ڈرپوک تھیں۔ کمرے میں اگر کوئی ذراسی چوہیا بھی آ جاتی تو وہ ڈر کے مارے پلنگ پر چڑھ کر بیٹھ جاتیں اور جب تک وہ چوہیا نکل نہ جاتی یہ اسی طرح ڈری بیٹھی رہتیں' لیکن عجب بات ہے کہ میں نے ممانی صابرہ کو ایسا نہیں پایا۔ میں 20 اگست کو حصار سے منڈی ڈبوالی آ گیا تھا اور اس سے اگلے روز ہی پتہ چلا کہ تمام راستے بند ہو گئے ہیں اور سکھ منڈی ڈبوالی کے مسلمانوں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ تمام رات آنکھوں میں گزری تھی۔ عجیب قسم کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا۔ ہر شخص اپنی جگہ ہراساں تھا۔ اسی عرصے میں ممانی صابرہ کے دیور دلاور حسین بیمار ہو گئے۔ گویا پریشانی میں ایک اور پریشانی' مگر میں نے دیکھا کہ ممانی صابرہ کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اسی طرح سب بچوں کو خوش و خرم رکھنے میں مصروف رہتیں۔ اپنے دیور سید دلاور حسین کو بھی حوصلہ دیتیں اور کہتیں: ''بھیا معمولی سی بیماری کو مرد اس طرح کب لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔'' غالباً دلہن ہونے کی وجہ سے اور عادتاً بھی ممانی صابرہ کو میں نے اونچی آواز سے بولتے کبھی نہیں سنا۔ بس وہ بچوں کے کان میں چپکے سے کچھ کہتیں اور بچے کھلکھلا اٹھتے۔ ماموں دلاور حسین نے ایک دفعہ چھیڑا ''بھابی! آپ ہر وقت چپ چپ رہتی ہیں۔ غالباً بھائی یاور حسین کو یاد کرتی ہیں یا پھر ان کے نام کی تسبیح جپتی رہتی ہیں۔''

ممانی صابرہ نے اس کے جواب میں ایک مسکراہٹ کے سوا کچھ نہیں کہا۔ نئی نویلی دلہن ہونے کی حیثیت کو انہوں نے آخری وقت تک برقرار رکھا' حتیٰ کہ جس وقت وہ شہید ہونے کے لیے گھر سے باہر نکلیں انہوں نے منہ پر رومال رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک دلہن کی طرح سمٹتی سمٹائی قتل گاہ کی طرف جا رہی تھیں۔ مہندی سے رچا ہوا ان کا ایک ہاتھ ان کی ساس کے کاندھے پر سہارے کے طور پر اس وقت بھی موجود تھا۔

ایک رات کا ذکر ہے منڈی ڈبوالی کے مسلمانوں کا خیال تھا کہ اس رات سکھوں کا ایک بہت بڑا اجتھا مسلمانوں کے محلے پر حملہ کرنے والا ہے' اس لیے بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ مجھے وہ رات اب بھی یاد آ جاتی ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بس ہر لمحہ یہ خیال ہوتا تھا کہ اب حملہ آور آئے اور انہوں نے ہم سب کا صفایا کیا۔ رات کے قریباً تین بجے ہوں گے کہ یک لخت محلے کی دوسری طرف سے نعرہ تکبیر بلند

ہوا۔ سب اپنے اپنے گھروں میں جو کچھ بھی ہتھیار پاس تھے لے کر تیار ہو گئے۔ میں نے ممانی صابرہ کو دیکھا کہ وہ وضو کر کے نماز کے لیے کھڑی ہو رہی ہیں۔ میں سمجھا غالباً ڈر کر انہوں نے نماز پڑھنا شروع کر دی ہے‘ مگر ممانی صابرہ کی ساس نے بتایا کہ ایسا نہیں‘ بلکہ جب سے بہو گھر میں آئی ہے پچھلے پہر اٹھ کر نماز پڑھنا اس کا معمول ہے۔ ڈاکٹر زاہدہ اور ان کی والدہ نے اس بات کی تصدیق کی کہ صابرہ روزہ نماز کی بڑی پابند تھیں۔ بھولے بھالے لوگ عام زندگی میں ڈرپوک بھی نظر آتے ہیں‘ لیکن کوئی خاص وقت پڑتا ہے تو یہ لوگ جہاں مجسمہ ایثار بن جاتے ہیں وہاں ان کے رویے میں خاص طرح کی طمانیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے ممانی صابرہ کی شخصیت میں وہی طمانیت نظر آتی تھی۔ بس ایک سنبھلا سنبھلا یا۔ انداز جس میں توکل کی شان نمایاں۔ کم از کم مجھے ایک لمحے کے لیے بھی ممانی صابرہ میں کبھی گھبراہٹ کے آثار نظر نہیں آئے۔ انہیں تو میں نے اس وقت بھی پریشان نہیں دیکھا جب ہمارے گھر پر گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ وہ کچھ اس طرح خاموشی کے ساتھ یہ سب منظر دیکھ رہی تھیں جیسے انہوں نے اسے اپنی تقدیر سمجھ کر قبول کر لیا ہے اور اب وہ ہر چہ باداباد کی منزل پر متمکن ہیں۔

میں نے جب ممانی صابرہ کی والدہ اور ان کی چھوٹی بہن ڈاکٹر زاہدہ سے پوچھا کہ ممانی صابرہ کا پاکستان کے بارے میں کیا خیال تھا تو دونوں نے بیک وقت جواب دیا: ”صابرہ تو یہ کہتی تھی میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔“ میں نے اپنے دل میں کہا۔ ”وہ ٹھیک ہی تو کہتی تھیں پاکستان نہیں آئیں نا!“

معلوم نہیں کس جذبے کے تحت ممانی صابرہ نے اپنے میکے میں یہ کہہ دیا کہ وہ پاکستان نہیں جائیں گی۔ ہمارے ہاں تو جس وقت بھی پاکستان کا ذکر آتا تھا ان کی آنکھوں میں ایک خاص طرح کی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ تو یہ چمک دیکھ کر ماموں دلاور حسین نے شرارت سے کہہ دیا: ”بھائی دراصل پاکستان کا نام زبان پر آتے ہی آپ اس لیے بے اختیار سی ہو جاتی ہیں کہ وہاں آپ کے دولہا پہلے سے پہنچ چکے ہیں۔“ یہ فقرہ سن کر ممانی صابرہ کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔ اسی طرح ایک بار میری بیوی خدیجہ نے مذاقاً ممانی صابرہ سے کہا: ممانی جان! غالباً آپ ہر وقت ماموں یاور کی فکر میں غلطاں رہتی ہیں۔“ تو انہوں نے فوراً جواب دیا تھا: ”خدیجہ بہن! مجھے ان کی فکر کیوں ہونے لگی وہ تو امن کی جگہ پر ہیں۔ میں تو آپ لوگوں کے لیے دست بدعا رہتی ہوں اور میری ساری پریشانی آپ لوگوں کے لیے ہے۔“

ان کی ایک نند نے پوچھا: ”کیا بھابی آپ کو بھائی یاور کا بالکل خیال نہیں آتا؟“ اس پر ممانی صابرہ نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا کر کہا تھا: ”اُوں ہوں۔“

انٹرویو کے دوران میں میرا خیال تھا کہ میں ڈاکٹر زاہدہ سے صرف ان کی بہن صابرہ کے بارے میں سوال کروں گا‘ لیکن ان کے اداس چہرے بلکہ پوری اداس زندگی کو دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے سوال کر ہی دیا: آپ کی شادی کب ہوئی تھی؟

آج سے تقریباً 12 سال قبل‘ انہوں نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں نے یہ سوال کر کے کوئی عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا‘ مگر اس کے باوجود میں نے دوسرا سوال کر ڈالا جو غالباً پہلے سوال سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ مجھے زاہدہ کی والدہ نے بتا رکھا تھا کہ ان کے شوہر ڈاکٹر یوسف کو قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں نے پوچھ لیا ڈاکٹر صاحب کو قتل ہوئے کتنا عرصہ گزر چکا ہے۔

اگست میں پورے دس سال ہو جائیں گے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ایک لمحہ رک کر اور آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے بولیں:

شادی کے پونے دو سال تو مجھے بس خواب ہی نظر آتے ہیں۔" یہ کہہ کر ان کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔" لیکن اس بار انہوں نے ان آنسوؤں کو آنکھوں سے باہر نہیں آنے دیا۔ فوراً موضوع بدل کر کہنے لگیں: "ہاں تو صابرہ باجی بہت ہی سلیقہ شعار لڑکی تھیں۔ انہیں نئے سے نئے کھانے پکانے کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ میٹھی چیزوں سے بے حد رغبت رکھتی تھیں۔" ڈاکٹر زاہدہ کی والدہ بولیں۔ "کیا بتاؤں مشکور! میری ایک بیٹی صابرہ پاکستان پر قربان ہو گئی۔ دوسری یہ زاہدہ بیٹی پاکستان میں درد وغم کا مجسمہ بن کر رہ گئی۔"

ڈاکٹر زاہدہ پھر موضوع بدل کر کہنے لگیں۔ اور سنایئے بھائی صاحب! آپ کے کتنے بچے ہیں؟ ہماری بھابی کیسی ہیں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں ڈاکٹر زاہدہ سے کسی انداز میں اظہار ہمدردی کروں۔ غالباً یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا جس میں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ انسان کے کچھ دکھ اور غم ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے آپ اظہار ہمدردی بھی نہیں کر سکتے۔ بس ایسے دکھوں اور ایسے غموں سے وہ انسان خود ہی نمٹ سکتا ہے جو ان میں مبتلا ہوتا ہے۔ غالباً ڈاکٹر زاہدہ کی توجہ کا تمام تر مرکز ان کی ایک دس سالہ لڑکی ہے یا پھر ان کے وہ مریض جو ان سے علاج کراتے ہیں۔ مجھ میں تو ڈاکٹر زاہدہ کی اس مسکراہٹ کو دیکھنے کی بھی تاب نہ تھی جو دوران گفتگو وہ بڑی ہمت و استقلال کے ساتھ اپنے چہرے پر لے آتی تھیں۔ اس مسکراہٹ میں جہاں حوصلہ اور زندگی کے سنگین حقائق سے مقابلہ کرنے کا عزم پایا جاتا تھا' وہاں بلا کی اداسی اور شدید کرب کا احساس بھی صاف طور پر نظر آ رہا تھا۔ اپنی کم ہمتی کے پیش نظر میں نے فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر زاہدہ سے انکی طرف دیکھے بغیر بات کرنی چاہیے۔ میں آخر وقت تک اپنے اسی عزم پر قائم رہا' لیکن مجھے یہ خیال بار بار ستاتا رہا کہ میں ہمدردی کے طور پر کوئی لفظ تو زبان سے ادا کروں' مگر افسوس کے مجھے کوئی فقرہ' کوئی موزوں لفظ نہ سوجھ سکا اور میں اسی طرح صم" بکم" ان سے رخصت ہو کر آ گیا۔ ممانی صابرہ کے ضمن میں ان کی بہن ڈاکٹر زاہدہ کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ دیکھ لیجئے بعض وقت دو بہنوں کی قسمتیں کس طرح درد وغم کی ایک سی لڑیوں میں بندھ جاتی ہیں۔

ممانی صابرہ پر کچھ لکھنے سے قبل جہاں میں ان کی والدہ اور انکی بہن سے ملا' مجھے چاہیے تھا کہ میں ان کے شوہر یاور حسین صاحب سے بھی ملاقات کرتا' لیکن ماموں یاور حسین سے میں کس طرح ملتا؟ ایک تو وہ آج کل کیمبل پور میں رہتے ہیں' دوسرے میں اخلاقی طور پر ان سے بے حد شرمندہ ہوں۔ وہ قریب کے رشتے میں میرے ماموں لگتے ہیں۔ نہایت حسرت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ میں ان کے کسی کام تو کیا آتا انہوں نے مجھے پچھلے دنوں اپنی بیٹی کی شادی میں مدعو کیا تھا۔ میں اس شادی میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ وہ مجھے اپنی شہید بیوی کے بارے میں بتا بھی کیا سکتے تھے' بس شادی کے بعد انہوں نے ممانی صابرہ کو ایک بار ہی تو دیکھا تھا۔ دوسرے بار تو وہ پاکستان کی سرحد پر ان کا انتظار ہی کرتے رہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ممانی صابرہ بھولی تو تھیں ہی۔ ان کے بھولپن کا ایک واقعہ اور سن لیجئے۔ جس رات حملے کا بہت خطرہ تھا اسی رات کا ذکر ہے ہماری نانی کو بہت پریشانی لاحق ہوئی' تو ممانی صابرہ نے ان سے کہا: امی! دیکھیے نا کوئی ہمیں کیوں قتل کرے گا۔ آخر ہماری خطا کیا ہے۔ اور اگر ہم اس وجہ سے مارے جاتے ہیں کہ مسلمان ہیں تو پھر اس موت سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ موت تو شہادت ہو گی۔"

اور واقعی ممانی صابرہ کی کوئی خطا نہیں تھی' لیکن وہ قتل کر دی گئیں۔ اس لیے کہ آخری وقت جب ظالم ان کے جسم پر پے در پے لاٹھیاں اور کلہاڑے برسا رہے تھے' تو وہ ہر وار پر یا اللہ کہے جا رہی تھیں۔

ہمارے گھر کی لاشیں مردہ خانے لائی گئیں، تو مجھے اور میرے والد صاحب کو تو یہ لاشیں دیکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ البتہ ہمارے ایک عزیز نے ان لاشوں کو دیکھا اور جب وہ واپس آئے تو میرے والد صاحب سے کہنے لگے: ”بھائی افضال! میں نے سب لاشیں دیکھیں، لیکن یہ نئی نویلی دلہن کی لاش کس کی تھی؟ عجیب بات ہے یہ لاش زخموں سے چور چور تھی، لیکن سمٹی سمٹائی شرم وحیا کا مجسمہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دلہن شرم وحیا کا پتلا بنی بیٹھی رہی اور ظالم اس پر وار کرتے رہے۔ قسم خدا کی، ذرا چل کر دیکھو تو سہی یوں لگتا ہے دلہن اس انتظار میں ہے کہ کوئی اس کا ڈولا اٹھانے آئے گا۔ اپنے عزیز کے یہ فقرے سن کر اس وقت میرا دل چاہا کہ زور زور سے چیخ کر ماموں یاور حسین کو آوازیں دوں کہ ماموں یاور آپ کہاں ہیں؟ آیئے نا اپنی دلہن کو لے جایئے!! کون کہہ سکتا ہے کہ حصول آزادی کے وقت اس طرح لہو میں ڈوب کر کتنی دلہنوں نے اپنے دولہاؤں کا انتظار کیا ہوگا اور آزادی کے چہرے کو تابانیاں بخشی ہوں گی۔

(تحریر مشکور حسین یاد...... اردو ڈائجسٹ آزادی نمبر)

ٹائیں ٹائیں فش

کتاب گھر پر پیش کیا جانے والا، گل نوخیز اختر کا مقبول ترین ناول، جسے پاک وہند کے قارئین نے سند قبولیت بخشی۔ اُردو کا پہلا مکمل مزاحیہ ناول، ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو ایک بار شروع کر کے ختم کیے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ ٹائیں ٹائیں فش کہانی ہے ایک غریب گھر کے سادہ لوح نوجوان کی جسے حالات ایک ارب پتی لڑکی کا کرائے کا شوہر بنا دیتے ہیں۔ اس کاغذی شادی سے پہلے اور بعد میں کمال عرف کمالے کی سادہ لوحی اور حماقتیں کیا گل کھلاتی ہیں، جاننے کیلئے پڑھیے ٹائیں ٹائیں فش۔ اسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

چناروں کے آنسو

نوجوانوں کے پسندیدہ ترین مصنف طارق اسماعیل ساگر کا کتاب گھر پر پیش کیا جانے والا پہلا ناول **چناروں کے آنسو** کہانی ہے ایسے سر پھرے آزادی کے متوالے لوگوں کی جو اپنی حریت اور آزادی کی سانس کے بدلے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہیں۔ تحریک آزادی کشمیر اور ہندوستان میں سکھوں کے خالصتان کی تحریک کے پس منظر میں لکھا گیا۔ چناروں کے آنسو کو **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

لہو لہو داستانیں

یہ 1945ء کے وسط کا ذکر ہے۔ ہم ان دنوں سرسہ ضلع حصار (مشرقی پنجاب) میں تھے۔ ہمارے محلے کا نام سبزی منڈی تھا۔ چماروں اور دھانکوں کے چند مکانات چھوڑ کر یہ پورا محلّہ مسلمانوں کا تھا۔ ہمارے مکان سے مشرق کی طرف تین چار مکان چھتوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ ان میں ہمارے رشتے دار تو نہیں رہتے تھے‘ لیکن جو بھی کرائے پر مکان لیتے ان سے ہمارا تعلق رشتے داروں سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا تھا۔ کسی سے ہمارا تعلق ماموں اور بھانجے کا تھا اور کہیں یہ تعلق خالہ بھانجے کی شکل اختیار کر لیتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ ماموں بھی ایسے تھے کہ ہم پر جان چھڑکتے اور خالائیں بھی ایسی کہ ان کا پیار سے بھانجے کہتے کہتے منہ سوکھ جاتا تھا کبھی احساس ہی نہ ہوا کہ ہم اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے سینکڑوں میل دور غریب الوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

انہی دنوں ہمارے مکان سے چوتھے مکان میں نئے کرائے دار آئے جب کوئی نیا کرایہ دار آتا تو ہمیں یہ جاننے کی خواہش ہوتی کہ یہاں ماموں کا رشتہ ہے یا خالہ کا۔ والد صاحب چونکہ ملازمت کے سلسلے میں اکثر باہر رہتے تھے‘ اس لیے چچا اور تایا کا رشتہ بہت ہی کم قائم ہوتا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے زندگی میں کسی کو چچا کہا ہو۔ ویسے میرے حقیقی چچا بھی کوئی نہیں تھے۔ جب یہ نئے کرایے دار آئے تو دوسرے دن ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہماری ایک نئی خالہ آئی ہیں۔ میں ان دنوں نویں جماعت میں تھا۔ نئی خالہ سے ملنے گیا۔ معلوم ہوا کہ ان کا بڑا لڑکا دسویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ خالہ زاد بھائی سے ملاقات ہوئی۔ سب لوگ بے حد پسند آئے۔ خالہ تو بہت ہی اچھی تھیں۔ ان کا تعلق یو۔ پی سے تھا۔ بہت ہی شستہ اور رواں اردو بولتی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کہتیں: ”واری جاؤں“ اب وہ خالہ ہمارے درمیان نہیں‘ لیکن جب کبھی وہ تصور میں لہراتی ہیں احترام و محبت کی ایک نئی کیفیت ابھر آتی ہے۔

یہ وہ دن تھے جب پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی۔ سرسہ جو لاہور سے بہت زیادہ فاصلے پر تھا اور جہاں سیاسی زندگی کا شعور بہت کم تھا وہاں بھی پاکستان کا نام بار بار لیا جاتا۔ ہمارے اساتذہ شہاب الدین صاحب اور کاظم حسین رازؔ صاحب پاکستان کے متعلق اکثر باتیں کیا کرتے۔ شہاب الدین صاحب نے علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی تھی‘ وہ پرجوش انداز میں پاکستان کی حمایت کیا کرتے۔ رازؔ صاحب کا انداز زیادہ تر منطقی اور فلسفیانہ ہوتا تھا۔ اسکول میں پاکستان کے موضوع پر ہندو طلبہ سے گرم گرم بحثیں ہوتیں۔ ایک دفعہ ایک ہندو لڑکے نے مجھے سے سوال کیا:

”تم پاکستان کا مطالبہ کس لیے کرتے ہو؟“

میں نے اسے جلانے کے لیے کہا:

’’اس لیے تاکہ تمام ہندوستان کو پاکستان بنا سکیں‘‘

وہ بہت سٹپٹایا۔ کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس کے چہرے پر نفرت پھیل رہی تھی اس نے غصے بھرے لہجے میں کہا:

’’ہم تم سے اپنی آٹھ سو سالہ غلامی کا انتقام لیں گے‘‘

’’بہادر سنگھ! ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ تم ہمیشہ غلام رہے ہو اور آئندہ بھی غلام رہو گے۔ اگر تمہیں آزادی مل بھی گئی تب بھی تم غلام ہی رہو گے تم دولت کی غلامی سے کبھی نجات نہیں پا سکتے۔‘‘

بہادر سنگھ نے اس دن کے بعد سے مجھ سے بولنا چھوڑ دیا اور پھر اس وقت بولا جب 3 ستمبر 1947ء کو ہمارے گھروں میں کیمپ قائم ہوا اور فوج نے ہمیں محاصرے میں لے لیا۔ ہم اس وقت چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے۔

بہادر سنگھ نے اس وقت مجھے للکار کر کہا تھا:

’’تمہیں اپنے الفاظ یاد ہیں؟ ہم تمہیں یہاں سے زندہ نہیں جانے دیں گے۔‘‘

’’بہادر سنگھ! تم کسی بھول کا شکار ہو۔ ہماری زندگی تمہارے قبضے میں نہیں ہے۔ ہم لڑنا مرنا جانتے ہیں۔ اس وقت تک ہمارا کوئی بال بھی بیگا نہیں کر سکتا جب تک خدا ایسا کرنا نہ چاہے۔‘‘

بہادر سنگھ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا‘ میرے قریب آیا اور آہستہ سے کہنے لگا:

’’پرسوں آپ لوگوں نے جو اللہ اکبر کے نعرے لگائے تھے انہوں نے ہمارے دل ہلا دیئے تھے مجھ پر تو اب تک دہشت طاری ہے۔ معلوم نہیں تمہارے ان نعروں میں کیا ہے؟‘‘

میں صرف مسکرا دیا تھا۔

1946ء میں حالات اور بھی بدل گئے۔ ہمارے ہاں نوائے وقت اور زمیندار ایک روز کے بعد پہنچتا تھا۔ دہلی سے جنگ اور انجام بھی آتے تھے۔ ڈان کا صرف ایک پرچہ آتا تھا۔ شام کے وقت محلے کے بڑے بوڑھے ایک جگہ بیٹھتے اخبار پڑھا جاتا‘ اور پھر عجیب عجیب تبصرے ہوتے۔

پھر 1946ء کے انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں جوش و خروش کا عجیب عالم تھا۔ ان دنوں میرے بڑے بھائی صاحب نے غلے کی دوکان کھول رکھی تھی۔ اسکول سے آ جانے کے بعد میں دوکان پر آ بیٹھتا تھا۔ دیہاتی سودا سلف لینے آتے۔ میں ان سے پوچھتا کس کو ووٹ دو گے؟‘‘

’’پاکستان کو ان سب کا ایک ہی جواب ہوتا۔ مجھے حیرت تھی کہ دیہاتیوں میں پاکستان کی لہر از خود کیسے دوڑ گئی ہے۔ حکام زیادہ تر ہندو یا انگریز تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان کے حق میں ووٹ دیئے جائیں۔ ان افسروں نے تشدد کی روش بھی اختیار کی۔ دھن کی دیوی کے درشن بھی عام کر دیئے گئے لیکن سب ہتھکنڈے بے اثر ثابت ہوئے۔ ان انتخابات نے سیاسی گہما گہمی کو تیز کر دیا۔ اب ہر طرف پاکستان کا چرچا تھا‘ مگر ابھی کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس سیاسی ارتقا کو ایک کھیل تماشہ سمجھ رہے تھے۔ ہمارے شہر میں ظہور الحسن پٹواری رہتے تھے میں نے ان سے سوال کیا تو وہ مجھے اپنے گھر پر لے گئے اور بیٹھک کے دروازے بند کرنے کے بعد آہستہ سے بولے:

''میں تمہیں ایک راز کی بات بتانا چاہتا ہوں۔''

میرا جذبہ تجسس اور گہرا ہو گیا۔ میں نے سراپا شوق بنتے ہوئے پوچھا: ''فرمایئے''

''مگر وعدہ کرو کہ اس راز کو کسی اور پر منکشف نہیں کرو گے؟''

''میں خدا کو حاضر ناظر سمجھتے ہوئے وعدہ کرتا ہوں''

''اچھا تو پھر سنو! مجھے ایک انگریز افسر نے بتایا ہے کہ ہم نے ہندوستانیوں کو پہلے کچھ مراعات دیں۔ وہ بہت بے سرے ہو گئے۔ اب ہم ان پر بہت سختی کرنے والے ہیں۔ جب خوب سختی کر چکیں گے تو پھر ذرا سی نرمی اختیار کریں گے۔ سختی کے بعد وہ ذرا سی نرمی انہیں بہت اچھی لگے گی۔''

ظہور الحسن صاحب نے پر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا گویا پوچھ رہے ہوں' کچھ سمجھے!

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پر اب بہت سختی ہونے والی ہے۔

''تو اور کیا؟ کیا انگریز آسانی سے اتنا بڑا ملک چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ ان سیاسی لیڈروں کی بھلا کیا اہمیت ہے؟ انگریز بہت دانش مند ہے۔ وہ کچی گولیاں نہیں کھیلا۔ ایسا چکر دے گا کہ سب کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔''

یہ باتیں سن کر میں کئی دنوں تک افسردہ رہا۔ راز کی بات کسی سے کہہ بھی نہ سکتا تھا کیونکہ وعدہ کر کے آیا تھا۔

پھر ہندوستان کی عبوری حکومت قائم ہونے کا منصوبہ سامنے آیا۔ ایک اور بزرگ نے بتایا کہ یہ بھی انگریزوں کی چال ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو بیوقوف بنا رہے ہیں' لیکن دل نہیں مانتا تھا کہ ہمارے سیاسی مدبرین اتنے ہی کودن ہیں کہ وہ آسانی سے الو بن رہے ہیں۔ وہ رات مجھے اچھی طرح یاد ہے جب عبوری حکومت میں شامل ہونے والے ارکان کا ریڈیو پر اعلان ہوا۔ ہمارے محلے میں دو تین سے زیادہ ریڈیو نہ تھے۔ مسلمان اراکین کے نام سن کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ خوشی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ معلوم نہیں یہ جذبہ کیوں ابھر آیا تھا کہ ہم ہندوؤں کو ہر میدان میں شکست دے دیں گے۔ چودہ سال کے بچے کا ذہنی افق ہوتا ہی کیا ہے:

انہیں دنوں اسرار احمد صاحب حصار سے سرسہ آئے۔ یہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ضلعی صدر تھے۔ انہوں نے سرسہ میں اس کی شاخ قائم کی اور مجھے سیکرٹری بنا گئے۔ محمد یقین صدر منتخب ہوئے تھے۔ اگلے دن مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب نے بلا لیا۔ ان دنوں پیر مصباح الدین صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔ مجھے ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے:

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہیں کچھ ہو چلا ہے؟''

''جناب! میں آپ کی بات سمجھا نہیں''

''تم سیاست میں حصہ لینے لگے ہو''

''کیسی سیاست؟''

''سیکرٹری نہیں بنے ہو؟'' ان کی آواز میں تندی تھی۔ ''اس کا انجام بھی سوچا ہے؟''

مجھے جوش آ گیا شاید اس لیے کہ میرا مخاطب مسلمان تھا:

''مجھے انجام سے کیا ڈراتے ہیں؟ میرا وہی انجام ہوگا جو پوری قوم کا ہوگا'' اب ان کا لہجہ مشفقانہ تھا:

''تم ذہین بچے ہو' کہیں ایسا نہ ہو......''

''اب قوم کے لیے ایک ایک فرد کی ضرورت ہے۔ اگر واقعی مجھ میں کچھ صلاحیتیں ہیں تو مجھے ان سے کام لینا چاہیے۔ بعد میں یہ کس کام کی؟''

بعد میں معلوم ہوا کہ ہم تین اشخاص کی گرفتاری کے احکام صادر ہو گئے تھے پھر روک لیے گئے۔

ایک رات ہماری منہ بولی خالہ ہمارے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ یہ 2 جون کی تاریخ تھی۔ وہ اکثر حالات حاضرہ پر اس وثوق سے تبصرہ کیا کرتی تھیں کہ جیسے قائداعظمؒ ابھی ابھی ان سے مل کر گئے ہیں۔ ان کی باتوں میں حقیقت بہت ہی کم ہوتی تھی۔ میں کبھی کبھار باتوں باتوں میں کوئی چٹکی لے لیا تھا۔ بس اسی حد تک کہ انہیں پتہ نہ چلے۔ بڑی معصومیت سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتا اور انہیں بہت آگے لے جاتا اور جب وہ انتہا کو پہنچ جاتیں تو کوئی ایسی بات کر دیتا جس سے ان کی باتوں کا محل دھڑام سے نیچے گر پڑتا۔ کبھی تو وہ میری بات کو سمجھتی ہی نہ تھیں اور جب کبھی سمجھ جاتیں تو برا بھلا کہنے لگتیں اور مارنے کے لیے اٹھتیں' میں ہنستا ہوا باہر نکل جاتا۔

اس رات وہ بہت خوش تھیں اور بے حد سنجیدہ آتے ہی والدہ سے کہنے لگیں:

''بہن! آج بہت ہی اچھی خوشخبری لائی ہوں۔ ابھی ابھی آپ کا بڑا بھانجا خیر پور (ایک گاؤں کا نام) سے آیا ہے وہاں اس کی ملاقات مدووٹ سے ہوئی......اس نے آ کر بتایا ہے کہ......نہیں بہن ایسے نہیں بتاؤں گی' پہلے منہ میٹھا کراؤ۔''

میں ازراہ مذاق گڑ اٹھا لایا۔

''ہاں ہاں ٹھیک ہے! یہی لے آؤ منہ میٹھا ہو جائے گا''

گڑ کی ایک ڈلی منہ میں رکھتے ہوئے:

''بیٹا! پاکستان دہلی تک پہنچ گیا ہے۔ اب وہ ایک دو دن میں ہمارے پاس بھی پہنچ جائے گا۔''

میں نے ہنسنا چاہا' لیکن احترام مانع تھا۔ پھر مجھے شرارت سوجھی اور میں نے سوالات کرنے شروع کر دیئے:

''خالہ جان! پاکستان دہلی کب پہنچا؟''

''آج ہی۔''

''خالہ! اس کے لباس کے متعلق بھی آپ کو معلوم ہے؟''

''ہاں بیٹا! اس نے چغہ پہن رکھا ہے اور سر پر سبز عمامہ''

''خالہ جان! اس کے ڈاڑھی بھی ہے؟''

''بیٹا! کیسی باتیں کرتے ہو۔ پاکستان بغیر ڈاڑھی کے بھی ہو سکتا ہے؟ اس کے بارے میں تمہارے بھائی نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ

با قاعدگی سے نماز پڑھتا ہے اور آج کل وہ روزے بھی رکھ رہا ہے۔ اسکی پیشانی نورانی ہے اور آنکھوں میں سے ایمان کا نور چھلک رہا ہے بیٹا۔ وہ یہاں بھی تو آئے گا جی بھر کر دیکھ لینا۔''

میں نے خالہ کے جانے کے بعد خوب ہنسا' یہاں تک کہ پیٹ میں بل پڑ گئے...... اور اگلی صبح 3 جون کو ریڈیو پر اعلان ہو رہا تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ نے پاک و ہند کو آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ (الطاف حسین قریشی)

آگ کی پناہ گاہیں

امرتسر کے حالات یوں تو اگست کے آغاز ہی سے خراب تھے لیکن 8 اگست کے بعد تو بد سے بدتر ہو گئے۔ اس روز امرتسر پولیس کے سپرنٹنڈنٹ میاں محمود علی خاں تبدیل ہو کر راولپنڈی چلے گئے۔ ان کی جگہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے سنبھالی جو سکھ تھا۔ اس نے عہدہ سنبھالتے ہی پولیس کے مسلمان جوانوں کو حکم دیا کہ اپنی بندوقیں لائن میں جمع کرا دیں اور دس دن کے لیے چھٹی پر چلے جائیں۔ جو ملازم اس حکم کی خلاف ورزی کرے گا اسے جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ مسلم پولیس کو اس طرح نکال دینے کے بعد اس نے سکھ پولیس کو حکم دیا کہ مسلمان کرفیو کے اوقات ختم ہونے پر بھی باہر نکلیں تو انہیں گولی سے اڑا دو۔ سکھ کرفیو کے اوقات میں بھی آزادی کے ساتھ چلتے پھرتے رہتے۔ 8 اگست کے بعد جو ملٹری شہر کا امن قائم رکھنے کے لیے متعین کی گئی وہ سب سکھوں' ڈوگروں اور گورکھوں پر مشتمل تھی۔ عام مسلمانوں سے ہتھیار چھین لیے گئے تھے' لیکن ان سب باتوں کے باوجود مسلمان سکھوں کا برابر مقابلہ کرتے رہے اور شہر بھر میں کئی مقامات پر دست بدست لڑائیوں کی نوبت آتی رہی سکھ مسلمان کو جہاں پاتے اس پر حملہ کر دیتے تھے اور مسلمان انہیں کی کرپانیں چھین کر انہیں ہلاک کر رہے تھے۔

رات کے وقت جنگ بے حد شدت اختیار کر جاتی۔ ہر طرف سے بموں کے پھٹنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی محاذ جنگ پر شدید گولہ باری ہو رہی ہے۔ شہر کے شمالی حصے میں نسبتاً امن تھا کیونکہ فیض پورہ میں سو فیصدی مسلمان تھے اور ان کے ڈر کے مارے سول لائنز اور لارنس روڈ کے ہندو اور سکھ دم نہیں مار سکتے تھے۔

دس اگست کو درجن بھر سکھوں نے ''لوہارکا'' اور فیض پورہ کے درمیان چار نہتے مسلمان شہید کر دیئے۔ اس کے جواب میں فیض پورہ کے مسلمانوں نے سات سکھوں کو مار گرایا۔ اسی روز تین ہزار سکھوں کے ایک مسلح لشکر نے موضع ''لوہارکا'' کا محاصرہ کر لیا جب ''لوہارکا'' سے دودھ لانے والے مسلمانوں اور دوسرے مزدوروں سے کوئی شخص بھی فیض پورہ نہ پہنچا' تو فیض پورہ کے مسلمان نے ایک گھڑ سوار مسلمان کو دریافت حال کے لیے بھیجا۔ اس نے دیکھا کہ سکھوں نے چاروں طرف سے ''لوہارکا'' کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ سکھوں نے اس مسلمان سوار پر گولی چلائی لیکن نشانہ خطا گیا۔ اس نے واپس آ کر اطلاع دی۔ چار مسلمان سائیکلوں پر سوار ہو کر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس گئے۔ اس نے کہا اس وقت میرے پاس پولیس کی جمعیت نہیں جسے اس طرف بھیج سکوں...... سائیکل سوار پھر چھاؤنی گئے اور بلوچ رجمنٹ کے افسر سے امداد کے طالب ہوئے۔ اس نے بارہ فوجی تین ٹرکوں میں سوار کر کے ''لوہارکا'' کی طرف بھیج دیئے۔ سکھ فوجی ٹرک دیکھ کر بھاگ گئے اور گنے کے کھیتوں میں چھپ گئے۔ ایک پکڑا گیا' اس نے سر کے بالوں سے لے کر گھٹنے تک لوہے کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے پاس چار گز لمبا برچھا' تلوار اور چھرا تھا۔

بلوچ رجمنٹ کے جوان شام تک وہیں رہے اور رات گیارہ بجے رخصت ہو گئے۔ ان کے واپس ہوتے ہی سکھوں کا لشکر پھر اکٹھا ہو گیا‘ اور رات کے تین بجے ”لوہارکا“ پر پھر دھاوا بول دیا۔ تھوڑی دیر اندھا دھند گولیاں چلانے کے بعد گاؤں میں داخل ہو گئے اور مسلمانوں کو قتل کرنے لگے جو مسلمان بھی انہیں ملا اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جوان بوڑھے بچے‘ مرد اور عورتیں سب ان کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ اکثر عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگیں لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ بعض نے مٹی کا تیل کپڑوں پر چھڑک کر آگ لگا لی اور جل کر مر گئیں۔ جوان مرد مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ سکھ بھی زخمی ہوئے۔ چند مسلمان رات کے اندھیرے میں جان بچا کر فجر کے وقت فیض پورہ پہنچے اور حال بیان کیا۔ محلے بھر میں کہرام مچ گیا۔ دو جوان انگریز ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر گئے۔ اس نے کہا میں اپنا بوریا بستر لپیٹ چکا ہوں‘ نیا ڈپٹی کمشنر تمہاری مدد کرے گا۔ ”یہ جواب پا کر چھاؤنی میں بلوچ رجمنٹ کے آفیسر سے فریاد کی۔ اس نے کرایے کی موٹر میں ایک تھانیدار اور دو سپاہی ساتھ کر دیئے اور فیض پورہ کے تین مسلمان بھی جو بندوقوں سے مسلح تھے ساتھ ہو گئے۔ اس جمعیت نے لوہارکا جا کر بچے کھچے مسلمانوں کو نکالا۔ زخمیوں کو سنبھالا۔ کچھ سکھ سامنے آئے جسے اس پارٹی نے فائروں پر دھر لیا اور متعدد سکھ ہلاک کر دیے۔ زخمیوں میں میں نے ایسے ایسے ضعیف العمر بوڑھے دیکھے جن پر ہاتھ اٹھاتے انسان کو شرم آنی چاہیے۔ ایک پانچ برس کی بچی کو دیکھ کر تو بے اختیار آنسو نکل آئے۔ اس کے ماں باپ بہن بھائی سب کے سب شہید کر دیئے گئے تھے۔ اس پر بھی برچھے سے حملہ کیا گیا تھا جو پسلی میں گھس گیا تھا۔ بچی کے کپڑے خون میں لت پت تھے۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ بیٹا کچھ کھاؤ گی تو اس نے پانی مانگا۔ چمچے سے اسے گرم دودھ پلایا گیا۔

شہر کے دوسرے حصوں میں بھی مسلمانوں پر حملے ہو رہے تھے۔ اس لیے ہمارے محلے کے مسلمان گھروں سے نکل کر آغا خاں کی سرائے میں جمع ہونے لگے۔ ہم سب تین دن وہاں رہے۔ سرائے اور اس کے نزدیک کا کنواں قلعہ نما تھا۔ ہم وہاں شبانہ روز پہرہ دیتے تھے۔

15,14 اگست کی درمیانی شب سکھوں نے سردار شوکت حیات خاں کے خسر میاں مقبول حسین کی کوٹھی کو آگ لگا دی جو ہم سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ کوٹھی کے مکین لاہور جا چکے تھے۔ 15 اگست کو دس بارہ سکھ ننگی تلواریں سونتے ہم پر حملہ آور ہوئے اور ہمارے دو آدمیوں کو گھائل کر دیا۔ ہم بھی برچھے بھالے لے کر ان پر ٹوٹ پڑے اور سب کو واصل جہنم کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس کے تین مسلمان جوان ہمارے پاس آئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ لوگوں کے بچنے کی کوئی امید نہیں کیونکہ سکھ مسلمانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر رہے ہیں۔ ہم آپ کو ریلوے اسٹیشن یا چھاؤنی پہنچا آتے ہیں۔ چنانچہ پولیس کی معیت میں چھاؤنی پہنچ گئے جہاں پہلے ہی ہزاروں مسلمان جمع ہو چکے تھے۔

14 اگست کی شام سکھوں نے فیض پورہ میں خوب لوٹ مچائی اور اگلے روز آگ لگا دی۔ اسی روز شام کے وقت ہمیں لاہور جانے والی لاریاں مل گئیں۔ ہم نے دیکھا کہ خالصہ کالج میں بے شمار سکھ‘ ڈوگرے‘ گورکھے جمع ہیں جن کی آنکھوں سے شرارت اور خباثت ٹپک رہی تھی۔ اگر ہمارے ساتھ بلوچ رجمنٹ کی گارڈ نہ ہوتی تو ہم میں سے ایک متنفس بھی امرتسر سے زندہ سلامت نہ نکل سکتا۔ خالصہ کالج کے دونوں دروازوں میں بلوچ رجمنٹ کے دو دو جوان کھڑے تھے جن کے پاس رائفلیں اور برین گنیں تھیں اور ہمارا قافلہ بخیریت گزر گیا۔ رات گیارہ بجے ہم وطن کیمپ پہنچے۔

(فضل حق پشاوری)

اندھیرے کے ناگ

سکھوں کو شکست دینے کے بعد سانس بھی نہ لیا تھا کہ بارش ہونے لگی۔ خدا خدا کر کے اگلے دن بارش رکی تو سکھوں کا ایک جم غفیر قافلہ پناہ گیروں کے قافلے کی طرف آتا دکھائی دیا جو دریا کے کنارے ایک میل تک پھیلا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے گھوڑوں پر سوار ہو کر سارے قافلے کو خبردار کیا اور بہادر اور باہمت اشخاص مقابلے کے لیے نکلے اور جوانمردی کے ساتھ مزاحمت کرنے لگے۔ سکھوں کی تعداد سات آٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ملٹری کے دستے بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے قافلے کے قریب پہنچتے ہی گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی، مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ سکھوں نے آگے بڑھ کر قافلے کو گھیرے میں لے لیا اور مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ چیخ پکار، فریاد و فغاں کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، عورتیں، مرد اور بچے سراسیمہ ہو کر دریا کی طرف بھاگے اور دریا میں چھلانگیں لگا لگا کر اپنے آپ کو موجوں کے حوالے کرنے لگے۔ سکھ دریا کے کنارے پر گولیوں، برچھیوں، نیزوں، کرپانوں اور کلہاڑیوں سے مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کر رہے تھے۔ ادھر دریا کی موجیں پناہ ڈھونڈنے والوں کو امڈ امڈ کر موت کی آغوش میں لے رہی تھیں۔ عصر سے مغرب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ سینکڑوں مسلمان سکھوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ سینکڑوں نذر آب ہو گئے۔ سراسیمگی کا یہ عالم تھا کہ ماں کو بچے کی، بھائی کو بہن کی، شوہر کو بیوی کی اور بیٹے کو باپ کی خبر نہ تھی۔ مغرب کے قریب سکھوں کا جتھا مال مویشی اور بیل گاڑیوں پر لدا ہوا سامان لے کر لوٹ گیا۔ اب ہر شخص اپنے عزیزوں کی تلاش میں سرگرداں پھرنے لگا۔ مجھے اپنے بیوی اور بچے دریا کی موجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے نظر آئے۔ بچے ماں کے ساتھ لپٹے ہوئے تھے۔ بڑھ کر ان کے پاس پہنچا اور موجوں سے لڑتے ہوئے بمشکل انہیں کنارے تک لایا۔ میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ بیوی اور بچوں کو کنارے پر بٹھا کر میں والدہ کی تلاش میں نکلا انکی گود میں میرا چار سالہ بچہ اویس تھا۔ مجھے قوی اندیشہ تھا کہ وہ دونوں دریا کی نذر ہو چکے ہیں لیکن خدائے کریم نے اپنی قدرت کاملہ سے انہیں محفوظ رکھا اور وہ مجھے مل گئے۔ میرا بڑا ہمشیرزادہ صادق اور میری ایک عم زاد بہن کے تین جوان بیٹے اور بیٹی شیر خوار بچے سمیت دریا کی نذر ہو گئے۔ میرا ایک بیٹا رضا محمود غوطے کھانے کی وجہ سے جانبر نہ ہو سکا۔ ہماری طرح اور بہت سے خاندانوں کو اسی قسم کے صدمے اٹھانے پڑے۔

رات کی تاریکی ہزار ہولناکیاں لے کر وارد ہوئی۔ ہر طرف لاشیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بارش ہونے لگی۔ تاریکی کا یہ عالم کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہزاروں کتے چیخ رہے تھے۔ بجلی کے بار بار کڑکنے سے فضا اور بھی ہولناک ہو رہی تھی۔ بجلی کی چمک بھیانک حقیقتوں پر رہ رہ کر روشنی ڈالتی تھی اور وحشت زدہ انسانوں کو اور بھی ڈرا رہی تھی۔ اس روشنی میں دور کہیں مویشی کھڑے نظر آتے تو عورتیں چلانے لگیں: لو وہ جتھا آ گیا۔

(مظہر الدین مظہر)

ساڈھورہ کی روداد

انبالہ چھاؤنی اور اس کے مضافات میں انارکی کی ابتدا یوں ہوئی کہ 16 اگست کو دو سکھوں نے جو انبالہ چھاؤنی سے تانگے پر سوار ہو کر کلدیپ نگر گئے تھے۔ گاؤں کے قریب اپنے ساتھی اور مسلمان مسافروں کو قتل کر دیا اس کے بعد دو سکھ تانگے میں سوار ہو کر اسی مقام کی طرف گئے اور

وہاں پہنچ کر تانگے والے کو بھی قتل کر دیا۔ ایک ہندو جو اسی تانگے پر سوار تھا' گھوڑا ہانک کر مسلمان تانگے والے کی لاش چھاؤنی لے آیا۔ مسلمانوں میں ہراس پھیل گیا۔ تانگے والوں نے اگلے دن ہڑتال کر دی۔ اس کے بعد ہر روز قتل کی وارداتیں ہونے لگیں جمعہ 22 اگست کو جامع مسجد میں بم پھینکا گیا جس سے چھ مسلمان شہید اور آٹھ زخمی ہوئے۔ یہ حالات دیکھ کر میں اپنے بال بچوں کو لے کر ساڈھورہ چلا گیا۔ اب سکھ منظم جتھوں کی صورت میں ریل گاڑیوں پر سفر کرنے والوں اور راہ چلتے مسلمانوں کو قتل کرنے لگے۔ انبالہ سے لیکر جگادھری تک کا سفر بے حد پر خطر ہو گیا۔ اس راستے میں کئی مسلمان مارے گئے اور انہوں نے خوف کے مارے سفر بند کر دیا اب مسلمانوں کے دیہات پر یکے بعد دیگرے حملے شروع ہو گئے۔ عید کے روز 18 اگست کو جگادھری کے ریلوے اسٹیشن عبداللہ پور پر حملہ ہوا اور پانچ سو مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ اس کے بعد حسن پور تاراج ہوا۔ یہاں بھی مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ اس کے گھر لوٹے گئے عورتوں کی بے حرمتی کی گئی نوجوان لڑکیاں اغوا کر لی گئیں۔

ستمبر کے آغاز میں ساڈھورہ سے ایک میل کے فاصلے پر مسلمانوں کی دو بستیوں اودھم گڑھ اور نواں شہر پر حملے ہوئے۔ اودھم گڑھ کے مسلمانوں نے سکھوں کا پہلا حملہ پسپا کر دیا اور ان کے چھ آدمی مار ڈالے۔ اگلے روز سکھوں نے زیادہ جمعیت کے ساتھ حملہ کیا اور مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ وہاں میرے ماموں بھی تھے۔ انہوں نے سر پر کلہاڑی کا زخم کھایا اور گر پڑے۔ ہوش میں آنے پر وہ قریبی کھیت میں جا چھپے۔ انہوں نے دیکھا کہ سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام کرنے کے بعد گاؤں کو تسلی سے لوٹا اور پھر نذر آتش کر دیا۔ اس گاؤں سے صرف ایک مسلمان چھپ چھپا کر بھاگنے اور جان بچانے میں کامیاب ہوا۔ اگلے دن چھوٹا ماروہ اور بڑا ماروہ کے گاؤں تاراج کیے گئے۔ سکھوں کے دستے علاقہ مجسٹریٹ چونی لال کو شک اور تھانے دار کیسر سنگھ کے زیر ہدایت کام کر رہے تھے۔ ساڈھورہ کا قصبہ حملے سے محفوظ رہا۔ 21 ستمبر کو مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ مسلمان اگلے دن ساڈھورہ سے نکلنے اور پیدل چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ انہیں اپنے ساتھ صرف ایک ایک بستر اور ایک ایک ٹرنک لے جانے کی اجازت ہوگی۔ ساڈھورہ کے مسلمانوں نے یہ حکم سن کر اپنا تمام مال لٹا دیا۔ اگلے دن سے بارشیں ہونے لگیں' اس لیے روانگی ملتوی کر دی گئی۔

جب ضلع انبالہ کی دو تحصیلوں کھرڑ اور روپڑ میں مسلمان بیدردی سے قتل کیے گئے تو بقیۃ السیف میں سے کچھ تو کرالی کیمپ میں جمع ہو گئے اور کچھ تحصیل نرائن گڑھ میں بھی بھاگ آئے۔ پھر تحصیل نرائن گڑھ بھی مسلمانوں کے دیہات پر حملے ہونے لگے۔ وہاں راجپوتوں کے دو گاؤں کوٹ بلا اور جھوریوالہ کے مسلمانوں نے حملہ آوروں کا جم کر مقابلہ کیا اور انہیں کافی نقصان پہنچا کر پسپا کر دیا۔ اس کے بعد ملٹری نے آ کر مسلمانوں پر بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ بہت سے مسلمان شہید کر دیئے گئے اور کئی گرفتار کر لیے گئے۔ جب ضلع انبالہ میں سکھوں کے منظم حملوں سے ضلع بھر میں دہشت پھیل گئی تو تحصیلداروں' ذیلداروں اور دوسرے سرکاری کارکنوں سے اعلان کرا دیا گیا کہ مسلمان فلاں تاریخ کو مارچ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس طرح کوٹ بلا اور جھویوالہ میں کوئی پندرہ بیس ہزار مسلمان جمع ہو گئے۔ اس قافلے کو پیدل چلا کر ملٹری کی ایک گارڈ نے کالے انب دکالے آم تک پہنچایا۔ ملٹری گارڈ یہ کہہ کر ان کی ڈیوٹی یہیں تک تھی' رخصت ہو گئی۔ اس کی جگہ جاٹ ملٹری کی دوسری گارڈ آ گئی۔ اس گارڈ نے صبح پانچ بجے حکم دیا کہ مسلمان پانی وغیرہ پینا چاہیں' تو پی لیں اور چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ چلتے وقت مسلمانوں سے لاٹھیاں' چھڑیاں اور سوٹیاں تک چھین لی گئیں۔ کہا گیا کہ مضبوط اور جوان اشخاص قافلے کے دونوں طرف رہیں۔ پندرہ بیس ہزار مسلمانوں کا یہ قافلہ جس میں نو سو کے قریب بیل گاڑیاں

تھیں، چھ میل میں پھیلا ہوا تھا...... یہ قافلہ اصغر پور کے قریب دریائے مارکنڈہ کو عبور کر رہا تھا کہ اس پر سکھوں اور ہندوؤں کے ایک جم غفیر نے ہلہ بول دیا تھا۔ قافلے والوں نے حملہ آوروں کو پتھر مار کر بھگا دیا اور انہی کے ہاتھوں سے تلواریں چھین چھین کر انہیں واصل بہ جہنم کیا۔ جاٹ ملٹری حملہ آوروں کا تعاقب کرنے کے بہانے سے کھیتوں میں جا کر چھپ گئی اور پوزیشن لے کر قافلے پر گولیاں برسانے لگی، مشین گنوں اور برین گنوں کے منہ کھول دیے گئے فائرنگ کی آواز ساڈھورہ میں سنائی دے رہی تھی صبح سات سے شام کے 3 بجے تک اندھا دھند گولیاں چلتی رہیں اندازہ ہے کہ اس قتل عام میں چار ہزار سے چھ ہزار تک مسلمان مارے گئے۔ تین سو سے زیادہ عورتیں اغوا کر لی گئیں۔ پانچ سو کے قریب مسلمان بھاگ کر ساڈھورہ پہنچے جن میں اکثر زخمی تھے۔ قافلے کا پچھلا حصہ واپس کالے انب چلا گیا۔ ساڈھورہ کے مسلمانوں نے ان تباہ حال بھائیوں کی بہت خدمت کی۔ پانچ چھ ہزار مسلمان کالے انب کو واپس چلے گئے تھے۔ وہ ایک ہفتہ وہاں رہے۔ اتنے دن انہیں کھانا میسر نہ آسکا اور لوگ پنوار گھاس کھا کھا کر بسر اوقات کرتے رہے۔ انہیں ایک خاص کنویں سے پانی پینے کی اجازت تھی۔ اس میں زہر ملا دیا گیا اور لوگ پیچش اور اسہال کے امراض میں مبتلا ہونے لگے۔ ایک ہفتے بعد ان سب کو ساڈھورہ لایا گیا۔ وہاں ان کے امراض نے ہیضے کی صورت اختیار کر لی اور ایک ماہ کے اندر اندر دس ہزار مسلمان لقمہ اجل ہو گئے۔

ان حالات میں کمزور ایمان کے مسلمان ہندو بن بن کر اپنی جانیں بچاتے رہے۔ بعض جگہ تو گاؤں کے گاؤں ہندو بنا لیے گئے۔ اکثر دیہات کے مسلمان کیمپوں میں جمع ہونے لگے۔ ساڈھورہ کے کیمپ میں پچاس ہزار سے زیادہ کا اجتماع ہو گیا۔ کیمپ میں راشن کی سخت قلت محسوس ہونے لگی تو میں نے چندہ جمع کر کے برقی پیغامات مقامی ڈپٹی کمشنر مشرقی اور مغربی پنجاب کے وزرا اور حکام حتیٰ کہ قائداعظمؒ تک کو ارسال کیے۔

حکومت پاکستان کی طرف سے آٹے کی ایک سو ساٹھ بوریاں آئیں۔ اس کے بعد پاکستان نے دو سو بوریاں اور بھیجیں۔

ساڈھورہ کیمپ میں جتنا عرصہ گورکھا رجمنٹ حفاظت کے لیے متعین رہی۔ کیمپ میں امن رہا لیکن جب جاٹ رجمنٹ کا پہرہ بدلا تو انہوں نے مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم شروع کر دیئے۔ گھروں میں گھس گھس کر عورتوں کو زدوکوب کیا اور ان کی بے حرمتی کی۔ ان کا قیمتی سامان لوٹ لیا۔ جب کچھ گھوسیوں نے مقابلہ کیا تو جاٹ ملٹری نے فائرنگ کر کے بہت سے مسلمان شہید کر دیے۔

ساڈھورہ کیمپ سے مسلمان پناہ گزین اسپیشل گاڑیوں میں سوار کر کے پاکستان لائے گئے۔ آخری اسپیشل 28 نومبر کو چلی۔ اس سے تین دن پہلے جاٹ رجمنٹ کا پہرہ بدلا تھا۔

(سید محمد محسن الدین)

خونی بھیڑیے

25 جولائی 1947ء کو مجھے گوہانہ سے خط موصول ہوا کہ تمہارا بھائی کئی روز سے مفقود الخبر ہے۔ اس کا پتہ لگانے کے لیے فوراً گھر آؤ۔ یہ خط پڑھتے ہی میں نے دو ہفتے کی چھٹی لی اور گھر پہنچا۔ بھائی کی تلاش میں ادھر ادھر چکر لگائے۔ آخر ایک کنویں میں اس کی لاش ملی۔ معلوم ہوا وہ کسی کام سے چھوچھک داس گیا ہوا تھا کہ غنڈوں نے قتل کر دیا۔

بھائی کو چھوچھک داس ہی میں دفن کر کے گھوانہ آیا تو دو قصبات' کنواہ اور مائن بیل کی نسبت اطلاع ملی کہ وہ بالکل برباد ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا ہے۔ عورتیں اٹھالی گئی ہیں اور کنواہ کے بعض مسلمان اپنے مکانوں ہی میں جلا دیئے گئے ہیں۔ گویا رہتک میں ہر جگہ فساد شروع ہو گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ارادہ کیا کہ رخصت گزار کر تمام کنبہ رہتک لے جاؤں گا۔ اس لیے کہ وہ بڑا شہر ہے۔ ضلع کے تمام ذمے دار افسر وہیں ہیں۔ پولیس کا انتظام ہے لیکن میرا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔

2 اگست کی صبح کو پولیس کے چار غیر مسلم سپاہی رہتک سے گوہانہ آئے اور کہنے لگے "ہمارے علاقے میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا ہے۔ شریر لوگ ہر جگہ جھگڑے پیدا کر رہے ہیں۔ ان فتنہ گروں میں مسلمان بھی ہیں' ہندو بھی ہیں اور سکھ بھی۔ ہمیں افسران ضلع نے اس لیے بھیجا ہے کہ سب لوگ اتفاق سے رہو۔ آپس میں فساد نہ کرو' جو فساد کرے گا گولی سے اڑا دیا جائے گا اور اس کے خاندان پر بھاری جرمانے کیے جائیں گے۔

پولیس والوں کی یہ ہدایت بظاہر بڑی خوبصورت اور باعث اطمینان تھیں لیکن دوپہر کے وقت دیکھا کہ امن وسلامتی کے یہی اجارہ دار سپاہی ایک وسیع احاطے میں گوہانہ کے نامسلموں کو جمع کیے بیٹھے ہیں اور انہیں مسلمانون کو موت کے گھاٹ اتارنے پر اکسا رہے ہیں۔ ایک سپاہی ہندوؤں اور سکھوں سے کہہ رہا تھا بھائیو! کوئی فکر نہ کرو پولیس اور ملٹری تمہارے ساتھ ہے اور "مسلموں" (مسلمانوں) کو تباہ کرنے کے لیے تمہیں ہر قسم کی مدد دے گی۔

یہ الفاظ سن کر میں سخت پریشان ہو گیا۔ خوف سے میری ٹانگیں تھرتھرانے لگیں۔ میں اسی حالت میں گھر پہنچا بدن پر کپکپی طاری تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اب گوہانہ کے مسلمان کسی صورت نہیں بچ سکتے۔ پھر بیوی اور والدہ کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور انہیں سامان تیار کرنے کے لیے کہہ دیا۔ والدہ بیوی اور لڑکیاں ضروری سامان باندھنے میں لگ گئیں۔ میں نے چار تانگوں اور کچھ گھوڑوں کا انتظام کیا تاکہ صبح ہی صبح وہاں سے روانہ ہو جائیں۔

رات کے بارہ بجے گوہانہ کے شمال مشرق میں کچھ چیخیں سنائی دیں۔ پھر مغرب سے بھی چلانے کی آوازیں آئیں۔ اس کے بعد گلی کوچوں میں آدمی دوڑتے بھاگتے معلوم ہوئے۔ میں نے باہر نکل کر لوگوں سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ گوہانہ اور گرد ونواح کے سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا ہے گھوانہ تین طرف سے گھر چکا ہے۔ فلاں فلاں محلے میں بہت سے مسلمان شہید ہو چکے ہیں۔ کئی مکان نذر آتش کر دیئے گئے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اپنی گلی میں قدم رکھا ہی تھا کہ تین گرانڈیل آدمی مکان میں داخل ہوتے ہوئے نظر آئے اور میرے پہنچتے پہنچتے انہوں نے میرے چار بچے اور دو لڑکیاں ذبح کر ڈالیں۔ مجھے دیکھ کر ایک غنڈہ میری طرف جھپٹا میں نے لپک کر اس کا نیزہ چھین لیا۔ دوسرے بدمعاش نے بڑھ کر مجھ پر برچھی سے وار کیا جس سے میرا بازو زخمی ہو گیا۔ تیسرے خونخوار نے میری والدہ اور بیوی کا کام تمام کیا۔ چونکہ میں زخم کھا کر گر پڑا تھا' اس لیے یہ تینوں بھیڑیئے مجھے چھوڑ کر مکان کے اندر داخل ہو گئے اور مال واسباب لوٹنے لگے۔ گھر کے تمام زن واطفال شہادت پا چکے تھے میں زخم کے درد سے الگ تڑپ رہا تھا۔ جب ذرا ہوش آیا تو رینگتا' سرکتا پھر باہر نکلا۔ دیکھا گلیاں لاشوں سے پٹی پڑی ہیں ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ اس دلدوز نظارے سے میں پھر بے ہوش ہو گیا' لیکن ہمارے محلے کے ایک بزرگ نے مجھے گرتا دیکھا تو دوڑ کر

میرا بازو تھاما اور کھینچتا گھسیٹتا مکئی کے کھیت میں لے گیا۔ میرے زخم پر پٹی باندھی، منہ میں پانی ڈالا۔ چہرے پر چھینٹے دیئے اور اس طرح مجھے ہوش میں لا کر کہا: ''امین! میں بھی گھر بار لٹا کر نکلا ہوں۔ اب اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں کہ ہم پاکستان کا رخ کریں اور پیدل چل کر وہاں جائیں۔'' یہ کہہ کر ان بزرگ نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس طرح ہم گردش ایام کی سختیاں سہتے ایک ماہ گیارہ روز پا پیادہ چل کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

(محمد امین)

ایک رخ اور بھی

راولپنڈی سے ادھر حضرو کے قریب و جوار میں ایک قصبہ ہے جس میں ایک بڑا اور معزز ہندو خاندان صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ اتفاق سے ریلوے اسٹیشن پر مشرقی پنجاب اور یو۔ پی کے دو تین سو زخمی اتارے گئے۔ جب چھاتیاں کٹی ہوئی عورتیں، ناک کٹے ہوئے بوڑھے بوڑھیاں اور جھلسے ہوئے بچے جلوس کی طرح بستی میں داخل ہوئے تو ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم و ستم کا شور بپا ہوگیا۔ ہر آدمی کے دل میں ان کی طرف سے نفرت کا جذبہ اور انتقام کا جوش کروٹیں لینے لگا۔ یوں تو اس بستی میں سینکڑوں ہندو آباد تھے لیکن یہ ایک خاندان ان سب میں لکھا پڑھا اور ہندوؤں میں نامور سمجھا جاتا تھا، وہ بڑا گھبرا ہوا تھا چنانچہ جب اس کا سہم اور خوف حد سے بڑھا تو ایک منصوبے کے تحت اپنی دو لڑکیوں کو ان کی ہونے والی شادیوں کے زیور اور کپڑے پہنا دیئے اور وہ تمام دن مستقبل کی دلہنیں بنی پھرتی رہیں۔ جب شام ہوئی تو سارا گھر سوگوار ہوگیا اور جب نصف رات گزر چکی اور آسمان اپنے سینے سے ستاروں کا ہار اتارنے لگا تو انہوں نے اپنے گھر کا تمام معمولی سامان سے لے کر قیمتی سامان تک جس میں لکڑی کا صندوق، مسہریاں، لکڑیاں اور ادھر ادھر کا کاٹھ کباڑ شامل تھا اپنے صحن میں رکھنا اور بیچ میں لڑکیاں کو بٹھا کر تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ ابھی آگ لگائے دو گھنٹے نہیں گزرے تھے کہ ملٹری کے ٹرک آ گئے اور انہوں نے کہا کہ اپنا قیمتی سامان اور بیوی بچوں کو ٹرک میں بٹھا دو تاکہ تمہارا مال اور جانیں محفوظ ہو جائیں۔ ہم مسلمان ہیں۔ تم پر کوئی سختی نہیں ہوگی۔ ہم تمہیں احتیاط کے ساتھ تمہارے کیمپ میں پہنچا دیں گے۔

اس وقت مرد تو خاموش رہے مگر عورتوں سے نہ رہا گیا اور کہا کہ ہم نے تو اپنے گھر کا سامان اور اپنی بچیوں کو زندہ جلا دیا ہے۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کو زخمی اور خون سے تربتر دیکھ کر بھی ہوش و حواس کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے اور ہماری حفاظت کی ذمہ داری لیں گے۔ پھر تو مرد بھی پھوٹ پڑے اور ایک کہرام مچ گیا۔ ابھی مری مری دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر جھلک رہی تھی اور اس محلے میں ایک کہرام برپا تھا مگر کیا حاصل وقت کے مرے تو ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ وہ روتے پیٹتے اپنا بچا کھچا زیور اور نقدی لے کر ٹرک میں سوار ہوگئے اور ٹرک بخیریت تمام کیمپ تک پہنچ گیا۔

(جہاں دانش)

(بحوالہ اردو ڈائجسٹ)

انبالے سے لاہور تک

پاکستان کی طرف ہجرت کرنے کی ہمت آزما دلچسپ داستان

قیام پاکستان کے موقع پر جن مسلمانوں نے پاکستان میں قیام وسکونت کا فیصلہ کیا انہیں ہجرت کے لیے گوناگوں مسائل اور از حد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہر اک مہاجر کی اپنی ایک الگ داستان ہجرت ہے۔ ظلم وسربریت' گھیراؤ' جلاؤ' فسادات اور قتل وغارت گری کی ان جاں گسل گھڑیوں میں جو لوگ بحفاظت وطن عزیز پہنچ گئے وہ یقیناً خوش نصیب تھے اور ان کا خیر وعافیت سے یہاں پہنچنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ جب لٹے پٹے' تھکے ہارے' سراسیمگی کی فضا میں رہنے والے' خوف ودہشت کے راہی اپنی منزل پاکستان میں پہنچتے تو گویا انہیں قرار آ جاتا۔ آزادی جیسی نعمت پانے کے بعد وہ خدائے بزرگ وبرتر کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے کہ اب وہ عالم اسلام کی سب سے بڑی مملکت کے باسی تھے۔

تقسیم ہند کے دوران ہجرت کا ایک انوکھا' دلچسپ بلکہ سنسنی خیز واقعہ جناب ملک مقبول احمد خاں صاحب سابق ڈائریکٹر روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے ساتھ پیش آیا جو اپنے وقت کے ایک اعلیٰ منتظم سمجھے جاتے ہیں اور آج کل ایک رفاہی اور سماجی راہنما کی حیثیت سے خلق خدا کی خدمت میں مصروف ہیں۔ دراصل یہ ان کی اپنی آپ بیتی ہے' انہی کے الفاظ میں سنئے:

''میں پاکستان بننے سے پہلے انبالہ چھاؤنی ریلوے اسٹیشن پر بطور ٹکٹ کلکٹر تعینات تھا۔ ہم تمام مسلمان ریلوے ملازمین نے پاکستان پوسٹنگ کے لیے اپنی رضامندی دے دی تھی مگر ہمارے تبادلے کے احکامات ابھی تک نہیں آئے تھے۔ ہم اسی انتظار میں تھے کہ 14 اگست کا دن آ گیا۔ اسلامی تاریخ کے لحاظ سے یہ 27 رمضان المبارک کا بابرکت دن تھا۔ پاکستان معرض وجود میں آ گیا تھا مگر ہم ابھی تک انبالہ چھاؤنی ریلوے اسٹیشن ہی پر تھے۔ ہمارے اسٹیشن پر ریلوے پولیس کے سب ملازمین مسلمان تھے لیکن 10 اگست کو تمام مسلمان پولیس کا تبادلہ ہو گیا اور ان کی جگہ سکھ ملازمین پولیس میں آ گئے۔ ہم باقاعدہ اپنی ڈیوٹی دے رہے تھے لیکن روز بروز حالات ہمارے خلاف ہوتے گئے۔

یہ 16 اگست کا دن تھا ہم اپنی قیام گاہ میں تھے کہ دو مسلمان ریلوے قلی ہمارے گھر آئے۔ واضح رہے کہ ہم آٹھ مسلمان ریلوے ملازمین اکٹھے رہتے تھے۔ مسلمان قلی بڑے گھبرائے ہوئے تھے۔ ہم نے وجہ پوچھی تو وہ بڑے رازدارانہ انداز میں ہمیں بتانے لگے کہ سکھ ریلوے پولیس نے منصوبہ بنایا ہے کہ وہ تمام مسلمان ریلوے ملازمین کو جو ابھی تک انبالہ چھاؤنی ریلوے اسٹیشن پر ہیں' مار دیں گے' اس لیے وہ ہمیں اس کی بروقت اطلاع دینے آ گئے ہیں۔ ہم سب لوگ واقعتاً پریشان ہو گئے۔ سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ مین لائن جو دہلی سے لاہور براستہ انبالہ آتی تھی اس پر ٹرین سروس بوجہ فسادات بند کر دی گئی تھی۔ انبالہ چھاؤنی ریلوے اسٹیشن کا اسٹیشن ماسٹر خوش قسمتی سے مسلمان تھا۔ ہم نے آپس میں مشورہ کر کے اس سے ملنے کا

پروگرام بنایا۔ اس دن یعنی 16 اگست کو ہم نے اپنی یونیفارم پہن لی اور ریلوے اسٹیشن پر آ گئے۔ ہم نے تھوڑا بہت سامان مسلمان قلیوں کے ذریعے اسٹیشن پر پہنچا دیا تھا۔ جب ہم مسلمان اسٹیشن ماسٹر صاحب سے ملے تو وہ بھی کچھ پریشان ہوئے۔ بہرکیف انہوں نے ہمیں خاصی تسلی دی۔

انبالہ چھاؤنی بہت بڑی چھاؤنی تھی اور ایک بڑا ریلوے جنکشن تھا۔ رات دو بجے وہاں سے ایک ریل گاڑی بٹھنڈہ کو براستہ راجپورہ، نابھہ اور پٹیالہ وغیرہ چلا کرتی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر نے ہمیں مشورہ دیا کہ آپ سب مسلمان وردیاں پہن کر اسٹیشن پر ڈیوٹیاں کریں اور خاموشی سے رات دو بجے والی گاڑی سے اللہ کا نام لے کر بٹھنڈہ روانہ ہو جائیں جہاں سے ممکن ہے لاہور کے لیے ریل گاڑی مل جائے۔

ہم نے رات دو بجے تک اپنی ڈیوٹی سرانجام دی مگر نہایت محتاط ہو کر۔ مسلمان قلیوں نے ہمارا سامان ٹرین کے ایک چھوٹے ڈبے میں خاموشی سے رکھ کر اسے بند کر دیا تھا۔ ریلوے پولیس کا سکھ حوالدار تمام رات اسٹیشن پر ہمارے درمیان ادھر ادھر پھرتا رہا۔ شاید اسے کچھ بھنک لگ گئی تھی، تاہم ہم ذرا بھی پریشانی کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔

جب گاڑی چلنے لگی تو ہم پلیٹ فارم کی دوسری طرف سے اپنے ڈبے میں سوار ہو گئے اور سکھ پولیس کو پتہ نہ چلنے دیا۔ گاڑی رات دو بجے روانہ ہو گئی۔ اب سفر بہت خطرناک تھا۔ راستے میں ہر جگہ خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ ہم نے اپنے ڈبے کو اندر سے بند کر لیا اور روشنیاں گل کر دیں۔ راستے میں جب گاڑی کسی اسٹیشن پر رکتی تو باہر سے آہ و بکا اور چیخ پکار کی آوازیں آتیں۔ ہم نے کھڑکیاں کھولیں اور نہ ہی باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ ہم لوگ تعداد میں سات تھے۔ بس اپنے ڈبے میں بند رہے کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

صبح سویرے گاڑی بٹھنڈہ پہنچ گئی۔ ہم اپنا سامان لے کر اترے۔ اسٹیشن پر سب خیریت تھی۔ وہاں ہمارے واقف مسلمان ریلوے ملازمین مل گئے۔ ہم نے ان کو اپنے انبالہ سے ڈرامائی طور پر فرار ہونے کا حال سنایا اور ان کے ہمراہ بٹھنڈہ اسٹیشن ہی پر رہے۔ اب لاہور آنے کا مرحلہ تھا۔ یہ 17 اگست کا دن تھا۔ پتہ چلا کہ ایک ایکسپریس ٹرین دہلی سے لاہور براستہ بٹھنڈہ آتی تھی اور اس روز بھی گاڑی کے آنے کا وقت قریب تھا مگر وقت جیسے کٹ ہی نہ رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ گھنٹوں پر محیط ہونے لگا۔ خیر خدا خدا کر کے ایکسپریس ٹرین آئی اور ہم اس میں سوار ہو گئے۔ یہ تقریباً شام کا وقت تھا جب گاڑی فیروز پور ریلوے اسٹیشن پر آ کر رک گئی۔ خاصی دیر تک وہ آگے روانہ نہ ہوئی تو ہمیں تشویش ہوئی۔ اتنی دیر میں اسٹیشن پر خاصا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ہم بھی گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر آ گئے اور ٹرین کے آگے روانہ نہ ہونے کی وجہ پوچھی تو ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ پتہ چلا کہ باؤنڈری کمیشن کا اعلان ہو گیا ہے جس کے مطابق فیروز پور، امرتسر اور گورداسپور کے اضلاع ہندوستان کے حوالے کر دیے گئے ہیں۔

ابھی ہم اس اطلاع پر حیران و پریشان تھے کہ پتہ چلا اس ایکسپریس ٹرین کے ہندو ڈرائیور نے جو دہلی ہیڈ کوارٹر سے تھا، نہ صرف گاڑی کو لاہور لے جانے سے انکار کر دیا ہے بلکہ گاڑی کے پاکستان لے جانے پر مزاحمت کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ پلیٹ فارم پر ایک بڑا ہجوم بھی اس کے ساتھ مل گیا۔ اب تو ہم مزید پریشان ہو گئے۔

اس وقت میری عمر بیس بائیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ پہلے تو ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنی وردیاں پہن لیتے ہیں اور پیدل ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ رات کے اندھیرے میں دریائے ستلج کا پل پار کر جاتے ہیں جو وہاں سے تقریباً آٹھ دس میل کی مسافت پر تھا لیکن اس میں بہت خطرہ تھا۔ ہم اسی ادھیڑ بن میں تھے۔ سوچا کہ پتہ کیا جائے کہ یہاں فیروز پور ریلوے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر کون ہے اور اگر وہ مسلمان ہے تو اس کی مدد و مشورہ لیا جائے۔

جب ہم ان کے دفتر پہنچے تو باہر نام کی تختی پڑھ کر ہماری ڈھارس بندھی۔ وہ بھی مسلمان تھے اور اپنے دفتر میں موجود تھے۔ ہم نے ان سے اپنا تعارف کروایا اور ان سے گاڑی کے آگے روانہ نہ ہونے کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بھی یہی بتایا کہ ڈرائیور ہندو ہے اور باؤنڈری کمیشن کے اعلان کے بعد وہ کسی قیمت پر گاڑی لاہور نہیں لے جا رہا اور اس نے یہ بھی کہا ہے کہ گاڑی کو کسی بھی صورت میں پاکستان نہیں لے جانے دیا جائے گا۔

ہم نے اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ ہم نے سوچا ہے کہ ہم پیدل ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ روانہ ہو جاتے ہیں۔ اگر بچ گئے تو پاکستان پہنچ جائیں گے۔ انہوں نے ہمارے اس فیصلے سے اتفاق نہ کیا اور خدشہ ظاہر کیا کہ اب حالات مسلمانوں کے بالکل خلاف ہیں اور ہمارا پیدل جانا بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک ان کے چہرے پر کچھ طمانیت دکھائی دی۔ یکدم وہ بڑی دور کی کوڑی لائے۔ کہنے لگے کہ اس ریل گاڑی میں عام طور پر کچھ ڈرائیور اور فائرمین وغیرہ جو لاہور سے تعلق رکھتے ہیں، اکثر اپنی ڈیوٹی ختم کر کے لاہور واپس جاتے ہیں اور اگر ہم لوگ ٹرین میں گھوم پھر کر ایسے کسی ڈرائیور یا فائرمین کو تلاش کریں اور اگر کوئی مل گیا تو وہ اسے گاڑی آگے لے جانے کے لیے کہیں گے۔

ہم سب ساتھیوں نے پوری ٹرین کے مسافروں کی چھان بین شروع کر دی۔ معاً ایک ڈبے میں ایک شخص کالے کپڑوں میں ہمیں نظر آ گیا، یعنی وہ یونیفارم میں تھا اور ضرور ریلوے کے تکنیکی عملے میں سے تھا۔ ہم اسے بوگی سے اتار کر ایک طرف لے گئے اور اس کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ فائرمین ہے لیکن انجن چلانے کا تجربہ رکھتا ہے اور یہ کہ وہ عیسائی ہے۔

اب رات ہو چکی تھی۔ ہم نے اسٹیشن ماسٹر صاحب کو یہ اطلاع دے دی۔ انہوں نے کہا کہ متعلقہ فائرمین کو انجن میں سوار کرا دیں۔ خوش قسمتی سے انجن میں اس وقت کوئی ڈرائیور یا دوسرا شخص نہ تھا۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ اب اسٹیشن ماسٹر صاحب نے اگلے اسٹیشن سے لائن کلیر مانگی جو فوراً ہی مل گئی۔ ہم سے انہوں نے کہا کہ آپ لوگ گاڑی میں بیٹھ جائیں اور اس سے پہلے اس فائرمین کو بتا دیں کہ جونہی سگنل ڈاؤن ہو۔ گاڑی کو فوراً چلا دے کیونکہ خدشہ تھا کہ اسٹیشن پر غیر مسلموں کا خاصا ہجوم گاڑی کو نہ چلنے دے۔ ہم میں سے دو افراد افائرمین کے ساتھ انجن میں سوار ہو گئے۔

جیسے ہی سگنل ڈاؤن ہوا، گاڑی روانہ ہو گئی اور تھوڑی ہی دیر میں ہم دریائے ستلج عبور کر پاکستان میں داخل ہو گئے۔ آگے بھی لائن کلیر تھی اور ہم خیریت سے رات کے وقت قصور پہنچ گئے۔ یہاں ہم نے سجدہ شکر ادا کیا۔ بھوک، پیاس سے بے نیاز ہم سب ساتھی ایک عزم اور ولولے کے ساتھ جلد از جلد لاہور پہنچنا چاہتے تھے۔ قصور سے دوسرے ڈرائیور کا انتظام ہو گیا اور ہم 18 اگست 1947ء کی صبح لاہور پہنچ گئے۔ اس دن عید الفطر تھی مگر ہمیں کچھ یاد نہ تھا سوائے آزادی کے......

لاہور پہنچ کر ہمیں یہ بھی اطلاع ملی کہ ہمارے گھر والے عزیز و اقارب امرتسر سے بخیریت لاہور پہنچ چکے ہیں۔ اگلے روز اپنے پاکستان پہنچنے کی اطلاع ہم نے ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں دے دی اور ڈیوٹی پر حاضر ہو گئے۔ ہم اب پاکستان ویسٹرن ریلوے کے ملازم تھے جو آج صرف پاکستان ریلوے کہلاتا ہے۔ یوں اللہ کی مہربانی سے ہم بھی زندہ سلامت آ گئے اور ایک پوری ریل گاڑی بھی پاکستان کے حصے میں لے آئے۔ اس کے بعد کوئی گاڑی باقاعدہ ٹرین سروس کی حیثیت سے پاکستان نہ آئی۔"

(راوی مقبول احمد خان۔ اردو ڈائجسٹ، اگست 1999ء)

نذیر احمد نیشنل ایمرجنسی کے نام

ممتاز مصنف اور ادیب سید قاسم محمود نے اس پرسوز داستان میں اپنے سفر ہجرت اور مہاجرین کی حالت زار کا تمام تر کرب سمو دیا ہے۔

نذیر احمد سے میری ملاقات اس دن ہوئی جس دن باؤلی ریفیوجی کیمپ کھلا۔ باؤلی لاہور میں مہاجرین کا چوتھا کیمپ تھا۔ پہلا ریلوے اسٹیشن سے باہر کھلا میدان تھا جو خود بخود مہاجر کیمپ بن گیا تھا۔ دوسرا کیمپ شاہدرہ تھا اور تیسرا والٹن۔ میں ریلوے اسٹیشن والے غیر سرکاری مہاجر کیمپ میں محض رضا کار کے طور پر کام کرتا تھا۔ والٹن کیمپ میں باضابطہ کلرک کی حیثیت سے ساٹھ چار سو گریڈ میں تعینات ہوا یعنی ساٹھ بنیادی تنخواہ، چار سالانہ اضافہ اور آخری حد سو روپے۔ میں اکیلی جان، اتنی تنخواہ نہ بھی ملتی تو صرف گیلا راشن بقائے وجود کے لیے کافی تھا۔ اصل مقصد بچھڑے ہوؤں کی جستجو تھا۔ دلی کے پرانے قلعے میں بھی رضا کار بننے کا یہی مقصد تھا کہ اس طرح سرکاری عملے کا قرب حاصل ہو جاتا تھا۔

پرانے قلعے کے مہاجر کیمپ میں داخل ہونے کی بھی ایک لمبی کہانی ہے۔ مختصر یہ کہ دلی سے شمال مغرب میں اٹھائیس میل کے فاصلے پر سادات کی ایک شریف اور شائستہ بستی تھی، کھر کھودہ۔ اس بستی کا شمار ہندو جاٹوں کے اکثریتی ضلع روہتک کے ان چند قصبوں میں ہوتا تھا جو پرانی اسلامی تہذیب کی اقدار کی آبرو رکھے ہوئے تھے۔ سونی پت، مہم، کلانور، جھجر، روہتک اور کھر کھودہ یہاں دو ڈھائی ہزار مسلمان تھے، ڈھائی تین ہزار ہندو۔ کھر کھودہ ایک اونچے پہاڑی نما ٹیلے پر واقع تھا۔ گرداگرد فصیل تھی جو جگہ جگہ سے شکستہ ہو چکی تھی۔ چار اطراف میں چار دروازے تھے جو منہدم ہو چکے تھے۔ صرف نام باقی رہ گئے تھے۔

آزادی کے پہلے دن پندرہ اگست کو جب تقریباً بیس ہزار جاٹوں اور سکھوں نے اطراف سے حملہ کیا تو قصبے کی اونچائی اور شکستہ دروازوں نے دفاعی حکمت عملی میں ہماری بڑی مدد کی۔ ویسے بھی ہم نے گزشتہ چھ ماہ سے چندہ سازی سے خاصی تیاری کر رکھی تھی۔ ہمارے تیرگروں نے جو انڈین آرمی میں اسلحے سازی کے کارکانوں میں ملازم رہ چکے تھے، چار انچ دہانے کی چار توپیں (دروازوں پر رکھنے کے لیے)، بارود کے گولے اور بوتلیں اور گایوں بھینسوں کے سینگ (بارود سے بھرے ہوئے) تیار کر رکھے تھے۔

غنیم نے قصبے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ پو پھٹے چڑھائی شروع ہوتی۔ شام کو اپنی دو چار لاشیں اٹھا کر واپس چلے جاتے۔ رات کو وہ اپنی اپنی ٹولیوں میں ہاوہو میں مشغول ہو جاتے اور کبھی کبھی محصورین کو خوفزدہ کرنے کے لیے نعرہ زنی کرتے۔ ہمارے بڑے میر رشید احمد کی بیٹھک میں جمع ہو جاتے۔ ہم لڑکے بالے سارے دن کی اپنی اپنی فتوحات کے قصے مزے لے لے کر سنایا کرتے۔ ہماری خواتین اور چھوٹے بچے میر مہربان علی کی حویلی میں

اکٹھے ہو جاتے۔ چاروں دروازوں کے ناکوں پر مسلح توپچی چوکس بیٹھے رہتے اور دو دو چار چار پہریدار گلیوں بازاروں میں گشت کرتے رہتے۔

ہلکی ہلکی بارش تو پورا ہفتہ ہوتی رہی تھی لیکن بائیس اگست کی شام کو جو موسلا دھار بارش ہوئی ہے اور جو بجلیاں کڑکی ہیں اور بادل گرجے ہیں، لگتا تھا قیامت آ گئی ہے۔ دیکھتے دیکھتے گھٹنوں گھٹنوں پانی گلیوں میں شور مچانے لگا۔ محصورین نے اس کو غیبی امداد سمجھا کہ اب غنیم حملے سے باز رہے گا، ممکن ہے مایوس ہو کر واپس چلا جائے۔ رات کو دو بجے کے قریب اچانک معلوم ہوا کہ ہمارا اسلحہ جو ایک تہ خانے میں محفوظ تھا، پانی میں غرقاب ہو گیا ہے۔ اسلحے کا ذخیرہ بھی یہیں تھا اور شام کو جنگ کے بعد بندوقیں، برچھیاں، بلم، لاٹھیاں، تیر کمانیں اسلحہ خانے میں جمع کر دی جاتی تھیں۔ پانی کا بے قابو ریلا جانے کیونکر سیڑھیاں اتر کر دیواروں پر چڑھ گیا تھا۔ لالٹینوں کی روشنی میں سینگ اور گولے اور بندوقیں بے بسی سے تیرتی نظر آتی تھیں۔

اہل بستی پر مرگ کا سناٹا طاری ہو گیا۔ اکابرین میں باہم صلاح مشورہ ہوا۔ طے پایا کہ فوری طور پر قافلہ بناؤ اور دہلی کی طرف بھاگ نکلو۔ بستی سے دو اڑھائی میل کے فاصلے پر جب قافلہ بارش میں بھیگتا ہوا، کیچڑ میں لت پت، نہر گوپال پور کے پل پر سے گزرنے لگا تو غنیم کے گھوڑ سوار دستوں نے اچانک نمودار ہو کر روک لیا۔ حکم ہوا نہر کے ایک کنارے مرد قطار باندھ کر کھڑے ہو جائیں۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ برقع پوش خواتین نے حسب حکم اپنے اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ دوسرے کنارے پر قطار باندھ لی۔ تب فائرنگ کا حکم ہوا۔ اجتماعی قتل وقتال کا سلسلہ شروع ہوا۔ بہت سے مقتولین نہر کے سیلابی پانی میں ڈبکیاں کھانے لگے۔ جو عقبی میدان کی طرف بھاگے، ان کا تعاقب کیا گیا اور بیچ میدان میں موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ قافلہ سخت جاں آن کی آن میں نرم ونازک پھول کی پتیوں کی طرح بکھر گیا۔ جن دو چار کی قسمت میں پاکستان کے باشندے بننا لکھا تھا وہ بچ گئے۔

میں زخمی حالت میں قریب ہی کھڑا ایکھ (گنے کے کھیت) میں چھپ گیا۔ کئی روز چھپا رہا اور وہ ڈراؤنا منظر اپنی ان بدنصیب آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ بے شمار گدھ، چیلیں، کوے اور کتے جانے کہاں سے آ آ کر وہاں جمع ہو گئے تھے۔ یہ سب مل کر پاکستان کو بھنبھوڑ رہے تھے، اس کی بوٹیاں نوچ رہے تھے۔ اس کی ہڈیاں چبا رہے تھے۔ چچا تایا، ماموں، خالو، خالائیں، پھوپھیاں، بھانجے بھتیجے، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں تمام انسانی رشتوں نے اپنی اپنی قربانی دے دی تھی۔ وہ ہولناک اور دلدوز منظر ایک غلاف تھا، ایک چھلکا جس کے اندر زندگی ملفوف ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد دنیا کا ہر منظر، ہوا کا جھونکا، سورج کی دھوپ بھی اس غلاف سے چھن کر ہی میرے حواس تک پہنچ سکی۔

جب میدان میں شام غریباں منانے والا بھی کوئی نہ رہا اور قافلے کی ایک ایک ہڈی اور ایک ایک بوٹی کا صفایا ہو گیا اور ٹھٹھے لگانے والے تماشائی بھی رفتہ رفتہ غائب ہو گئے تو جینے کی ہوس مجھے پا پیادہ دہلی لے آئی۔ رات کی تاریکی میں چھپ چھپا کر سفر کرتا اور دن کے اجالے میں کسی کھیت میں روپوش ہو جاتا۔ دہلی کے پرانے قلعے کے ریفیوجی کیمپ میں بطور رضا کار مہینہ ڈیڑھ کام کیا۔ اکتوبر میں لاہور آ گیا اور جلد ہی میٹرک کا امتحان دینے کی بنیاد پر والٹن مہاجر کیمپ میں کلرک بھرتی ہو گیا۔

ایک روز کیمپ کمانڈنٹ نے سب رضا کاروں اور تنخواہ دار عملے کو اپنے بیرک کے برآمدے میں طلب کیا اور بتایا کہ والٹن میں اب تل دھرنے کی بھی گنجائش نہیں رہی اس لیے آج باؤلی میں ایک نیا مہاجر کیمپ قائم ہو گیا ہے۔ تم میں سے فلاں فلاں حضرات فوری طور پر باؤلی پہنچ کر کیمپ کمانڈنٹ کے پیش ہو جائیں۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ باؤلی سرحد سے کوئی دس میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے جہاں کبھی دوران جنگ

انگریزوں نے ایک عارضی دوران جنگ انگریزوں نے ایک عارضی چھاؤنی بنالی تھی۔

یہ باؤلی مہاجر کیمپ کے قیام کا پہلا دن تھا۔ جتنے رضا کار اور کلرک وغیرہ وہاں بھیجے گئے تھے' وہ نئے کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر نئی ڈیوٹیاں لینے کے لیے جمع ہوئے۔ کمانڈنٹ کا نام کوئی نہیں جانتا تھا۔ سب انہیں ''کیپٹن صاحب'' کہتے تھے۔ لمبے تڑنگے' گورا رنگ' کالی اچکن پر سرخ ترکی ٹوپی انہیں خوب سجتی تھی۔ انہوں نے اپنے نائب کی مدد سے سرکاری فہرست کے مطابق اپنے نئے ارکان عملہ کو پکارنا شروع کیا۔ حاضرین اپنے اپنے نام پر ہاتھ اٹھاتے رہے۔ محمد اسحاق والنٹیئر' تنویر احمد کلرک' قاسم علی کلرک' نذیر احمد نیشنل ایمرجنسی۔ یہ ''نیشنل ایمرجنسی'' میرے لیے ایک بالکل نئی چیز تھی۔ نذیر احمد نے ہاتھ اٹھایا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ گندمی رنگ' بھوری بھوری مسکراتی ہوئی آنکھیں' جسم گٹھا ہوا' پہلی نظر میں پٹھان معلوم ہوا۔

سب کی ڈیوٹیاں مقرر کرتے وقت کیپٹن صاحب نے کہا دو آدمی ایسے چاہئیں جو لاشوں کی تجہیز و تکفین کر سکیں۔ یہ کام سخت ہے لیکن ثواب کا کام ہے۔ بجائے اس کے کہ میں خود ڈیوٹی لگاؤں۔ آپ میں سے دو آدمی جو اسلامی جذبے سے یہ کام کر سکیں' ہاتھ کھڑا کر لیں۔ نذیر احمد نے فوراً ہاتھ کھڑا کر لیا۔ اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ہاتھ اٹھا لیا۔ ہم دونوں لاش برداری پر مامور ہو گئے۔ ایک پرانے سٹریچر کے سہارے ہماری دوستی پروان چڑھنے لگی۔

معمول یہ تھا کہ رات کو واہگہ بارڈر کی جانب سے مہاجرین کی تین کارواں آتے تھے۔ ایک دس بجے' دوسرا دو بجے اور تیسرا چار ساڑھے چار بجے۔ ہر قافلے میں انڈین ملٹری کے چار پانچ ٹرک ہوتے تھے۔ اگلی سیٹوں پر ڈرائیور کے علاوہ ایک دو باوردی سپاہی ہوتے تھے۔ ٹرک میں مہاجرین جانوروں کی طرح اوپر تلے ٹھنسے ہوئے ہوتے تھے۔ مہاجرین کو پہلے اتار کر سڑک کے کنارے جمع کیا جاتا تھا۔ پھر رضا کار انہیں بیرکوں کی طرف لے جاتے تھے۔ پہلے فوراً گیلا راشن دیا جاتا تھا کہ سوکھا راشن کل سے شروع کیا جائے گا۔ گیلے راشن میں دو دو تنوری روٹیاں اور پتلی شوربہ دال۔ یہ سرکاری راشن تھا لیکن اہل لاہور نے سرکاری گیلے راشن کا موقع کم ہی دیا۔ اس کے امدادی تانگے اور ریڑھے ہر کنوائے کے آنے سے پہلے ہی سڑک کے دونوں طرف موجود ہوتے تھے۔ دیگیں' گرم گرم بریانی' پلاؤ' زردہ' نان' کلچے' کمبل' کپڑے' ادویہ اور دیگر حسب توفیق جمع شدہ امدادی سامان۔

ہر ٹرک سے جو مہاجرین برآمد ہوتے تھے' ان میں پنجابی بولنے والے بھی تھے' اردو بولنے والے بھی۔ اس وقت زبان' رنگ' نسل اور عمر کی کوئی تفریق نہ تھی۔ ہر ہجرت کرنے والا مہاجر تھا۔ فی ٹرک دس پندرہ زخمی اور بیمار ضرور نکلتے تھے جن کو مرہم پٹی کے لیے ڈیوٹی پر مامور رضا کار فوراً ڈسپنسری پہنچاتے تھے جو قریب ترین بیرک میں قائم کر لی گئی تھی۔

ہر ٹرک میں سے کم از کم ایک لاش ضرور برآمد ہوتی تھی۔ مرنے والے پر بھی زبان' رنگ' نسل اور عمر کی کوئی قید نہ تھی۔ اس سٹریچر پر لاد کر مردہ خانے میں رکھ دینا نذیر احمد نیشنل ایمرجنسی اور اس کے نائب قاسم علی کی ذمے داری تھی۔

لیکن یہ ڈیوٹی بہت چھوٹی اور تھوڑی تھی۔ ہم فی کنوائے پندرہ بیس منٹوں میں اپنا مردہ ٹھکانے لگا کر فارغ ہو جاتے تھے۔ بے گور و کفن لاشوں کو تجہیز و تکفین کی رسوم کی ادائیگی کے بغیر ٹھکانے لگانے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ تب نذیر احمد مہاجرین کی ٹولیوں میں گھس جاتا تھا۔ ان سے باتیں کرنے بیٹھ جاتا۔ کس ضلع سے آئے ہو۔ کیا کام کرتے تھے۔ پاکستان میں کہاں جانے کا ارادہ ہے۔ باتیں' زندہ باتیں' پرامید باتیں مہاجرین

کی بکھری ہوئی اداس مایوس روحوں میں جینے کی تمنا پیدا کر دیتیں۔ دن کے وقت اور رات کے وقت، ہر وقت میں نے نذیر احمد کو دیکھا، مہاجرین کو پاکستان کی اہمیت وفضیلت بتاتے پایا۔ میں بھی ایک اداس، مایوس، لہولہان قافلے سے بچھڑا تنہا مہاجر تھا۔ نذیر احمد کی باتوں سے میرے بکھرے ہوئے زخمی احساسات میں بھی جمعیت پیدا ہوئی۔

نذیر احمد مہاجر نہیں تھا۔ ہم سب کا انصاری بھائی تھا۔ ضلع مردان کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ چند برس پہلے اس کے والد نے لائل پور میں تمباکو کی دکان کھول لی تھی اور بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے اسلامیہ کالج لاہور میں داخل کرا دیا تھا۔ دوران تعلیم اس نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب پاکستان بنا تو وہ بی اے کے چوتھے سال میں تھا۔ مہاجرین کی آمد اور دوسرے امور کی وجہ سے پنجاب یونیورسٹی نے فیصلہ کیا کہ جو طلبہ اس ہنگامی اور نازک وقت میں قوم کی خدمت کریں گے، انہیں امتحان دیے بغیر نیشنل ایمرجنسی ڈگری یا ڈپلوما سرٹیفکیٹ دیا جائے گا۔ مہاجر کیمپوں اور دوسرے مقامات پر قومی خدمت بجا لانے والے طلبہ کو اسی لیے ''نیشنل ایمرجنسی'' کہا جاتا تھا۔

نومبر 1947ء کی اس رات عجب واقعہ ہوا۔ ہم دونوں دوسری کنوائے کو بھگتا کر سڑک کے کنارے پلیا پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ظاہر ہے نئے ملک کی نئی باتیں، نئے عزائم، نئے ولولے، نئے نئے خواب، ہجرت کی باتیں، مستقبل کی باتیں، زندگی، عظیم تر، نفیس تر، حسین تر زندگی کی باتیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ پلیا کے پچھواڑے ذرا نشیب میں بجلی کے عارضی کھمبے کے عین نیچے ایک عورت بیٹھی ہے۔ ہم دونوں لپک کر اس کے پاس گئے۔ بڑھیا ساٹھ کے پیٹے میں تھی۔ سفید براق لباس، سفید دوپٹہ، سفید قمیص شلوار، سفید بال، سفید رنگ، سفید آنکھیں، سفید بھویں۔ جالندھر کے کسی افغان گھرانے کی خاتون تھی۔ نذیر احمد نے کہا: ''ماں جی، چلیے، یہاں سردی ہے۔ ہم آپ کو بیرک میں پہنچا دیتے ہیں۔'' ماں جی نے کوئی جواب نہ دیا۔

نذیر احمد نے جھک کر ماں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ ماں جی لڑھک گئیں۔ دونوں پاؤں اوپر اٹھ گئے۔ مردہ چہرہ ٹمٹماتے ہوئے بلب کی پیلی پیلی روشنی کے مقابل آ گیا۔ ماں جی کی روح نے ان کا ساتھ ایسے عالم میں چھوڑا جب وہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ آخری سانس کے وقت ان کی آنکھیں بند کرنے والا بھی قریب کوئی نہ تھا۔

اب بیٹھی ہوئی لاش کو مردہ خانے تک لے جانے کی منزل سر پہ کھڑی تھی۔ میں سراپا دہشت تھا۔ نہر گول پور کے کنارے کھر کھودہ کے میدان دو ڈھائی ہزار پیاروں کی لاشوں کا غم برداشت کر لینا حوصلہ مندی نہیں تھا، میری مجبوری تھی۔ گزشتہ پندرہ روز سے لاشیں اٹھانے اور مردہ خانے میں رکھنے کی مجبوری معاش کی مجبوری نہیں تھی، روح کی مجبوری تھی۔ اب ہر طرح کی مجبوریاں تحلیل ہو چکی تھیں، اور میں ٹھہرا صرف انسان، خوف کے وقت خوفزدہ، دہشت کے وقت دہشت زدہ ہو جانے والا بندہ بشر۔

میں نے نذیر احمد سے کہا: ''یار صبح دن کی روشنی میں لے جائیں گے۔'' نذیر احمد نے کہا: ''نہیں، ابھی جائیں گے۔ فرض فرض ہے۔ اگر ہم سچے پاکستانی ہیں تو یہ ہماری پاکستانیت کا امتحان ہے۔'' نذیر احمد بندہ بشر نہیں تھا۔ وہ تو نیشنل ایمرجنسی تھا۔ اسے سچا پاکستانی بننے کا جنون تھا۔

نذیر احمد نے اپنی پرامید باتوں سے، میٹھی میٹھی اثر پذیر دلیلوں سے مجھے پاکستانیت کا امتحان دینے پر مائل کر لیا۔ اس نے کلمہ توحید با آواز بلند پڑھا۔ اس کی پیروی میں، میں نے بھی پڑھا۔ اس نے اللہ اکبر کہا میں نے بھی کہا اور ہم دونوں نے مل کر ماں جی کو سٹریچر پر ڈالا۔ نذیر احمد اونچی

آواز میں چاروں قل باری باری پڑھنے لگا۔ ہم مردہ خانے کی طرف چلے‘ جس کا فاصلہ پل صراط سے بھی طویل اور کٹھن تھا۔ اگر سٹریچر کے آگے میں ہوتا تو گھپ اندھیرے میں میرے آگے آگے مردے ہی مردے چلتے ہوئے نظر آتے۔ میں نذیر احمد سے کہتا کہ بھائی‘ مجھے ڈر لگ رہا ہے‘ میں پیچھے آ جاتا ہوں۔ اور جب میں پیچھے ہوتا تو یوں محسوس ہوتا سٹریچر میں بیٹھی ہوئی‘ اکڑی ہوئی‘ جھولتی ہوئی لاش‘ جیسے پوچھ رہی ہو‘ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟

جب ہم نے ماں جی کو مردہ خانے میں دوسرے نئے نئے پاکستانیوں کی صف میں رکھا‘ تو سابقہ لاشوں میں سے کسی لاش کے حلق سے ایک مردانہ‘ انتہائی ہولناک اور لمبی ہی لمبی‘ غرغراتی ہوئی آواز نکلی...... ’’ہائے۔‘‘ تب میں بھاگا اور وہ آواز میرے پیچھے بھاگی۔ میں اور تیز بھاگا۔ وہ آواز اور تیر بھاگی۔ میں نے دور سے دیکھا‘ نذیر احمد بھی مخالف سمت میں بھاگا جا رہا تھا۔ چپ چاپ ہم بجلی کی رفتار سے بھی تیز بھاگتے رہے۔ اس نے مجھے آواز نہیں دی۔ میں نے اسے نہیں پکارا۔ وہ جو مجسم نظریہ پاکستان تھا۔ وہ مجھے پھر کبھی‘ کہیں بھی نہیں ملا۔

نذیر احمد! تم کہاں ہو؟ تم یا تمہارا جیسا مجھے پھر کہیں‘ کبھی نہیں ملا۔ میرے بھائی‘ میرے دوست‘ میرے سچے پاکستانی! تم جہاں بھی ہو‘ جس حالت میں بھی ہو‘ مجھ سے ملو۔ پھر نیشنل ایمرجنسی کا وقت آن پڑا ہے۔ بے شمار گدھ‘ چیلیں‘ کوے اور کتے پاکستان کو بھنبھوڑ رہے ہیں۔ اس کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں اور اس کا گوشت کھا رہے ہیں۔ جلد پہنچو‘ تا کہ ہم مل کر ان کا قلع قمع کر دیں۔ تم ہو کہاں؟ جہاں بھی ہو‘ جلد پہنچو۔ اگر تم یہاں سے مستقل رخصت ہو چکے ہو تو خوابوں میں آؤ۔ کوئی بشارت لاؤ۔ تمہارا باؤلی ریفیو جی کیمپ والا‘ قاسم علی۔

(تحریر سید قاسم محمود‘ اردو ڈائجسٹ‘ اگست 1998ء)

کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے، ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔

اگر آپ ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم سے kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود ADs کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجئے، آپ کی یہی مدد کافی ہوگی۔

یاد رہے، کتاب گھر کو صرف آپ بہتر بنا سکتے ہیں۔

پاکستان۔ میرے خوابوں کی جنت

تقسیم کے بعد علی گڑھ میں گزرے کٹھن شب وروز اور پاکستان چلے آنے کی ناقابل فراموش داستان

آج ماہ آزادی کے موقع پر مجھے تحریک قیام پاکستان کی آخری گھڑیاں اور اپنے اس وطن سے دور اس کی فرقت میں بیتے ہوئے لمحات شدت سے یاد آرہے ہیں۔

ہماری اس جنگ آزادی میں 1946ء کے عام انتخابات ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان انتخابات میں قائداعظمؒ کے احکامات پر عمل کرتے ہوئے ہم طلبہ نے کارکنوں کی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا جس کے نتیجے میں مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بن کر ابھری تھی اور ہندوؤں کو یقین ہو گیا تھا کہ اب کوئی طاقت بھارت ماتا کو دو ٹکڑے ہونے سے نہیں بچا سکتی' لہٰذا ان دشمنان اسلام نے طیش میں آ کر فسادات کی آگ بھڑکا دی اور مسلم اقلیتی صوبوں میں فرزندان توحید کا گشت وخون اور لوٹ مار شروع کر دی۔

ہم لوگ ان دنوں مسلمانان ہند کے علمی وثقافتی گڑھ' علی گڑھ میں آباد تھے اور میں مسلم یونیورسٹی میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ ہمارا گھر ''بیت السلام'' شہر کے نواح میں واقع تھا۔ اس کے آگے گھڑ دوڑ کا میدان' نمائش گاہ اور ہندوؤں کے گاؤں تھے۔ جب ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں تو علی گڑھ کے دیہات میں بھی ہندوؤں میں یہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ان ''مسلوں'' کو چین سے نہ بیٹھنے دو۔ ان خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے انور پاکستانی نے اپنی مشہور نظم میں کہا تھا۔

یہ مشورہ ہوا کل غیروں کی انجمن میں
چھوڑو نہ جان باقی اسلامیوں کے تن میں
میں نے کہا شری جی کیا سوچتے ہو من میں
یہ چاند وہ نہیں ہے آ جائے جو گہن میں

جوں جوں اگست کا مہینہ قریب آرہا تھا اور اعلان آزادی کی تاریخ نزدیک ہو رہی تھی' علی گڑھ کا ماحول مکدر ہوتا گیا۔ دن بھر شہر میں طرح طرح کی افواہیں گشت کرتی تھیں۔ یہ بھی سننے میں آتا کہ ہندوؤں نے پوری تیاری کر لی ہے اور کسی وقت بھی رات میں شہر پر ہلا بولا جا سکتا ہے۔ اکثر نصف شب کو پاس کے گاؤں سے ''بجرنگ بلی کی جے'' کے نعرے بلند ہوتے۔ ہم جب اپنے مکان کی چھت پر چڑھ کر دیکھتے تو دیہات کے اطراف میں مشعل بردار جلوس نظر آتا۔ تھوڑی ہی دیر میں دوسری سمت میں فضا نعرہ تکبیر کے ایمان پرور نعروں سے گونجنے لگتی۔

ہماری کوٹھی کے تین طرف کھلا میدان تھا اور مغرب کی جانب دو بنگلے تھے جو بھیکم پور اسٹیٹ کی ملکیت تھے۔ ان میں سے ایک بنگلے میں یونیورسٹی کے انگریزی کے پروفیسر فیلڈن رہتے تھے جبکہ دوسرے مکان میں نواب صدر یار جنگ کے چھوٹے بھائی‘ عبیدالرحمٰن خان شیروانی قیام پذیر تھے۔ جب شہر میں فسادات نے شدت اختیار کر لی تو شیروانی صاحب نے یہ تجویز کیا کہ جب بھی رات کو دیہات کی طرف سے حملے کا اندیشہ ہو تو ہم سب ان کے گھر میں جمع ہو جائیں۔ وہاں انہوں نے اپنی جاگیر سے مسلح پہرے داروں کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ حالات ایسے مخدوش ہوتے جا رہے تھے کہ اکثر راتیں جاگتے بیتی تھیں۔ اگر ذرا بھی آنکھ لگ جاتی تو نعروں اور دھماکوں کی آوازیں چونکا دیتی تھیں اور ہم سب بڑے چھوٹے گھپ اندھیرے میں افتاں وخیزاں شیروانی صاحب کی کوٹھی کا رخ کرتے تھے۔ بڑے بھائی صاحب‘ جو علی گڑھ میں وکالت کر رہے تھے‘ اپنے ایک ہاتھ میں بندوق سنبھالتے جبکہ ان کے دوسرے ہاتھ میں بھابی صاحبہ کے زیورات کا تھیلا ہوتا۔ ہم لوگ گود میں چھوٹے بچوں کو اٹھا لیتے جو اس ماحول میں خوفزدہ ہو کر بلکنے لگتے۔ بھابی کے لیے یہ راستہ طے کرنا بڑا دشوار تھا۔ ایک تو ہر طرف تاریکی‘ دوسرے ان کا پیر بھاری تھا۔ سب عورتیں اور بچے زنان خانے میں اکٹھے ہو جاتے اور مرد باہر پہرا دینے پر تعینات کر دیئے جاتے۔ ادھر گاؤں والوں کے دلوں میں مسلمانوں کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ صرف شور وغل مچا کر رہ جاتے اور حملہ کرنے کی نوبت نہ آتی۔

اسی اثنا میں دہلی سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ چھوٹی بھابی معیادی بخار میں مبتلا ہیں اور ان کے پاس کوئی تیماردار نہیں کیونکہ بھائی صاحب جو مرکزی حکومت میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے‘ اپنے دفتر کی کراچی منتقلی کی تیاریوں میں بے حد مصروف ہیں‘ چنانچہ مجھے فوری طور پر دہلی جانا پڑا۔

اگست کے اوائل میں پاکستانی مرکزی حکومت کے لیے نامزد عملے کی کراچی روانگی شروع ہو گئی تھی۔ پہلی خصوصی ٹرین جو 15 اگست کو دہلی سے لاہور کے لیے روانہ ہوئی‘ مشرقی پنجاب کے علاقے میں تخریب کاروں کے حملے کا نشانہ بنی اور کافی افراد شہید ہوئے۔ ان حملوں کے سبب دہلی کو فرقہ وارانہ فضا اور سنگین ہو گئی۔

بھائی صاحب کی رخصت کے انتظامات میں تاخیر کے سبب ہمیں دہلی میں 15 اگست کو بھارت کا یوم آزادی کا جشن دیکھنے کا موقع مل گیا۔ سب سے بڑا مجمع انڈیا گیٹ کے اطراف میں تھا۔ سویرے ہی سے وہاں جوق در جوق خلقت جمع ہو رہی تھی۔ جس طرف بھی نگاہ اٹھتی انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آتا۔ عورتیں‘ مرد‘ بچے‘ بوڑھے اور جوان رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس ہاتھوں میں بھارت کا قومی پرچم تھامے گورنر جنرل اور اپنے وزیراعظم کے جلوس کے منتظر تھے۔ دفعتاً بھارت ماتا کی جے ’’مہاتما گاندھی کی جے‘‘ کے نعروں کی گونج اور تالیوں کے شور میں گورنر جنرل کی سواری آتی نظر آئی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بحریہ کے سربراہ کی سفید وردی میں ملبوس تھے ان کے ہمراہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو بھی بارہ گھوڑوں کی ایک بگھی میں سوار تھے۔ پنڈت جی نے گاندھی ٹوپی اور کھدر کی شیروانی زیب تن کی ہوئی تھی۔ گورنر جنرل اور وزیراعظم ہاتھ ہلا ہلا کر پرجوش تماشائیوں کے نعروں کا جواب دے رہے تھے۔ بے تحاشا ہجوم کے سبب گاڑی نہایت آہستہ رفتار سے چل رہی تھی اور بعض جوشیلے افراد اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح پنڈت جی سے ہاتھ ملا لیں یا کم از کم ان کا بدن چھو لیں۔ میں اپنے تصور میں کراچی پہنچ گیا تھا اور اس مجمع میں اپنے آپ کو بالکل اجنبی محسوس کر رہا تھا۔ میرے دل میں کوئی جوش تھا نہ ولولہ۔ وہی ملک جو صرف ایک روز قبل میرا وطن تھا‘ میں آج وہاں ذہنی طور پر ایک

جلا وطن کی حیثیت رکھتا تھا۔

دو چار دن بعد بھائی صاحب اور بھابی صاحب کراچی کے لیے روانہ ہو گئے اور میں واپس علی گڑھ آ گیا۔ میں اگرچہ عربی میں ایم اے پاس کرنے کے بعد تحقیقی مقالہ لکھنے میں مصروف تھا مگر قیام پاکستان کے بعد میرا دل اچاٹ ہو گیا تھا اور مجھے بھارت میں ایک پل گذارنا بھی گوارا نہ تھا مگر مجھے والد صاحب کی خواہش کا احترام کرنا پڑا اور میں نے تحقیق کا کام جاری رکھا۔ والد صاحب صوبہ متحدہ میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کا علی گڑھ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا ارادہ تھا مگر وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کی اولاد پاکستان کی خدمت کرے۔ ان کا یہ نظریہ تھا کہ بارسوخ، پنشن یافتہ سرکاری ملازمین کو بھارت میں قیام کرنا چاہیے کیونکہ ان کے وجود سے وہاں کے بے نوا غریب مسلمانوں کی ڈھارس بندھے گی۔ ان سب لوگوں کے لیے پاکستان ہجرت کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ مگر ہندو اقتدار کے نشے میں مست تھے اور تمام مسلمان ان کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹک رہے تھے۔ انہیں تو مسلمانوں نے اپنی ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لینا تھا۔

متعصب ہندو طبقہ قیام پاکستان کے بعد علی گڑھ میں مسلمانوں کو کسی طرح چین سے بیٹھا نہیں دیکھ سکتا تھا، چنانچہ شہر میں حیلے بہانوں سے فسادات کا سلسلہ جاری رہا بلکہ اس میں اور شدت آ گئی۔ مسلمانوں کا خون بہایا جاتا رہا اور ان کے مکان اور دکانیں لوٹی اور نذر آتش کی جاتی رہیں۔ اور تماشا یہ تھا کہ مجرم کی حیثیت سے بھی مسلمان ہی گرفتار کیے جاتے تھے۔ مقامی انتظامیہ نے ہندو غنڈوں کو لوٹ مار کی کھلی چھٹی دی ہوئی تھی۔ جب ہر طرف سے مسلمانوں نے صدائے احتجاج بلند کی تو بھارتی حکومت نے تحقیقات کے لیے دو مرکزی وزراء رفیع احمد قدوائی اور پنڈت کیلاش ناتھ کاٹجو کو علی گڑھ بھیجا جس پر ایک مقامی شاعر، آرزو ڈبائیوی نے فی البدیہہ یہ شعر کہا:

کانگریسی وزیر قدوائی ساتھ جن کے ہیں کاٹجو بھائی
ہندوؤں کے غلیظ دامن سے دھونے آئے ہیں داغ رسوائی

جیسا کہ عام خیال تھا یہ تحقیقات محض اشک شوئی تھی کیونکہ مسلمانوں کے خلاف کارروائی ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت وزیر داخلہ سردار پٹیل کی سرپرستی میں عمل میں آ رہی تھی۔ ان کے آلہ کار راشٹریہ سیوک سنگھ والے تھے۔ پٹیل کی یہ حکمت عملی تھی کہ مسلمان خود کو بھارت میں غیر محفوظ تصور کریں اور ان کے پاؤں اکھڑ جائیں تا کہ وہ سب پاکستان کا رخ کریں اور اس نئی مملکت کے لیے بے شمار مہاجرین کا بوجھ سنبھالنا ناممکن ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہندو انتظامیہ نے خصوصیت کے ساتھ معزز اور باحیثیت مسلمانوں کی تذلیل میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی انہیں جھوٹے مقدمات میں ملوث کیا جا رہا تھا۔

ایک روز عجیب حادثہ پیش آیا۔ منہ اندھیرے پولیس کی بھاری نفری نے ہمارے مکان کو گھیرے میں لے لیا اور سپاہی بلا اجازت زنان خانے میں داخل ہو گئے اور خانہ تلاشی شروع کر دی۔ والد صاحب نے جب نگران افسر سے اپنا تعارف کرایا اور سرچ وارنٹ طلب کیا تو اس نے بتایا کہ یہ کارروائی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے عمل میں آئی ہے کیونکہ مصدقہ سرکاری اطلاع کے مطابق اس بنگلے میں غیر لائسنس شدہ اسلحہ موجود ہے۔ پولیس کی جماعت نے گھر کا چپا چپا چھان ڈالا مگر جب کچھ نہ ہاتھ آیا تو وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

دو دن بعد جب ایک سنسر شدہ خط موصول ہوا تو پولیس کی شان نزول کا عقدہ حل ہوا۔ میرے عربی کے استاذ پروفیسر عبدالعزیز میمن صاحب کراچی تشریف لے گئے تھے۔ جب بھارت میں فسادات کے سبب ان کا وہاں پر قیام طویل کھینچ گیا تو موصوف نے مجھے یہ تاکید کی تھی کہ چونکہ ان کا گھر غیر محفوظ تھا اس لیے میں ان کی بندوق اپنے ہاں منتقل کرلوں۔

مذکورہ واقعے کا والد صاحب کی حساس طبیعت پر شدید ردعمل ہوا اور وہ چند ہی روز بعد والدہ محترمہ کے ہمراہ کراچی کوچ کر گئے۔

یونیورسٹی کے باہر علی گڑھ کی فضا بالکل بدل گئی تھی اور ہندو احباب کے رویے میں تو نمایاں تبدیلی آ چکی تھی۔ اب پہلے جیسا خلوص اور بے تکلفی باقی نہیں رہی تھی۔ بچپن کے ساتھ کھیلے ہوئے دوست بھی اکثر طنزاً دریافت کرتے: ''یار! تم اپنے پاکستان کب جا رہے ہو؟'' حد تو یہ تھی کہ وہ ہندو چوکیدار اور مہتر وغیرہ جو برسوں سے ہمارے نمک خوار تھے' ان کی نظروں میں بھی فرق آ گیا تھا۔ انہیں توقع تھی کہ یہ جلد وفعان ہوں تو ان کی چیزوں پر ہم قبضہ کرلیں۔ ایسے حالات میں وہاں وقت گذارنا بڑا اذیت ناک اور صبر طلب تھا۔

والدین کے ہجرت کر جانے کے بعد بھارت میں قیام اور بھی زیادہ سوہان روح بن گیا تھا۔ مگر دل یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ میری اتنی محنت رائیگاں جائے۔ خدا خدا کر کے میرا مقالہ مکمل ہوا اور میں نے بغیر ایک پل ضائع کیے فوراً ہی رخت سفر باندھ لیا اور ریل گاڑی کے ذریعے لاہور کے لیے روانہ ہوگیا۔ شوق منزل میں جوش و ولولہ کا یہ عالم تھا کہ دل چاہتا تھا میرے پر لگ جائیں اور گھڑی کی چوتھائی میں اڑ کر پاکستان پہنچ جاؤں۔ میری نیند اچاٹ ہوگئی تھی اور کچھ کھانے پینے کو دل نہ چاہتا تھا۔ بالآخر وہ گھڑی آن پہنچی جس کا مدت سے انتظار تھا اور ہم نے خود اپنی آنکھوں سے اپنے خوابوں کی جنت کو دیکھ لیا۔

پاکستان کی سرحد میں داخل ہوتے ہی میں نے اس پاک دھرتی کو چوما اور اپنے مالک کے حضور سجدہ شکر بجالایا۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ میں نے 14 اگست 1949ء کو پاکستان کی سرزمین پر پہلا قدم رکھا اور یوں مجھے یوم آزادی کی تقریبات میں خلوص و محبت کے ساتھ بھرپور حصہ لینے کا موقع مل گیا۔

یہ کسے خبر تھی کہ کبھی وہ منحوس گھڑی بھی آئے گی جب اپنی نادانیوں اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب ہمارا پیارا ملک دولخت ہو جائے گا اور ہم جنگی قیدی کی حیثیت سے پچیس ماہ کے طویل عرصہ بھارت کی سربریت اور ایذا رسانی کا شکار بنے رہیں گے اور دوبارہ اسی راہ سے گذر کر مادر وطن کی آغوش میں عافیت نصیب ہوگی۔

وہاں سے نکل کے پھر نہ ملی عافیت کہیں
آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی

(تحریر ایم ایم حسن' اردو ڈائجسٹ' اگست 1998ء)

سفرنامہ ہجرت

مولانا حالی کے شہر سے دریائے خوں پار کر کے لاہور پہنچنے کی دلدوز داستان

میں 10 مارچ 1940ء کو پانی پت (انڈیا) میں پیدا ہوا۔ میرا خاندان وہاں شیخوں کا خاندان مشہور تھا۔ میرے دادا شیخ محمد یوسف حسن حافظ قرآن تھے، وہ پانی پت کے داروغہ بھی رہے۔ میرے والد شیخ محمد یامین حسن، چچا شیخ محمد مبین حسن تعلیم سے وابستہ ہوگئے۔ باقی عزیزوں میں سے میرے خالو اور ماموں بھی اسی شعبے میں آئے۔ اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ استاد ہونے کے ناتے انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران اور بعد میں بھی حد سے زیادہ نیک نامی سے وقت گزارا۔ میرے پورے خاندان کو ایک دینی گھرانہ سمجھا جاتا تھا اور آج میں خلوص نیت سے یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم اور بزرگوں کی نیک دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میرا ایک بیٹا ماشاءاللہ حافظ قرآن ہے۔

سست دھک میں پانی پت کا نام پانی پرست تھا مگر راجہ ارجن دوئم نے جو پانڈوؤں کا جانشین تھا، اس شہر کو کلجک میں دوبارہ بسایا اور اس کا نام پانی پت رکھا۔ تاریخ پاک و ہند میں پانی پت تین مشہور جنگوں کی وجہ سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ اس شہر ہی میں بوعلی شاہ قلندرؒ کا مزار بھی ہے اور یہی شہر مولانا حالی کا مسکن بھی رہا۔ مولانا حالی نے تعلیم و تدریس کے فروغ کے لیے یہاں ایک کمرے میں سکول کی بنیاد رکھی اور بعد میں اپنے صاحبزادے اور دوسرے مخیّر حضرات کی کاوشوں سے شہر کے بالکل ساتھ جی ٹی روڈ پر ایک عظیم الشان اسکول قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جس کا نام حالی مسلم ہائی سکول رکھا گیا جو قیام پاکستان کے بعد عرصہ تک قائم رہا۔ میرے مرحوم والد اور مرحوم پھوپھا اسی اسکول میں مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے۔

پانی پت کی مشہوری اس شہر کے جید علماء اور قراء حضرات کی وجہ سے بھی تھی۔ جا بجا مساجد، دینی مدارس اور ان میں تجدید قرآن اور قرأت کا جو معیار تھا، اس کی پاک و ہند ہی نہیں افغانستان اور دوسرے ملکوں میں بھی شہرت تھی اور قراء حضرات کو سننے اور سیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ یہاں آتے تھے۔

پانی پت کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ دہلی کے قریب ہوتے ہوئے بھی یہاں درباری جوڑ توڑ سے پاک، سادہ سا قصباتی ماحول قائم تھا جو اہل علم کے لیے سازگار تھا اور شاید اسی لیے کافی علماء اور صوفیائے کرام نے اسے اپنا مستقر بنایا۔

میرے دادا کا بہت بڑا مکان تھا۔ جس کے خاصے کشادہ کمرے، دالان، بڑا صحن اور گھر کے باہر بہت وسیع چبوترہ تھا۔ یہ محلّہ سیدانیاں میں تقریباً درمیان واقع تھا۔ شام کو محلّہ کے بزرگ دن کے کام کاج سے فارغ ہو کر ہمارے چبوترے پر اکٹھے ہوتے اور کم از کم عشاء کی نماز تک یہ محفل رہتی۔ بزرگ بتاتے تھے کہ دادا کی زندگی میں احتراماً لوگ ان کے سامنے بیٹھ کر ان کی نصیحتیں سنتے تھے اور محلے اور محلے کی مسجد کا ہر کام ان کی مرضی سے ہوتا تھا۔ میرے باقی رشتہ دار الگ محلّہ میں جسے شیخوں کا محلّہ کہا جاتا تھا، رہتے تھے۔ اس محلے میں زیادہ تر مسلمانوں کے گھر تھے، صرف دو گھر ہندوؤں

کے تھے۔ مگر ان دونوں بھائیوں نے ہندو ہونے کے باوجود پورے محلے والوں کا برے وقت میں ساتھ دیا جس کے لیے سب ان کے شکر گزار تھے۔

جون 1947ء میں پاکستان بننے کے اعلان کے بعد سے حالات روز بروز کشیدہ ہوتے چلے گئے۔ والد صاحب اسکول سے واپسی کے بعد رات کو بہت کم کہیں باہر جاتے۔ اگست میں حالات دگرگوں ہوئے تو اسکول بند ہو گیا اور ہر طرف سے آنے والی فسادات کی خبروں نے تمام لوگوں کو از حد پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ والد صاحب ان دنوں اسکول کے بورڈنگ ہاؤس کے بھی انچارج تھے۔ انہوں نے تین لڑکوں کے سوا سب کو ان کے گھروں کو بھجوا دیا اور ان تینوں کو جو فسادات زیادہ ہو جانے کی وجہ سے اپنے گاؤں نہیں جا سکے تھے' اپنے گھر لے آئے کہ حالات کچھ ٹھیک ہو جائیں تو چلے جانا۔

ستمبر 1947ء کے وسط تک حالات اتنے خراب ہو گئے کہ کرفیو اور خاصے گشت و خون کی وجہ سے گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ کرفیو کھلتا تو والد صاحب بھاگ کر دوسرے رشتہ داروں کی خبر لے آتے یا ان میں سے کوئی آ کر اپنی اطلاع دے جاتا اور ہماری خبر لے جاتا۔ اس دوران ان دونوں ہندو بھائیوں نے کم از کم ہمارا بہت ساتھ دیا۔ گھر میں پکانے یا ضرورت کی چیزیں وہ جا کر لا دیتے اور ہر طرح سے ہمارا دھیان رکھتے۔ والد صاحب نے ان تینوں لڑکوں کے ساتھ مل کر گھر کا سامان باندھنا شروع کیا۔ میرے گھر میں دادا کے وقت کے اور ابا' چچا کے جمع شدہ برتن اور کافی چیزیں تھیں جو بکسوں میں آرام بند کیں۔ کچھ سامان بستروں کی شکل میں باندھا۔

میں یہ سب دیکھ کر ابا اور اماں سے پوچھتا تو وہ کہتے: ’’بیٹے! اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ اپنے نئے ملک پاکستان جائیں گے۔‘‘ میں پریشان ہوتا کہ آپ نے اپنا سامان باندھ لیا ہے' میری مرغیاں کیسے جائیں گی' خاص طور پر میری بیٹی؟ دراصل مرغیوں میں ایک اندھی تھی' میں اسی کو بیٹی کہتا تھا اور بیٹھ کر اسے آواز دیتا تو وہ آواز کی سمت بھاگتی اور چیزوں سے ٹکراتی گرتی پڑتی میرے پاس آ جاتی اور میں اسے دانہ کھلاتا تھا۔ ابا تسلی دیتے تھے کہ فکر نہ کرو' اس کا بھی کچھ انتظام کر لیں گے۔

اس تمام عرصے میں ابا' اماں' باقی محلے دار اور ہمارے رشتے دار بہت پریشان دکھائی دیتے تھے۔ کرفیو کے دوران میرے والد اور والدہ بار بار چھت پر جانے والی سیڑھیوں کے درمیان ایک سوراخ سے جس سے سامنے گلی خاصی دور تک صاف نظر آتی تھی باہر دیکھتے اور واپس آ جاتے۔ میں ضد کرتا تو دو تین دفعہ میری والدہ نے مجھے بھی گود میں لے کر باہر کا نظارہ کرایا۔ گلی بالکل سنسان تھی مگر یہ یاد ہے کہ اکا دکا ہندو آرام سے آ جا رہے ہوتے تھے۔

اکتوبر کا مہینہ شروع ہوا تو والدین زیادہ پریشان رہنے لگے۔ اور ایک رات برابر میں ہندو بھائیوں میں سے ایک نے ابا کو آوازیں دیں اور ان کو چھت پر بلا کر مطلع کیا کہ صبح شیخوں کے محلے اور اس کے ساتھ کچھ اور علاقے سے مسلمان گھرانے نکال کر انہیں محلّہ انصار لے جایا جائے گا۔ محلّہ انصار شہر کے بیرونی طرف واقع تھا۔ جس کے قریب ہی ایک بڑا میدان بھی تھا۔ ابا نے ان کی منت کی کہ وہاں کی خبر لے کر آئیں اور صبح ہمیں بھی اطلاع دیں کہ وہ کس طرح نکلے اور کہاں کہاں سے محلے خالی ہوئے ہیں۔

ایک ہندو بھائی نے حامی بھر لی اور خاصی رات گئے اس نے اطلاع دی کہ سب خیریت سے ہیں اور کہا ہے دعا کریں' عزت سے نکل

جائیں۔ انہوں نے ساتھ لے جانے کے لیے کچھ ہلکا سا سامان باندھ لیا ہے۔

علی الصبح فائرنگ کی کچھ آوازیں آئیں اور میرے والد خاصی دیر سیڑھیوں کے سوراخ سے باہر کا نظارہ کرتے رہے۔ ہندوؤں کو آوازیں دیں مگر وہاں سے جواب نہ آیا۔ ابا واپس آئے تو اماں جا کر باہر کا نظارہ کرنے لگیں۔ قریباً دوپہر کو ہندو آیا اور کوٹھے ہی پر بلا کر اس نے بتایا کہ اب سے کچھ دیر بعد شیخوں کا محلّہ خالی ہوگا، میں ادھر ہی کی خبر لینے گیا تھا۔ صبح سکھوں نے خاصی فائرنگ ان کے محلے کے ساتھ گھاٹی میں کی اور کچھ مسلمان عورتیں بچے مار دیئے مگر آپ کے سب عزیز خیریت سے ہیں۔

شام سے کچھ پہلے ابا جو مسلسل سیڑھیوں میں کھڑے باہر کا نظارہ کر رہے تھے انہوں نے اماں کو آواز دی کہ اب محلّہ خالی ہو رہا ہے اور سامنے گلی میں سے جو راستہ بڑے بازار کی طرف جاتا تھا اس راستہ سے لوگ جا رہے ہیں۔

اماں اور ابا نے وضو کیا اور نفل پڑھنے لگے۔ رات کو ہندو پھر ابا کو چھت پر بلا کر اطلاع دے گیا کہ شیخوں کا محلّہ اور ہمارے دوسرے عزیز بخیر و عافیت محلّہ انصار پہنچ گئے ہیں اور میں ان سے مل آیا ہوں، وہ آپ کے بارے میں پریشان ہیں۔

6 اکتوبر 1947ء کی صبح فجر کی نماز کے بعد سکھوں نے ہمارے محلّہ پر حملہ کر دیا۔ اس کی اطلاع رات ہی کو ہندوؤں نے ہمیں دے دی تھی اور ابا سے کہا تھا کہ کچھ بھی ہو، گھر کا صدر دروازہ نہ کھولیں، اس کی ارلی مضبوطی سے لگائے رکھیں (ارلی لکڑی کا شہتیر ہوتا تھا جس دروازے بند کرنے کے بعد پیچھے لگا دیتے جو دونوں طرف کی دیواروں میں بھی ہوتا تھا اور اسے ہٹائے بغیر دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔)

حملے کے وقت خاصی فائرنگ اور کچھ دھماکوں کی آوازیں آئیں۔ وہ تین لڑکے جو ہمارے گھر میں تھے، صدر دروازے کے ساتھ بیٹھک میں رہتے تھے، ڈر کر ایک دم گھر کے صحن میں آ گئے۔ انہوں نے ابا کو بتایا کہ صدر دروازہ توڑنے کے لیے دھماکے کیے جا رہے ہیں۔

عین اسی وقت ہماری چھت پر ساتھ والے تیسرے گھر سے ایک محلے دار اتر آیا اور اس نے ابا کو آواز دی کہ شیخ صاحب فوراً بھابی اور ادریس وغیرہ کو لے کر اوپر آؤ اور چھتوں سے ہوتے ہمارے گھر میں آ جاؤ۔ سکھ پوری طاقت سے آپ کے دروازے کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہاں قریباً سارا محلّہ جمع ہو گیا ہے۔

میں ایکدم بھاگا اور اپنی بیٹی (مرغی) کو بغل میں دبا لیا۔ ابا نے اماں سے کہا کہ آپ چلیں میں ان لڑکوں کے ساتھ کچھ سامان لے کر آتا ہوں۔ اماں نے زبردستی میری ''بیٹی'' کو گود سے اتار دیا کہ اور لے دوں گی اور مجھے گود میں لے کر چھت پر چلی گئیں۔ بڑی مشکل سے لکڑی کی سیڑھی جو چھت پر پڑی رہتی تھی لگا کر ہم دوسرے گھر میں اترے اور وہاں سے تیسرے گھر میں داخل ہوئے تو وہاں سخت کہرام برپا تھا۔

کچھ زخمی افراد کپڑے پھاڑ کر اپنا خون بند کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چند بزرگ مرد عورتیں یہ دیکھ رہے تھے کہ کون آ گیا، کون رہ گیا۔ میری والدہ کو اور مجھے دیکھتے ہی کئی خواتین آگے بڑھیں اور ابا کے بارے میں پوچھا اور اسی لمحہ دو تین جوان لڑکے بہت سے ہمارے گھر کی طرف بھاگے اور پھر کچھ دیر بعد ابا اور تینوں لڑکے آ گئے مگر خالی ہاتھ۔

میں یہ سب دلخراش منظر دیکھ کر رو رہا تھا اور میری والدہ اور دوسری عورتیں مجھے پیار کرتے ہوئے چپ کرا رہی تھیں۔ جس طرح باقی تمام

لوگ درود پاک کا ورد کر رہے تھے، مجھ سے بھی کہہ رہے تھی کہ ادریس روؤ نہیں، کلمہ پڑھو۔ ابھی بھی جب اسی منظر کو سوچتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

دوپہر کے قریب اچانک شور بلند ہوا کہ اپنے بچوں کے ہاتھ مضبوطی سے تھام لو، فوج آ گئی ہے اور وہ ہمیں یہاں سے باہر لے کر جائے گی۔ گھر کا صدر دروازہ کھلا اور تمام مرد، خواتین، جوان لڑکے، لڑکیاں اونچی آواز میں کلمہ اور درود پڑھتے ہوئے باہر نکلنا شروع ہوئے مگر ایک دو کے سوا کسی کے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا، سب خالی ہاتھ تھے۔

اس گھر سے نکال کر فوج جس راستے سے ہمیں لے جا رہی تھی وہ میرے گھر کے چبوترے والی گلی کے ساتھ گزرتا تھا۔ چبوترے پر میں نے دیکھا کہ ہمارے سامنے رہنے والی جوان لڑکی اور اس کا بچہ چبوترے پر لیٹے ہیں اور عورت پر اسی کا دوپٹا ڈالا ہوا ہے۔ میں دیکھ کر چیخا کہ اماں اسے تو اٹھاؤ، یہ یہاں کیوں سو رہی ہے۔ اسی وقت فوجی جو چبوترے پر کھڑا تھا، کود کر میری والدہ کے پاس آیا اور اس نے اپنا رومال نکال کر میرے آنسو پونچھے اور کہنے لگا: ''بیٹا! چپ ہو جاؤ، یہ بھی آ جائے گی۔'' میں اس کے ایک دم کودنے اور اپنی ماں کے پاس آنے سے ڈر گیا اور بالکل چپ ہو گیا۔ اور پھر اسی خوف سے تمام راستے نہیں رویا۔

شام سے پہلے ہم محلّہ انصار پہنچے تو میرے پھوپھا سب سے پہلے ملے اور زندہ سلامت دیکھ کر بہت زیادہ خوش ہوئے۔ ہمیں گھر لے گئے۔ ابا کو ڈھونڈنا شروع کیا، وہ اور تینوں لڑکے نہیں مل رہے تھے۔ ایک دفعہ پھر پورے گھر میں پریشانی کا حملہ ہوا۔ پھوپھا، خالو وغیرہ ابو کی تلاش میں نکلے اور خاصی دیر بعد ابا تینوں لڑکوں، پھوپھا اور خالو کے ساتھ گھر آئے تو سب نے سکھ کا سانس لیا۔ اور اماں جو جائے نماز پر کچھ وظیفہ پڑھ رہی تھیں، وہیں سجدے میں چلی گئیں۔ میں ان کے پاس ہی بیٹھا کبھی اماں کو دیکتا اور کبھی پھوپھی، خالہ اور کبھی دروازے کی طرف کہ نہ معلوم ابا کہاں گئے۔

ابا ان لڑکوں کے ساتھ آ رہے تھے کہ اسی دوران میں بازار کی سڑک پر دونوں ہندو بھائیوں نے ان کو ساتھ لیا تھا اور ہمارے گھر واپس لے گئے تھے۔ باہر کی بیٹھک کا دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔ صدر دروازہ ہنوز بند تھا۔ وہ انہیں ساتھ لے کر اندر گئے اور تینوں نے ایک ایک نگ اٹھایا جو آرام سے اٹھا سکتے تھے اور انہی ہندوؤں کے ساتھ واپس ہمارے پاس پہنچے۔

گھر آ کر دو بکس اور ایک بستر بند جو ابا لائے تھے، رکھ دیا۔ کسی نے کہا کہ بکسوں میں کیا ہے۔ ان کو کھولا تو ایک میں کھانا پکانے کے برتن وغیرہ اور دوسرے میں کچھ چادریں اور دادا، پڑدادا کی زمینوں کے کاغذات، رجسٹریاں وغیرہ تھیں۔ بستر بند کھولا تو اس میں رضائیاں اور کھیس وغیرہ تھے۔ اماں نے کھانے کے برتن تو نکال لیے کیونکہ اس وقت گھر میں موجود 21 افراد کے لیے صرف ایک دیگچہ تھا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ دیگچہ بھی اسی وقت جب پھوپھا وغیرہ آئے تھے تو کسی نے دے دیا تھا کہ اسی میں پکا کر گزارہ کر لیں۔ خیر اس طرح کھانے کا بندوبست اللہ نے کر دیا۔ سونے کے لیے رضائیاں کھیس بھی موجود اور عارضی طور پر گھر میں تو رہ ہی رہے تھے۔

سب کچھ چھوڑ کر آنے کا افسوس اپنی جگہ بجا تھا مگر اب میرے یہ تمام بزرگ اس بھاگ دوڑ میں تھے کہ اب یہاں سے کس طرح پاکستان جائیں گے۔ ریل گاڑیوں کا پتہ کرتے تو معلوم ہوتا کہ دو تین گاڑیاں دہلی وغیرہ سے گئی ہیں مگر ان پر بھی سکھوں نے حملے کیے ہیں اور خاصے لوگ

شہادت پا گئے اور جو بچے وہ نہایت بے سروسامانی کی حالت میں گئے ہیں۔ بس یا ٹرک الگ کرائے پر ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور مل بھی جاتا تو اکیلا اتنا لمبا سفر ان حالات میں ناممکن تھا۔

ادھر میرے چچا جو پاکستان کے قیام کے وقت ہائی اسکول جالندھر میں ڈرائنگ ٹیچر تھے پہلے نکل کر لاہور پہنچ چکے تھے اور ان کی ہمیں کوئی اطلاع نہیں تھی اور پریشانی بھی تھی کہ نہ معلوم وہ کن حالوں میں ہوں گے۔ لاہور آنے کے بعد کسی سے مل کر دھنی رام روڈ انارکلی میں ایک مکان کھلوا لیا تھا۔ یہ ایک ڈاک خانہ تھا جس میں نیچے دو کانیں' ان کے اوپر ایک بڑا ہال' ایک کمرہ 10X10 اور ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اور دوسری منزل پر ایک بڑا اور ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ گھر کا انتظام کرنے کے ساتھ ہی انہوں نے معلومات حاصل کرنی شروع کیں کہ دہلی اور پانی پت سے لوگ کہاں کہاں سے آئے ہیں اور آنے کے لیے ریل گاڑیاں اور بسوں' ٹرکوں کے قافلے کب اور کس طرح آ رہے ہیں۔ دہلی میں ان کے خالو بڑی بہن اور دوسرے رشتہ دار تھے۔ پانی پت میں ہم لوگ تھے۔ کرنال میں ان کے ماموں تھے۔

والٹن جہاں مہاجرین کا کیمپ بنا دیا گیا تھا چچا جان وہاں کے چکر لگا کر پتہ کرتے رہتے تھے۔ معلوم ہوا کہ دہلی سے ایک ٹرین آج آ رہی ہے۔ وہ اسٹیشن پہنچے اور کئی گھنٹے انتظار کے بعد ٹرین آئی تو عجیب روح فرسا مناظر تھے۔ بہت سے ڈبوں میں صرف لاشیں اور زخمی بھرے ہوئے تھے۔ کچھ ڈبے جو بچ گئے تھے ان میں سے لوگ اتر کر پلیٹ فارم پر سجدۂ شکر ادا کر رہے تھے۔ چچا کی نظر اپنی بڑی بہن پر پڑی اور خدائے ذوالجلال کا شکر ادا کیا کہ ان کا پورا خاندان بخیر و عافیت پہنچ گیا تھا۔ وہ سب ہم پانی پت والوں کے بارے میں بے حد پریشان تھے۔ کیونکہ اس گاڑی میں پانی پت کے سٹیشن پر بھی کچھ لوگ سوار ہوئے مگر ہمارے گھر کا کوئی فرد وہاں موجود نہیں تھا۔ خیر چچا انہیں گھر لائے۔

چچا کو علم ہوا کہ کچھ بسوں اور ٹرکوں کا ایک قافلہ پانی پت جا رہا ہے۔ انہوں نے گھر والوں کو بتایا اور قافلے کے ساتھ دو دن کا سفر کر کے پانی پت پہنچے۔ یہ چند بسیں اور ٹرک تمام لوگوں کو واپس لانے کے لیے ناکافی تھے۔ ابا نے بڑے ہونے کی حیثیت میں یہ فیصلہ کیا کہ میری پھوپھی اور چند لوگ اپنے بچوں کے ساتھ اس قافلے میں چلے جائیں اور وہ خود بعد میں جس طرح انتظام ہو سکا آ جائیں گے کیونکہ محلّہ کے بہت لوگ ابھی باقی تھے۔ اس وقت محلے داری آج کل سے مختلف ہوتی تھی۔ محلے دار اپنے رشتہ داروں اور پیاروں سے کسی طرح کم نہیں ہوتے تھے۔ میرے مرحوم دادا شیخ محمد یوسف حسن صاحب کی وجہ سے محلے والے میرے والد کی تعظیم و تکریم اسی طرح کرتے تھے۔ اسی لیے خاصا زور دینے کے باوجود ابا محلے والوں کو چھوڑ کر آنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ چار و ناچار یہ قافلہ روانہ ہوا اور چچا کہہ گئے کہ اگر خیریت سے پہنچ گئے تو جلد ہی کسی اور قافلے کے ساتھ آؤں گا اور آ کر لے جاؤں گا۔

سات آٹھ دن کے بعد علی الصبح دروازے پر زور سے دستک ہوئی اور دروازہ کھولا تو چچا کھڑے تھے۔ انہوں نے ابا سے کہا کہ چپ کر کے جلدی سے چلو تا کہ بس میں جگہ مل جائے ورنہ پھر کسی اور قافلے کے آنے کی امید بہت کم ہے۔ سامان تھا ہی کونسا۔ دو ٹین کے بکس اور ایک بستر۔ تینوں لڑکوں نے یہ سامان اٹھایا اور بھاگم بھاگ ساتھ ہی کھلے میدان میں جہاں بسیں اور ٹرک کھڑے تھے پہنچے وہاں پہلے ہی خاصے لوگ ان میں سوار ہو چکے تھے۔ مشکل سے ایک بس میں اندر والدہ کو اور چھت پر ابا اور لڑکوں کو جگہ ملی۔ خدا کا شکر کیا۔ ابا نے پہلا قافلہ جانے کے بعد کچھ بھنے ہوئے

چنے، گڑ اور مرمرے خرید کر ایک بکس تقریباً آدھا بھر لیا تھا کہ راستے میں کھانے کی کوئی چیز ملنے کی امید نہیں تھی' ان ہی سے پیٹ بھر لیا کریں گے۔

اس قافلہ کے ساتھ جس میں تین چار بسیں اور آٹھ ٹرک تھے' پانچ فوجی جوان تھے جو اس کی حفاظت کے لیے پاکستان سے بھیجے گئے تھے اور ان فوجیوں نے پانی پت سے پاکستان میں داخل ہونے تک جس طرح دن رات اس قافلے کی حفاظت کی' اسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ وہ نہ صرف حفاظت کر رہے تھے بلکہ جس طرح بھی ان کے بس میں تھا لوگوں کی مدد بھی کرتے رہے۔ ان کی ایک بات جو یاد رہ گئی وہ یہ کہ پانی لانے کے لیے ایک جوان جو ہماری بس ہی میں آگے بیٹھتا تھا' خود برتن لے کر جاتا اور میں نے دیکھا کہ وہ پانی بھرنے سے پہلے خود پیتا اور پھر برتن بھرتا۔ میرے والد نے ایک جگہ اس سے پوچھا کہ پہلے خود پیاس بجھاتے ہو تو وہ بول پڑا: ''یہ بات نہیں۔ دراصل بیشتر پانی کی جگہوں پر سکھوں نے زہر ڈال دیا ہوا ہے۔ میں اس لیے پہلے پیتا ہوں کہ زہر کا پتہ لگ جائے۔ میں مر جاؤں مگر آپ میں سے کسی کو کوئی نقصان نہ ہو۔''

کیا جذبہ تھا۔ ایسے ہی جذبوں کے تحت یہ ملک پاکستان معرض وجود میں آیا اور انشاءاللہ قائم و دائم رہے گا۔

آگ اور خون کی دریا میں سے گزر کر دو راتوں اور ڈھائی دنوں میں ہم لوگ 19 اکتوبر 1947ء کو پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے۔ سفر صرف دن میں ہوتا۔ مغرب سے پہلے کسی کھلی جگہ پر قافلہ کھڑا ہو جاتا اور فوجی جوان اور چند نوجوان رات کو پہرہ دیتے۔ میں زیادہ تر چھت پر اپنے والد کے ساتھ بیٹھا رہا۔ میں نے جلے ہوئے مکان' بے گور و کفن مردوں' عورتوں' لڑکیوں اور بچوں کی لاشیں بڑی تعداد میں دیکھیں۔ بیل گاڑیوں' پیدل اور کچھ بسوں اور ٹرکوں کے قافلے بھی نظر پڑے۔ ایک منظر پر آج بھی میرا دل ہل جاتا ہے۔ ایک دریا کے پل سے جب ہماری بس گزر رہی تھی تو پل کے ایک کونے پر بڑی تعداد میں ننگی لاشیں ایک کونے میں اس طرح جمع تھیں جس طرح گند وغیرہ دریا میں بہہ کر آتا ہے اور پل کے ساتھ تیز بہاؤ کی وجہ سے ایک کونے میں جمع ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک عورت جس نے سرخ جوڑا پہنا ہوا تھا' ان لاشوں کے عین درمیان پڑی تھی۔

ہمارا قافلہ عصر کے وقت اسلامیہ کالج سول لائنز کے چوک میں آ کر رکا اور وہاں سے ہم تانگے میں دھنی رام روڈ پہنچے۔ گھر پہنچ کر عزتیں اور جانیں بچا کر آنے پر میرے والد اور والدہ جس طرح میری پھوپھیوں' پھوپھاؤں اور ان کی اولاد سے مل کر روئے اور شکر ادا کیا' وہ بھی اپنی طرز کا الگ ہی نظارہ تھا۔ پھوپھیاں مجھے چھاتی سے لگا کر جتنا پیار کر سکتی تھیں کر رہی تھیں اور ساتھ ہی خدا کا شکر ادا کر رہی تھیں۔

یہ تو تھا وہ عظیم سفر جو گھر آ کر پورا ہوا۔ خداوند قدوس نے اس کے بعد جو اپنی رحمتیں نازل فرمائیں' ان کا شکر ادا کرنا مشکل ہے۔ میرے والدین جو پاکستان میں صرف اپنے پہنے ہوئے کپڑوں میں تھے ان کے پاس دوسرے کپڑے نہیں تھے۔ والد صاحب کو چچا کے ایک محترم دوست قدوسی صاحب کی معرفت تیسرے دن ہی گورنمنٹ سینٹرل ماڈل سکول لوئر مال لاہور میں فزیکل ٹریننگ کے استاد کی حیثیت سے اس وقت کے پرنسپل باری صاحب نے ملازمت دے دی کیونکہ وہ مدراس کوالیفائیڈ تھے جو اس زمانے میں بہت بڑی ڈگری تھی۔ باری صاحب نے اگلے دن ہی والد صاحب کو 500 روپے قرض حسنہ دیا کہ شیخ صاحب' ویسے تو آپ یہ رقم نہیں لیں گے' آپ اپنی تنخواہ میں سے تھوڑے تھوڑے کٹواتے رہیں۔ اسی دن شام کو ابا جان انارکلی میں کراچی کلاتھ ہاؤس گئے۔ جو موجودہ وول ہاؤس کے برابر میں کپڑے کی دکان تھی اور قمیض' پاجاموں اور شلواروں کا کپڑا لائے۔ میری والدہ نے گھر میں ہاتھ سے کپڑے سی کر تیار کیے۔ ان چند دنوں میں والد صاحب چچا کے کپڑے پہن لیتے اور والدہ ان کے کپڑے دھو دیتیں جو صبح وہ اسکول پہن جاتے۔ مرتے دم تک ابا جان کہا کرتے تھے کہ خدا نے اتنا کچھ دیا جس کا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

والد صاحب سرکاری ملازمت سے عزت ووقار کے ساتھ 1967ء میں ریٹائر ہوئے۔ جدی پشتی زمینوں کے بدلے میں زرعی زمینیں الاٹ ہوگئیں جو میرے پاس تبرک کے طور پر موجود ہیں۔ خدا نے اتنی استطاعت دی کہ ابا نے کم تنخواہ کے باوجود تیرہ مرلے پر دو منزلہ مکان بنایا جس میں اب میں اور میری اولاد مقیم ہے۔ میں نے پڑھا اور والد صاحب کی ریٹائرمنٹ کے ایک ماہ بعد فوج (آرمرڈ کور) میں کمیشن حاصل کرلیا اور بہت دھوم سے میری شادی ہوئی۔

خدا نے میرے والد صاحب کو تیسری نسل میں پوتے پوتیاں دیکھنے کا شرف بخشا۔ میرے پھوپھا اور پھوپھی جو میرے ساس اور سسر بھی تھے' انہوں نے میرا ایک بیٹا پالا کیونکہ ان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اسے حافظ قرآن بنا دیا جو میرے گھرانے میں میرے دادا مرحوم کے بعد پہلا حافظ ہے۔ باقی اولاد بھی نہایت نیک ہے۔

میں 24 سال بہت عزت سے نوکری کر کے 1991ء میں فوج سے ریٹائر ہوا اور ایک پرائیویٹ سوسائٹی میں گذشتہ ساڑھے چھ سال سے بہت عزت وقار سے ایڈمن آفیسر ہوں۔ اور یہ میرا ایمان ہے کہ والدین اور بزرگوں کی نیک دعائیں ابھی بھی میرے اور میری اولاد کے ساتھ ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ بہت عزت وقار سے وقت گزر رہا ہے اور انشاءاللہ آئندہ بھی گزرے گا۔ آمین۔

قارئین! بہت قربانیوں کی بدولت یہ پاک سرزمین خدا نے ہمیں عطا کی۔ ہزاروں لاکھوں مسلمان ظلم وستم اور گشت وخون کے دریاؤں سے گزر کر پاک سرزمین پر آئے۔ خدا ہمیں' ہماری اولاد اور آنے والی نسلوں کو اس ملک عزیز کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں نے اپنا زندگی کا اصول بنایا ہوا ہے جو ہر پاکستانی کا ہونا چاہیے۔

پاکستان کی عظمت کے لیے زندہ رہو!

(تحریر میجر (ر) محمد ادریس' اردو ڈائجسٹ اگست 1998ء)

پارس

رخسانہ نگار عدنان کی خوبصورت تخلیق......معاشرتی اصلاحی ناول پارس کہانی ہے ایک لاابالی کمسن لڑکی کی، جس کی زندگی اچانک اُس پر نامہربان ہوگئی تھی۔ یہ ناول ہمارے معاشرے کے ایک اور چہرے کو بھی بخوبی اور واضح طور پر دکھاتا ہے اور یہ پہلو ہے ہائی سوسائیٹی اور ان میں موجود برگر فیملیز اور نئی بگڑی ہوئی نسل۔ پارس ایک ایسے نوجوان کی کہانی بھی ہے جو زندگی میں ترقی اور آگے بڑھنے کے لیے شارٹ کٹ چاہتا تھا۔ قسمت نے ان دونوں کو ملا دیا اور کہانی نے نیا رُخ لے لیا۔ پارس ناول کتاب گھر کے رومانی معاشرتی اصلاحی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

خاکستر میں چنگاری

ایک مست ملنگ کا ایمان افروز تذکرہ جس نے کئی دشمنان اسلام کو جہنم واصل کیا

نام فتح محمد‘ سیدھا سادا‘ بھولا بھالا‘ دبلا پتلا اور لمبا انسان۔ سر کے بال اڑے ہوئے اور جسم پر صرف ایک لنگوٹی ہوتی تھی۔ بزدل اتنا کہ چھوٹے چھوٹے بچوں سے بھی پٹ جایا کرتا۔ جب وہ پٹنے کے بعد زار زار روتا تو لوگوں کو بے اختیار ہنسی آ جاتی تھی۔ اتنے بڑے قد وقامت کا انسان بچوں سے مار کھا رہا تھا اور مار کھا کر رو رہا تھا۔

وہ دن بھر خشک گھاس اور گوبر اکٹھا کرتا‘ مانگ تانگ کر روٹی کھاتا اور شام کو بچوں سے پٹتا۔ صبح ہوتے ہی وہ بڑ کے نیچے اس گوبر اور گھاس کو جلاتا اور دھواں پیدا کرتا۔ گاؤں کے لوگ اپنے حقے لے کر آتے اور اس آگ سے اپنی چلمیں بھرتے۔ یہی اس کا پیشہ تھا اور رات کو وہ اسی جلتے ہوئے گوبر کے پاس لیٹتا اور خراٹے بھرتا۔

ایک دفعہ جب وہ صبح جنگل کی طرف جا رہا تھا تو چند لڑکوں نے اسے کہا کہ آج ہم تمہاری شادی کرنے والے ہیں اور بڑی مشکل سے عورت ڈھونڈی ہے۔ فتح محمد نے یقین کر لیا۔ چنانچہ اسے نئے کپڑے پہنا کر گدھے پر بٹھایا گیا اور گاؤں کی گلیوں میں پھیرایا گیا۔ چاروں طرف ہی ہی‘ ہاہا‘ ہوہو‘ کھی کھی کی آوازیں گونجتی رہیں اور شام کو تھک تھکا کر بیچارے فتح محمد کو کہہ دیا گیا کہ وہ عورت بھاگ گئی ہے۔ وہ ایک دو بڑے بوڑھوں کے پاس جا کر رویا اور شکایت کی لیکن وہ بھی ہنسنے لگے اور فضا کھی کھی سے معمور ہو گئی۔

چودھری نے اس کو کئی دفعہ گاؤں سے نکالا۔ لیکن وہ پھر واپس آ جاتا تھا۔ لوگوں کو بھی اس سے کچھ لگاؤ ضرور تھا۔ جب وہ لاغر جسم انہیں نظر نہ آتا تو وہ اسے یاد کرنے لگتے۔ وہ پھر آ جاتا تھا۔ جا کر پھر لوٹ آتا تھا اور آ کر پھر چلا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ کچھ عرصہ سے یہیں رہنے لگا تھا اور گاؤں کے لوگوں کی زندگی کا ایک جزو بن گیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ بغیر کسی قیمت کے دوسروں کو ہنساتا تھا وہ ایک نادر اور انوکھے کھلونے کے مانند تھا۔ جس سے سارا گاؤں کھیلتا تھا۔ فتح محمد خود رو رو کر دوسروں کو ہنساتا تھا۔

15 اگست 1947ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا اور پاکستان و بھارت لیلائے آزادی سے ہمکنار ہوئے۔

سرسبز و شاداب گاؤں‘ لہلہاتی کھیتیاں‘ کنویں کی نشہ آور آواز‘ تنومند انسان‘ سرکتے ہوئے آنچل‘ اودے‘ پیازی‘ نیلے‘ ہرے اور لال......

اسی ماحول میں انسانی خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ تحصیل نکودر پاکستان کے بجائے بھارت میں شامل کر دی گئی تھی۔ مسلم دیہات پر حملے روز بروز تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔

ایک دن دریائے ستلج کے پار ایک مسلمان گاؤں سے امداد طلب ہوئی۔ وہ گاؤں چاروں طرف سے غیر مسلم دیہات سے محصور تھا۔ چنانچہ بڑے چودھری نے ایک اور چودھری کی معیت میں چند نوجوانوں کو بھیجا۔ فتح محمد بھی اس گروہ میں شامل کر دیا گیا تا کہ وہ چودھری کی چلم بھرتا رہے اور اس کے دل کو بہلاتا رہے۔

چودھری رضا کاروں سمیت اس گاؤں میں پہنچ چکا تھا۔ رضا کار چند ناکوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ فتح محمد بھی چودھری اور جامو کے ساتھ گاؤں کے ایک ناکے پر کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔

فتح محمد معمول کے خلاف خاموش تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ غیر مسلم ہمیں کیوں مار رہے ہیں؟ ہم پر کیوں حملے کر رہے ہیں؟ کیا ہم ان کے کہنے پر یہاں سے چلے جائیں گے؟ کیا انہوں نے ہمیں بسایا تھا؟ کیا سکھ ان کو بزدل سمجھ رہے ہیں؟ اس قسم کے صدہا خیالات اس کے ذہن میں گھومے اور اس کے ضمیر سے آواز آئی کہ ہم بزدل نہیں...... اس کے سامنے اپنے گاؤں کے ایک جلسے کا نقشہ کھنچ گیا اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے کانوں سے ٹکرائے۔ سبز کپڑے پہنے ہوئے نوجوان نظر آئے جو زور شور سے کہہ رہے تھے: ”حق ہے ہمارا پاکستان‘ لے کے رہیں گے پاکستان“

اس کے جسم میں ایک لاوا ابلنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ تن تنہا ایک جم غفیر کے لیے کافی ہے۔ لیکن وہ چپ چاپ پہرہ دیتا رہا۔ غیر مسلموں کو معلوم نہ ہو سکا کہ مسلمانوں نے بھی باہر سے امداد منگوالی ہے۔ اسلیے وہ انہیں کمزور جان کر ان پر پل پڑے۔ حملے کا نام سن کر بزدل چودھری اپنے ساتھی کے ہمراہ دم دبا کر بھاگ رہا تھا مگر اس کی چلم بھرنے والا‘ دل بہلاوا فتح گاؤں کے ناکے پر مقابلے کے لیے ڈٹا ہوا تھا۔ فتح کو یک لخت اپنی ذمے داری کا احساس ہوا اور وہ چاق چوبند پہرہ دینے لگا۔ آناً فاناً ایک سکھ نے فتح محمد پر حملہ کر دیا۔ فتح نے اپنی لاٹھی گھمائی اور اس کے سر پر دے ماری۔ سکھ چکرا کر گرا تو فتح محمد نے اس کی تلوار چھین لی اور اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور اس نے سات حملے آور موت کے گھاٹ اتار دیے۔ سکھوں کا حملہ پسپا ہو چکا تھا۔ فتح محمد اپنے گاؤں واپس آیا تو گاؤں والوں کا سلوک اب پہلے سے بہت مختلف تھا۔ کچھ لوگوں نے کھلم کھلا اس کی تعریفیں کیں اور اسے اس بہادری پر تھپکا لیکن نہ جانے کیوں فتح خاموش رہا اور رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔

تحصیل نکودر ضلع جالندھر کے مسلمانوں کا سب سے مضبوط اور آخری مدافعاتی محاذ دو دفعہ حملہ آوروں کو پسپا کر چکا تھا۔ لیکن اب خطرہ زیادہ بڑھ چکا تھا۔ اس لیے ارد گرد سے مزید امداد منگوائی گئی۔ فتح بھی اپنے گاؤں کے دوسرے جوانوں کے ساتھ گیا۔ اس دفعہ وہ چودھری کی چلم بھرنے اور اس کا دل بہلانے کے لئے نہیں بلکہ اپنی رضامندی سے مقابلے کی خاطر جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار نمایاں تھے اور آنکھیں نور کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ فتح محمد کلگنہ گاؤں کے ایک ناکے پر کھڑا مجاہدانہ شان سے پہرہ دے رہا تھا۔

سورج غروب ہو گیا۔ آہستہ آہستہ تاریکی کے سیاہ بادل فضا کو اپنی لپیٹ میں لینے لگے۔ فائرنگ کی آواز آئی۔ ریاست کپورتھلہ کے فوجی حملہ کر رہے تھے۔ لوگوں کو موت کے پسینے آنے لگے‘ گاؤں کی گلیوں میں بھاگ دوڑ ہونے لگی‘ بچے سکتہ زدہ ہو گئے‘ عورتیں قرآن مجید کی آیتوں کا ورد کرنے لگیں۔ حفاظتی اقدامات گولیوں کی تاب نہ لا کر ملیامیٹ ہوتے گئے۔ فضا چیخ و پکار سے معمور ہوئی۔

فتح محمد نے باکانہ اور مجاہدانہ انداز میں چہل قدمی کرتا رہا۔ اس کے نزدیک ہی مسجد دم بخود تھی۔ وہ مسجد کے اندر چلا گیا۔ اس کا ذہن سوچنے

لگا کہ وہ لاٹھی سے اس انسان کو بے ہوش کر دے گا جو یہاں آئے گا اور وہ مسجد کی اینٹوں سے ان لوگوں کے سر پھوڑ دے گا جو اسے مسمار کریں گے۔ وہ...... یک لخت اس نے قدموں کی چاپ سنی...... وہ چوکنا ہو گیا اور مسجد کی دیوار کے پیچھے چھپ گیا۔ جونہی حملہ آور نے اندر قدم رکھا۔ وہ آگے بڑھا اور لاٹھی گھما کر اس کے سر پر دے ماری۔ حملہ آور بل کھا کر زمین پر گرا۔ فتح محمد نے اس کی تلوار چھینی اور اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ پھر چند لمحوں کا وقفہ ہوا جس میں اس نے لاش کے دو ٹکڑے گھسیٹ کر دیوار کے پیچھے کر دیے۔ اتنے میں ایک اور حملہ آور دروازے سے اندر آیا۔ فتح محمد نے لاٹھی گھمائی اور حملہ آور کے گرتے ہی اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ کچھ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ حتیٰ کہ گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ وہ تلوار لیے مسجد سے باہر نکلا۔ کسی نے ٹارچ کی روشنی پھینکی اور رائفل کی گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ وہ ڈگمگایا اور ٹارچ کی سیدھ میں بھاگا۔ چاروں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ اس کی تلوار اٹھی۔ ٹارچ پھر اس کے سینے پر کوندی' ایک اور گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ وہ کپکپا کر زمین پر گر پڑا۔ تلوار بھی اس کے ساتھ ہی زمین پر آ رہی۔ ایک قہقہہ بلند ہوا ''سخت جاں مصلا'' اور گھوڑے کے اگلے دو قدم اس کے سینے پر آ رہے۔ اس کے حلق میں کچھ اٹک رہا تھا۔ گھوڑے کے دباؤ سے اس کے لبوں سے نکلا اللہ اکبر!! گھوڑ سوار اگلی طرف چل دیا اور فتح محمد کی لاش مسجد کے قریب کسی نئی پیدائش کا انتظار کرتی رہی۔

نکودر تحصیل کے مسلمان نکودر۔ کیمپ میں پہنچ چکے تھے۔ فتح کے گاؤں کے لوگ بھی کیمپ میں موجود تھے۔ کئی دن گزر گئے۔ لیکن فتح محمد نہ آیا۔ کئی روز بعد ایک نوجوان جو اس لڑائی میں شریک تھا۔ چھپتا چھپاتا وہاں پہنچا اور اس نے بتایا کہ فتح محمد نے کئی حملہ آوروں کو موت کے گھاٹ اتارا اور پھر انہی کی گولیوں سے شہید ہو گیا۔

اس پر بوڑھوں نے آسمان کی طرف دیکھا' عورتوں نے اس کی ماں کی برتری کے گن گائے جس نے ایسا سپوت جنا تھا۔ بچے افسوس زدہ ہوئے جیسے انہوں نے ایک ساتھی کھو دیا ہو۔ نوجوان اس کے کام اور اس کی موت پر رشک کرنے لگے۔ چودھری نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سنا اور بھولے ہوئے خواب کے مانند کسی بات کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ پھر ہر شخص کی زبان پر تھا: ''فتح محمد بہادر تھا۔ وہ موت سے لڑ جانا جانتا تھا۔ فتح محمد نے پاکستان کے لیے جام شہادت نوش کیا۔ وہ مر نہیں سکتا وہ شہید ہوا اور شہید ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔'' ؎

شہید اس دار فانی میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں
زمیں پر چاند تاروں کی طرح تابندہ رہتے ہیں

(تحریر انعام الحق کوثر' اردو ڈائجسٹ' اگست 1998ء)

چلتی ریل کی آخری بوگی

دینا نگر سے پاکستان تک سفر آزادی کی جاں گداز داستاں

15،14 اگست 1947ء کی درمیانی شب آج بھی میرے حافظہ پر روز اول کی طرح تروتازہ ہے۔ اس رات قریب و جوار کے مرد و زن‘ بچے اور بوڑھے ہمارے گھر ریڈیو کے گرد ”پاکستان“ کے منصہ شہود پر آنے کے منتظر تھے۔ اس دور میں ریڈیو خاص خاص گھروں میں ہوا کرتا تھا۔ جونہی ”یہ ریڈیو پاکستان ہے“ کے الفاظ سامعین تک پہنچے‘ ایک غلغلہ سا مچ گیا۔ ”اللہ اکبر“ اور ”پاکستان زندہ باد“ کے نعروں سے تاریخ قصبے دینا نگر کے در و بام گونج اٹھے۔ بڑوں کے چہرے تو خوشی سے تمتما ہی رہے تھے مگر ہم بچوں کو بھی اس خوشی کا کسی قدر ادراک ہو رہا تھا۔ شکرانے کے نوافل ادا ہونے لگے۔ مٹھائیاں بٹنے لگیں‘ فی الفور سبز پرچم ہمارے گھر کے اوپر لہرا دیا گیا۔ ایک دوسرے سے معانقے اور مبارکبادیوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ غیر مسلم ہمسائے بھی نیم دلی سے مبارکباد دینے پر مجبور تھے۔

دینا نگر میں جشن بہاراں کا سماں تھا۔ اس تاریخی قصبے پر بہاروں کا بھی عجب سلسلہ تھا۔ جونہی میں شعوری آنکھ سے دیکھنے کے قابل ہوا خود کو گنگناتی ندیوں کے ماحول میں پایا۔ برسات میں بارشوں کا تواتر کئی روز تک جاری رہتا۔ باد و باراں کے اس خوش کن موسم میں‘ اپنے دو ماموں زاد بھائیوں کے ہمراہ دینا نگر کے دوہرے پل پر نہانے کے لیے چل پڑا کرتا (اس پل کے نیچے سے دو چھوٹی نہریں مختلف سمتوں میں رواں دواں تھیں) ایک نہر کے کنارے کنارے حد نگاہ تک آم کے درخت پٹھان کوٹ کی جانب چلے گئے تھے۔ نہر کا پانی اس قدر ٹھنڈا ہوتا تھا کہ زیادہ دیر نہانے سے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ نہانے کے دوران نہر کی تہ میں گڑھے کھودے جاتے تا کہ نہر میں بہہ کر آنے والے آموں کو آگے جانے سے روکا جا سکے۔ دوسری صبح ان مفت کے آموں کے حصول کے لیے تینوں بھائی دوہرے پل کی جانب دوڑ لگاتے اور اپنے اپنے گڑھوں سے یخ بستہ آم نکال کر خوب مزے سے کھاتے۔ آم کے موسم میں یہ پھل اس بہتات سے ہوتا کہ گلی کوچے آموں کی خوشبو سے مہک جاتے۔

ایک دفعہ ایک انگریز آموں کا ٹوکرا لیے نہر کے کنارے بیٹھا آموں کی شیرینی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہم بچوں کو قریب پا کر انگریزی لہجہ لیے اردو میں اس نے ہمیں کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ ہم بچہ لوگ اس گورے کی دعوت سے اس درجہ خائف ہوئے کہ چیختے چلاتے وہاں سے بھاگ لیے۔ مبادا ہمیں پکڑ ہی نہ لے۔ گھر میں آم ٹوکروں کے حساب سے آتے۔ ایک بڑے ٹب میں ٹھنڈے ہونے کے لیے برف سے ڈھانپ دیے جاتے۔ پھر تمام اہل خانہ میں زیادہ آم کھانے کا مقابلہ شروع ہو جاتا۔ ایک بار مجھے نہر کے کنارے سے چاندی کی اٹھنی (پچاس پیسے) ملی جسے میں کئی دنوں تک خرچ کرتا رہا۔

قیام پاکستان سے ایک سال قبل تک ہندو تہواروں سے ہم بچہ لوگ خوب حظ اٹھاتے رہے۔ دیوالی کے موقع پر ہندو دوستوں کے ہمراہ ہندو گھرانوں سے پھل، مٹھائیاں اور نقدی وصول کرتے۔ مگر جوں جوں قیام پاکستان کا وقت قریب آتا چلا گیا بھائی چارے کی فضا مسموم ہوتی چلی گئی۔ آخر کار وہ وقت بھی آ گیا کہ ہم مسلمان بچے ہندو بچوں کی تختیوں پر ’’پاکستان زندہ باد‘‘ اور ہندو بچے ہماری تختیوں پر ’’اوم‘‘ کے الفاظ تحریر کر دیتے تھے۔ نانا مرحوم جب کبھی گائے کا گوشت لینے جاتے تو دوسرے مسلمان بھائی کے استفسار پر جواب دیتے کہ لاہور جا رہا ہوں۔ گائے کا گوشت ذبح خانے ہی سے دستیاب تھا۔ جس کا خفیہ نام مسلمانوں نے ’’لاہور‘‘ رکھا ہوا تھا۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ نانا مرحوم کو آخر کار شہر لاہور ہی کو اپنا دنیاوی اور آخری مسکن بنانا پڑا۔ انقلابات ہیں زمانے کے۔

ہمارے اسکول کے نزدیک ایک بڑا تالاب ہوا کرتا تھا جس پر ایک بہت بڑا بڑ کا درخت سایہ فگن تھا۔ اس کے نیچے سفید براق بگلے کثیر تعداد میں ایک ٹانگ پر کھڑے گہری سوچ میں غرق نظر آتے مگر جونہی کوئی مچھلی ان کی نگاہ میں آتی وہ پلک جھپکنے سے پہلے اپنی لمبی چونچ پانی میں ڈال کر اسے اچک لیتے اور اپنے شکار کو شکم میں اتارنے کے بعد دوبارہ ایک ٹانگ پر فلسفے کی گتھیاں سلجھانا شروع کر دیتے۔ شاید اسی بنا پر ہندوانہ ذہنیت کو بگلا بھگت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

زندگی اپنی رعنائیوں کے ساتھ رواں دواں تھی۔ اہل دینا نگر کو اس بات کا ہرگز ادراک نہ تھا کہ ان کا یہ جشن بہاراں چند روز تک محدود ہے اور قیام پاکستان کے تیسرے ہی دن ضلع گورداسپور کا بیشتر علاقہ بشمول دینا نگر بھارت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ تاریخ نے شاید ہی اتنا دھوکا کبھی دیکھا ہوگا۔ دو روز پیشتر جو غیر مسلم سہمے سہمے نظر آتے تھے یک بیک شیر ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھوں سے رعونت وخشونت ٹپکنے لگی تھی اور انہوں نے کئی نسلوں کے تعلقات بالائے طاق رکھ دیے تھے۔ مسلمانان دینا نگر نے اپنی آخری عید خوف و ہراس کے عالم میں ادا کی۔ کسی چہرے پر بشاشت نہ تھی۔ نماز عید کے بعد ہر کوئی اپنے گھر کی فکر میں غلطاں نظر آیا۔ سب مسلمان اپنے اپنے گھروں میں قید ہو کر رہ گئے۔

اب کیا ہوگا؟ ہر لب پر یہی سوال تھا۔ مسلمان آبادی پر سکوت مرگ طاری تھا۔ رات کے وقت ٹھیکری پہرے کا انتظام ہونے لگا اور کسی قدر روایتی ہتھیار بندی کا اہتمام بھی کیا گیا۔ چند روز بعد شام کے وقت جب تمام اہل خانہ کھانے کے اہتمام میں مصروف تھے کہ اچانک ماموں سید ذاکر علی صاحب نے مرکزی دروازے کے دونوں کواڑ اس شدت سے دھکیلے کہ خوفزدہ مکینوں کے دل دہل گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے کہا کہ نکل چلو حملہ ہو گیا۔ سہمے ہوئے اہل خانہ کو کسی چیز کے سمیٹنے یا سنبھالنے کا موقع ہی نہ ملا۔ مردوں کو جوتا پہننے اور مستورات کو دوپٹہ لینے کا ہوش نہ رہا۔ ہم بچہ لوگ تو پہلے ہی مرجھائے ہوئے تھے۔ کھانے کا اہتمام دھرے کا دھرا رہ گیا۔ تمام اہل خانہ اپنے گھر سے یوں باہر ہوئے جیسے اس مکان سے کبھی تعلق ہی نہ تھا۔ چند گلیاں چھوڑ کر ہمیں ایک محفوظ مکان میں لے جایا گیا۔ راستے میں ایک انسانی لاش بھی دیکھنے کو ملی۔ اس پناہ گاہ میں بہت سی عورتیں اور بچے پہلے سے موجود تھے۔

ذرا حواس بحال ہوئے تو پتہ چلا کہ ہمارے ساتھ فقط چینی کا ایک ڈبہ ہی آ سکا تھا۔ وہ بھی کسی فرد کے ہاتھ سہواً چلا آیا تھا۔ مکان کے اندر مستورات بچوں کو چپ کرانے میں مشغول جبکہ مرد حضرات چھت پر حفاظت کی فکر میں غلطاں۔ غرض عجب کسمپرسی کا عالم تھا۔ دو روز بعد فوجی کانوائے

کے آمد کی نوید ملی۔ سب لوگ شہر کی مرکزی شاہراہ دینانگر، پٹھان کوٹ روڈ کی جانب چل پڑے جہاں بلوچ رجمنٹ کے جوان ٹرکوں کے ساتھ موجود تھے۔ فوجی جوانوں نے کم جگہ کے باعث صرف مستورات، بچوں اور ضعیف حضرات کو ٹرکوں میں سوار ہونے کی اجازت دی اور جوان مردوں کو وہیں چھوڑ دیا گیا کہ خود ہی اپنی ہجرت کے اسباب پیدا کریں۔ ماموں ذاکر علی صاحب کو بھی دیگر جوان مردوں کی طرح ٹرکوں پر سوار ہونے کی اجازت نہ ملی۔ کچھ ہی دیر بعد فوجی ٹرک ہم مہاجرین کو نئے ملک پاکستان پہنچانے کے لیے حرکت میں آ گئے۔ ماموں سید ذاکر علی ہمیں اور ہم لوگ انہیں حسرت کی نظر سے دیکھتے رہ گئے۔ دینانگر کے در و بام آہستہ آہستہ ہماری حسرت بھری نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے اوجھل ہونا شروع ہو گئے۔

ہماری روانگی کے بعد ماموں سید ذاکر علی پر کیا گزری اس کی روداد انہی کی زبانی کچھ یوں ہے:

”مجھ پر اپنے عزیزوں اور جگر گوشوں کی جدائی کے بعد چند لمحے سکتے کی کیفیت طاری رہی، تاہم یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ جونہی میرے اوسان بحال ہوئے مجھے اپنے بچاؤ کی فکر لاحق ہوئی۔ کہاں جاؤں اور کیا کروں؟ کوئی منزل میرے سامنے نہ تھی۔ دینانگر کے در و بام میرے لیے غیر ہو چکے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اپنے آبائی گھر کی جانب چل پڑا۔ گھر کے سامنے ہی ہمارے کارخانے میں کام کرنے والے دو غیر مسلم شاگرد مقیم تھے۔ وہ مجھے اپنے گھر کی طرف جاتا دیکھ کر فوراً لپک کر آئے اور کہنے لگے: ”شاہ جی! کیوں اپنے گھر جا کر موت کو دعوت دیتے ہو؟ ہمارے گھر چلو ہم تمہاری حفاظت بھی کریں گے اور روانگی کا بندوبست بھی۔“ میں کئی روز تک ان کے گھر چھپا رہا، مگر کب تک؟ دیگر غیر مسلموں کو بھی میری پناہ کا علم ہو گیا۔ ان خون کے پیاسوں نے اہل خانہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا کہ مجھے ان درندوں کے حوالے کیا جائے آخر ایک رات ان دونوں شاگردوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ہمارے بڑے کارخانے میں چھپا دیا جائے۔ جو تھانہ دینانگر کے پیچھے واقع تھا۔

”جب میں اپنے شاگردوں کی ہمراہی میں تھانے کے قریب سے گزرا تو تھانے کے اہلکاروں نے مجھے پہچان لیا۔ بھلے وقتوں میں ان سے اچھے مراسم رہے تھے۔ وہ لپک کر آئے اور اچھی طرح ملے اور کہا کہ آپ بے فکر ہو کر رہیں، ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ خیر میں اپنے شاگردوں کے ہمراہ اپنے کارخانے کی چھت پر چلا گیا۔ ایسے حالات میں نیند کس کم بخت کو آتی ہو گی۔ رات کا کچھ ہی وقت گزرا ہو گا کہ مجھے احساس ہوا جیسے کوئی مجھے چھپ چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ جب میں نے اپنے شک کا اظہار اپنے ہمراہیوں سے کیا تو انہوں نے میرے خدشے پر صاد کیا اور مشورہ دیا کہ مجھے یہ جگہ فوراً تبدیل کر لینی چاہیے۔ ہمارے کارخانے کے قریب ہی ایک باغ تھا۔ میں اس میں پناہ کی غرض سے چلا گیا۔ میرے جانے کے بعد تھانے کے کارندوں نے میرے بارے میں ان نیک شاگردوں سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ پیشاب وغیرہ کرنے گیا ہے، واپس آ جاتا ہے۔ کارندوں نے کہا کہ جاؤ اسے ڈھونڈ کر لاؤ، ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے، چنانچہ وہ دونوں شاگرد میرے پاس باغ میں آ گئے۔

”رات خاصی گزر چکی تھی اور پو پھٹ رہی تھی۔ میں ان دونوں نیک شاگردوں کے ہمراہ تھانے کی حدود سے بچتے ہوئے ایک بار پھر دینانگر شہر کی جانب چل پڑا کہ شاید کوئی فوجی کانوائے مل جائے۔ ہم تھانے سے کچھ دور ہی آئے تھے کہ سامنے سے ایک جانور نما انسانی ہیولا اپنی طرف آتے دیکھا۔ جب وہ اور قریب ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ تو ہمارا ہی محلے دار ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے کیا حالت بنا رکھی ہے تو اس نے بتایا کہ جب حملہ ہوا تھا تو اس کے تمام اہل خانہ تہہ تیغ کر دیے گئے اور صرف اس اکیلے شخص نے تنور میں چھپ کر اپنی جان بچائی تھی۔ یوں وہ سر تا پا راکھ سے اٹ گیا۔

”شاہ جی! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔“ آنے والے محلے دار نے مجھ سے درخواست کی۔ میں نے جواباً کہا کہ میں کون سا گاڑی پر سوار ہوں جس طرح میں پیدل چل رہا ہوں، تم بھی میرے ساتھ چل دو۔ ابھی ہم کچھ ہی آگے گئے کہ ناگہاں بندوق چلنے کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس محلے دار کو خون میں لت پت گرا پایا۔ میں اس قدر حواس باختہ ہوا کہ اپنے تمام جسم پر ہاتھ پھیر کر اندازہ کرنے لگا کہ مجھے تو گولی نہیں لگی، حالانکہ لگی ہوئی گولی خود ہی اپنا مقام بتا دیتی ہے۔ محلے دار کو کراہتے چھوڑ کر ہم نے اپنی جان بچانے کے لیے دوڑ لگا دی۔

”جب شفاخانہ میونسپل کمیٹی کے سامنے پہنچے تو اندر سے ایک سکھ باہر آیا۔ وہ بھی ہمارے قصبے کا باسی تھا۔ اس سے اکثر ملنا جلنا تھا۔ وہ بہت اخلاق سے پیش آیا کہنے لگا: ”شاہ جی! یہ کیا ہو گیا۔ انسان کیوں اتنا وحشی ہو گیا۔ مجھے مسلمان بھائیوں کی مصیبت اور دکھ پر رونا آتا ہے۔ آپ جیسے مصیبت زدہ بھائیوں کے لیے اندر آرام وطعام کا بندوبست کر رکھا ہے۔ جونہی کوئی فوجی کانوائے یا ٹرک گزرتا ہے ہم اس مسلمان بھائی کو اس میں بحفاظت سوار کرا دیتے ہیں۔ آپ تھکے ہوئے ہیں اندر تشریف لے چلیں اور آرام کریں۔“

”مجھ پر اس سکھ کی ہمدردانہ باتوں کا بڑا اثر ہوا اور میں اندر جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔ میں نے اندر جانے کے لیے ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ میرے محسن شاگرد نے پیچھے سے میری قمیض کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ میرے اٹھتے ہوئے قدم فوراً رک گئے بلکہ زمین میں گڑ گئے۔ اب سکھ مجھے چکنی چپڑی باتوں سے اندر جانے کے لیے کہہ رہا تھا اور میرے شاگرد اس سکھ کو سمجھا رہے ہیں کہ وہ شاہ جی کی حفاظت بہتر طریقے سے کر رہے ہیں۔ الغرض نوبت کھینچا تانی تک پہنچ گئی۔ دراصل یہ پناہ گاہ مسلمان کا مقتل تھی جو بھی مسلمان اس میں ایک بار داخل ہو جاتا اسے زندہ باہر آنا نصیب نہ ہوتا تھا۔

”اب میرا ایک بازو سکھ نے پکڑ رکھا تھا جو مجھے قتل گاہ میں لے جانا چاہتا تھا۔ دوسرا بازو میرے شاگردوں نے تھام رکھا تھا۔ اللہ کریم کے قربان جائیے کہ فوراً اس نے رہائی کے اسباب مہیا کر دیے۔ اس کشمکش کے دوران ایک فوجی ٹرک آتا دکھائی دیا۔ میں نے فوراً اپنا ہاتھ اونچا کر کے بچاؤ کا نعرہ لگایا۔ ٹرک ڈرائیور نے بھی میرے قریب آ کر فوراً بریک لگا دی۔ یہ بلوچ رجمنٹ کا ٹرک تھا۔ یک دم بریک لگانے کی وجہ سے اڑتی دھول فرد ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ تینوں ایک پگڈنڈی پر بھاگے جا رہے ہیں۔ فوجی جوان نے مجھ سے سوال کیا کہ میں کون ہوں اور یہ کیا ماجرا تھا؟ جواباً میں نے بتایا کہ میں مسلمان ہوں اور وہ لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ فوجی نے اپنی بندوق ان بھاگنے والوں کی طرف سیدھی کر کے ایک گولی داغ دی۔ گولی ان بھاگنے والوں کے درمیانی شخص کو لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ باقی دونوں سہم کر وہیں رک گئے۔ ڈھیر ہونے والا شخص مجھے مقتل کے اندر لے جانے کا خواہاں سکھ تھا اور بچ جانے والے دونوں میرے شاگرد تھے۔ یوں رب کریم نے اپنے انصاف کا ادنیٰ کرشمہ اس ناچیز کو وہیں دکھا دیا۔

فوجی جوان سے اجازت لے کر میں ان دونوں شاگردوں کے پاس گیا تو وہ روتے ہوئے میرے پاؤں سے لپٹ گئے۔ جس خلوص اور ہمدردی سے انہوں نے برے حالات میں میرا ساتھ دیا تھا، اس پر بے ساختہ ان کے لیے دلی دعا نکلی۔ وہ دونوں میرے مقروض بھی تھے۔ اس جدائی کے موقع پر انہوں نے مجھ سے اپنے قرض کی معافی کے لیے درخواست کی جو میں نے بخوشی قبول کر لی۔ انہوں نے بھی جتنی نقدی ان کی جیبوں میں تھی نکال کر مجھے تھما دی تا کہ راستے میں میرے کام آ سکے کیونکہ میں اس وقت بالکل تہی دست تھا۔

”شاگردوں سے جدا ہو کر میں واپس فوجی ٹرک میں سوار ہونے کے لیے آ گیا۔ ٹرک بالکل خالی تھا اور مہاجرین کی تلاش میں دینا نگر آیا

تھا۔ فوجی جوان ''واں'' ''واں'' کی تکرار کر رہے تھے کہ اس جگہ مہاجرین گھرے ہوئے ہیں۔ پہلے تو مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں' تاہم ذہن پر دباؤ ڈالنے سے اندازہ ہوا کہ شاید وہ آوانکھہ دروازے کے بارے میں کہہ رہے ہیں' چنانچہ میں ان کی راہنمائی آوانکھہ دروازے کی جانب کرنے لگا۔ مطلوبہ جگہ پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا جم غفیر وہاں رکا ہوا ہے۔ فوجی ٹرک دیکھ کر وہ لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ ایک انار صد بیمار والا معاملہ تھا۔ ایک ٹرک میں زیادہ سے زیادہ جتنے لوگ سما سکتے تھے وہ سب سوار ہو گئے۔ باقی ماندہ حسرت و یاس کی تصویر بنے وہیں کھڑے رہ گئے۔ میدان محشر کا سا سماں تھا۔

فوجی ٹرک متحرک ہوا اور میانہ روی سے چلتا ہوا شام کو دریا کے پتن پر آ کر رک گیا۔ یہاں سب لوگوں کو ٹرک سے اتار دیا گیا۔ ہزاروں لوگ دریائے راوی کے اس کنارے جمع تھے اور دوسرے کنارے اپنے پیارے ملک پاکستان پہنچنے کے لیے بیتاب تھے۔ میں نے دیکھا کہ ملاح ابھی بیڑے کو کنارے نہیں لگا پاتے تھے کہ ہوش و خرد سے عاری لوگ دریا میں کود پڑتے اور بیڑے پر سوار ہو جاتے یا ہونے کی کوشش کرتے۔ اس دھینگا مشتی میں بعض افراد دریا کی طوفانی لہروں کی نذر بھی ہو جاتے۔ کیونکہ ان دنوں زیادہ بارشوں کی وجہ سے دریا سیلابی ریلے کی زد میں تھا اور اس کا پاٹ خاصا وسیع ہو چکا تھا۔

''ملاحوں کے منع کرنے کے باوجود ضرورت سے زیادہ لوگ بیڑے پر سوار ہو جاتے اور کئی کشتیاں زیادہ بوجھ کی وجہ سے ڈوب جاتیں۔ ایسے واقعات ہونے کے باوجود لوگ کشتی یا بیڑے پر ہجوم کرنے سے باز نہ آتے۔ میں خاصی دیر تک یہ نظارہ کرتا رہا اور پھر ایک بیڑے پر جیسے تیسے سوار ہو گیا۔ بیڑے نے اپنا سفر دوسرے کنارے کی جانب شروع کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بیڑے پر حجم سے زیادہ وزن ہے۔ چلتے ہوئے بیڑے کے کنارے پانی کی سطح سے صرف چند انچ ہی اوپر تھے۔ پانی کی لہر کا تھپیڑا جب پڑتا تو پانی بیڑے کے اندر گرتا' اس طرح وہ مزید بوجھل ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میرے لاشعور میں خطرے کی حس مجھے بار بار متنبہ کر رہی تھی۔ بیڑا ابھی تھوڑی دور آگے چلا تھا کہ میں نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور واپس کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ میں کنارے پر پہنچ نہیں پایا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے وہ بیڑا غرق ہو گیا۔

''موت اس قدر ارزاں ہو چکی تھی کہ کسی کو اس کے وارد ہونے پر کف افسوس ملنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ کنارے پہنچ کر میں نے متبادل انتظام کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ شام کے سائے وارد ہو رہے تھے۔ بارش ایک بار پھر شروع ہو گئی اور سکھوں کے حملے کا خوف اس کے سوا تھا۔ ایسے میں کوئی بات سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ اچانک ایک مہاجر بھائی نے مشورہ دیا کیوں نہ ہم بٹالہ شہر چلیں جو اندازاً قریب ہی تھا۔ شاید وہاں کوئی فوجی کانوائے پاکستان کو جاتا مل جائے۔ اس کا یہ مشورہ کچھ اچھا محسوس ہوا اور میں نے اس کے ارادے پر صاد کر دیا۔

چلتا ہوں چند گام ہر ایک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اب رات نے کسی قدر اپنے پاؤں پھیلا دیے تھے۔ ہم دونوں مہاجر بٹالہ شہر کی جانب اندازے سے چل دیے۔ چلتے چلتے ایک جگہ کچھ روشنی کے آثار ملے۔ ہم جونہی اس روشنی کے کسی قدر قریب ہوئے تو دیکھا کہ سکھوں کا ایک گروہ ہے جو مال غنیمت پر ایک دوسرے سے الجھ رہے ہیں

اور ارد گرد لاشیں بکھری ہوئی ہیں۔ مجھے خیال گزرا کہیں میرا ہمراہی مجھے دھوکے سے سکھوں کے حوالے کرنے تو اس طرف نہیں لے آیا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے ہی ساتھی سے الجھ پڑا۔ مگر جب اس نے کلمہ پڑھ کر اپنے مسلمان ہونے کی گواہی دی تو مجھے اطمینان ہوا۔

''الغرض ہم سکھوں کے اس گروہ سے بچتے بچاتے بٹالہ شہر کی جانب چلتے گئے۔ رات کے اندھیرے میں درست سمت کا تعین ممکن نہ تھا' تاہم ہم اپنا سفر جاری رکھنے پر مجبور تھے۔ صبح کاذب ہونے پر ہم ایک پختہ سڑک پر پہنچے تو سامنے بٹالہ 3 میل لکھا نظر آیا۔ ہماری جان میں جان آئی۔ اب ہم ایک پختہ سڑک پر رواں دواں تھے۔ جلد ہی ہم شہر پہنچ گئے۔ یہاں میرا ہمراہی مجھ سے یہ کہہ کر جدا ہو گیا کہ دراصل مجھے بٹالہ اپنے بیوی بچوں کے پاس آنا تھا اور وہ اکیلے سفر کرنے سے خائف تھا۔ مجھے اس کی اس دھوکا دہی پر بہت غصہ آیا مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

''اپنے ہمراہی سے جدا ہو کر میں ریلوے اسٹیشن کی جانب چل پڑا۔ اسٹیشن پر انسانوں کا ایک ازدحام تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ تمام بٹالہ شہر کے مسلمان آج ہی اپنے گھروں کو خالی کر کے آئے ہیں۔ بچے' بوڑھے' مرد' عورتیں اپنے مختصر اثاثوں سمیت اسٹیشن پر آ گئے تھے۔ ریلوے لائن کی دونوں جانب کہیں بھی تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ عجب نفسا نفسی کا عالم تھا۔ کوئی بھی کسی دوسرے کے لیے پلیٹ فارم پر ایک انچ جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ابھی گاڑی آنے میں دیر تھی۔ میں گھومتے گھامتے بکنگ آفس کے اندر چلا گیا۔ وہاں مجھے ایک ہندو ریلوے ملازم ملا۔ یہ شخص کبھی دینا نگر ریلوے اسٹیشن پر بھی متعین رہا تھا' لہٰذا کچھ صاحب سلامت تھی۔ بدلتے حالات کے زیر اثر اس کا انداز بڑا روکھا تھا۔

یہاں بھی رب کریم نے ایک بار پھر میری عجب انداز میں مدد فرمائی۔ اس ہندو ملازم نے میرے سامنے ایک سربستہ راز نہ جانے کس ترنگ میں آ کر اگل دیا جو شاید پلیٹ فارم پر موجود کسی مسلمان کو بھی معلوم نہ تھا۔ اس نے بتایا کہ آنے والی مہاجر ٹرین یہاں ہلکی ضرور ہو گی مگر رکے گی نہیں اور اسٹیشن سے گزر کر اپنی رفتار پکڑ لے گی۔ ہم ہندوؤں کی پوری کوشش ہے کہ یہاں سے کوئی مسلمان زندہ بچ کر نہ جانے پائے۔ اب اگر تم گاڑی میں سوار ہو سکتے ہو تو کوشش کر لینا' مگر یہ راز باہر کسی کو نہیں بتانا۔

اس گھناؤنے انکشاف نے میرے جسم میں سنسنی پھیلا دی۔ مجھے اپنے جسم کی تمام قوت سلب ہوتی محسوس ہوئی۔ مجھے کچھ دیر اپنی حسیات کو جمع کرنے میں لگی۔ اب میں یہ راز چیخ چیخ کر سب کو بتانا چاہتا تھا مگر پھر خیال آیا کہ مجھ طوطی کی اس نقار خانے میں کون سنے گا اور کون یقین کرے گا' لہٰذا خاموشی ہی بہتر ہے۔ ایک بار پھر پلیٹ فارم کا طائرانہ جائزہ لیا تو ایک جگہ ایک چھوٹا سا کنبہ مختصر سامان کے ساتھ قابض نظر آیا۔ پہلے تو یہ خاندان کسی طرح بھی مجھے اپنے ساتھ جگہ دینے کو تیار نہ ہوا تاہم ان کے سامان کو گاڑی میں رکھنے میں مدد دینے کی پیشکش پر وہ لوگ بصد مشکل میرے لیے ڈیڑھ دو فٹ جگہ خالی کرنے پر راضی ہو گئے۔ جہاں کھڑا ہونا تو ممکن تھا مگر بیٹھا نہیں جا سکتا تھا۔

اب میں بھی دیگر مہاجرین کی طرح اس انتہائی مختصر جگہ پر کھڑا گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ دور سے گاڑی آتی دیکھ کر مہاجرین میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ پلیٹ فارم کی حدود میں داخل ہوتے ہی گاڑی آہستہ تو ہو گئی اور اس کے ڈبے میرے سامنے سے آگے پیچھے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ ایک لحظہ کے لیے خیال آیا کہ گاڑی اب رک رہی ہے مگر پلیٹ فارم کے درمیان کھڑا ہونے کے باوجود جب آخری آخری ڈبے قریب پہنچتے محسوس ہوئے تو ایک بیک میرے جسم میں جیسے برقی رو دوڑ گئی اور میں اپنی زندگی کا ایک انتہائی مشکل اور خطرناک ترین فیصلہ کرنے پر مجبور ہو

گیا۔ میں نے اپنے اللہ کو قلب صمیم سے یاد کر کے اچھل کر گاڑی پر چھلانگ لگا دی۔ یہ فیصلہ مجھے سیکنڈ کے سویں حصے میں کرنا پڑا...... میرے ہاتھ گاڑی کے پائیدانوں کے اوپر ہینڈل پر جا پڑے جسے میں نے مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اگر میں یہ جرأت نہ کرتا تو کفار کے ہاتھوں قتل ہونا شاید میرا مقسوم ہوتا۔

اس مختصر سے وقفے میں ریل گاڑی اسٹیشن کی حد پار کر کے دوبارہ رفتار پکڑ چکی تھی۔ اب میرے دونوں ہاتھ ٹرین کی آخری بوگی کے ہینڈل پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے اور میرا باقی جسم پائیدان پر جھول رہا تھا۔ گاڑی میں سوار دیگر مسافروں نے جب میری یہ کیفیت دیکھی تو وہ میری مدد کو لپک آئے۔ ادھر میں ہینڈل چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا مبادا ان سے چلتی گاڑی میں میرے بازو چھوٹ جائیں اور میں پہیوں کے نیچے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے لیے جا پڑوں' تاہم مسافروں کی اس یقین دہانی پر کہ وہ ایسا نہیں ہونے دیں گے' میں خود کو ان کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ دو مسافروں نے میرا ایک بازو اور دو نے دوسرا بازو تھام لیا اور مجھے گھسیٹ کر بوگی میں سوار کر لیا۔ اس دوران میرے جسم کو بھی تختہ مشق بننا پڑا کیونکہ گردن سے نیچے میرا تمام جسم سامنے کے رخ سے کپڑوں سمیت بری طرح چھل چکا تھا۔ مگر زندگی کے عوض اس تراش خراش کی کیا حقیقت تھی۔

مہاجر گاڑی امرتسر سے ہوتی بخیریت لاہور پہنچ گئی۔ شاید میں پہلا اور آخری مسافر تھا جو اس چلتی ٹرین میں بٹالہ ریلوے اسٹیشن سے سوار ہو سکا تھا۔ ان سینکڑوں ہزاروں مسلمانوں پر کیا گزری جو سوار ہونے سے رہ گئے' اس پر کوئی واقف حال ہی روشنی ڈال سکے گا۔

(تحریر سید غیاث حسین مشہدی' اردو ڈائجسٹ اگست 1998ء)

سی ٹاپ

سی ٹاپ، مظہر کلیم کی عمران سیریز کا ایک ناول ہے جس میں پاکیشیا کا ایک انتہائی اہم سائنسی فارمولا یورپ کی مجرم تنظیم کے ہاتھ لگ گیا ہے جسے خریدنے کے لئے ایکریمیا اور اسرائیل سمیت تقریباً تمام سپر پاورز نے اس مجرم تنظیم سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ گو یہ مجرم تنظیم عام بدمعاشوں اور غنڈوں پر مشتمل تھی لیکن اس کے باوجود تمام سپر پاورز اس تنظیم سے فارمولا حاصل کرنے کے لئے اسے بھاری رقم دینے پر آمادہ تھیں حتیٰ کہ عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس کو بھی اس فارمولے کے حصول کے لئے اس تنظیم سے بار بار سودے بازی کرنا پڑی اور بھاری رقم دینے کے باوجود فارمولا حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اس کے باوجود وہ اسے مزید رقومات دینے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ ایسا کیوں ہوا۔ کیا عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس ایک عام سی مجرم تنظیم کے مقابل بے بس ہو گئے تھے؟ ہر لحاظ سے ایک منفرد کہانی، جس میں پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات کے ساتھ ساتھ تیز رفتار ایکشن اور بے پناہ سسپنس نے اسے مزید منفرد اور ممتاز بنا دیا ہے۔ **سی ٹاپ** کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مسرور بانو

مجھے جب بھی اپنی معصوم بیٹی مسرور بانو کا خیال آتا ہے، تو میرے سامنے وہ تمام معصوم بچے آجاتے ہیں جو 47ء کے سانحہ عظیم میں اپنی ننھی منی جانوں کے نذرانے دے کر ہمیشہ کے لیے بار زندگی سے سبکدوش ہوگئے۔ میں جب بھی اپنی لاڈلی کے بارے میں کچھ لکھنے بیٹھتا ہوں تو بے شمار بھولی بھالی معصوم صورتیں میرے اردگرد جمع ہو جاتی ہیں۔ پھول سے چہرے گھنگریالے بالوں والے بچے گول مٹول، بڑی بڑی آنکھوں والے منے، صحت مند، سانولے سلونے اور پھر دبلے پتلے، کمزور، نازک جسم والے بچے اور بچیاں بھی یہ سب معصوم صورتیں مجھ سے اپنی اپنی توتلی زبان میں شکایت کرنے لگتی ہیں۔ ‘‘بڑے افسوس کی بات ہے، آپ کو اپنی بیٹی یاد آتی ہے اور ہمارا خیال نہیں آتا’’ کوئی مجھ سے کہتا ہے: ‘‘مشکور چچا، میری طرف دیکھیے، میرے چھوٹے سے سینے پر نیزے کا زخم کیسا چمک رہا ہے۔’’ کوئی کہتا ہے ‘‘مشکور ماموں، میرے ماتھے سے بالوں کو ہٹا کر ذرا ملاحظہ فرمائیے، تلوار کے نشان نے کس طرح چاند کی تصویر کھینچ دی ہے۔’’ کوئی کہتا ہے: ‘‘مشکور پھوپھا، میری ہمت دیکھیے، میں ٹانگوں کے بغیر آپ کے پاس چل کر آیا ہوں اور کچھ بس نہ چلا تو ظالموں نے میری ٹانگیں ہی کاٹ ڈالیں۔’’ کوئی ننھا اپنے منہ سے دودھ اگلتے ہوئے کہتا ہے: ‘‘مشکور بھیا، میرے بائیں پہلو پر نظر کیجیے کسی ظالم نے اس طرح برچھی ماری ہے کہ میرا چھوٹا سا دل باہر نکل آیا ہے۔’’ غرض معصوم بچوں کے اس ہجوم میں میری لاڈلی کی تصویر دھندلی پڑ جاتی ہے، لیکن میں کچھ دیر ٹھہر کر پھر چلانا شروع کر دیتا ہوں:

‘‘مسرور، مسرور، میری بیٹی...... میری شہید بیٹی...... میری جان...... میری لاڈلی...... تم کہاں ہو...... بولو...... بیٹا......’’ میری اس چیخ پکار پر مسرور کا بھولا بھالا چہرہ قدرے خفگی کے آثار لیے پھر میرے سامنے آجاتا ہے۔ وہ مجھ سے کہتی ہے:

‘‘بابا جان، آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ اس قدر خود غرض کیوں ہو گئے ہیں۔ آزادی وطن پر قربان ہونے والے بچوں میں صرف ایک میں ہی تو نہیں، قوم کے کتنے ہی معصوموں نے اس راہ میں خون دیا ہے، ان کو کیوں نہیں یاد کرتے؟ مجھے بار بار آوازیں دے کر آپ اپنی کم ہمتی کا ثبوت کیوں دے رہے ہیں؟’’

اور جب میں اپنی بیٹی کے حوالے سے اُن مظالم کا تصور کرتا ہوں جو ہندوؤں نے سکھوں کو اپنا آلہ کار بنا کر بے گناہ بڑے بوڑھوں کے علاوہ شیر خوار بچوں پر توڑے، تو میں عجیب اذیت ناک احساس سے دوچار ہوتا ہوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے ان معصوم بچوں پر ظلم نہیں ٹوٹے، بلکہ میری بیٹی مسرور بانو پر ٹوٹے تھے۔ کبھی مسرور مجھے نیزے کی نوک پر نظر آتی ہے، کبھی تلواروں اور کرپانوں کے نیچے کبھی میں اسے قافلے والوں کے قدموں تلے پائمال ہوتے دیکھتا ہوں اور کبھی جنگل کے کسی سنسان راستے پر اس کا لاشہ بے گور و کفن نظر آتا ہے۔

مجھے اس وقت مسرور بانو کی صحیح تاریخ پیدائش یاد نہیں، البتہ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ 1945ء کے آخر میں پیدا ہوئی تھی مجھے اس کی پیدائش کا دن اچھی طرح یاد ہے۔ اس روز اخبار کے مضامین ترتیب دینے کے بعد چھاپے خانے میں بھیجنا ضروری تھے، اس لیے میں سخت مصروف

تھا۔ خدیجہ کو تکلیف ہی میں چھوڑ کر دفتر چلا آیا۔ اسکی دیکھ بھال کے لیے میری والدہ اور ایک عزیزہ موجود تھیں۔ دفتر سے واپسی پر معلوم ہوا کہ میں ایک بیٹی کا باپ بن چکا ہوں۔ میری یہ شادی خاصی کم عمری میں ہوئی تھی' اس لیے جس طرح مجھے شادی کے بعد بہت دنوں تک یہ بات عجیب سی لگتی رہی کہ میں ایک عدد بیوی کا شوہر بن گیا ہوں' اسی طرح ایک بیٹی کے باپ بننے کا واقعہ بھی میرے لیے عجیب طرح کا احساس رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں جب کبھی مجھے مسرور کو گود میں لینے کا اتفاق ہوتا' تو وہ بیٹی سے زیادہ بہن نظر آتی۔ ویسے بھی ہمارے ہاں دادا' دادی کی موجودگی میں باپ اپنی اولاد کو گود میں اٹھاتے ہوئے شرماتا تھا۔ (غالباً اب اس قسم کی باتیں ''رجعت پسند'' لوگوں تک محدود ہو چکی ہیں اور ان میں سے بھی بہت کم افراد تک۔) مسرور میرے اور خدیجہ سے زیادہ اپنے دادا اور دادی کے پاس رہتی تھی۔ ہم تو ایک طرح سے اس کے خدمت گزار تھے۔ اسے بھوک لگتی' تو خدیجہ کو یاد کیا جاتا۔ گھر میں کوئی ملازم یا میرا چھوٹا بھائی اظفر موجود نہ ہوتا' تو پھر امی مجھے بلا کر حکم دیتیں:

''بیٹا' ذرا مسرور کو باہر لے جا کر سیر ہی کرا لاؤ۔''

مسرور کے نانا جان سید آل حسن صاحب اتفاق سے آج کل لاہور میں میرے ہمسائے ہیں۔ میں نے یہ مضمون لکھنے سے قبل جب ان سے پوچھا کہ آپ کو اپنی نواسی مسرور بانو کی کوئی بات یاد ہے تو مجھے بتائیے۔ وہ فوراً کہنے لگے:

''ارے بیٹا' مسرور ہمارے پاس رہی کتنے دنوں؟ مجھے تو اس کی یہی بات رہ رہ کر یاد آتی ہے کہ میں نے اسے کبھی روتے نہیں دیکھا۔ ایک خاص نوعیت کی مسکراہٹ ہمیشہ اس کے لبوں پر کھیلتی رہتی تھی۔''

آل حسن صاحب آج ماشاء اللہ پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں والے ہیں۔ خدا کا باغ سرسبز و شاداب رکھے (آمین)' لیکن میں جب بھی انہیں کرسی پر خاموش بیٹھا دیکھتا ہوں' تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مسرور کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں اور ان کے ڈھیلے ڈھالے اور ضعیف بازو اسے اٹھا لینے کو آج بھی تیار ہیں۔ مسرور کی ایک خالہ فرحانہ جمال ہے جو مسرور سے چھ مہینے بعد پیدا ہوئی تھی۔ میں جب بھی فرحانہ کو دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ میری بیٹی اتنی بڑی ہو گئی ہوگی۔ شہید مرتے نہیں (میں اپنے ہر مرنے والے کو شہید کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں' البتہ مسرور بانو کو شہید کہنا شاید غلط نہ ہوگا) فرحانہ نے گزشتہ سال بی۔ اے۔ کیا تو مجھے یوں لگا جیسے مسرور نے بھی یہ امتحان پاس کر لیا ہے۔

جیسا کہ میں اپنے پہلے مضمون میں ذکر کر چکا ہوں' 29 اگست کو ہمارے ساتھ یہ سانحہ پیش آیا اور اس سے دس پندرہ روز قبل میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ میرے تمام عزیزوں کو ہندوؤں اور سکھوں نے مار کر ایک گڑھے میں دفن کر دیا ہے۔ میں نے جب اپنا یہ خواب گھر والوں کو سنایا تو سب نے میرا مذاق اڑایا اور کہا:

''تم ہندوؤں اور سکھوں سے ڈرتے ہو' اس لیے تمہیں ایسے خواب نظر آتے ہیں۔''

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مسرور کی آنکھوں میں اس دن کے بعد سے ایک عجیب قسم کی اداسی اور غمگینی نمایاں ہو گئی تھی۔ وہ مجھے دیر تک گھورتی رہتی اور بعض اوقات تو میں اس کے اس طرح دیکھنے سے بری طرح خوف کھاتا۔ امی سے میں نے اس بات کا ذکر کیا' تو انہوں نے کہا: ''خدا خیر کرے' میں خود بھی محسوس کرتی ہوں کہ اس بچی کے چہرے سے شادابی کم ہوتی جا رہی ہے۔'' جیسے جیسے دن قریب آ رہے تھے مسرور کی اداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب میں اعلانیہ کہنے لگا تھا کہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں زندہ نہیں بچوں گا یا پھر یہ بچی زندہ نہیں رہے گی۔ ہم پر ضرور کوئی آفت

آنے والی ہے۔ اظفر مرحوم ہنس کر کہتا: ''بھائی جان، آپ نے علم غیب کہاں سے حاصل کرلیا۔''

29 اگست کو جس دن ہم پر حملہ ہونے والا تھا۔ ہمارے ہاں اس قدر مہمان جمع تھے کہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس روز میں نے مسرور کو گود میں لینا تو درکنار اچھی طرح دیکھا بھی ہو۔ اس دن تو مجھے وہ ایسے وقت نظر آئی جسے میں تادم زیست کبھی نہیں بھول سکتا۔ جس وقت میرا چھوٹا بھائی اظفر ریوالور اور بندوق پولیس کے حوالے کرنے کے لیے باہر نکلا اور فائر ہوئے تو میری والدہ بھی گھر سے باہر نکل پڑیں۔ فوراً ہی (جیسا کہ میں اپنے پہلے مضمون میں لکھ چکا ہوں) خدیجہ نے مجھ سے باہر جانے کی اجازت مانگی۔ اس وقت مسرور خدیجہ کی گود میں تھی۔ ہندو اپنے گھروں سے اینٹیں اور پتھر برسا رہے تھے۔ خدیجہ، مسرور کو اپنے ایک ہاتھ سے بچانے کی کوشش میں مصروف چلی جا رہی تھی۔ میری بیٹی کے بھورے بھورے بال پریشان تھے چلتے وقت اس نے مجھے ایسی نگاہ سے دیکھا جس میں ہزار ہا معنی پوشیدہ تھے۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے میری بیٹی مجھ سے کہہ رہی ہے: ''لیجئے بابا جان، ہم تو چلے۔ آپ کو یہ زندگی مبارک۔'' ایک لمحے کے لیے شدت کے ساتھ میرا دل چاہا کہ اپنی لاڈلی کو سینے سے لگا کر رخصت کروں، لیکن دوسرے ہی لمحے میرے اور میری پیاری بیٹی کے درمیان مصلحت حائل ہوگئی۔ میں نے دل میں کہا: ''مشکور جذباتی نہ بنو۔ زندگی ہے تو پھر ملیں گے۔ میرا خیال تھا اور بالکل خیال ظلم کہ شاید باہر نکلنے پر ہندو ہمیں حسب وعدہ کچھ نہ کہیں گے اور یوں ہماری جان بچ جائے گی۔ مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں، لیکن خیال پڑتا ہے کہ خدیجہ نے چلتے وقت نہ صرف اپنے لیے اجازت چاہی تھی، بلکہ مسرور کے بارے میں بھی پوچھا تھا کہ اس امانت کو آپ اپنے پاس رکھیں گے یا میں گود میں سنبھالے رکھوں۔ غالباً میں نے نہایت غیر ذمے داری کا ثبوت دیتے ہوئے اور اپنی جان کی فکر کرتے ہوئے خدیجہ کو یہی جواب دیا کہ مسرور کو تم ہی اپنے پاس رکھو۔ اس وفا شعار نے چون و چرا کے بغیر سر تسلیم خم کیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ میں اپنے گھر کے دروازے کے قریب ہی جہاں ظہیر اور نفیس بانو خون میں نہائے پڑے تھے، گر گیا تھا اور خدیجہ مسرور کو لے کر باہر آ گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہندو برچھیوں اور بلموں سے ہمارے گھر سے باہر نکلنے والوں کو مار رہے ہیں۔ میری معصوم بیٹی کے ساتھ اس وقت فی الواقعہ کیا بیتی؟ مجھے نہیں معلوم، البتہ میں نے اپنی ماں کی یہ آواز ضرور سنی: ''اے بہنو، مسرور کو مجھے دے دو۔'' بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ہندوؤں نے خدیجہ پر حملہ کیا تو معصوم بچی کو بچانے کی غرض سے میری امی نے اسے اپنی گود میں لے لیا اور جب امی پر حملہ ہوا تو مسرور اپنی ماں کی گود میں آ گئی۔ دونوں نے معصوم بچی کو بچانے کی کوشش میں اپنا خاتمہ کرلیا۔ میں اپنی جگہ پڑا یہ سمجھ رہا تھا کہ مسرور بھی ان کے ساتھ ختم ہو چکی ہے، کیونکہ لاٹھیوں، کرپانوں اور بلموں سے مارنے کے فوراً بعد ہندو حملہ آوروں نے مٹی کا تیل اور جلا دینے والی گیس پھینک کر ہمارے مکان اور لاشوں کو آگ لگا دی تھی، لیکن نو بجے رات کے قریب جب حملہ آور جا چکے تھے اور آگ بھی قریب قریب بجھ چکی تھی، میں نے مسرور کی آواز سنی۔ مسرور نے پہلے تو اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں دادی کو پکارا اور جب دادی کی لاش نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ اپنی ماں سے مخاطب ہوئی۔ وہ ابھی اپنی ماں کو بلا رہی تھی اور میں موقع بھانپ ہی رہا تھا کہ پولیس کا ایک ہندو سپاہی آگے بڑھا اور کہا: ''ارے، تو ابھی زندہ ہے۔'' اس فقرے کے ختم ہوتے ہی مسرور کی ایک چیخ سنائی دی، پھر مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا کہ کیا ہوا۔ صبح کو جب میں لاشوں سے نکل کر بھاگا تو میں نے دیکھا کہ مسرور اپنی ماں اور دادی کی لاشوں کے درمیان پڑی مسکرا رہی ہے۔ اس کے ننھے سے گلے پر ہلکا سا زخم تھا اور سینے پر جوتے کا نشان جس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس ہندو سپاہی نے پہلے تو میری معصوم ڈیڑھ سالہ لاڈلی کو زور سے ٹھوکر ماری جو اس کے گلے پر لگی اور بعد میں فوراً اس کے منے سے سینے کو اپنے پاؤں تلے کچل دیا۔ جب میں نے چلتے وقت اپنی لاڈلی کو دیکھا ہے تو یقین کیجئے کہ اس کے چہرے پر خاص قسم کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

ہلکی ہلکی ہوا میں اس کے بال اڑ رہے تھے۔ اس کی ننھی سی لاش عجب طرح کا اطمینان اور سکون کا منظر پیش کر رہی تھی مجھے یوں لگا جیسے میری بیٹی کہہ رہی ہے: ''بابا، زندگی کے بکھیڑوں سے آپ نمٹتے پھریں، ہم تو بڑے آرام سے ہیں۔''

حال ہی میں میرے ایک عزیز بزرگ نے بتایا کہ جب ہمارے گھر کی لاشیں ایک ٹرک میں لاد کر مردہ خانے لائی گئیں، تو وہ اس وقت وہاں موجود تھے۔ جس وقت میری ماں کی لاش اتری ہے تو اس کے سینے پر مسرور کی لاش بھی رکھی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی ستم ظریف نے ہمارے گھر سے لاشیں اٹھاتے وقت پوتی کی لاش کو دادی کے سپرد کر دیا تھا۔ عجب اتفاق دیکھیے کہ جب لاشوں کو دفن کرنے کے لیے لے جایا گیا، تو مسرور اس وقت بھی اپنی دادی کے سینے پر آرام کر رہی تھی کہتے ہیں اسی حالت میں اسے سپرد خاک کیا گیا۔ واضح رہے کہ ان لاشوں کو کوئی کفن وغیرہ نہیں دیا گیا، بلکہ جس حالت میں بھی وہ ملی تھیں، اسی طرح ہندو پولیس نے انہیں ایک گڑھے میں ڈال کر دبا دیا۔ جب میں نے یہ سنا کہ میرے یہ سب پیارے ایک ہی گڑھے میں دبائے گئے، تو مجھے اپنا خواب یاد آیا۔ کاش! میں اپنے اس خواب کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے اپنے پیاروں کو کسی محفوظ جگہ لے جا سکتا۔

میں اپنی لاڈلی کا ذکر ختم کر رہا ہوں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ میرے قریب آن کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے:

''ابو میرے پیارے ابو کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے یاد کر کے آپ قوم کے دوسرے معصوم شہید بچوں کو بھولے جا رہے ہیں۔ اے بابا، اگر آپ نے ایسا کر دیا تو یاد رکھیے، میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔ میں نے آپ کو بیس سال اس بات سے روکے رکھا کہ آپ ہمارا ذکر نہ کریں، بلکہ ہماری یاد کو سینے سے لگا کر اس سے کوئی کام لیں، لیکن اب جو آپ نے یہ عذر پیش کیا ہے کہ قوم خود چاہتی ہے کہ میں تمہارا ذکر کروں، تو اے میرے پیارے بابا جان، اس ذکر کو کافی نہ سمجھیے۔ ہم مرنے والوں کو ہم شہیدوں کو خوش کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ آپ اپنے ملک و قوم کے لیے کچھ کر دکھائیں۔

''صلہ شہید کیا ہے؟ تب و تاب جاودانہ''

فی الحال تو میں اپنی بیٹی کے اس پیغام پر ندامت کے ساتھ سر ہی جھکا سکتا ہوں۔ میں نے ان بیس برسوں میں، جی ہاں، آزادی کے بیس برسوں میں سچ پوچھیے، تو کوئی ایسا کام نہیں کیا جس پر مجھے ذرا بھی فخر کا احساس ہو سکتا ہو۔ خبر نہیں میں اس اعتراف کی منزل سے آگے قدم کب بڑھا سکوں گا۔ محاسبہ صرف اعتراف تک محدود نہیں ہوتا۔ سچا محاسبہ انسان کو عمل کے لیے مستعد کرتا ہے۔ محاسبے کے ساتھ اگر عمل نہیں ہے تو سمجھ لیجیے ہم اپنی کوتاہیوں کا دل سے اعتراف نہیں کر رہے ہیں۔ میری شہید بیٹی میرے پاس بیٹھی مسکرا رہی ہے اور اپنی ہنستی ہوئی آنکھوں سے کہہ رہی ہے:

''ابو آپ باتیں بنانا خوب جان گئے ہیں، لیکن ہمارے خون کا تقاضا کچھ اور ہے۔''

وہ غنچے جن کی آنکھ بھی نہ کھلنے پائی تھی ابھی
چمن کے نام پر مٹے صدا بہار ہو گئے

(یادؔ)

(تحریر مشکور حسین یاد اکتوبر 67 ڈائجسٹ)

سونا کا لہو

مضافات دہلی کے ایک مہاجر گھرانے کی دردناک بپتا

گاؤں سے اناج کی بوریاں آئیں تو امی نے گودام میں رکھوا دیں۔ گھر میں کام کرنے والی اجو بوا تھیں جن کی عمر بمشکل تیس سال تھی۔ انہوں نے بوریاں دیکھیں تو گھبرا کر چیخ ماری اور بیٹھے بیٹھے گر گئیں۔ ان کا سارا جسم اکڑ گیا اور بتیسی بند ہو گئی۔ چمچے کی ڈنڈی سے ان کے دانت ذرا سے کھول کر امی نے پانی ڈالا۔ منہ پر پانی چھڑکا تو وہ گہرے گہرے سانس لے کر ہوش میں آ گئیں۔

’’کیا ہوا بوا؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘ وہ شرمندہ سی ہو کر بیٹھ گئیں۔ پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے کہا: ’’بی بی! مجھے قیامت کی وہ رات یاد آ گئی جب ہم ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ اس رات مجھ پر دو قیامتیں ٹوٹی تھیں۔ بوری دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میں اور دوسری عورتیں ان میں بند ہیں۔‘‘

’’آپ بوری میں بند ہو کر پاکستان آئی تھیں؟‘‘ خالہ نے پوچھا۔

’’ہاں بی بی! اپنی عزت سب کو پیاری ہوتی ہے۔ میری ساس نے مجھے بوری میں بند کر کے گھسیٹ کر ریل گاڑی میں سیٹ کے نیچے گھسا دیا تھا۔ میرے آگے ٹرنک رکھ کر اس پر بستر اور پوٹلیاں رکھ دی تھیں۔ بوری میں تین چار سوراخ سانس کے لیے رکھے تھے اور یقین کرو مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں زندہ دفن ہوں۔ سانس بھی رک رک کر آتا تھا۔ سارا جسم ٹھنڈا برف تھا۔ اور وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ ہر پل مجھے صدیوں جیسا لگتا تھا۔ ایسی آزمائشیں کبھی خدا کسی دشمن پر نہ ڈالے جو مجھ پر ٹوٹی تھیں۔‘‘

اتنے میں امی نے گلوکوز پانی میں ملا کر کٹورا بھر کے بوا کو لا کر دیا اور کہا: ’’یہ پی لو۔ پھر اپنی پوری داستان سنانا۔ آزادی کی خاطر سب نے قربانیاں دی ہیں۔ خدا کا شکر ہے پاک سرزمین پر زندہ سلامت ہیں۔ کسی کے غلام نہیں۔ رہی محنت مزدوری۔ تو اس میں کوئی عار نہیں۔ عزت سے روٹی ملے وہ سب سے اچھی ہے۔‘‘

اجو بوا نے پانی پیا پھر کہنے لگیں: ’’دلی جو اجڑا دیار ہے‘ اس کے پاس ہی ہم ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتے تھے۔ ساس سسر کا زمیندارہ تھا۔ ایک ہی بیٹا تھا وہ بھی لاڈ میں آ کر افیم کا نشہ کرنے لگا تھا۔ شادی کے بعد مجھے پتہ چلا۔ اللہ نے اوپر نیچے دو بچے دیئے‘ پھر ایک پیاری سی بیٹی جس کا نام میں نے ’’سونا‘‘ رکھا۔ اس کی رنگت بالکل سونے جیسی تھی۔ میں گھر کا کام کرتی‘ تب بھی ایک لمحہ کے لیے اسے اکیلا نہ چھوڑتی۔ پاس بٹھا لیتی۔ ایک سال کی بچی مجھے جان سے زیادہ پیاری تھی۔

ہمارے قصبے میں امن چین تھا۔ پھر یکدم پاکستان بننے کا شور مچا۔ جوانوں کے دلوں میں ولولے اٹھے۔ ہجرت کی بات ہوئی تو زمینیں اور مویشی اونے پونے بیچ گئے۔ میری ساس نے تنور جلا کر براکڑھاؤ رکھا۔ مکئی کے دانے بھونکر گڑ کے شیرے مین سونف ملا کر اسکے لڈو بنائے۔ میٹھی ٹکیاں بنا کر تھیلے میں بھریں، سسر نے پچھلی کوٹھڑی میں جا کر دروازہ بند کیا۔ فرش کی کھدائی کر کے اس میں سے روپیہ اور زیور نکالا۔ میں نے کپڑے کی چوڑی تھیلی سی۔ اس میں زیور اور روپے رکھ کر کمر سے باندھ لیا۔

رات کے اندھیرے میں سب نے دعا مانگی اور ملنے والوں کو سلام دعا کر کے گھر سے باہر چلے۔ گاؤں کی بیل گاڑی تھی۔ اس نے ہمیں رات کے اندھیرے میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار تک پہنچا دیا۔ وہاں کیمپ لگا تھا۔ میری ساس نے چار چادریں لٹکا کر پردہ کی۔ میں اندر بیٹھ گئی۔ بے سروسامانی کا عالم تھا۔ صبح ہوئی تو روٹیاں نکال کر اچار کے ساتھ کھائیں۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ چار پانچ دن کیمپ میں گزارے۔ سوکھی ٹہنیاں توڑ کر بطور ایندھن رکھ لیں۔ ایک بڑا سا توا تھا۔ آٹا گوندھ کر لے جاتے۔ ایندھن ڈال کر روٹیاں پکا کر لے آتے۔ اچار سے لگا کر کھا لیتے۔ یہی ناشتا تھا اور یہی کھانا۔ بچوں کو میٹھی ٹکیاں پکڑا دیتے۔

مرے میاں کو پتہ چلا کہ کیمپ میں افیم بک رہی ہے اور سونے کا زیور، چاندی کے کڑے دو تو زیادہ ملتی ہے۔ اس نے سوچا پاکستان جا کر معلوم نہیں افیم ملے یا نہیں، نشہ کیسے پورا ہوگا۔ تھوڑا سا زیور دے کر افیم خرید لی جائے۔ مگر وہ اپنی ماں اور باپ سے بہت ڈرتا تھا۔ اس نے مجھے کہا: ''میں درخت پر سوکھی ٹہنیاں دیکھ کر آیا ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔ دونوں مل کر لے آئیں گے۔ آج روٹیاں زیادہ پکانا۔ کیونکہ لاہور جانے والی ٹرین لیٹ ہو جاتی ہے۔ راستے میں روٹی کام آئے گی۔'' میں نے ساس سے کہا: ''میں ایندھن لینے سامنے قبرستان تک جا رہی ہوں۔'' اور اس کے ساتھ ہولی، سونا گود میں تھی۔

قبرستان میں جا کر اس نے سونا کو گود سے اتار لیا۔ میری چمپا کلی گلے میں تھی وہ زبردستی اتارنے لگا۔ میں نے اسے دھکا دیا۔ غصے میں آ کر اس نے سونا کو اٹھایا اور پاگلوں کی طرح اسکی ٹانگیں پکڑ کر گھمانے لگا۔ میں نے شور مچایا اور کہا: ''ظالم! تو یہ چمپا کلی لے اور بچی کو چھوڑ دے۔'' اس کے سر پر جنون سوار تھا۔ کہنے لگا: ''مجھے یہ بتا اور زیور کہاں ہے۔ مجھے سارا زیور چاہیے۔ میں افیم خریدوں گا۔''

''اچھا' میں ماں سے لا کر تجھ کو زیور دیتی ہوں۔ تو سونا مجھے دے۔'' میں اس کی طرف بڑھی کیونکہ بچی کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ سامنے سے میرے ساس اور سسر بھی آتے دکھائی دیے۔ انہیں دیکھتے ہی ظالم نے بچی کو زور سے گھما کر پختہ قبر کے تعویذ پر دے مارا۔ بچی کا سر کھل گیا اور قبر پر اس کا بھیجا بکھر گیا۔

میں نے دیوانوں کی طرح بچی کو قبر سے اٹھایا اور اس کا بھیجا ہاتھ سے سمیٹنے لگی۔ اتنے میں وہ بھاگ گیا۔ میری ساس سسر بھی رونے لگے۔ وہ کہنے آئے تھے کہ ریل گاڑی آ گئی ہے۔ چل کر سامان سنبھال لو۔ میرے سسر نے معصوم بچی کو پیار کیا۔ ساتھ ہی ایک گڑھا کھدا ہوا تھا۔ اس میں بچی کو ڈال کر مٹی ڈالی۔ درخت کی شاخیں توڑ کر رکھیں۔ یوں میری سونا کو مٹی میں ملا دیا۔ میرے ہوش و حواس ختم ہو چکے تھے۔ روتی پیٹتی ان کے ساتھ ہولی۔ خالی گود تھی۔ اور میرے اندر جیسے زلزلہ آ گیا تھا۔ بار بار کانپ اٹھتی۔ گاڑی میں جا کر میری ساس نے ایک بوری نکالی۔ اس میں تین چار سوراخ کیے۔ کہنے لگی: ''اس ڈبے میں چھ لڑکیاں اور بوری میں بند ہیں۔ دیکھ اگر ہندو سکھ کرپان ماریں تو آواز نہ نکالنا ورنہ وہ تجھے بے آبرو کر دیں گے۔ اٹھا کر لے جائیں گے۔''

بوری میں ڈال کر آزاربند سے منہ باندھا اور مجھے سیٹ کے نیچے ٹھونس دیا۔ میرے آگے لوہے کا ٹرنک تھا، اس پر بستر رکھا تھا۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا بوری میں جانے کب سے بند ہوں اور یونہی مر جاؤں گی۔ پھر گاڑی میں ہندو سکھ گھس آئے۔ سامان پھینکنے کی آوازیں آئیں۔ آخر میں کسی نے زور سے ٹرنک گھسیٹا اور بوری پر لات ماری۔ اتنے میں کھڑکی سے آواز آئی: ”نیچے آ جاؤ۔ گاڑی چل پڑی ہے۔ اور مال موجود ہے۔“ جاتے جاتے کسی بدبخت نے دوبارہ بوری میں کرپان ماری۔ میری ران اور پنڈلی زخمی ہو گئی۔ خون بہنے لگا۔ میں نے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا۔ درد کی لہر سارے جسم میں تھی۔ پھر مجھے ہوش نہیں آیا۔

مجھے ہوش آیا تو میں فرش پر پڑی تھی۔ میری ساس گھسیٹ کر مجھے نکال رہی تھی۔ باہر نکل کر میں نے گہرے گہرے سانس لیے۔ دیکھا کہ لاہور اسٹیشن پر کئی بوریاں پڑی تھیں اور ان میں سے کچھ لڑکیاں مر بھی چکی ہیں۔ وہ نظارہ میں بھلا نہیں سکتی۔ بوریاں دیکھ کر مجھے وہ سب کچھ یاد آ جاتا ہے۔

خوف اور صدمے سے میرا دودھ خشک ہو گیا تھا اور خون بھی۔ جتنا بہنا تھا وہ بہہ چکا تھا۔ اس ٹرین میں جو بھی لڑکیاں اور عورتیں تھیں، انہوں نے لاہور کے کیمپ میں بتایا کہ اب وہ اولاد پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ خوف نے ان کا سارا قدرتی ماہانہ نظام برباد کر دیا ہے۔ میری مرہم پٹی ہوئی۔

پھر میں یہاں آ گئی۔ تینوں بچے ساتھ تھے۔ پہلے ساس مری، پھر سسر، اب میں تنہا ہوں، گھروں میں کام شروع کر دیا ہے۔ یہ بچے پالنے ہیں۔ میرا شوہر اب میرے ساتھ نہیں رہتا۔ کوٹھری کے باہر نالے پر زمین میں سو جاتا ہے جب میں کام کرنے آتی ہوں تو وہ بچوں کا خیال رکھتا ہے۔ اس کا نشہ ٹوٹ چکا ہے۔ وہ میری بچی کا قاتل ہے۔ میں اس سے نفرت کرتی ہوں مگر نجانے کیا بات ہے جب وہ دو تین وقت کے فاقے سے ہوتا ہے تو میں ایک دو روٹیاں بچے کے ہاتھ بھجوا دیتی ہوں۔ اور جب اس کے کپڑے گندگی سے اٹ جاتے ہیں تو وہ چادر باندھ لیتا ہے۔ میں سوڈے میں کپڑے بھگو کر دھو دیتی ہوں۔ نفرت کے باوجود نجانے کیوں یہ کام کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اجو بوا رو پڑی۔

اجو بوا جب تک زندہ رہیں ہمارے گھر رہیں۔ بچوں کی شادیاں کر کے بھی انہوں نے ہمارا در نہیں چھوڑا۔ ان کا میاں بڑی دردناک موت مرا۔ آٹھ دن جان کنی کا عالم رہا۔ جان ہی نہیں نکلتی تھی۔ پھر مسجد کے مولوی نے اجو بوا سے کہا: ”بی بی! تو اس کو معاف کر دے۔ اس کا دم نہیں نکلے گا جب تک اسے معاف نہیں کرے گی۔“ بوا نے بیٹے سے کہا: ”باپ کو نہلاؤ۔“ بیٹے نے نہلایا تو اس کے جسم پر سے میل اور گندگی اتنی نکلی کہ سب حیران رہ گئے۔ جسم کے بالوں میں کیڑے اور جوئیں تھیں۔ نہلا کر اسے کپڑے پہنائے۔ اجو بوا نے کھڑے ہو کر کہا: ”یا اللہ! تیرے واسطے میں اس کو معاف کرتی ہوں، تو بھی معاف کر دے۔“ یہ کہتے ہی ان کے خاوند کی جان نکل گئی۔ اور چہرے پر سکون آ گیا۔

اجو بوا بڑی صابر عورت تھیں۔ اس نے محنت مزدوری کر کے جس طرح بچے پالے، ان کی شادی کی اور اپنی زندگی گزاری...... صرف آزادی کے لیے، پاک سرزمین میں رہنے کے لیے۔ چودہ اگست کو وہ بڑے مزے سے بیٹھ کر پاکستان کی جھنڈیاں ڈوری پر لئی سے چپکاتیں اور گھر کو سجاتیں۔ رات کو چراغاں کرتیں۔ پھر بڑی یاس سے کہتیں: ”آج میری سونا کی روح ضرور آئے گی۔ پاکستان کو دیکھ کر کتنی خوش ہو گی۔“ چراغ بجھنے نہیں دیتی تھی۔ تیل بار بار چراغوں میں ڈالتی تھیں۔ ان کی بتیاں اونچی کرتیں محلے کے بچوں سے کہتیں: ”آج چراغاں ہے۔ یہ آزادی کے چراغ ہیں۔ ان میں میری سونا کا اور میرا لہو بھی شامل ہے۔ پاکستان کی لاج رکھنا۔ یہ بڑی قربانیوں کے بعد بنا ہے۔ اس کی حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے۔

(تحریر صغیرہ بانو شیریں۔ اردو ڈائجسٹ اگست 1998ء)

پہلے یوم آزادی کی فوجی یادیں

اگست 1971ء کے ''اردو ڈائجسٹ'' میں جب ہم سنگاپور میں پاکستان کے پہلے یوم آزادی کی روداد لکھ رہے تھے' تو اپنی دانست میں عمر رفتہ کو آوازیں دے رہے تھے۔ یہ وقت کی دھند میں سے اپنی یادداشتوں کو کھرچنے اور نچوڑنے کا عمل تھا' لیکن مضمون کی اشاعت پر قارئین کے ردعمل سے اندازہ ہوا کہ لوگوں نے اس مضمون کو تاریخ کا ایک ٹکڑا سمجھ کر پڑھا۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری کا ایک شعر ہے۔

پری رخوں کی زبان سے کلام سن کے مرا
بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

بیشتر قارئین نے تو نامہ و پیام کے ذریعے اپنے خیالات سے آگاہ کیا' مگر قرب و جوار کے کئی احباب ہماری شکل دیکھنے آئے۔ ظاہر ہے اس مضمون کی ہل چل سابق فوجیوں کے حلقے میں پیدا ہوئی' ان کے ردعمل سے اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ قسمت راولپنڈی میں بفضل خدا آج جتنے بھی سابق سپاہی زندہ موجود ہیں' انہوں نے ہماری طرح اپنی آزادی کا پہلا سورج ملایا ہی میں دیکھا تھا۔ بعض اصحاب نے بعض واقعات کی نشان دہی کی' مگر اکثر نے شکایت کی کہ جناب ہم بھی تو پڑے تھے۔ راہوں میں۔

ایک صاحب جو کل' جزو کے بغیر دیکھ ہی نہیں سکتے' اس بات پر برہم تھے کہ ہم نے یوم پاکستان کی تقریب میں ریاست جوہور کے وزیراعظم داتو حون بن جعفر کا نام تو لے دیا' مگر ان کے رنگین و دلکش قومی لباس کی تفصیلات نظر انداز کر گئے' حالانکہ تصویر کائنات میں رنگ ان کے ریشمی ساز و رنگ رباجو سے پیدا ہوتا تھا۔

ایک صاحب نے گلہ کیا تم نے سر مرزا اسماعیل کی صاحبزادی گوہر تاج کا ذکر تو کر دیا' مگر ان کے شوہر غلام حسن غازی کو بھول گئے جن کی پاکستان دوستی کا ذکر کیے بغیر یہ تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ بالمشافہ گفتگو کرنے والے احباب میں زیادہ تر وہ بے تکلف احباب تھے جو اپنی یادوں کی گٹھڑیاں اٹھا لائے تھے کہ ع

آؤ حسن یار کی باتیں کریں!

ملایا میں تحریک پاکستان کے ایک سرگرم مگر گمنام کارکن کا تذکرہ بہت سے لوگوں نے کیا۔ یہ ایک غریب مدراسی نوجوان تھا جس کی عمر بیس اور تیس کے درمیان ہوگی۔ کسی کے بقول وہ سنگاپور کے ''سٹرنگ بازار'' (آرکیڈ) میں چھابا لگاتا تھا۔ اس کا نام غنی محمد تھا۔ سنگاپور کے پاکستانی یونٹوں کو پاکستان کی رنگین کاغذی جھنڈیاں اسی غنی محمد نے مہیا کی تھیں' قیمتاً نہیں تحفتاً۔ وہ یوم پاکستان سے پہلے لگاتار دو تین روز فوجی یونٹوں میں جھنڈیاں تقسیم کرتا رہا۔

غلام حسن غازی کی بات کرنل حبیب نے یاد دلائی جو مضمون پڑھتے ہی اپنا بھاری عصا ٹیکتے چلے آئے تھے کہ ع

تو بائے گل پکار' میں چلاؤں ہائے دل!

انہوں نے پہلے تو غازی خاندان کی خدمات کا ایک عمومی جائزہ پیش کیا۔ پھر ایک ہلکی سی پیاری چپت ہمارے رخساروں پر جماتے ہوئے بولے:

''جن کافری! لوگ تو نمک کو حرام کرتے ہیں تم میٹھا بھی حرام کرتے ہو۔ ڈیڑھ دو من آئس کریم تہا تم نے غازیوں کے گھر میں کھائی ہوگی' مگر غلام حسن کے بارے میں ایک سطر تک نہ لکھی کہ وہ کتنا 'پیا' آدمی تھا!''

ایک سنگین کوتاہی کی نشان دہی بھائی انعام قاضی نے کی یہ ڈبل کوتاہی تھی ہم نے لکھ دیا تھا کہ کیپٹن (بعد میں میجر جنرل) ریاض شمیم اور کیپٹن بعد میں بریگیڈیئر محمد ابراہیم قریشی (ان دنوں وزارت خارجہ میں ڈائریکٹر جنرل) وطن واپس جا چکے تھے' حالانکہ یہ دونوں حضرات وہاں موجود تھے۔ اپنی اس فروگزاشت پر ہمیں بے حد افسوس بلکہ ندامت اور حیرت ہے کہ یہ دونوں تو فوجی برادری کے نورتنوں میں سے تھے' ان کا نام ذہن سے کیسے اُتر گیا۔ (رئیسی ریاض شمیم) تو ہماری شاموں کے ندیم تھے۔ اپنے ''نائی سون کیمپ'' میں تو وہ عموماً علی الصبح وردی پہننے کے لیے جایا کرتے تھے اور ابراہیم قریشی سے جو اپنی فرسٹ پنجاب رجمنٹ کے ساتھ شہر سے سات آٹھ میل باہر چانگی جیل کی بلند فصیلوں کے سائے میں خیمہ زن تھے' تقریباً بلاناغہ ٹیلی فون پر علامہ اقبال کے اشعار بالخصوص علامہ کے پرندوں کے پردے میں سینئر افسروں کا مزاج پوچھا کرتے تھے کہ کہو'' کرگس'' کا'' موڈ'' کیسا ہے۔'' طائر لاہوتی اڑ رہا ہے یا بھیگا ہوا ہے؟ سنا ہے'' شاہین'' کے'' حاشیہ سواروں'' (Out Riders) کو حادثہ پیش آ گیا وغیرہ وغیرہ......

'' کرگس'' انکا کرنل بدھ سنگھ تھا۔ 'طائر لاہوتی' ہمارا کرنل ٹو بن C.I.E اور'' شاہین'' جنرل سر نیل رچی کمانڈر انچیف...... کوئی اور بات نہ سوجھتی' تو اس خیال سے کہ مبادا اردو شاعری سے تمنک جاتا رہے' ایک دوسرے کو ٹیلی فون پر شعر ہی سناتے رہتے۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

پری وشان افرنگ کے راستے میں 'بارودی سرنگیں' بچھانے کے مقناطیسی مشن پر اکثر ٹونی اور رئیسی کو بھیجا جاتا۔ دانایان فرنگ کے سامنے علامہ اقبالؒ کے فلسفہ خودی اور موز بے خودی کی گتھیاں سلجھانے پھیلانے کا عمل ہوتا تو ابراہیم قریشی کی خدمات طلب کی جاتیں اور ملائی ریاستوں کے منتری بساروں نے وزرائے اعظم چیف سیکرٹریوں وغیرہ کے آمنے سامنے بیٹھ کر جچی تلی انگریزی میں گفتگو کرنے کے لیے ہمارے پاس میجر جی۔ ایم خان' کیپٹن محمد نواز اور کیپٹن میاں شوکت علی تھے۔ کیپٹن محمد نواز صاحب جو بعد میں کرنل ہوتے ہندوستان میں پاکستان کے ملٹری اتاشی رہے۔ آج کل مرکزی حکومت میں کیبنٹ ڈویژن کے سیکرٹری ہیں۔ کیپٹن شوکت علی بعد میں کرنل ہوئے۔ آپ معروف دانشور میاں کفایت علی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ کرنل حبیب جن کا ابھی ذکر آیا' وہ کرنل حبیب نہیں جو آج کل پاکستان کی مرکزی اسمبلی کے رکن ہیں۔ یہ کرنل غلام حبیب ضلع جہلم کے معروف موضع بشارت کے قریب ایک'' موہڑے'' کے رہنے والے تھے لیفٹیننٹ کرنل تھے کہ اوائل 1974ء میں انتقال ہو گیا۔ ہاکی کے ممتاز کھلاڑی نوجوانی میں ہاکی کے'' بین الاقوامی جادوگر'' دھیان چند کے مقابلے میں کھیل چکے تھے اور اپنے بے تکلف حلقوں میں'' فاتح دھیان چند'' کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔

1946ء میں یہ ''فاتح دھیان چند'' سنگاپور میں فرسٹ پنجاب رجمنٹ میں کپتان تھے۔ پلٹن کا کمان افسر کرنل بدھ سنگھ تھا۔ (بعد میں اس پلٹن کی کمان پر کرنل سید وحید حیدر فائز ہوئے) اصول اور استحقاق کی بنیادوں پر ہر یونٹ کے مسلمان عناصر کے مفاد کا ''بلیو پرنٹ'' (Blue Print) تو میجر علی احمد اور کیپٹن محمد ابراہیم قریشی ہی تیار کرتے تھے' لیکن بٹالین کے بھرے دربار کے سامنے ''گیند'' کو گول تک غلام حبیب لے کر جاتے۔

ملایا میں مقیم پاکستانی افسروں نے ذاتی مراسم کے لحاظ سے مختلف مقامی خاندانوں سے ''بیعت'' کر رکھی تھی۔ جس کے جہاں سینگ سما گئے۔ حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے' بیٹھ گئے...... جو پہلی نظر میں بندھ گیا سو موتی' بعض گھرانے تو ہم لوگوں کو ''انڈین نیشنل آرمی'' (I.N.A) کے افسروں کی طرف سے باقاعدہ ''چارج'' میں ملے تھے۔

ہزار شمع بکشتند و انجمن باقیست!

کیپٹن حبیب نے غازیوں کے ہاتھ پر ''بیعت'' کر رکھی تھی جو اس کے نزدیک مہمان نوازی' تہذیبی شائستگی' اخلاقی پاکیزگی اور پاکستان دوستی میں اول نمبر پر آتے تھے۔

حبیب نے اپنی گفتگو کا آغاز ان کے گھر میں دیواروں سے لٹکے ہوئے قالینوں سے کیا۔ پھر غلام حسن غازی کی یاد میں شیر و شکر گھول رہے تھے کہ ناگاہ بھڑک کر بولے: ''تم ہمارا فرسٹ پنجاب کا ڈنر بھی کھا گئے!''

یہ واقعی ایک اور بھاری فروگزاشت تھی۔ 14 اگست کو ہماری سب سے بڑی مجلسی تقریب یہی ڈنر تھا۔ کرنل بدھ سنگھ اگرچہ باہر سے تو مکئی کی کھیل کی طرح کھلا رہتا تھا مگر پھیتر میں بدھ سنگھ ہی تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا اس کے یونٹ کی مسلمان نفری اپنا الگ جشن منائے' مگر جب ابراہیم قریشی نے کسی مفکر کے مقولے سے قوموں کے تشخص کی اہمیت اجاگر کی اور غلام حبیب نے فاتح دھیان چند کی زبان میں کہا: ''جناب ہم تو یہ جشن ہی آپ سے علیحدگی کا منا رہے ہیں''...... تو بدھ سنگھ' سدھ سنگھ ہو گئے!

چانگی میں ہم نے کئی بار حبیب کو دیکھا کہ وہ اپنی ''موٹی نشست دار سوٹی'' کو اپنے خیمے کے سامنے زمین میں گاڑ کر اس کی چھتری پر بیٹھے یونٹ کے حجام سے بال کٹوا رہے ہیں۔ آج بھی وہی عصا ان کے ہاتھ میں تھا۔ ڈنر کی بات چلی تو کرسی چھوڑ کر عصا زمین میں گاڑ کر اس کی چھتری پر بیٹھتے ہوئے بولے:

''ہاں' اب بات کرو۔''

''بڑی زرق برق تقریب تھی''، ہم نے کہا اور فی الواقع بڑی زرق برق تقریب تھی' کوئی تین سو مہمان شہزادوں سے شہزادے اور جرنیلوں سے جرنل ٹکرا رہے تھے۔ کتنی ہی ایسی ٹیمیں گھوم رہی تھیں جیسے وہ یورپ کے کسی شاہی محل سے نئی نئی نکلی ہوں۔ ملکوں پر مردوں کے پیچھے بیٹھ کر حکومت کرنے والی عورتیں!

''ایک بات ہم نے شروع میں طے کر لی تھی۔'' کرنل حبیب ڈنر کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے بولے: ''شراب سرو (Serve) نہیں کی جائے گی' خواہ سرنیل (کمانڈر انچیف) بھی مانگیں' تو نمبو پانی ملے گا۔''

ان لوگوں نے واقعی ایک نئی روایت کی طرح ڈالی تھی۔ سر نیل تو خیر سگریٹ بھی قینچی کے پیتے تھے اور انہوں نے خود ہی نمبو پانی مانگا ہوگا' مگر سینکڑوں فرنگی مردوں عورتوں کو مدعو کر کے ان کے سامنے نمبو پانی رکھ دینا غیر معمول دل گردے کی بات تھی۔

''جن کافری! یقین کرو لعل خاں'' مجتبیٰ اور دوسرے بوائز (Boys) تین دن کام میں جاگتے رہے۔ (لیفٹیننٹ آج کل لیفٹیننٹ کرنل) لعل خاں۔ لیفٹیننٹ (بعد میں لیفٹیننٹ کرنل) حسن مجتبیٰ جعفری چند برس ہوئے کراچی کے قریب موٹر کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوئے کیپٹن (بعد میں کرنل ابوطاہر حق مشرقی پاکستان کے رہنے والے) برما میں پاکستان کے ملٹری اتاشی ہے۔ 1965ء کی جنگ میں واہگہ محاذ پر ایسٹ پاکستان رجمنٹ کی قیادت کرتے ہوئے ستارۂ جرأت حاصل کیا۔ سب سے زیادہ پریشانی ہمیں جھنڈیوں میں ہوئی' مگر جب ملیں تو چھپڑ پھاڑ کر ملیں۔''

چھپڑ اس طرح پھٹا تھا کہ لیفٹیننٹ جعفری کسی کام سے یونٹ کے مین گیٹ سے گزر رہے تھے کہ چیک پوسٹ کے سنتری نے کہا: ''جناب! یہ آدمی کہتا ہے یونٹ کے کسی مسلمان صاحب کو بلا دو۔ کوئی چیز دینی ہے۔''

لیفٹیننٹ جعفری اس شخص کے پاس گیا تو وہ بولا:

''میں آپ کی یونٹ کے لیے پاکستان کی جھنڈیاں لایا ہوں۔ مہربانی کر کے میرا تحفہ قبول کریں۔'' پاس ہی جھنڈیوں کے بندھے ہوئے بنڈل رکھے تھے۔ یہ اجنبی شخص غنی محمد مدراسی تھا۔

''ڈنر کی طرح ہمارا ہاکی میچ بھی بڑا ''ہٹ'' (Hit) پروگرام تھا...... یاد ہے نا...... آدھا شہر گھروں سے نکل آیا تھا۔ مگر تم نے یہ واقعہ بھی قابل توجہ نہ سہا۔'' کرنل حبیب ڈنر ختم کر کے اب ہاکی میچ میں کود گئے۔ یہ نمائشی میچ پاکستان اور ''فارایف'' (Farelf) کی ہاکی ٹیموں کے درمیان 14 اگست کو ہوا تھا۔

مخالف ٹیم میں چار بین الاقوامی شہرت کے کھلاڑی شامل تھے۔ ادھر اپنا اوڑھنا بچھونا ایک غلام حبیب...... لیکن نمو نے شہبازوں سے لڑ گئے اور ایسی جان لڑا کے لڑے کہ مخالف ٹیم کے چاروں بین الاقوامی کھلاڑی ابتدائی پندرہ منٹ میں زخمی ہو کر تماشائیوں میں آ بیٹھے۔ ہم چار گولوں سے جیتے اور چاروں گول غلام حبیب نے کیے۔

''مونچھوں والے فل بیک جمعدار صاحب کا کیا نام تھا؟'' ہم نے اس میچ کی موٹی موٹی باتیں دہرانے کے لیے پوچھا' مگر توبہ کیجئے موٹی موٹی باتوں سے حبیب کی بھلا سیری ہوتی تھی۔ انہوں نے عصا ہاتھ میں پکڑ کر 1947ء میں کھیلا ہوا وہ میچ ہمارے صحن میں کھیلنا شروع کر دیا اور ایک ایک کر کے چاروں گول کر کے دکھائے کہ غنیم کیسا کیسا شدید محاصرہ کرتا رہا' مگر ہم (یعنی وہ) ہر مرتبہ گیند کو دشمن کے حصار سے اس طرح نکال لاتے جیسے مکھن سے بال نکالا جاتا ہے۔ چوتھا گول انہوں نے بیرونی پھاٹک سے نکلتے ہوئے کیا اور عصا ٹیکتے...... ہاتھ ہلاتے' ٹاٹا کرتے...... اپنے اوجری کیمپ کی طرف چلے گئے اور ہم آوازیں دیتے رہ گئے کہ غلام حبیب کہاں جا رہے ہو۔ ہائے! ہائے!

داغ فرقت دے گیا ہے کیسا کیسا آشنا!

اگلے روز صوبیدار عبدالخالق ملال صاحب تشریف لے آئے۔ ''ملال'' ان کے قبیلے کا نام ہے جو تحصیل مری کی پہاڑیوں میں آباد ہے۔

ورنہ ملال صاحب کے چہرے کو ہم نے گرد ملال سے کبھی آلودہ نہ دیکھا۔ وہ بارہ مہینے ساون کی طرح ہرے بھرے رہتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں باقی فوجی جب ملایا جا رہے تھے تو بے شک محاذ جنگ پر جا رہے تھے‘ مگر صوبیدار صاحب ’’فیملی ری یونین‘‘ (Faimily Re-Union) کے لیے جا رہے تھے کہ ان کے دو بھائی جناب بشیر ملال اور جناب نذیر ملال ایک طویل مدت سے وہاں مقیم تھے اور سنگاپور کے ممتاز شہریوں میں شمار ہوتے تھے۔ نذیر ملال جو چھوٹے تھے بیرسٹر تھے مگر قانون دانی کی دھوم تھی بشیر ملال کی جن کے پاس قانون کی کوئی باقاعدہ ڈگری نہ تھی۔ انہوں نے قانون کا مطالعہ اس انداز سے کیا تھا جیسے ساٹھ ستر برس پہلے ہمارے والد اور چچا جان گلستان سعدی سبقاً پڑھا کرتے تھے۔ نذیر ملال وکالت کرتے تھے۔ بشیر ملال نے قانون کا ’’ہیڈ ورکس‘‘ (Head Works) کھول رکھا تھا یعنی قانون کا رسالہ‘ کتابیں‘ شرحیں خلاصے اور تیر بہدف نسخے شائع کرتے تھے۔ بیرسٹری کا چغہ نذیر ملال کے پاس تھا‘ قانون دانی کا غلغلہ بشیر ملال کے آس پاس عدالت میں چھوٹے بھائی کا لفظ پتھر پر لکیر سمجھا جاتا‘ عدالت سے باہر بڑے بھائی کا فرمایا ہوا مستعد سنا ہے بعد میں سنگاپور یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے کر ان کی قانونی فضیلت کا اعتراف کیا۔ ملایا میں تحریک پاکستان کے ایک مرحلے میں وہ ’’تلائی مسلم لیگ‘‘ کے سیکرٹری جنرل بھی رہے۔ دونوں بھائی بے حد خلیق نرم گفتار اور متواضع ہاں طبیعتوں میں اتنا فرق ضرور تھا کہ اگر وطن میں رہتے تو کچھ عجیب نہیں کہ ایک ہائی کورٹ کے بنچ پر ہوتا اور دوسرا صوبائی یا مرکزی اسمبلی کے فرش پر۔ ایک لمبی مدت سے انگریزوں‘ چینیوں‘ ملائی لوگوں اور اس کے علاوہ ’’ملایا میں مستقل چلنے والی باد سحر گاہی کے غم میں رہتے رہتے ان کی گفتگو اور لہجے میں اب ایک برائے نام سی گنکری باقی رہ گئی تھی۔ جس سے وہ پکڑے جاتے کہ ہاں پوٹھوار کے رہنے والے تھے یا پھر ملاقاتیوں پے ’’جپھی‘‘ (معانقہ) ڈالنے میں گرم جوشی کی ادا‘ ورنہ باقی تمام ماحول میں پوٹھوار کے آثار دھندلا گئے تھے‘ چنانچہ صوبیدار عبدالخالق ملال صاحب جو تازہ تازہ پوٹھوار سے گئے تھے‘ اپنے بھائیوں سے زیادہ ہمارے بھائی معلوم ہوتے تھے بقول نذیر احمد شیخ ع

جو صید کی صورت وہی صیاد کی صورت!

آج کل ان کی کیا کیفیت ہے‘ لیکن ان دنوں صوبیدار صاحب نہایت بیدار سیاسی ذہن رکھتے تھے۔ شاید اسی لیے آرڈننس (Ordnance) کے شعبے سے وابستہ تھے کچھ عجیب بات ہے کہ ان دنوں برٹش انڈین یا ’’سپلائی‘‘ کے شعبوں میں نظر آتے۔ انفنٹری‘ رسالے یا توپ خانے میں اگر کوئی اکا دکا گریجویٹ نظر آیا‘ تو اسے دوعالم سے سرگراں پایا جیسے ’’مینک دلدل‘‘ میں ’’بوگ ڈاؤن‘‘ ہو گیا ہو۔

1947ء کی پہلی چھ ماہی میں‘ جب جنوب مشرقی ایشیا میں پھیلی ہوئی تمام برٹش انڈین آرمی سنگاپور کے جزیرے میں سمیٹ لائی گئی‘ تو مسلمان فوجیوں میں عقابی نگاہیں رکھنے والا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جو نہ انگریز کو گوشت کا راشن کم کرنے دیتا تھا اور نہ ہندوؤں کو مسلمانوں کو نظریاتی سرحدوں میں کوئی ’’ڈنٹ‘‘ (Dent) ڈالنے دیتا۔ صوبیدار عبدالخالق ملال اسی پرجوش گروہ کے سرگرم رکن تھے جنہوں نے کاغذ پر پاکستان کا نقشہ کھینچ کر ’’اس پروا ہگہ‘‘ حسینی والا چونڈہ کی چوکیاں بھی قائم کر لی تھیں۔ لوگ حیران تھے کہ صوبیدار صاحب کا ابھی تک ’’گراؤنڈ کورٹ مارشل‘‘ (Ground CourtMartial) کیوں نہیں ہوا تھا۔

آج جب صوبیدار صاحب تشریف لائے تو ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو ہم اپنے مضمون میں کوئی فاش غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ صوبیدار صاحب جو

دور بینی کا غیر معمولی جوہر رکھتے تھے۔ یقیناً مواخذہ کریں گے، مگر آپ نے ہمیں ''تھاپڑے'' (شاباش) سے نوازا کہ تم نے اس زمانے کے چھوٹے چھوٹے واقعات قلم بند کر کے مفید اقدام کیا۔ چلتے چلتے ایک واقعہ بھی سنا گئے۔ یہ واقعہ اگرچہ یوم آزادی کی تقریبات سے تو متعلق نہیں، مگر اسی فضا میں سانس لیتا ہے۔ (وہ اس واقعے کو مضمون کی صورت میں لکھ کر بھی ہمیں دے گئے تھے)

1947ء کے آخری دن جا رہے تھے۔ سنگاپور فوجیوں کا ایک وسیع مسافر خانہ تھا۔ سب سے بڑا کیمپ شہر سے باہر ایک پہاڑی کی طرف سے چڑھ کر دوسری طرف اُتر گیا تھا۔ آگے سمندر تھا، ورنہ کیمپ اس سے بھی آگے نکل جاتا۔ راس کماری سے لے کر درۂ خیبر تک رنگا رنگ فوجی اس کیمپ میں پڑے مراجعت وطن کی گھڑیاں گن رہے تھے۔ چند بحری جہاز بھارتی فوجیوں کو لے کر کلکتے، یعنی مدارس کی طرف جا چکے تھے۔ پاکستانیوں کے لیے کوئی جہاز دستیاب نہ تھا۔

کیمپوں کا ذکر چلا ہے تو تھوڑا سا ذکر ہم اپنی باشگاہ (Mess) کا بھی کر لیں جو انخلا کے اس مرحلے پر اپنی چادر سے باہر پاؤں نکال کر ایک چھوٹے سے غیر رسمی کیمپ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اوپر کے انتظامی ہیڈ کوارٹروں سے زبانی اور تحریری چیتاونیاں آتی رہتی تھیں کہ بارک قریبی گورا یونٹ کے سپرد کر دو، نیس کے دیگچے اور چمچے وغیرہ سی او ڈی میں جمع کراؤ اور تم لوگ تصاویر بتاں'' اور ''حسینوں کے خطوط'' لپیٹ کر کیمپ کلاس میں رپورٹ کرو۔ چھٹے ساتویں ''سب ایریا'' سے خونخوار شکل کا ایک انگریز میجر کچھ ایسے تیور بنائے پھوں پھوں کرتا، وارد ہوتا گویا اسی وقت ہمیں میس کے دیگچوں میں ڈال کر سی او ڈی میں جمع کر دے گا۔ مگر اس کے بیٹھتے ہی جب ٹونی ''خشک جن'' کی ایک سربند بوتل تازہ لیموں کی قطار کے ہمراہ ''برفاب مین لگی ہوئی کشتی میں سجا کر اس کے سامنے رکھ کر کہتا: ''اولڈ بوائے ذرا ایک چسکی ہو جائے'' تو یہ جن آن کی آن میں رام ہو جاتا، حتیٰ کہ تیسیر یا چوتھے جرعے پر وہ اپنے بریگیڈیئروں (پوپھم یا کوئی ایسا ہی نام تھا) جلی کٹی سنانے لگ جاتا کہ خواہ مخواہ آپ لوگوں کو پریشان کر رہا ہے۔ ناک چڑھا کر کہتا: ''جبھی تو بریگیڈیئر ہے۔ تمہارے نمبر 11 انڈین ڈویژن کا جنرل مورے اس کا بریگیڈ میجر رہ چکا ہے۔ ٹانکا سینگا میں اس نے مقامی لوگوں کی آزادی پر اس حماقت سے ہاتھ ڈالا تھا کہ خود برطانیہ کی آزادی کے لالے پڑ گئے تھے۔ احمق آدمی! دو ٹیمیں بھاگ چکی ہیں۔''

ادھر ٹونی نے اوپر تلے کے سب ہیڈ کوارٹروں کو بتا رکھا تھا کہ ہم فوجی اخبار ''جوان'' کا الوداعی نمبر چھاپ رہے ہیں اور مجبوری اس کی یہ آن پڑی ہے کہ آپ کے کمانڈر انچیف، ہمارے ایڈیٹر انچیف (سبط احمد) کے ساتھ ایک فوٹو کھنچوا چکے ہیں جو خاص نمبر ہی میں چھپ سکتی ہے، لہٰذا ہم فی الحال ''میس'' کا چوں سرو نہیں کر سکتے۔ ع

کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

''سب ایریا'' والے یا تو کمانڈر انچیف کے نام کے سامنے سرِ تسلیم کر دیتے یا حافظ قرآن سمجھ کر ہمیں بخش دیتے۔ انگریز ان دنوں یہ دونوں خصلتیں رکھتا تھا۔ ظرافت کی حس انگریز کی بڑی پیاری خوبی تھی۔

آخر کار جب جہاز ساحل ملایا سے لنگر اٹھانے لگا تو آخری شخص جو جہاز کی اٹھی ہوئی سیڑھی دوبارہ لگوا کر ہانپتا کانپتا جہاز میں پہنچا۔ وہ ٹونی تھا۔ کہتا تو یہی تھا کہ باشگاہ کا سب ''پھوہڑی تڑوا'' (ساز و سامان) ضابطے کے مطابق جمع کروا دیا ہے مگر ہمیں شبہ تھا کہ وہ جیسے اپنی بعض محبتیں اس

سرزمین میں کھلی چھوڑ آیا تھا' ویسے ہی باشگاہ کے دروازے بھی کالا خاں چوکیدار کی صوابدید پر کھلے چھوڑ آیا ہوگا۔

جو تیری رضا ہو تو کر

(کالا خاں چوکیدار ضلع ہزارہ میں پیدا ہوا تھا۔ مگر پیدا ہوتے ہی ملایا میں پہنچ گیا تھا۔ اس کا رنگ انگریزوں کی مانند سفید۔ آنکھیں چینیوں کی طرح باریک تھیں۔ پنجابی' انگریزوں کی طرح بولتا تھا اور ملائی زبان ملائیوں کی طرح)

تعطل کے زمانے میں تحرک کے اسباب پیدا ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ ہمارا میس میں سوچ بچار کا اڈہ تھا' مگر واقعات کا اصل سمندر تو کیمپ کلاں میں اٹل رہا تھا۔ پاکستان بن چکا تھا۔ سپاہیوں کے کندھوں پر گو ابھی تک پلٹنوں کے وہی نام...... بلوچ...... کماؤں...... پنجاب...... جاٹ...... گورکھا وغیرہ لکھے تھے مگر دلوں کی تختیوں کے نمبر تبدیل ہو چکے تھے۔

سینے میں وہ کچھ اور تھا' لفظوں میں ہے کچھ اور
غم کے کئی انداز بیاں میں نہیں ملتے

کیمپ میں طرح طرح کی افواہیں یا صوبیدار ملال صاحب کے الفاظ میں ''چہ میگوئیاں'' گشت کرتی رہتی تھیں۔ ایک ''چہ میگوئی'' جس نے مسلمان فوجیوں کا خون کھولا رکھا تھا' یہ تھی کہ ہندوستان سے جب مسلمان فوجیوں کو (خواہ پوری پلٹن ہو) پاکستان بھیجا جاتا ہے تو ان سے ہتھیار رکھوا لیے جاتے ہیں اور ان سے غیر شریفانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ اس پر مسلمانوں کے نمائندوں نے کیمپ کمانڈنٹ کو اپنی بے چینی سے اور اس مؤقف سے آگاہ کیا کہ ہم ہندوستان میں سے گزر کر پاکستان جانے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اگر بھیجا ہی جائے تو ہتھیار ہمارے ساتھ رہیں۔ ہمارا مطالبہ تھا کہ ہمیں سیدھا کراچی بھیجا جائے' مگر کیمپ کمانڈنٹ صرف لالٹین یا پینے کی دال ہی تقسیم کر سکتا تھا۔ کسی ایسے جہاز کا بندوبست کرنا جو وہاں سے چلے اور تیرتا ہوا کراچی جا ٹھہرے' اس کے بس سے باہر تھا۔ ہاں' اسنے جب بے چینی بڑھتے دیکھی تو اوپر والوں کو سگنل پر سگنل دینے شروع کر دیے کہ

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر بپا!

اور اس کے جواب میں مقامی گیریژن کے کماندار اعلیٰ جنرل کوکس دوڑے دوڑے کیمپ میں پہنچے۔ جنرل کوکس کو ہم نے جب بھی دیکھا غروب آفتاب کے بعد دیکھا اور یہی دیکھا کہ موصوف جب پیتے تھے تو بس پیتے ہی تھے۔ ہر جرعے کے ساتھ سناٹے کے سمندر میں آگے ہی آگے گہرے پانیوں میں اترتے ہی چلے جاتے۔ ایسا لگتا تھا اس کیفیت میں اگر ان کا ''بریگیڈیئر جنرل سٹاف'' بھی کوئی مسئلہ لے کر آ جاتا' تو آپ بمشکل ایک نگاہ نیم باز سے اس کی طرف دیکھ کر کہتے ایڑیوں پر گھوم جاؤ جیک! اباؤٹ ٹرن! اور کان کھول کر سن لو۔

غم دوراں سے کہہ دو ہم ابھی تشریف رکھتے ہیں
حضور بے خودی جام و سبو کی بارگاہوں میں

مگر یہ کیفیت رات کی تھی۔ صبح کے وقت جنرل کوکس قطعاً مختلف کوکس ہوتا۔ صوبیدار ملال صاحب کے بقول وہ فوجی قابلیت کے علاوہ مدبر بھی تھا اور اردو بول لیتا تھا۔ بہرکیف جنرل صاحب نے کیمپ میں پہنچ کر پہلے اکابرین کو انگریزی میں سمجھانے بجھانے کی کوشش کی مگر اکابرین

نے پہلے سے یہ برجستہ جواب ازبر کر رکھا تھا کہ ”جناب! جوان نہیں مانتے۔“

اب جنرل صاحب نے اپنی اردو یا رومن اردو آزمانی چاہی اور یہی ان کی ”واٹرلو“ بن گئی۔ آپ نے پاکستان کے سب فوجیوں کو جمع کیا اور اردو میں خطاب فرمایا جس میں یہ بھی کہہ گئے۔

”تم ہندوستانیوں کے ڈر سے جانا نہیں چاہتے...... تم لوگوں نے ہندوستان پر سینکڑوں برس حکومت کی ہے‘ لیکن اب تم ہندوؤں کے ڈر سے وہاں سے گزرنا نہیں چاہتے۔“

یہ سنتے ہی ہجوم میں سے ایک سپاہی جس نے چرمی جنگل گرین وردی پہن رکھی تھی‘ جست کر کے اٹھا اور گرجدار آواز میں بولا: ”جناب جنرل صاحب بہادر! انگریز قوم کو غرض ہو‘ تو گدھے کو بھی باپ بنا لیتی ہے۔ میں اے۔ ٹی کمپنی کا سپاہی ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ خچریں ہوائی جہازوں میں لائی گئی ہے‘ مگر انگریز اب ہمیں اپنے ملک تک نہیں پہنچا سکتا۔

اور جناب جنرل صاحب بہادر! ہم اب پاکستان کے مجاہد ہیں۔ اب ہماری جانیں ہماری نہیں ہیں۔ یہ قائداعظم کی امانت ہیں۔ ہم حرام موت نہیں مرنا چاہتے...... اور پاکستان زندہ باد!“

ایک پاکستانی سپاہی کا یہ جواب سن کر جنرل کوس کے چہرے پر جو رنگ آیا‘ تو اس کی کیفیت صوبیدار صاحب نے بیان نہیں کی‘ مگر اس واقعے کے تھوڑے دن بعد جب ایک گرانڈیل لشکر بردار جہاز سنگاپور سے روانہ ہوا تو اس میں پاکستانیوں کی تعداد غالب تھی جس کے سربراہ ایک میجر صاحب تھے۔

جہاز اگرچہ راستے میں بمبئی میں بھی رُکا‘ مگر پاکستانی فوجیوں کو اس نے کراچی میں لا کر اتارا جہاں مقامی لوگوں کا ایک جم غفیر نعرہ زناں‘ پھولوں کے ہار لیے ہمارے استقبال کو موجود تھے۔ وہ چرمی وردی والا سپاہی بھی شاید اسی جہاز سے اترا ہو‘ مگر وہ کون تھا؟ اس کا نام کیا تھا؟ وہ کہاں ہے؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔

(سید ضمیر جعفری۔ اردو ڈائجسٹ)

انکا

انکا...... چھ انچ کی گڑیا، ایک قتالہ عالم، آفت کی پڑیا۔ پراسرار قوتوں کی مالک، خوش قسمتی کی دیوی، جس کے حصول کے لیے بڑے بڑے پجاری اور عالم سر توڑ کوششیں کرتے تھے۔ ایک ایسی داستان جس نے سالوں تک پراسرار کہانیوں کے شائقین کو اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ **انکا**...... اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ بہت جلد **کتاب گھر پر جلوہ افروز ہو رہی ھے۔**

جب میں نے ہجرت کی!

چھوٹے علی گڑھ کی تباہی کی داستان جناب احمد الدین مارہروی کے قلم سے۔

درخت کے پتوں میں ہلکی سی سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے‘ تو ایک مبصر دور سے آنے والے طوفان کی پیش گوئی کر دیتا ہے۔ اسی طرح سرسید نے آج سے سو برس پہلے بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر سے ہندو مسلم واقعات پر جو گفتگو کی تھی‘ اس میں ان واقعات کی صاف اور صریحی جھلک تواقع ہے جو ان دونوں قوموں کے مابین تنازعات اور بعد ازاں پاکستان کی شکل پر منتج ہوئے۔

اس مرد حق آگاہ کی نگاہ دور بین نے ہندو قوم کی دلی کدورت کا عملی طور پر تجزیہ کر کے کہہ دیا تھا: ”مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کا مل کر ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ہو گا‘ ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں..... مجھے اپنی اس پیشین گوئی پر پورا یقین ہے جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔“

اور بدقسمتی سے اس زمانے میں ہم زندہ تھے اور ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھا جو سرسید کی چشم دور بین نے 1867 میں دیکھ لیا تھا۔

سرسید کے زمانہ سے علی گڑھ کو مسلمانان ہند کا ذہنی اور تعلیمی مرکز سمجھا جاتا تھا۔ نواب وقار الملک کی کوششوں سے مسلم لیگ معرض وجود میں آئی تو سیاسی قوت بھی اس طرف منتقل ہو گئی۔ سرسید کے ساتھیوں میں مولوی بشیر الدین صاحب بھی تھے جو شروع شروع میں نجم الاخبار میں نہایت سرگرمی سے ان کے خلاف مضامین لکھا کرتے تھے‘ لیکن پہلی ہی ملاقات میں ایسے گرویدہ ہوئے کہ خود اپنا اخبار البشیر جاری کر کے ان کی مدح سرائی شروع کر دی۔ اور یہی نہیں ان کی طے کردہ اس پالیسی پر کہ علی گڑھ شجر علم کی جڑ ہو اور اس کی شاخیں ہندوستان کے تمام شہروں میں پھیلی ہوں۔“ انہوں نے اٹاوہ میں علی گڑھ کی طرح کا ایک اقامتی اسکول قائم کر دیا جو آگے چل کر کالج بن گیا۔ اس ادارے کی دو بڑی نمایاں خصوصیات تھیں۔ ایک تو یہ کر اس میں اخراجات اتنے کم تھے کہ نادار ترین شخص بھی صرف پانچ روپیہ ماہوار دے کر بچے کی تعلیم‘ رہائش خوراک کپڑے بچھونے‘ کتابیں میں غرضیکہ ہر طرف سے مطمئن ہو جاتا تھا۔ دوسرے تعلیم اور تربیت کے لحاظ سے یہ علی گڑھ کا مکمل نمونہ پیش کرتا تھا۔ مولوی بشیر الدین ”چھوٹے سرسید“ کے لقب سے موسوم تھے۔ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی تھے۔ علی گڑھ سے جو نئی اسکیم شروع ہوئی اس کی ابتدا اٹاوہ ہی سے ہوا کرتی۔ یہیں طالب علم ابتدائی تعلیم حاصل کرتے اور پھر اعلیٰ مدراج طے کرنے کے لیے مادر علمی کا رخ کرتے‘ چنانچہ جب مسلمانوں کو فنی تعلیم دینے اور کامرس اور زراعت کے شعبے قائم کرنے کا فیصلہ ہوا تو ان کی ابتدائی کلاسیں اٹاوہ اسکول اور کالج ہی میں شروع کی گئیں اور یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ نے علی گڑھ پہنچ کر ان فنون میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔

یہ بھی اتفاق ہے کہ ایک ہی وقت میں میرے چچا ڈاکٹر سر ضیا الدین احمد علی گڑھ ''یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور میں اٹاوہ کالج کا سربراہ تھا۔ ہم دونوں بالطبع اور اصولی طور پر بھی درسگاہوں کو عملی سیاست سے علیحدہ رکھنے کے مؤید بھی تھے اور اس پر کاربند بھی۔ اٹاوہ ایک چھوٹا سا ضلع تھا جس کی آبادی میں ہندوؤں کا تناسب نوے فیصد تھا۔ مسلمان بالعموم مفلوک الحال اور غیر تعلیم یافتہ تھے جن کا کوئی اثر تھا نہ رسوخ۔ ہندو وا قتصادیات‘ تجارت‘ بلدیہ نظم و نسق اور تعلیم پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے‘ ان کا ایک اپنا ہائی اسکول تھا اور گورنمنٹ کالج پر بھی انہی کی اجارہ داری تھی۔ مسلمانوں میں لے دے کر ایک نواب محسن الملک کی ذات تھی جو علی گڑھ سے وابستہ ہونے کے بعد مولوی بشیر الدین صاحب کی پشت پناہی کیا کرتی۔

ان بتیس دانتوں میں اسلامیہ کالج کی مثال اس زبان کی سی تھی جو دل اور دماغ کی ترجمانی کرتی‘ آگے کا راستہ بتاتی اور راہ کے خطرات سے آگاہ کرتی رہتی ہے۔ صرف ہندوستان کے گوشے گوشے ہی سے نہیں لنکا‘ برما‘ ملایا سے بھی مسلمان طلبہ تعلیم و تربیت کے لیے یہاں آتے پھر علی گڑھ پہنچ کر ان کا ذہن و کردار صیقل ہو جاتا۔

کالج کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے عمائدین کو دعوت دی جاتی کہ وہ یہاں آ کر نہ صرف لیکچروں بلکہ طلبہ کے درمیان اقامت گاہوں میں قیام کر کے ان سے تبادلہ خیالات بھی کریں۔ کالج میں طلبہ کی ایک پارلیمنٹ بھی تھی جس میں سیاسی امور پر بحث ہوا کرتی۔ اس طرح ہمارے طلبہ ذہنی اعتبار سے پختہ ہو جاتے۔ اس کا یہ نتیجہ تھا کہ جب قائداعظمؒ کی قیادت میں تحریک پاکستان شروع ہوئی تو علی گڑھ اور اٹاوہ دونوں نے چولا بدلا۔ عملی سیاسیات سے کنارہ کشی اور دامن بچانے کی دیرینہ پالیسی ترک کر دی اور میدان میں نکل آئے۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اگر علی گڑھ کے طلبہ بھرپور جدوجہد نہ کرتے‘ تو لیاقت علی خاں کو اپنے حریف محمد احمد کاظمی کے مقابلے میں کبھی کامیابی نہ ہوتی جن کی پشت پر کانگریس کی تمام قوت تھی۔ اسی طرح اٹاوہ سے مسلم لیگ کے ایک ایسے امیدوار کا کامیاب ہونا ممکن نہ تھا جسے قائداعظمؒ کی زبان میں ''لیمپ پوسٹ'' ہی کہنا چاہیے۔ جس کا کسی نے کبھی نام سنا تھا نہ صورت دیکھی تھی۔ اس وقت کا ہر ہندو کانگریسی نہیں بلکہ مہا سبھائی ذہنیت کا بھی پرستار تھا۔ مقامی مسلمان اقتصادی اور سیاسی طور پر ہندوؤں کے دست نگر اور زیر اثر تھے‘ لیکن ہمارے طلبہ اپنے اوپر خواب و خوار حرام کر کے ایسی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ ایک ووٹ بھی کانگریسی امیدوار کے حق میں نہ پڑ سکا۔

مسلمان ابتدا ہی سے بڑا وسیع القلب‘ روادار اور صلح جو رہا ہے۔ ہندو یونیورسٹی کے برخلاف جہاں مسلمانوں کا داخلہ ممنوع تھا‘ علی گڑھ میں نہ صرف طلبہ بلکہ کئی اساتذہ بھی ہندو تھے یہی حال اٹاوہ کالج کا تھا۔ پہلے وہاں اعلیٰ تعلیم و تربیت کے پیش نظر بعض خاندان اپنے بچوں کو بجائے سناتن دھرم کے اسلامیہ کالج میں داخل کراتے تھے۔ لیکن جب سے ہمارے ہاں تجارت اور زراعت کے شعبے قائم ہوئے‘ ہندوؤں نے ان میں بڑھ چڑھ کر داخلہ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کی ایک اچھی خاصی تعداد ہو گئی تو انہوں نے پہلے ہندی تعلیم کا مطالبہ کیا اور پھر ہندی ادب کی آڑ لے کر اپنی ایک جداگانہ تنظیم قائم کر لی۔ سیاسی کش مکش شروع ہونے کے بعد طلبہ کی ان جماعتوں میں بھی اس طرح تفریق ہو گئی کہ مسلمان طلبہ دل سے مسلم لیگ کے شیدا تھے اور ہندو کانگریسی کیمپ سے وابستہ۔ یہ لوگ جھگڑے فساد کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر لیتے تھے جس کا مناسب حل تلاش کرنے میں بعض اوقات رات رات بھر جاگنا اور دماغ سوزی کرنا پڑتی۔ کوشش یہی رہتی کہ ہر طوفان سر کے اوپر سے گزر جائے۔ اس سلسلے میں ایک طرف سرکاری

افسروں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے جاتے اور دوسری طرف ہندو طلبہ سے غیر معمولی رواداری برتی جاتی جس کو مسلمان طلبہ بالعموم ناپسند کرتے‘ لیکن نشیب و فراز سمجھانے پر خاموش ہو جاتے۔

آج پاکستان کی آزاد فضا میں سانس لینے والے اندازہ نہیں کر سکتے کہ اہل علی گڑھ اور اٹاوہ کے دلوں پر جو آزادی کی جدوجہد میں سب سے آگے تھے لیکن پاکستان بنتے ہی قافلہ سے جدا ہو کر بے دست و پا اور بے یار و مددگار بن گئے‘ کیا گزری ہو گی دونوں مرکزوں کی مثال ان جہازوں کی سی تھی جن کے لنگر شکستہ ہو چکے ہوں اور اب وہ طوفان خیز موجوں کے رحم و کرم پر تھے کہ ان کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں۔ پہلی بات تو یہ ہوئی کہ شہر میں سب سے بلند اور وسیع عمارت ہونے کے باعث حکومت نے طے کیا کہ 15 اگست کو کانگریس کا جھنڈا سب سے پہلے اس عمارت پر نصب کیا جائے گا جس پر کل تک مسلم لیگ کا پرچم لہرایا کرتا تھا۔ پھر پہلے یوم آزادی کا جلسہ بھی اس کے وسیع اور مرصع ہال میں منعقد ہو گا۔ اس روز کے پروگرام میں پرنسپل کی اس تقریر کو خاص اہمیت دی گئی جس کا مقصد اس سے علانیہ حلف وفاداری لینا تھا۔ کالج پارلیمنٹ کے صدر کی وساطت سے انہوں نے طلبہ کو بھی اسی قسم کی پابندیوں میں جکڑ ڈالا۔ حکم ہوا کہ تقریروں کے متن پیش از وقت منظور کروا لیے جائیں۔ میں نے بڑی احتیاط سے مسودہ تیار کیا‘ لیکن اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا کہ اس میں نئی حکومت سے وفاداری کے الفاظ بہت کم ہیں اور ’’دلی رکارٹ‘‘ کا عنصر غالب ہے۔ حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ مجبوراً یہ کرنا پڑا۔

کانگریسی حکومت کے ابتدائی دور میں جواہر لال نہرو یا گاندھی نہیں وزیر داخلہ اور بھائی پٹیل سیاہ و سفید کا مالک تھا اور کانگریس کا مرد آہنی کہلاتا تھا۔ اس کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کی رہی سہی قوت کو بھی توڑ لیا جائے چنانچہ انہیں پشت ہمت کرنے کی ہر طرح کوشش کی گئی۔

کانگریسی حکومت قائم ہوئے ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ ایک روز علی الصباح جو دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ مسلح پولیس نے مکان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ دریافت کرنے پر سٹی مجسٹریٹ صاحب آگے بڑھے۔ ایک سرکاری پروانہ دکھا کر کہنے لگے۔ حکومت کو باوثوق ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ تمہارے ہاں ہتھیاروں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ مکان کی تلاشی لینے آئے ہیں۔ اب تم گھر کے اندر نہیں جا سکتے۔ یہیں سے پکار کر مستورات کو کہہ دو کہ وہ پردے میں ہو جائیں۔ لطف یہ کہ مجسٹریٹ صاحب ہمارے ہم پیالہ اور ہم نوالہ چلے آتے تھے۔ میرے ہاں اکثر آ کر گھنٹوں بیٹھتے ناشتہ ساتھ کرتے‘ ریڈیو سنتے‘ خبروں پر تبادلہ خیال کرتے بلکہ میری سفارش پر مجرموں تک کو رہا کر دیتے۔ ان سے ایسی طوطا چشمی کی توقع تک نہ ہو سکتی تھی لیکن اس وقت تو ان کی نظریں پھری ہوئی اور لہجہ انتہائی تحکمانہ تھا۔ تلاشی کی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ گھر کی ایک ایک سوئی دیکھی پرکھی گئی کہ اس میں کوئی بم تو پوشیدہ نہیں۔ باغیچے کی تمام زمین کھود ڈالی کہ میرے پالتو سانپوں کو سر چھپانے تک کی جگہ باقی نہ رہی‘ اور نابدان کو دوربینوں کی مدد سے جانچا گیا کہ ان میں کوئی توپ تو نہیں چھپی ہوئی۔

بدقسمتی سے صحن میں ایک کنواں تھا۔ پولیس افسروں کو یقین ہو گیا کہ گولیوں کا ذخیرہ یہیں پوشیدہ ہے۔ ہندو غوطہ خوروں کی ایک جماعت پانی کے اندر اتر گئی مگر ہتھیاروں کا کوئی سراغ ہاتھ نہ آیا۔ کنوئیں کی دیواریں آتشی کی مدد سے پرکھی گئیں‘ لیکن وہاں بھی کوئی نشان نہ ملا۔ ادھر زنانہ پولیس اس نے خواتین کا اپنی اصطلاح میں ’’ننگا جھاڑا‘‘ مگر ایک کیل کو برآمد نہ کر سکی۔ سہ پہر کے تین بج گئے تھے اور کسی کے منہ میں ایک کھیل ہو گئی

تھی۔ آخر جھک مار کر بیٹھ گئے۔ اچانک ایک سکھ جمعدار دو کارتوس ہاتھ میں لیے خوشی خوشی دوڑتا ہوا آیا اور دانت نکال کر اپنے افسر سے کہنے لگا۔ دیکھیے یہ زندہ کارتوس موری میں پڑے پائے گئے ہیں۔ میرے قلب پر اس سے دھکا سا لگا لیکن نظر اٹھا کر جو دیکھا تو ان حضرت کی اپنی پیٹی سے اوپر کے دو کارتوس غائب تھے جن کا رنگ‘ ساخت اور نشان ان ہی جیسا تھا۔ منہ سے بے ساختہ نکل گیا‘ سکھ پھر سکھ ہے“

مجسٹریٹ کے کان کھڑے ہوئے کہنے لگا: ”کیا معاملہ ہے؟“ میں نے کہا ”وہ جو کہتے ہیں کہ عیب کے کرنے کو ہنر چاہتے تو اس بے چارے سکھ کو وہ ہنر کہاں سے حاصل ہو سکے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے اچانک تلاشی لے کر بخوبی تحقیق کر لی کہ مکان کے اندر کسی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں۔ اگر بفرض محال یہ دو کارتوس ملے بھی تو بلا بندوق کے ان کا کیا مصرف ہو سکتا ہے؟ دوسری بات یہ کہ آپ نے تمام موریاں دوربینوں سے دیکھ لیں۔ ان میں آپ کو کوئی مشتبہ چیز نظر نہیں آئی۔ اب یہ حضرت کارتوس کہیں باہر سے لے کر آئے ہیں اور ذمے داری مجھ پر ڈال رہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر قابل غور بات یہ ہے کہ ان کی کارتوسی پیٹی کے دو خانے کیوں خالی ہیں؟ سپاہی جب ڈیوٹی پر روانہ ہوتا تو پوری طرح لیس ہو کر نکلتا ہے۔ صبح سے اس وقت تک کوئی فائر نہیں ہوا‘ پھر یہ دو کارتوس کہاں گئے؟ اس سے بھی قطع نظر ان کارتوں اور پیٹی کے کارتوسوں میں ذرا بھی فرق نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دلائل کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا اور سردار جی کو منہ کی کھانی پڑی۔

اس جھونجل میں ایک لطیفہ بھی ہو گیا۔ میں نے پولیس کے گرگوں سے کہہ کہ آپ نے تو خوب چھان پھٹک کر لی اور کوئی ہتھیار ہاتھ نہ لگا۔ اب میں خود اپنا اسلحہ آپ کو دکھاتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ڈی ایس پی صاحب کے چہرے پر ایک مردنی چھا گئی۔ آنکھیں باہر نکل آئیں اور ہکا بکا ہو کر پوچھنے لگا: تو واقعی آپ نے ہتھیار چھپا رکھے ہیں؟ میں نے کہا میرے پاس دو ہتھیار ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ کسی وقت بھی مہلک ثابت ہو سکتے ہیں‘ ایک تو میرا یہ قلم ہے اور دوسری زبان۔ ان دونوں کی معمولی سی جنبش ان جری طالب علموں سے سب کچھ کرا سکتی ہے‘ لیکن آپ پوری طرح مطمئن رہیں کہ یہ دونوں حربے آپ یا آپ کی حکومت کے خلاف کبھی استعمال نہ ہوں گے۔ بیچارہ کپتان اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور مجسٹریٹ صاحب نے اس پر ایک واشگاف قہقہہ لگا کر اسے اور بھی شرمندہ کر دیا۔

پولیس تو اپنا کام کر کے رخصت ہوئی لیکن مجسٹریٹ صاحب رُک گئے۔ بازار سے کچھ مٹھائی پوری منگائی اور ناشتہ کرنے کے ساتھ ساتھ معذرت کرتے گئے کہ کیا کیا جائے‘ ملازمت کا معاملہ ہے‘ حکومت کی طرف سے سخت احکام آئے ہیں کہ شہر کے تمام سربرآوردہ اشخاص کو بدنام کیا جائے اور اس میں بحیثیت پرنسپل اسلامیہ کالج کے آپ کا نام سرفہرست ہے آپ کو بے انتہا زحمت ہوئی‘ اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں لیکن میری مجبوری کو بھی مدنظر رکھیے۔

معافی تو خیر ان کو دینی ہی تھی لیکن اس سب کا نتیجہ کیا نکلا پہلا احساس تو یہ ہوا کہ شہر میں ہوا خیزی ہو گئی۔ معلوم نہیں کس نے کیا سمجھا۔ پولیس نے بہر حال یہ تو سب کو بتا دیا کہ پرنسپل صاحب کے ہاں ناجائز ہتھیاروں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اب جتنے منہ اتنی باتیں کوئی پولیس کو گالیاں دیتا تھا‘ کوئی مجسٹریٹ کو۔ کوئی میری موافقت میں بولتا تو دوسری طرف تردید کرنے والے اکٹھے ہو جاتے۔ ہندوؤں میں میرے خلاف بدظنی اور مخاصمت کے جذبات بھڑک اٹھے پرانی دوستیاں سب القط ہوئیں اور مخالفت جنم لینے لگی۔ شام ہوئی تو دریافت حال کرنے والوں کا تانتا لگ گیا۔

ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ اظہار ہمدردی دونوں طرف سے ہی تھا لیکن لہجے متضاد تھے۔ مسلمان خائف تھے اور برادران وطن تمسخرانداز میں اشک شوئی کر رہے تھے۔ ایک مہاتا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میاں اگر بھارت میں رہنا ہے تو یہ لباس تبدیل کرو‘ زبان بدلو اور کالج کے نام سے اسلامیہ کا لفظ اڑادو تب معلوم ہوگا کہ ہم بھائی بھائی ہیں۔

ادھر پبلک کا یہ عالم تھا ادھر کانگریسی حکومت کالج کو مسلمانوں کا ایک مضبوط قلعہ سمجھ کر اس کی شکست و ریخت کے درپے تھی۔ گاہے گاہے ایسے احکامات صادر ہوتے رہتے جس سے اس کی بنیادوں پر کاری ضربیں پڑتیں۔ مثلاً پہلے اس کی مرکزی حیثیت کو ختم کرنے کے لیے دوسرے صوبوں کے طلبہ کا داخلہ یہ کہہ کر بند کر دیا گیا کہ تعلیم صوبائی محکمہ ہے اور حکومت اس کو پسند نہیں کرتی کہ اس کا روپیہ غیروں پر خرچ ہو۔ اس لیے آئندہ صرف وہی طلبہ داخل کیے جائیں جو اس صوبہ کے حقیقی باشندے ہوں نتیجہ یہ کہ کالج میں طلباء کی تعداد ایک تہائی رہ گئی اور دو بورڈنگ ہاؤس بالکل خالی ہو گئے۔ ان میں سے ایک ہندو اسکول کے نام منتقل کر دیا گیا۔ دوسرا حکم یہ نافذ ہوا کہ داخلے کے فن مقامی طالب علموں کو باہر سے آنے والوں پر ترجیح دی جائے اور ظاہر ہے کہ مقامی طالب علم ہندو تھے جو کامرس اور زراعت کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس آنا چاہتے تھے۔ آخر اسلامیہ کالج میں دو تہائی ہندو گھس آئے اور مسلمان طلبہ نہ صرف اقلیت میں رہ گئے بلکہ کالج پارلیمنٹ میں انکی آواز بھی دب گئی۔ روزانہ کے جھگڑوں اور تصادم نے تعلیم کا معیار پست کر دیا اور نظم و نسق بھی پامال ہو کر رہ گیا۔ وہ تمام خصوصیات جن سے کالج ہمیشہ متصف رہا تھا‘ معدوم ہونی شروع ہو گئیں۔ اساتذہ سربہ گریباں تھے کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ یکایک ایک ایسا پروانہ صادر ہوا جس نے رہی سہی تنظیم بھی خاک میں ملا دی۔ اس میں پہلے تو ان نام نہاد مظالم کی خونچکاں داستان بیان کی گئی تھی جو پاکستانی مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر ڈھائے تھے‘ پھر ان شرنارتھیوں کی زبوں حالی کا رونا رویا گیا تھا اور تان اس پر ٹوٹی تھی کہ ان غریب اور مظلوموں کی ہر قسم کی امداد دینا ہمارا قومی اور اخلاقی فرض ہے‘ اس لیے تمام تعلیمی اداروں میں خواہ وہ سرکاری ہوں یا نجی ہر خالی اسامی پر سب سے پہلے ان کا تقرر لازمی ہوگا۔

اس کے متعلق حکومت سے بڑی طول طویل خط کتابت ہوئی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا‘ بلکہ آخری خط میں تو میرے متعلق یہاں تک کہہ دیا گیا: ”آپ کی تحریروں سے مخاصمت اور مخالفت کی بو پھوٹ رہی ہے اور آئندہ آپ کو نہ صرف محتاط بلکہ گورنمنٹ کا وفادار بن کر رہنا پڑے گا معاملہ یہیں تک رہتا تو غنیمت تھا غضب یہ ہوا کہ اس مراسلے کی ایک کاپی نقل ان آخری الفاظ پر سرخ پنسل کا نشان کر کے ضلعی حکام کو بھیج دی گئی نیچے نوٹ دے دیا گیا کہ یہ شخص بہت سرکش اور متمرد نظر آتا ہے اس کی سخت نگرانی کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ میری سرکاری اور نجی ڈاک پر سنسر عائد کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو‘ مسلمانوں کے لہو سے ہولی کھیل رہے تھے۔ کوئی جگہ محفوظ نہ تھی اور لوگ خائف ہو ہو کر پاکستان کو ہجرت کر رہے تھے۔ سرکاری ملازمین پہلے ہی کراچی یا لاہور پہنچ چکے تھے۔ اکثر طلباء ان کے والدین بھی ترک وطن کر رہے تھے اور چونکہ ان سب سے دیرینہ تعلقات تھے اس لیے وہ برابر خطوط لکھتے رہتے تھے۔ مجھے سنسر کی پابندیوں کی کچھ خبر نہ تھی۔ انہیں خطوط کا جواب دیتا رہا اور اس طرح حکومت کے ہاتھ میں میرے خلاف عدالتی چارہ جوئی کا بہانہ آ گیا‘ تاہم شہر میں میری کچھ بچی کھچی عزت یا مسلمانوں میں اثر و رسوخ باقی تھا اس لیے پہلے ایسی تدابیر اختیار کی گئیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

یوپی کے باون ضلعے تھے اور ہر ضلع میں ایک انسپکٹر تعینات تھا۔ حکومت نے چار مسلمان نائبوں کو ترقی دے کر عارضی انسپکٹر بنایا اور انہیں ان اضلاع میں متعین کیا، جہاں وہ اسلام کا لیبل لگا کر مسلمانوں کی بیخ کنی کر سکیں۔ انہیں میں سے ایک صاحب اٹاوہ میں بھی تعینات ہوئے۔ انہیں میری کڑی نگرانی کرنے اور میرے خلاف رپورٹیں بھیجنے کا حکم ہوا۔ بیچارہ ایک شریف انسان تھا، لیکن انتہائی بزدل اور حکومت کی گرفت سے سخت خائف۔ چھپ کر مجھ سے ملتا۔ سرکار کے خفیہ مراسلے جو میرے متعلق ہوتے دکھا دیتا اور یہ بھی بتا دیتا کہ وہ ان کا کیا جواب دے رہا ہے۔ انہیں میں وہ چھٹی بھی تھی جس میں مجھ پر باغیانہ خیالات پھیلانے کے الزام میں مقدمہ چلانے کی تجویز تھی۔ ساتھ ہی ڈائرکٹر صاحب کے نام ایک نیم سرکاری خط بھی منسلک تھا جس میں انہیں مشورہ دیا گیا تھا کہ مجھ سے دوستانہ طریق پر ملیں اور بتائیں کہ ایک ماہ کے اندر اندر ہجرت کر کے پاکستان چلے جایئے ورنہ مقدمے کی کارروائی شروع ہو جائے گی۔ آپ نے پاکستانی مہاجروں کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں ایسا مواد موجود ہے جس کی بنا پر کوئی عدالت بھی آپ کو وطن دشمنی کا مجرم قرار دے کر چودہ سال تک کی سزا دے سکتی ہے۔

میرے لیے یہ بڑا سخت لمحہ فکر تھا۔ میرے چچا ڈاکٹر ضیاء الدین ہی صحیح مشورہ دے سکتے تھے لیکن بد قسمتی سے ان کا انہی دنوں انتقال ہو گیا تھا۔ ایک بات البتہ واضح تھی۔ اگر کالج اپنی اصل حالت میں قائم رہتا، مسلمان کو اپنے کلچر کی آزادی حاصل ہوتی اور گورنمنٹ اس کی بیخ کنی کے در پے نہ ہوتی تو مجھ پر چاہے کچھ بھی بیتی میں سب خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا، لیکن اب کہ آں قدح بکشست وآں ساقی نماند...... اس کی روح نکل چکی تھی۔ صرف جسم باقی رہ گیا تھا وہ بھی مجروح و مفلوج میرے لیے بجز اس کے کوئی چارہ باقی نہ تھا کہ گرمیوں کی تعطیل تک انتظار کروں تا کہ جن لڑکوں کے والدین پاکستان جا چکے تھے اور وہ صرف سالانہ امتحانات کی وجہ سے رُکے ہوئے تھے چلے جائیں پھر میں بھی با چشم گریاں و سینہ بریاں اس اُجڑے ہوئے گلشن کو جس کی آبیاری سالہا سال سے کر رہا تھا ہمیشہ کے واسطے خیر باد کہہ دوں گا۔

ڈائریکٹر صاحب تعلیمات سے پرانی ملاقات تھی۔ ان سے اس سلسلے میں جا کر ملا لیکن یہ وہ والے افسر نہ تھے۔ اب ان کے ہاتھ میں سنہری زنجیریں اور دماغ پر کابوس سوار تھا۔ بڑی ہمدردی سے پیش آئے، تمام معروضات کو بڑی توجہ اور انہماک سے سنتے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی بے بسی اور بے چارگی کا اظہار فرماتے رہے۔ آخر میں بہ حیثیت ایک مخلص دوست کے یہی مشورہ دیا کہ کالج تو آپ کا آپ کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ گورنمنٹ کی پالیسی کے تحت چلے گا۔ آپ اگر اپنے طور طریق بدل سکتے ہوں تو...... ما بخیر و شما بسلامت، لیکن اگر یہ ممکن نہیں تو خواہ مخواہ 'آ بیل مجھے مار'' کے مصدیق مصیبت مول لینے اور جیل میں سڑنے سے لاکھ درجہ بہتر ہو گا کہ آپ پاکستان چلے جائیں اور وہاں پہنچ کر اسی قسم کا کوئی ادارہ قائم کر لیں۔

مشورہ بظاہر بہت عمدہ اور پر خلوص تھا، لیکن میں نے ایک آخری قدم اور ٹھانے کا فیصلہ کیا اور وہ تھا مولانا ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو وزیر اعظم سے ملاقات کر کے مسلمانوں کی عام تعلیم اور اسلامیہ کالج کی آئندہ روش کے متعلق گفتگو کرنے کا عزم۔ اس سلسلے میں جو پاپڑ مجھے بیلنے پڑے انہیں میرا ہی دل جانتا ہے، لیکن جو نتیجہ نکلا وہ بھی سن لیجئے۔ دونوں نے ایک ہی بات کہی کہ سردار پٹیل وزیر داخلہ ہیں اور ملک کے اندرونی معاملات میں ان کو کلی اختیار حاصل ہے اس معاملے میں ہم بالکل بے دست و پا ہیں، اس لیے آپ ان سے ملیے۔ اور ان سے ملنے کا نتیجہ پہلے ہی معلوم تھا۔

اس طرح بھارتی حکومت نے میرے اوپر اپنے تمام دروازے بند کر کے ایک کھلے دروازے کی طرف اشارہ کر دیا جس کے دوسری

جانب امن تھا، آزادی تھی اور نئی مملکت اسلامیہ کے لیے جس کو ہم اپنا ملک کہہ سکتے تھے، کام کرنے کے بے پناہ مواقع حاصل تھے۔

میں اپنی غلط فہمی کی بنا پر سمجھ رہا تھا کہ کانگریسی حکومت کے یہ تیر ونشتر میری ذات تک ہی محدود ہیں، لیکن پاکستان پہنچنے کے بعد جب دیکھا کہ شبلی کالج اعظم گڑھ، شیعہ کالج آگرہ، رندھیری کالج بمبئی اور خدا معلوم کہاں کہاں کے پرنسپل اور پروفیسر بھی اسی طرح حکومت ہند کے تیروں کا نشانہ بن چکے ہیں تو معلوم ہوا کہ بھارت کی سرزمین پر مسلمانوں کا صرف تیغ وتفنگ سے ہی قتل عام نہیں ہوا بلکہ ایسی ہلاکتیں بھی عمل میں آئی ہیں جن میں جسم کو خراش تک نہیں آئی لیکن جذبات بری طرح کچل دیے گئے۔

(احمد الدین مارہروی، اردو ڈائجسٹ)

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی وترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجیے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچایئے۔
۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجیے۔
۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

تین مناظر جو مجھے اب تک یاد ہیں

اپریل 46ء میں تعطیلات کے بعد اسکول کھلے میں مسلم لوئر مڈل اسکول پٹیالہ میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ تحریک پاکستان سے متعلق میری یادیں یہیں سے شروع ہوئیں۔ گھاس منڈی میں تقریباً ہر ہفتے کوئی نہ کوئی عظیم الشان جلسہ ہوتا‘ کانگرسی اور مسلم لیگی رہنما دوروں پہ دورے کر رہے تھے۔ ہماری دلچسپی کا دائرہ صرف اس حد تک تھا کہ ہم مسلمان لیڈروں کی تقریروں کے کچھ اقتباسات زبانی رٹ لیتے اور پھر اپنے محلے میں بچوں کے جلسے منعقد کرتے اور ان میں تقریریں ہوتیں‘ کوئی ہم میں سے محمد بخش مسلم بن جاتا‘ کوئی ممدوٹ اور کوئی دولتانہ دیکھتے دیکھتے جلوس نکلنے شروع ہوئے۔ ’’پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ اور لے کے رہیں گے پاکستان کے نعروں سے فضائیں گونجنے لگیں۔ سبز ہلالی پرچم مسلم عوام کی محبت وعقیدت کا مرکز بن گیا۔ ہم بھی راتوں کو جلوس نکالتے‘ سبز پرچم کی جگہ شہر کے قریبی کھیتوں سے جوار کے پودے اکھاڑ کر لاتے اور ان کے سبز لہراتے ہوئے پتوں کو ہلالی پرچم بنالیا جاتا۔

رفتہ رفتہ ہندو اور مسلمان بچوں کے درمیان نفرت گہری ہوتی چلی گئی۔ ہفتے میں ایک آدھ بار ہمارا جلوس دشمن کے جلوس سے ٹکرا جاتا۔ دشمن کے پاس ڈنڈے ہوتے اور ہمارا ہتھیار جوار کے ٹانڈے ایک رات ہمارا جلوس اپنے محلے سے ہندوؤں کے محلے کی طرف رواں دواں تھا۔ ہمیں ایک تنگ گلی سے گزر کر کھلے میدان میں آنا تھا۔ سامنے سے دشمن کے جلوس نے ناکہ بندی کر دی اور حکم دیا کہ واپس چلے جاؤ۔ ادھر یہ طے تھا کہ جب نعرۂ تکبیر کہا جائے تو فوراً ٹانڈوں کو ’’آگ‘‘ کی طرف پکڑ لو اور جڑ والے موٹے حصے سے دشمن پر بھاری ضربیں لگاؤ‘ چنانچہ ایک بار دشمن کو الٹی میٹم دیا گیا کہ راستہ چھوڑ دو‘ ورنہ انجام کی ذمہ داری فریق ثانی پر ہوگی۔ وہ بھی ٹلنے والے نہ تھے‘ ڈٹے رہے۔ ہم نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ دشمن اس جنگی اشارے کو نہ سمجھ سکا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے ٹانڈے اس بری طرح برسنے لگے کہ دشمن چیخیں مارتا ہوا بھاگا۔

میری یاد کی سکرین پر دوسرا سین 47ء کے خونی واقعات کا منظر ہے۔ مسلم ہائی اسکول پٹیالہ کی ساتویں جماعت میں پڑھتے ہیں ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ پتہ چلا قائداعظم تشریف لا رہے ہیں۔ اسکول کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ مسلم اسکول کے بچے بھی اپنے محبوب قائد کا استقبال کریں گے۔ ہمیں سیاہ رنگ کی جناح کیپ خریدنے کا حکم ملا‘ صرف ایک دن کی مہلت تھی اسکول کے پانچ سات سو بچوں نے ٹوپیوں کے لیے شہر بھر میں طوفان اٹھا دیا۔ چھوٹے سائز کی ٹوپیاں نہ رہیں‘ تو بڑے سائز کی ٹوپیوں پر حملہ ہو گیا۔ بہر حال دوسرے دن ہم سب ’’مسلم لیگی یونیفارم‘‘ میں شاداں اور فرحاں اسکول پہنچے‘ معلوم ہوا کہ قائداعظم کسی دوسری اہم ترین مصروفیت کی بنا پر پٹیالہ تشریف نہ لا سکیں گے۔ دل کی حسرت دل ہی میں رہی۔ اسکول بند ہوا تو ہم جناح کیپ جلوس کی شکل میں گھروں کو روانہ ہوئے۔

چھ ستمبر 47ء کا دن میرے لیے چھ ستمبر 65ء کے دن کی طرح ایک یادگار ہے۔ 14 اگست کے اعلان آزادی کے بعد پٹیالہ کے مسلمان ظلم و استبداد کی چکی میں اس بری طرح پیسے گئے کہ اس کی یاد دلوں سے محو نہ ہو سکے گی۔ والد صاحب پولیس افسر ہونے کے باوجود مسلمانوں کی جدوجہد آزادی میں پوری طرح ساتھ تھے' چنانچہ ہندوؤں میں انہیں ''مسلم لیگی'' کہا جاتا تھا۔ فسادات شروع ہوئے' تو مسلمان پولیس کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ گردو نواح میں قتل و غارت کا بازار تو دیر سے گرم تھا' لیکن پٹیالہ شہر کی باری آخیر میں آئی۔ شہر میں کرفیو لگا ہوا تھا اور سکھ فوج مسلمانوں کے محلوں میں گھس کر گھر گھر گولیاں چلانے لگی۔ ڈیڑھ ہفتے میں شہر کے اندر گشتوں کے پشتے لگ گئے۔ ہم ایک گھر سے نکل کر دوسرے اور تیسرے میں پناہ لیتے ہوئے بالآخر ایک ایسے مکان میں پہنچے جاں تقریباً دوسو مرد عورتیں پہلے سے موجود تھیں۔ چھ ستمبر کی صبح آٹھ بجے کے قریب اس مکان پر حملہ ہوا۔ سکھ ملٹری نے افسر کے حکم سے مشین گن سے فائر کیا گیا۔ نہتے لوگ چند منٹ میں خاک و خون میں لوٹنے لگے۔ میرے بازو میں گولی لگی' تو میں لاشوں کے درمیان ہی چپکے سے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فضا میں گولیوں کی سنسناہٹ تھم گئی۔ اب صرف تڑپنے والوں کی آہیں سنائی دے رہی تھیں۔ والد صاحب کی لاش مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں سمجھا وہ ختم ہو چکے' لیکن تھوڑی دیر بعد انہوں نے ''پانی'' کہا۔ مکان کے اس کونے سے جہاں پٹرول چھڑک کر آگ لگانے کی کوشش کی گئی تھی' مگر آگ نہ لگ سکی تھی' والدہ کراہتے ہوئے اٹھیں اور ابا جان کو پانی دیا۔ میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ مجھے اپنی تکلیف کا احساس تک نہ تھا۔ والد صاحب امی سے کہہ رہے تھے۔ ''دیکھنا اپنے آپ کو سکھ درندوں کے حوالے نہ کرنا' اس سے بہتر ہے کہ خود کو ہلاک کر لینا اور دیکھو موت کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ میری جان بڑی آسانی سے نکل رہی ہے۔ یہ بھی سن لو کہ یہ ظالم کتنے ہی ظلم کر لیں' پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ پاکستان میں انشاء اللہ لا الہ کی حکومت قائم ہو کر رہے گی۔ اور ہاں...... بچے کہاں گئے؟...... پاکستان زندہ باد...... لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔''

عام حالات ہوتے تو شاید قیامت برپا ہو جاتی لیکن اس وقت نہ والدہ روئیں نہ میری آنکھ سے کوئی آنسو ٹپکا۔ بس یہ ہوا کہ اس کے بعد مجھے خود اپنی تکلیف کا بھی احساس ہونے لگا' گویا میں اب زخمی ہوا ہوں۔ اسی حالت میں لاشوں کے درمیان ایک رات بسر کرنے کے بعد دوسرے دن بمشکل اٹھا اور مکان سے باہر بازار میں نکل آیا' قلعے کا چوک سامنے تھا۔ چوک کے عین درمیان کسی مسلم دوشیزہ کی عریاں لاش چند لمبے بانسوں کے سہارے الٹی لٹکی ہوئی تھی اور اس کی رانوں کے درمیان بڑے سے کاغذ پر سرخ الفاظ میں ''پاکستان زندہ باد'' لکھا تھا۔ یہ منظر کبھی بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہو سکتا۔

چھ ستمبر جس دن ہم پر حملہ ہوا' پٹیالہ شہر میں قتل عام کا آخری دن تھا۔ اس کے بعد بچے کھچے مسلمانوں کو ہانک کر بہادر گڑھ کے قدیم قلعے میں بند کر دیا گیا۔ دو ماہ تک کیمپ کی جاں گسل صعوبتیں برداشت کر کے جب ہم پاکستان میں داخل ہو گئے' تو ہماری مسرت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ واہگہ بارڈر پر جب ہم نے ایک طویل مدت کے بعد نعرۂ تکبیر کی آواز سنی تو سارے غم غلط ہو گئے۔ پاکستان ہماری تمناؤں کی دنیا...... میرے مرحوم والد کے خوابوں کی زندہ تعبیر آج میرے سامنے تھا۔ ہم جس مال گاڑی میں سوار تھے' وہ عجیب بے ہنگم طریقے سے ہچکولے کھاتی ہوئی گھسٹ رہی تھی اور میں سپنوں کی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ پاکستان جہاں اسلام کی حکومت ہوئی جہاں خلافت راشدہ کا دور زندہ ہو جائے گا' جہاں حق اور انصاف کا بول بالا ہو گا میرے منہ سے بار بار نکلا:

''پاکستان زندہ باد' پاکستان پائندہ باد۔''

(گوہر صدیقی اردو ڈائجسٹ)

2 سوال آزادی کے

☆14 اگست 47ء کو آپ کہاں تھے اور کس حال میں تھے؟
☆29 سال بعد آج کیا سوچ رہے ہیں؟
قارئین ملگجے ماضی میں ڈوب کر اپنے خیالات کا دیا جلاتے ہیں

ایک ننھا سا پانچ چھ سال کا شریر بچہ اپنے گھر سے کچھ دور اپنے باغیچے میں دُنیا کی ہر شے سے بے نیاز کھیل رہا تھا کہ اس کی دادی اماں اپنی لاٹھی ٹیکتی ہوئی تیز قدموں سے باغیچے میں داخل ہوئی۔ اس کا بازو پکڑا اور گھسیٹتی ہوئی اسے گھر لے آئی اور پاؤں میں ایک لمبی سی تالے دار زنجیر ڈال دی تاکہ وہ گھر سے باہر نہ نکل سکے۔ وہ بیچارہ اپنی شفیق ماں کے اس عجیب وغریب رویے کو دیکھ کر سہم گیا کہ نہ جانے اس نے کون سا ایسا بھاری قصور کیا ہے جو یہ سزا مل رہی ہے۔ اس نے اپنی پھوپھی اور چچی کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا۔ مگر ان کے چہروں پر اسے گھبراہٹ اور پریشانی کے سوا کچھ نہ ملا۔ اس پر کسی کو بھی رحم نہ آیا اور وہ بیچارہ ایک کونے میں بیٹھا روتے روتے سو گیا۔

دوسری صبح اٹھتے ہی زنجیر پھر اس کے پیروں میں ڈال دی گئی اور پھر یہ روزانہ کا معمول بن گیا۔ صبح سویرے اس کے پاؤں میں زنجیر پڑ جاتی اور اندھیرا ہوتا، تو کھلتی۔ وہ سارا دن یا تو کونے میں بیٹھا اپنی امی ابا کو رو رو کر یاد کرتا یا پھر ڈیوڑھی کے دروازے پر بیٹھا بوڑھوں، جوانوں اور نوعمر لڑکوں کے جوش وخروش کا نہ رکنے والا سیلاب دیکھتا رہتا جو پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد اور نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے گلی سے گزرتا۔ کبھی ان کی حویلی کے ایک حصے میں لوگ جمع ہوتے اور وہ انہیں آپس میں ٹین کی واسکٹیں اور لوہے کی برچھیاں تقسیم کرتے دیکھتا۔ کبھی کبھار اچانک ہنگامہ مچ جاتا۔ لوگ بندوقیں لیے گاؤں کے شمالی جانب بھاگتے نظر آتے اور پھر فائر کی آوازیں آتیں اور وہ ڈر کے مارے اپنی دادی یا پھوپھی سے آ کر لپٹ جاتا۔ گھر کے اندر اور باہر کے ماحول میں یک دم تبدیلی اس کے ننھے سے ذہن میں ایک عجیب سا انقلاب برپا کر گئی، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

وہ اپنی دادی اماں سے پوچھتا، تو وہ جواب میں صرف اتنا کہتیں ''بیٹا پاکستان بن رہا ہے۔'' مگر اس کا؟ ذہن اس جواب سے مطمئن نہ ہوتا۔ رات کو جب وہ چھت پر سوتا...... تو روزانہ آگ کے شعلے اٹھتے ہوئے نظر آتے۔ کبھی دور کبھی ذرا قریب۔ وہ دادی اماں سے سوال کرتا:

''دادی اماں! یہ آگ کہاں لگی ہے؟''

اماں گاؤں کا نام بتائیں۔

وہ پھر پوچھتا: ''اماں آگ کس نے لگائی ہے؟''

''ہندوؤں اور سکھوں نے۔'' اماں جواب دیتیں۔

''اماں! یہ ہندو اور سکھ آگ کیوں لگاتے ہیں؟''

اور اماں پھر جواب دیتیں: ''بیٹا! پاکستان بن رہا ہے ناں۔''

''کیا آگ لگانے سے پاکستان بن جاتا ہے اماں؟''

اماں تنگ آ کر غصے سے کہتیں: ''بس سو جا اب''

اور وہ پٹنے کے خوف سے خاموش ہو جاتا۔

ایک دن گھر میں جو اخبار آیا اس پر ایک دبلے پتلے آدمی کی بڑی سی تصویر بنی ہوئی تھی۔ وہ ٹوپی، شیروانی اور شلوار پہنے گھوڑے پر سوار ہاتھ میں ایک جھنڈا لیے ہوئے تھا۔ گھر کی سب عورتیں بڑے اشتیاق سے تصویر دیکھنے لگیں۔ پھر محلے کی عورتیں بھی تصویر دیکھنے آ گئیں۔ وہ بڑی دیر تک اس تصویر والے شخص کی باتیں کرتی رہیں۔ جب سب عورتیں چلی گئیں تو اس نے دادی اماں سے پوچھا: ''اماں! یہ کس کی مورت ہے؟''

قائداعظم کی! اماں نے جواب دیا۔

''قائداعظم کون ہے؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''یہ ہمارا لیڈر ہے جو پاکستان بنا رہا ہے۔'' اماں نے کہا۔

''اچھا تو یہ وہی شخص ہے جو ہمارے گاؤں کے اردگرد کے گاؤں میں روزانہ رات کو آگ لگا جاتا ہے؟''

اماں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ روتا ہوا ڈیوڑھی کی چوکھٹ پر جا بیٹھا اور زنجیر سے کھیلنے لگا۔

ایک صبح اسے زنجیر سے آزاد کر دیا گیا (شاید چودہ اگست کا دن تھا) اس کی پھوپھی اور چچی جلدی جلدی سامان اکٹھا کر رہی تھیں اور وہ حیران سا یہ منظر دیکھتا رہا۔ انہوں نے سامان باندھا اور باہر کھڑی ہوئی بیل گاڑی میں رکھ دیا۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے انہوں نے گھر کی دہلیز چومی اور روتی ہوئی بیل گاڑی میں سوار ہو گئیں...... بیل گاڑی چل پڑی، تو اس نے اپنی پھوپھی سے پوچھا:

''کیا ہم لوگ ابو امی کے پاس جا رہے ہیں؟''

''ہاں بیٹے۔'' پھوپھی نے جواب دیا۔

وہ بہت خوش ہوا کہ چلو اب اس زنجیر سے تو ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاؤں گا۔ بیل گاڑی گاؤں سے باہر نکلی تو اس نے بہت سی بیل گاڑیاں کھڑی دیکھیں جن میں عورتیں بچے اور بوڑھے سامان کے ساتھ لادے ہوئے تھے۔ گاؤں کے سب مرد اور نوعمر لڑکے کچھ گھوڑوں پر سوار اور کچھ پیدل، ہاتھوں میں بندوقیں، لاٹھیاں، برچھیاں وغیرہ لیے جمع تھے...... وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گیا اور اس نے پھر اپنی پھوپھی سے پوچھا: ''کیا یہ لوگ ہمارے ابو امی کے پاس جا رہے ہیں؟''

''نہیں بیٹے! یہ سب لوگ پاکستان جا رہے ہیں۔ ہم لوگ بھی پاکستان جائیں گے اور وہیں رہیں گے تمہارے ابو کے پاس۔''

وہ کئی دن سے یہ لفظ ''پاکستان'' سن رہا تھا۔ بچوں اور بوڑھوں اور جوانوں کو نعرے لگاتے۔ عورتوں کو آپس میں باتیں کرتے اس نے

ہمیشہ اُن کی زبان سے یہ لفظ سنا‘ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ پاکستان کیا ہے۔

اس نے پھر پھوپھی سے پوچھا: ”پاکستان کیا ہوتا ہے؟“

”پاکستان ہمارا وطن ہے۔ بیٹے!“ پھوپھی نے پیار سے کہا۔

”یہ وطن کیا ہوتا ہے پھپھو؟“

”وطن گھر کو کہتے ہیں بیٹے!“ پھوپھی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کیا یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ یہ پاکستان نہیں ہے پھپھو۔“ اس نے پھر سوال کیا۔

”نہیں بیٹے! اب یہ ہمارا گھر نہیں‘ یہ پاکستان نہیں ہے۔“ ”پھوپھی اماں“ نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”ہم لوگ تو اس میں رہتے ہیں۔ پھر یہ پاکستان کیوں نہیں؟“

”یہ بھی ہمارا گھر تھا۔ لیکن ہندو اور سکھ ہمیں یہاں تنگ کرتے تھے‘ ہمارے گھر لوٹتے‘ انہیں آگ لگا دیتے‘ ہمیں نماز پڑھتے دیکھ کر برا مناتے اس لیے ہم نے یہ گھر چھوڑ دیا اور اب پاکستان میں رہیں گے۔“

”کیا وہاں پاکستان میں ہمیں ہندو سکھ تنگ نہیں کریں گے؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”نہیں بیٹا! پاکستان میں ہندو سکھ نہیں ہوں گے۔ وہاں صرف مسلمان ہوں گے۔ وہاں ہم اپنی مرضی سے رہیں گے۔ کوئی کسی کو لوٹے گا نہیں‘ کوئی کسی کو نہیں مارے گا اور کوئی کسی کے گھر کو آگ نہیں لگائے گا۔

اس کا تجسس ختم نہ ہوا۔ سوالات کا ذخیرہ ختم ہو گیا اور وہ خاموش ہو کر اپنی اونچی حویلی کو دیکھتا رہا جو آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھی۔

بیل گاڑیوں کا یہ سفر کئی دن جاری رہا۔ راستے میں کئی جگہ اسے جب عورتوں‘ مردوں اور بچوں کی لاشیں نظر آتیں تو وہ خوفزدہ ہو جاتا اور پھوپھی اماں سے لپٹ جاتا۔ آخر کار ایک روز یہ سفر ختم ہوا اور انہیں ایک بڑے سارے جنگلے میں جس کے گرد کانٹے دار تاریں لگی تھیں بند کر دیا گیا۔ اس کے اردگرد بہت سے سپاہی پہرہ دے رہے تھے کھلے آسمان کے نیچے چلچلاتی دھوپ میں جب اس نے دن گزارا تو اس نے پھوپھی اماں سے پوچھا ”کیا یہی پاکستان ہے؟“

”نہیں بیٹے! پاکستان اب زیادہ دور نہیں۔“ اور وہ کچھ مطمئن ہو گیا۔ جنگلے میں بند انہیں کئی دن گزر گئے۔ روزانہ ٹرک آتے‘ لوگوں کو لاد کر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جاتے اور ان کی جگہ نئے لوگ اس جنگلے میں آ کر بند ہو جاتے۔ وہ نئے آنے والوں کو دیکھتا اور جانے والوں کے متعلق سوچتا رہتا۔

آخر ایک روز انہیں بھی ایک ٹرک میں بھر دیا گیا۔ عورتیں‘ بچے‘ مرد‘ سامان سب ٹھونس دیے گئے اور ٹرک روانہ ہو گیا۔ کتنے ہی گھنٹے ٹرک چلتا رہا۔ ایک جگہ آ کر تھوڑی دیر کے لیے رکا تو نعرۂ تکبیر۔ اللہ اکبر۔ پاکستان زندہ باد۔ قائداعظم زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ اس نے دیکھا کہ سب لوگوں کے چہروں پر خوشی کی کہکشاں جگمگا رہی تھی۔ شاید یہ پاکستان کی سرحد تھی۔ ٹرک دوبارہ چل پڑا‘ تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا جیسے

سوچ رہا ہو آج اس کے پیروں کی زنجیریں ہمیشہ کے لیے کٹ گئی ہیں۔

29 سال گزر گئے۔ پاکستان بنا اور پھر اس نے نیا پاکستان بھی وجود میں آ گیا۔ وہ بچہ جوان ہو کر بڑھاپے کی طرف تیزی سے قدم اٹھا رہا ہے، مگر ذہنی طور پر وہ ابھی تک بچہ ہی ہے۔ کیونکہ وہ ابھی تک یہ سوچ رہا ہے کہ وہ کون سے عوامل تھے جن کی وجہ سے پاکستان وجود میں آیا۔ شاید اس لیے کہ وہ زنجیریں جو اس کے پیروں میں پڑی تھیں، پاکستان آنے کے بعد اس کے ذہن پر پڑ گئیں۔

میں کون ہوں

اماوس کی تاریک رات تھی۔ چار سو گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ تاریکی کے عفریت نے ماحول کو اپنے خوفناک جبڑوں میں جکڑ رکھا تھا۔ نفسا نفسی کا وہ عالم تھا کہ انسان کا سایہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا اور وہ تن تنہا اندھیرے میں ٹامک ٹونیاں مارتا پھر رہا تھا۔ قافلے اپنے راستے گم کر بیٹھے تھے۔ اور اندھوں کی مانند ادھر ادھر ہاتھ مارتے بھٹکتے پھر رہے تھے۔ زندگی کے ہاتھی کو ہر اندھا ٹٹول ٹٹول کر اپنی رائے عالیہ عطا کر رہا تھا۔ آوازوں کے ہجوم میں کہنے والے کی ذات گم ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسے میں جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا۔ لیکن...... میں نے کیا دیکھا......؟ میں بھلا دیکھ بھی کیا سکتا تھا......؟ ان اندھیروں میں تو نظر نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اپنے بھی اپنوں کو پہچان نہیں پا رہے تھے۔ اور اس عالم اضطراب پہچان میں جبکہ اپنے پرائے کی تمیز بھی ناممکن نظر آ رہی تھی۔ میں کیونکر دیکھ سکتا تھا کہ میرے اسلاف کون ہیں اور کیسے ہیں......؟ میں تو ان کی صورت سے بھی ناآشنا تھا پھر بھلا مجھ پر ان سے بے اعتنائی کا الزام کیسا؟ میں تو خود اپنی ہستی کو نہ دیکھ پایا تھا کہ میری ہیئت ترکیبی کیا ہے......اور پھر یہ فقط میرا ہی تو مسئلہ نہیں تھا۔ تو میری پوری نسل کا المیہ تھا...... یہ میرے عہد کا سانحہ تھا......! سب بے قرار تھے، بے چین تھے، مضطرب تھے، میں کیا ہوں؟ میں کون ہوں؟ یہ اندھیرے کیسے ہیں؟ سحر کب ہو گی؟ ہر ایک ذہن میں انہی سوالوں کی گونج تھی، لیکن یہ گونج ذہن کی تاریک وادیوں میں صدائے بازگشت بن کر رہ جاتی!

ہر طرف تاریکیاں ہی تاریکیاں تھیں...... اندھیرے ہی اندھیرے...... پھر اچانک...... نوید سحر لیے ایک کرن فضاؤں میں تیر گئی۔ اہل زمیں کو مژدۂ جاں فزا سنا گئی۔ اہل چمن کو ذوق نمو بخش گئی۔ تاریکیں چھٹنے لگیں تو لوگ ایک دوسرے کو پہچاننے لگ گئے۔ اور سب سے بڑی بات کہ وہ اپنے آپ کو پہچاننے لگے۔

بھائی بھائیوں سے گلے ملے۔ اپنے پرائے کی تمیز مٹ گئی...... اور تب بھائی متحد ہو گئے۔ ظلم کے خلاف۔ اندھیروں کے خلاف۔ عفریت کے جبڑے چیر دیئے گئے۔

اور پھر 14 اگست کی سحر کی ضیا بار کرنیں چار دانگ عالم میں پھیلیں۔ تو اہل بنیش نے دیکھا کہ وہ جو اپنے آپ کو پہچان گئے تھے انہوں نے اپنا آپ منوا لیا ہے صبح کا عالم بڑا دل خوش کن تھا، لیکن...... شومی قسمت سورج کو گہن لگ گیا اور وہ ایسا گہنایا کہ کائنات پر ایک بار پھر تاریکیاں مسلط ہوتی نظر آنے لگیں۔ ستاروں نے کہکشاں بن کر ضیا پاشی کے بجائے اپنی ذات کی شمع جلائی اور یوں مفادات کے تمام پروانے اپنے گرد اکٹھے کر لیے۔

لمحہ لمحہ صدیوں کی مسافت طے کر کے آ رہا ہے اور اب مجھے یوں لگتا ہے جیسے روشنی کا وہ سفر محض چند لمحوں کا تھا اور اب ہم ایک بار پھر انہی تاریک پستیوں کی طرف جا رہے ہیں۔ جہاں خود اپنا پتہ نہیں ملتا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے نا!

لیکن میں سوچتا ہوں کہ تاریخ تو انسان بناتے ہیں...... کیا ہم میں اب کوئی ایسا نہیں رہا جو وقت کے سبک اور ہوا کی ہوار کی باگیں سنبھال لے۔ کوئی تو سوچے۔ کوئی تو سمجھے!

(ایم فیروز شاہ۔ میانوالی)

پرانی نسل سے گلہ

کیا خوب سوال کیا ہے آپ نے بھی کہ جس دن پاکستان بنا تو ہم کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے‘ تو آیئے سنیئے:

14 اگست کا غلغلہ آزادی مچا ہوا ہے۔ جمعۃ المبارک کی مقدس رات ہے۔ رمضان المبارک کا مقدس مہینہ اپنے الوداعی مراحل طے کر رہا ہے۔ ایک 20 سالہ خاتون اپنے بڑے بیٹے کے لیے بشرٹ اور نیکر سی رہی ہے۔ یہ کپڑا پچھلے ہفتے اس کا شوہر کنٹرول کے پرائے کارڈ پر لے کر آیا تھا۔ کیونکہ اس کے اپنے کارڈ کپڑے کا کوٹہ ختم ہو گیا تھا اور وہ اس وقت رات کی ڈیوٹی پر ہے وہ چاہتی ہے کہ صبح جب بڑا منا جاگے گا تو آزادی کا سورج طلوع ہو چکا ہوگا اور یہ کتنی بڑی بات ہوگی کہ آزادی مقدس کا استقبال دھلے ہوئے کپڑوں سے کیا جائے‘ اس لیے مشین پر سر جھکائے وہ وقت کی رفتار سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے مشین چلا رہی ہے۔ سامنے بان کی چارپائی پر ایک دو سالہ اور دوسرا سات سالہ بچہ آزادی کی لذت سے بے نیاز سو رہے ہیں۔ رات نصف ہونے کے قریب ہے کہ کپڑے سل گئے۔ تراش خراش کی جانچ پڑتال ابھی ہو رہی ہے کہ نومولود پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ پر پاکستان کی نومولود بحریہ 21 توپوں کی دھواں دھار آواز میں نوید آزادی سناتی ہے‘ خاتون کے ہاتھ سے بشرٹ اور نیکر چھوٹ کر مشین پر آ رہتے ہیں اور اس کے ہاتھ اور آنکھیں بے اختیار تشکر کے طور پر آسمان کی جانب اٹھ جاتی ہیں۔ وہ پھر جلدی سے بچوں کی پیشانی چومنا شروع کر دیتی ہے۔ ذہن میں ایک ہی تصور ہے میرے بچے آزاد ہو گئے۔ ان دونوں بچوں میں سات سالہ بچہ بڑے بھائی صاحب تھے اور دو سالہ بچہ خود میں تھا۔

دوسرا سوال تو پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ جب ہم نے دیوار کی بنیاد ہی ٹیڑھی رکھی تو اب کیا خاک سیدھی ہوگی‘ یعنی جب ہم نے آزادی کے وقت کچھ محسوس نہ کیا تو اتنے برس بعد کیا محسوس کریں گے‘ پھر اگر تربیت صحیح ہو جاتی تو شاید سن بلوغ تک پہنچنے سے پہلے ہی ہم کچھ محسوس کر لیتے لیکن اس وقت تو عالم یہ تھا کہ مہاجر بے چارے لٹ پٹ کر آئے تھے۔ انہیں رہائش کا غم دامنگیر تھا۔ رہے مقامی لوگ تو وہ شاید انقلابات زمانہ کے سب سے بڑے قائل تھے۔ بھلا یہ سنہری موقع کیوں ہاتھ سے جانے دیتے؟ لگے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے اور ہم مہاجروں کے بچوں کے بچوں کے ساتھ بھیڑ بکریوں کی طرح منشی بننے کی مشین کی طرف دھکیل دیئے گئے۔ اساتذہ میں زیادہ تعداد مہاجرین کی تھی۔ وہ خود پریشان تھے تو ہمیں کیا پڑھاتے؟ وقت گزرتا رہا۔ مہاجروں کو گھر مل گئے اور ہم منشی بن گئے تو مقامی لوگوں کی حرص و طمع اور بڑھ گئی۔ وہ خود تو گھروں میں بیٹھے مزید دولت مند بننے کی کوششیں کرنے لگے اور اپنی چھوڑی ہوئی کرسیوں پر اپنے ہی بیٹوں‘ بھتیجوں‘ بھانجوں اور عزیزوں کو براجمان کر گئے۔ اب وہ

دفتروں اور کارخانوں میں اسی سوچ سے کام کر رہے ہیں۔ اس حال میں ہم محسوس کریں بھی تو کیا؟ خدا لگتی بات تو یہ ہے کہ ہم نے من الحیث والقوم اگر کچھ محسوس کیا بھی تو صرف اور صرف 6 ستمبر 65ء سے 21 ستمبر 65ء کی مختصر مدت میں ورنہ کبھی اس سے پہلے نہ ہم نے کچھ محسوس کیا اور نہ اب کر رہے ہیں اور اگر ہر شاخ کی حالت یہی رہی تو انجام گلستان چاہے جو بھی ہو بے چون و چرا قبول کر لیجئے گا۔ یہ ہمارے لیے کوئی نئی بات بھی نہ ہوگی کیونکہ یہ المیہ ہمارے ساتھ پیش آ چکا ہے۔

ہم نئی نسل سے تو آپ بالکل گلہ مت کیجئے کیونکہ ہمیں تو آپ پرانی نسل نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ آزادی کیا چیز ہے ملک وقوم کا کیا مفہوم ہے؟ یہ جو تھوڑا بہت اسلام ہم نئی نسل میں کہیں کہیں پایا جاتا ہے تو یہ ہماری ماؤں کا ہم پر احسان ہے کہ وہ صبح سویرے اسکول بھیجنے سے قبل روز زبردستی محلے کی مسجدوں میں بھیج دیا کرتی تھیں۔

(ہدایت اللہ جان۔ مردان)

آزادی کا عملی روپ

میری شعوری زندگی بارہ تیرہ سال پر محیط ہے۔ اس سے قبل کے واقعات یا تو دھندلکے میں ہیں یا سنی سنائی باتوں پر مشتمل، لیکن گزشتہ بارہ تیرہ سال کی تاریخ کا عملی مشاہدہ کیا۔ اس عرصے کے دوران میں نے اپنے ملک میں مسلسل ہنگامی حالات کا راج دیکھا۔ ڈی۔ پی۔ آر اور سیفٹی ایکٹ جیسے قوانین کی حکمرانی دیکھی۔

میں جب تحریک آزادی کا مطالعہ کرتا ہوں تو الہلال اور زمیندار جیسے اخبارات کو انگریزوں کے خلاف شعلے اُگلتا دیکھتا ہوں، لیکن انگریزی حکومت کسی پرچے کو مستقل بند نہیں کرتی۔ نہ ایڈیٹر حضرات مقدمے کے بغیر سالوں جیل میں سڑتے نظر آتے ہیں، لیکن میں نے ان دس برسوں میں کئی اخبارات و جرائد کو محض حق بات لکھنے کی پاداش میں مستقل طور پر بند ہوتے دیکھا ہے۔

تحریک خلافت کراچی کا اجلاس ہو یا کانگریس کی سول نافرمانی یا مسلم لیگ کے راست اقدام کا دن، مجھے اپنے ہی مورخین کی تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ نظر نہیں آتا کہ کسی سیاسی رہنما کی بیوی یا بہن کو حوالات میں بلا کر بے عزت کیا گیا ہو۔ میں کسی عالم دین کو انگریز حکام کے ہاتھوں ننگا ہوتے نہیں دیکھتا، مجھے اپنی غلامی کی تاریخ میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی لیکن آزاد ہو کر یہ تمام افعال میرے قومی وجود کا حصہ نظر آتے ہیں۔ ان باتوں کے مشاہدے کے بعد میں آزادی اور غلامی کے مابین کوئی فرق محسوس کرنے میں ناکام ہو جاتا ہوں ہو سکتا ہے یہ میرے اور مجھ جیسے سینکڑوں نوجوانوں کی غلط سوچ ہو، لیکن آپ اگر دونوں ادوار میں کچھ واضح فرق محسوس کرتے ہیں، تو خدارا ہمیں بھی سمجھائیے تاکہ ہم لفظ آزادی کے معنوں سے تو آگاہ ہو جائیں!

پاکستان میرے ہی وجود کا ایک لازمی حصہ ہے اور میں اس کا لازمی جزو غلامی کے فسانے سنے اور آزادی کا عملی روپ دیکھا۔ خدارا آزادی کا وہ تصور اُجاگر کیجئے جس سے آزادی اور غلامی کے مابین حقیقی فرق واضح ہو۔

(بیورغ بلوچ۔ کوئٹہ۔ بحوالہ اردو ڈائجسٹ)

آدم خور

ایک شخص پر گزرنے والی قیامت کی دلدوز روداد جسے آزادی وطن کی خاطر اپنا خاندان قربان کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اور انتہائی بھیانک تجربے سے گزرنا پڑا

ڈاکٹر ندیم احمد جب پہلی بار اس اسپتال میں داخل ہوا تو اس کے دل میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس کیفیت کو وہ کوئی نام تو نہیں دے سکا مگر اس نے اسے بے چین کر دیا۔ اسپتال کی عمارت پرانے طرز کی تھی۔ طرز تعمیر وہی تھا جو انگریزوں کے دور کی عمارات کا ہوا کرتا تھا۔ دیواروں پر قلعی تو کی گئی تھی مگر لگتا تھا کہ آخری بار قلعی کم از کم پانچ سال قبل کی گئی تھی۔ باہر کی دیواروں پر کالی جمی ہوئی تھی اور جا بہ جا سیاہ لکیریں اوپر سے نیچے تک ان بارشوں کا پتہ دیتی تھیں جو قلعی کی اس تہہ نے دیکھی تھیں۔ دروازوں پر گہرا سرخ رنگ‘ جیسا کہ اینٹوں کا ہوتا ہے‘ کیا گیا تھا۔ ان کے ہینڈل ٹوٹے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں‘ روشن دانوں اور بعض دروازوں پر لگی جالیاں اکھڑی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر شیشے بھی ٹوٹے ہوئے تھے جو باقی تھے وہ بھی کائی سے سیاہ ہو گئے تھے۔ عمارت کے سامنے ایک باغ بنایا گیا تھا جو کسی زمانے میں اپنی رعنائیاں بکھیرتا ہوگا‘ اب تو وہاں صرف جھاڑ جھنکار ہی موجود تھے۔ مریضوں کے لواحقین وہیں بیٹھ کر ڈاکٹر کا انتظار کیا کرتے تھے۔ انہیں زیادہ تر یہی بتایا جاتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر نکلے ہوئے ہیں حالانکہ وہ اپنے گھر کے راؤنڈ پر ہوا کرتے تھے یا پھر پرائیویٹ کلینک میں۔

اسپتال کے بڑے دروازے کے اوپر ایک پرانا سالخوردہ ٹین کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس پر کسی زمانے میں ”گورنمنٹ اسپتال برائے دماغی امراض“ لکھا ہوا تھا۔ اب صرف گورنمنٹ برائے دماغی امراض نظر آتا تھا۔ کسی منچلے نے ”اسپتال“ کا لفظ ہی مٹا دیا تھا۔

یہ اسپتال عرف عام میں پاگل خانہ کہلاتا تھا۔

ڈاکٹر ندیم احمد دماغی امراض کا ڈاکٹر تھا۔ وہ ملک کے مایہ ناز ماہرین نفسیات میں شمار کیا جاتا تھا۔ ابھی ایک ہفتہ قبل اسے اس اسپتال کے انچارج کے طور پر اس شہر میں منتقل کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ لاہور کے ایک میڈیکل کالج کے شعبہ نفسیات میں پروفیسر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ یہ عارضی تبدیلی اس نے خود کروائی تھی اور صرف چھ ماہ کے لیے تھی۔ وہ اپنی روزمرہ زندگی سے کچھ بور سا ہو گیا تھا اور طلبہ اور طالبات کو نفسیاتی بیماریاں اور ان کے علاج پڑھا پڑھا کر تنگ آ گیا تھا۔ ڈاکٹر ندیم چاہتا تھا کہ کسی کا علاج بھی کرے۔ اپنے ہی شہر کے کسی دماغی امراض کے اسپتال میں وہ اس لیے نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ وہاں وہ دوستوں اور احباب میں گھرا رہتا۔ گھریلو اور کالج کی مصروفیات اسے سنجیدگی سے معالج کا کام کرنے میں مانع ثابت ہوتیں۔ اس کا خیال تھا کہ ایک عام ڈاکٹر اور ماہر نفسیاتی کے طریقہ کار میں فرق ہونا چاہیے۔ ایک عام ڈاکٹر مریض کو دیکھتا ہے‘ مرض کی تشخیص کرتا ہے اور

دوائیں تجویز کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ مریض دوائیں استعمال کرتا ہے اور ٹھیک ہو کر اپنی دنیا میں مگن ہو جاتا ہے۔ جبکہ ماہر نفسیات کو مریض کے اندر اترنا پڑتا ہے۔ اس کا مزاج، اسکا خاندان، گھریلو ماحول، دوست احباب غرض اسے ہر چیز کے بارے میں جاننا پڑتا ہے۔ ماہر نفسیاتی عام ڈاکٹر نہیں ہوتا۔ وہ مریض کا دوست اور غم خوار ہوتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں ہے تو صرف نوٹ چھاپنے کی مشین ہے، معالج نہیں ہے۔

ان باتوں کو مدنظر رکھ کر اس نے اپنا تبادلہ ایک نسبتاً چھوٹے شہر کے اسپتال میں کروایا تھا۔ یہ تبادلہ عارضی اس لیے تھا کیونکہ بہرحال اس کی بھی زندگی تھی، بیوی بچے تھے، گھر تھا۔ وہ ایک استاد بھی تھا۔ وہ تو صرف کچھ عرصہ کے لیے ایک لگی بندھی زندگی سے نکلنا چاہتا تھا۔ کچھ تبدیلی کا خواہشمند تھا۔

بہرحال وجوہات کچھ بھی رہی ہوں وہ اب اس اسپتال میں موجود تھا اور یہاں آ کر ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔

اسپتال کا عملہ اسکے اسپتال کے لیے موجود تھا۔ انہوں نے اسے پھولوں کے ہار پہنائے اور اسے سیدھا اپنے کمرے میں لے جایا گیا۔ اس کے کمرے کی مجموعی حالت اگرچہ اسپتال کے باقی حصے کی طرح ہی تھی لیکن لگتا تھا کہ عملے نے اس پر خاصی محنت کی ہے۔ ہر طرف صفائی ستھرائی نظر آتی تھی۔ دیواروں کی قلعی اگرچہ جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھی لیکن زمین پر مٹی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میز پر بچھا ہوا سبز کپڑا ابھی نیا نیا دھلا اور استری ہوا تھا۔ قائداعظم کی تصویر بھی نئی لگتی تھی۔ اس نے کمرے کا بغور جائزہ لے کر ایک گہرا سانس لی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی نے اس کے وزن کے نیچے ایک بلند بانگ صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ مسکرا دیا۔ اسے اپنے گزشتہ دفتر کا فرنیچر یاد آ گیا۔ کس قدر نفیس اور عمدہ تھا وہ لیکن وہ تو یہاں ایک معالج بن کر آیا تھا، بیوروکریٹ بن کر نہیں۔ یہ چیزیں ایک معالج کے لیے اہمیت نہیں رکھتیں۔ اس کا کام لوگوں کے دکھ درد بانٹنا تھا، ان پر فرعونیت کے کوڑے برسانا نہیں تھا۔

ایک خاتون جن کی عمر چالیس کے آس پاس تھی آگے بڑھی اور بولی:

”سر میرا نام نیلم خان ہے۔ مس نیلم خان۔“ اس نے لفظ مس پر زور دیا۔ ”میں یہاں ہیڈ نرس ہوں۔ یہ ڈاکٹر رشید ہیں۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر درانی ہیں اور وہ آخر میں ڈاکٹر سلیمہ کھڑی ہیں۔“

ڈاکٹر ندیم نے ایک ایک کو غور سے دیکھا۔ سوائے ڈاکٹر سلیمہ کے باقی دونوں ڈاکٹر شکل سے نالائق اور لاابالی لگتے تھے۔

”ڈاکٹر درانی کے ساتھ رحیم صاحب ہیں، آپ کے پی اے اور ان کے ساتھ امجد علی ہیں، ایڈمنسٹریٹر۔“

”آپ سب لوگ تشریف رکھیں۔ پلیز۔“ ڈاکٹر ندیم نے کہا۔ سب پرانی کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھ گئے۔

”دیکھیں میرا قیام اس اسپتال میں صرف چھ ماہ کے لیے ہے۔“ ڈاکٹر ندیم نے کہا۔ ”میں اگرچہ ایک استاد ہوں لیکن یہاں آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں یہ چیز بھولتا جا رہا تھا کہ میں بنیادی طور پر ایک معالج بھی ہوں۔ دراصل اپنے آپ کو یہ یاد دلانے آیا ہوں کہ میرا اصل پیشہ کیا ہے۔“ ڈاکٹر ندیم نے ان لوگوں کے چہروں پر حیرت پڑھ لی۔ وہ مسکرایا: ”آپ مجھ سے یہ توقع نہ رکھئے گا کہ میں صبح آ کر اس کمرے میں بیٹھ جاؤں گا اور دوپہر کو واپس گھر چلا جاؤں گا۔ اگر موڈ ہوا تو گیارہ بجے اسپتال کا ایک چکر لگا لیا ورنہ اخبار پڑھتے اور چائے پیتے ہی دن گزر گیا۔ یہ کام تو میں لاہور میں رہ کر بھی بخوبی انجام دے سکتا تھا...... خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اب آپ لوگ اپنے اپنے کام پر چلے جائیں اور آپ تینوں میں

سے کوئی ایک ڈاکٹر مجھے یہاں کے مریضوں کے بارے میں مختصر سی معلومات فراہم کر دے۔''

ڈاکٹر ندیم جانتا تھا کہ صرف ڈاکٹر سلیمہ میں اتنی صلاحیت ہو گی کہ وہ اسے تمام مریضوں کے متعلق کچھ بتا سکے۔ لیکن اس نے جان بوجھ کر اس کا نام نہیں لیا تھا۔

تمام لوگ باہر چلے گئے۔ اس نے کمرے کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ کچھ دیر بعد اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں اور ہتھیلیوں پر سر کی پشت ٹکا دی۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ اسے وہ دن یاد آ رہا تھا جب وہ نیا نیا کالج سے امتحان دے کر فارغ ہوا تھا اور ایک اسپتال میں ہاؤس جاب کے لیے گیا تھا۔ اسپتال کا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ بالکل اسی انداز میں گھومنے والی کرسی میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کے منہ میں سگار تھا جسے وہ بڑی تیزی سے ادھر ادھر گھما رہا تھا۔ ڈاکٹر ندیم کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس ڈاکٹر نے اسے پہلا جملہ کیا بولا تھا:

''ہاں بھئی برخودار......کیا چاہتے ہو؟''

اس کے جواب میں ڈاکٹر ندیم نے کیا منمنایا تھا' اسے بالکل یاد نہیں تھا۔ اس وقت اس کا صرف یہ دل چاہ رہا تھا کہ وہ پلٹ کر کمرے سے باہر بھاگ جائے آج وہ بھی ایک اسپتال کا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ تھا اور اسی انداز میں کرسی میں دھنسا ہوا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کے منہ میں سگار چکر نہیں کھا رہا تھا۔ اگر کوئی نیا ڈاکٹر اس کے سامنے آتا تو وہ بھی غالباً یہی جملہ بولتا:

''ہاں بھئی برخودار۔ کیا چاہتے ہو؟''

وقت اسے کہاں سے کہاں لے آیا تھا۔ اس کے وہ ساتھی جو اس کے ساتھ کالج سے فارغ ہوئے تھے ان میں سے زیادہ تر اس سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ زندگی کی دوڑ میں آگے نہیں بڑھا تھا بلکہ اوپر گیا تھا۔ اس نے چلنے کے بجائے اونچی چھلانگیں لگائی تھیں۔

''سب نصیب کی بات ہے۔'' اس نے سوچا۔

دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز نے اسے واپس اسپتال میں پہنچا دیا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر سلیمہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی سیاہ رنگ کی فائل تھی۔ وہ دروازے پر جھکی تو ڈاکٹر ندیم نے کہا:

ڈاکٹر سلیمہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس پہنچی۔ ڈاکٹر ندیم نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

''جی!'' ڈاکٹر نے کہا۔

''سر میں تمام مریضوں کی مختصر ہسٹری لے کر آئی ہوں۔'' ڈاکٹر سلیمہ نے کہا۔ یہ کہہ کر اس نے فائل سیدھی کر کے اس کی طرف بڑھا دی۔

ڈاکٹر ندیم نے فائل کھول کر ورق گردانی شروع کر دی۔

''مجھے یہ پڑھنے میں کچھ وقت لگے گا۔ آپ مختصراً بتا سکتی ہیں کہ یہاں کتنے مریض ہیں؟''

''جی سر! یہاں تین قسم کے مریض موجود ہیں۔'' ڈاکٹر سلیمہ نے کہنا شروع کیا۔ ''ایک قسم تو نفسیاتی مریضوں کی ہے۔ وہ ویسے تو ٹھیک ہیں لیکن ان کی گھریلو زندگی کچھ اس قسم کی ہے کہ جب انہیں گھر واپس بھیجا جاتا ہے تو وہ پاگلوں والی حرکتیں شروع کر دیتے ہیں۔ ہر ایک کا مسئلہ الگ

ہے۔ ان کی کل تعداد تریسٹھ ہے جن میں اکتالیس خواتین اور بائیس مرد شامل ہیں۔ ہر ایک کی مختصر ہسٹری فائل میں موجود ہے۔ زیادہ تر خواتین شوہر اور سسرال والوں کے ظلم وستم کی وجہ سے یہاں تک پہنچتی ہیں۔ چند ایک کو تو ان کے والدین اور بھائی بہنوں نے اتنا تنگ کیا کہ وہ نیم پاگل ہوگئیں اور باقی وہ ہیں جو کسی اتفاقی حادثے کے سبب پاگل ہوئیں۔ مرد زیادہ تر محبوبہ یا بیوی کی بے وفائی کے سبب مریض بنے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں کوئی ایسا غم پیش آیا کہ وہ اپنے ہوش کھو بیٹھے۔ مگر یہ صرف عارضی طور پر بیمار ہیں۔ ٹھیک ہو جائیں' چلے جاتے ہیں۔ نئے آ جاتے ہیں۔ دوسری قسم مکمل پاگلوں کی ہے۔ انہیں علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ یہ کل چھیالیس ہیں۔ تیس مرد اور سولہ عورتیں۔ ان میں سے کچھ مجرم ہیں۔ کچھ کو لوگ پکڑ کر ہمارے حوالے کر گئے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کی ہسٹری مکمل نہیں ہے۔ بہت کم ایسے ہیں جن کے رشتے داروں کا ہمیں علم ہو سکا ہے۔ ان سے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ ہم نے لکھ دیا۔ وہ رشتے دار بھی ان مریضوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے۔ ان لوگوں نے تو اپنی طرف سے انہیں مردہ سمجھ لیا ہے۔ آخری قسم خطرناک پاگلوں کی ہے۔ یہ وہ ہیں جن کو ہمیں علیحدہ کوٹھریوں میں اور بعض اوقات زنجیروں میں جکڑ کر رکھنا پڑتا ہے۔ ایسے صرف تین مریض ہیں اور تینوں مرد ہیں۔''

ڈاکٹر سلیمہ چپ ہوئی تو کمرے میں کچھ دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ ڈاکٹر ندیم کچھ سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ سر ہلا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا:

''او کے ڈاکٹر۔ بہت بہت شکریہ۔ میں جب فائل پڑھ لوں گا تو پھر آپ کو ایک بار زحمت دوں گا۔ میں ان تمام مریضوں کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

ڈاکٹر سلیمہ کھڑی ہوگئی۔

''ٹھیک ہے سر۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر سلیمہ باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر ندیم نے فائل شروع سے کھولی اور مطالعہ شروع کر دیا۔

نام: نازیہ خان: تاریخ پیدائش: 2 مارچ 1960ء: والد/ شوہر کا نام کریم دین......

پوری فائل کا عمیق مطالعہ کرنے میں اسے دو دن لگے۔ ان دونوں کے بعد وہ اس قابل ہوگیا تھا کہ اسپتال کے ہر مریض کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ہو۔ اب وہ ان مریضوں کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے گھنٹی کے بٹن پر پاؤں رکھ دیا۔ فوراً چپڑاسی اندر داخل ہوا۔

''ڈاکٹر درانی' ڈاکٹر رشید اور ڈاکٹر سلیمہ کو بلاؤ۔''

چپڑاسی جی کہہ کر چلا گیا۔ ڈاکٹر ندیم کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سوچ میں گم ہوگیا۔ وہ پروگرام بنا رہا تھا کہ مریض کا کس طرح انٹرویو لے گا۔ اس نے سوچا کہ مریضوں کے نام جس ترتیب سے فائل میں موجود ہیں وہ اسی ترتیب سے ان سے ملے گا۔ سب سے پہلے نازیہ خان سے' پھر شجاعت علی سے' پھر......

ان کی سوچ دروازہ کھلنے کی آواز سے ٹوٹ گئی۔ تینوں ڈاکٹر کھڑے ہوئے تھے۔

''السلام علیکم سر۔'' تینوں نے کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' ڈاکٹر ندیم کھڑا ہو گیا۔ ''میں اسپتال کا ایک راؤنڈ کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہوں گا کہ آپ تینوں بھی میرے ہمراہ ہوں۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' ڈاکٹر درانی نے کہا۔

اسپتال کی اندرونی حالت بھی بیرونی حالت سے مختلف نہیں تھی۔ دیواروں کا رنگ اڑ گیا تھا۔ جگہ جگہ پان کی پیکوں کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ انتظار کرنے والے لوگوں کے لیے بنائے گئے بینچ جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ برآمدے میں سے اکثر بلب غائب تھے۔ جس سے عجیب سا اندھیرا اچھایا ہوا تھا۔ اس اندھیرے نے اسپتال کے ماحول کو اور بھی پراسرار اور کسی حد تک بھیانک بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر ندیم ایک ایک چیز کا فائدہ لے رہا تھا لیکن اس نے تینوں ڈاکٹروں سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ یہ کام انتظامیہ کا تھا اور وہ متعلقہ لوگوں سے ایک طویل ملاقات کرنا چاہتا تھا۔

چاروں ڈاکٹر ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔ ڈاکٹر رشید نے دروازہ کھولا اور ڈاکٹر ندیم اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا جس میں دو قطاروں میں لوہے کے سپرنگ والے پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ندیم نے اندازہ لگایا کہ پلنگوں کی تعداد تیس ہوگی۔ پندرہ ایک دیوار کے ساتھ اور پندرہ مقابل کی دیوار کے ساتھ۔ ان پر سفید چادریں بچھی ہوئی تھیں جن میں سے اکثر اجلی تھیں۔ یعنی یہ آج کل ہی میں بچھائی گئی تھیں۔ ان تیس پلنگوں پر تیس خواتین سلائی جاتی تھیں۔ اس وقت زیادہ تر خواتین پلنگوں سے نیچے زمین پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ سلائی کڑھائی کا کام کر رہی تھیں، دو سوئیٹر بن رہی تھیں۔ کچھ عورتیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں اور باقی بستر پر یونہی لیٹی ہوئی تھیں یا کوئی کتاب یا اخبار پڑھ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ذہنی مریضہ ہیں۔ چاروں ڈاکٹروں کو دیکھ کر زمین پر بیٹھی ہوئی زیادہ تر عورتیں کھڑی ہو گئیں اور بستر پر لیٹی ہوئی اٹھ بیٹھیں۔ کمرے میں جو ہلکا سا شور ہو رہا تھا وہ یکلخت تھم گیا۔ ڈاکٹر ندیم کو ایسا لگا جیسے کسی کرخت مزاج استاد نے پوری کلاس کو للکارا ہو اور سب بچے دہشت سے دبک گئے ہوں۔ وہ ہلکے سے مسکرایا۔

''آپ لوگ بیٹھیں۔'' اس نے کہا۔ کوئی نہیں بیٹھا۔ کمرے پر بدستور خاموشی طاری رہی۔ ڈاکٹر ندیم کچھ بے چین سا ہو گیا۔ مریضوں سے اس کا واسطہ بہت عرصے بعد پڑا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کرے یا کیا کہے۔

''میرا نام ندیم ہے۔ ڈاکٹر ندیم۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ''میں یہاں......''

اس جملہ ادھورا رہ گیا۔ باہر برآمدے میں بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اچانک دروازہ دھڑام سے کھلا اور ایک نرس ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

ڈاکٹر ندیم نے حیرت اور غصے سے اس کی اور پھر تینوں ڈاکٹروں کی جانب دیکھا۔ ڈاکٹر سلیمہ نے آگے بڑھ کر نرس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا ہوا رضیہ؟'' اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''وہ ڈاکٹر صاحبہ۔'' نرس اب بھی ہانپ رہی تھی۔ ''وہ بابے کو پھر دورہ پڑا ہے۔ اس نے شاہد کے ہاتھ پر کاٹ لیا ہے۔ بوٹی اتار لی ہے جی اس نے۔''

''کیا مطلب؟'' ڈاکٹر ندیم نے ڈاکٹر سلیمہ کی طرف دیکھا۔

''آپ آ کر دیکھ لیں سر۔'' ڈاکٹر سلیمہ نے جلدی سے کہا' پھر نرس سے بولی۔ ''چلو میرے ساتھ...... شاہد ٹھیک تو ہے؟''

سب ہال سے نکل کر برآمدے میں آ گئے اور نرس کے پیچھے چلنے لگے۔

''بوٹی اتار لی ہے جی بابے نے اس کی۔ پتہ نہیں کیسے اس کا بازو اس کے قابو میں آ گیا۔'' نرس نے افسوس اور خوف کے ملے جلے انداز میں کہا۔ ''بابے کے منہ اور ڈاڑھی پر خون ہی خون لگا ہے۔''

پانچوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے' مختلف برآمدوں سے ہوتے ہوئے' ایک لوہے کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ دروازے پر موجود دربان نے انہیں دیکھتے ہی سلام کیا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ ایک راہداری میں کھلتا تھا جو آخر میں بند تھی۔ ایک طرح سے وہ ایک بند گلی کا منظر پیش کرتی تھی۔ راہداری روشن تھی۔ روشنی ٹیوب لائٹوں اور ان روشن دانوں سے آ رہی تھی جو چھت کے پاس تھا۔ راہداری کے دونوں جانب چار چار کمرے تھے۔ کمرے تین طرف سے اینٹوں اور سامنے کی جانب سے لوہے کی سلاخوں سے بنے ہوئے تھے۔ لوہے کا ایک چھوٹا سا دروازہ جو کہ سلاخوں ہی سے بنا تھا گرل کے بائیں جانب تھا۔ کمروں کے درمیان کی دیوار کافی دبیز تھی۔

یہاں خطرناک پاگل رکھے جاتے تھے۔

ڈاکٹر سلیمہ اور نرس تیز تیز چلتے ہوئے دائیں جانب کے تیسرے کمرے کے سامنے پہنچے۔ ڈاکٹر ندیم بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ کمرے کے اندر ایک شخص بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ اس سے اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے پاگل خانے کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا جس میں قمیص میں کالر اور شلوار میں ازار بند نہیں ہوتا۔ لوگوں کی موجودگی محسوس کر کے وہ رک گیا۔ پہلے وہ سر جھکائے اپنی جگہ کھڑا رہا پھر یکدم اس نے سر اٹھایا۔ گورے چٹے چہرے پر سرخ آنکھیں نہایت بھیانک معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کی مونچھوں' ڈاڑھی اور باچھوں پر جا بجا خون لگا ہوا تھا۔ انسانی خون۔ اس کا قد کاٹھ اچھا تھا اور دیکھنے سے ایک تندرست انسان نظر آتا تھا۔

انسان خون دیکھ کر ڈاکٹر ندیم کو جھرجھری آ گئی۔ وہ خون سے ڈرا نہیں کرتا تھا لیکن کسی انسان کے ہونٹوں پر انسانی خون اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

''ہا...... آ گئے ہو۔'' پاگل غرایا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا جنگلے تک آ گیا۔ سب ایک ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اس نے جنگلا دونوں ہاتھوں میں پکڑا ہوا تھا۔ ''جاؤ...... جا کر کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ مجھے آج بھوک لگی ہے۔'' اس کی سرخ سرخ آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ چہرے پر ایک وحشت طاری تھی جسے کسی عام آدمی کے لیے دیکھنا بھی ناممکن تھا۔ پھر وہ مسکرایا تو اس کے پیلے پیلے دانت نمایاں ہوئے۔ ڈاکٹر ندیم کو نہ جانے کیوں بھیڑیے کا خیال آ گیا۔ وہ کسی بھیڑیے کی طرح غرا رہا تھا۔

جاؤ بے وقوفو...... جا کر کچھ کھانے کو لاؤ۔ وہ پھر چلایا۔ ''آج میرا دل انسانی گوشت کھانے کو چاہ رہا ہے۔ گرم گرم نرم نرم گوشت۔ جاؤ...... دفع ہو جاؤ۔ بے وقوفو۔''

نہ جانے وہ گالیوں کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ تھی، ڈاکٹر ندیم ایک دم ڈاکٹر درانی کی طرف پلٹا۔

”کمرے کی چابی لاؤ۔“ اس نے کہا۔

”جی سر؟“ ڈاکٹر درانی حیران رہ گیا۔

میں نے کہا ہے کہ کمرے کی چابی لاؤ۔ مجھے اندر جانا ہے۔“

سر یہ بہت خطرناک پاگل ہے۔ آپ اس کا......“

”تم نے سنا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ ڈاکٹر ندیم کو غصہ آ گیا ”جا کر چابی لاؤ۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

ڈاکٹر درانی نے حیرت اور بے بسی سے ڈاکٹر سلیمہ کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر سلیمہ آگے بڑھ ہی رہی تھی کہ ڈاکٹر ندیم پھر بولا:

”اس کی طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ تم چابی لاؤ، میں اس کا علاج جانتا ہوں۔ میری فکر نہ کرو۔“

”کتے تو جاتا کیوں نہیں۔“ بابا پھر غرایا۔ ”جا جا کر کھانا لا۔ گرم گرم خون لا، نرم نرم گوشت لا۔“ پھر وہ خود ہی مسکرا دیا۔ ”ہاں۔ گرم گرم خون اور نرم نرم گوشت۔“

اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ غصے اور وحشت کی جگہ ایک عجیب سے تاثر نے لے لی۔

”گرم گرم خون اور نرم نرم گوشت۔“ وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔ ڈاکٹر درانی باہر چلا گیا۔ بابا گویا دنیا و مافیہا سے بے نیاز سر جھکائے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر ندیم اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پوری راہداری میں سناٹا طاری تھا۔ اتنی گہری خاموشی تھی کہ ڈاکٹر ندیم اپنے سانسوں کی آواز تک سن سکتا تھا۔

اس سناٹے کو بابے کی چیخ نے توڑا۔ وہ وحشیانہ انداز میں چیختا تھا اور ہوا میں اس طرح ہاتھ چلا رہا تھا جیسے اپنے اوپر حملہ کرنے والوں کو روک رہا ہو۔ ”نہیں نہیں۔ نہ مارو۔ نہ مارو۔ خدا کے واسطے نہ مارو۔ میں میں۔“ اچانک اس نے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ پوری راہداری میں قہقہوں کی گونج دہشت پھیلا رہی تھی۔ وہ مسلسل ہنسے جا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلے ہوئے تھے اور وہ چھت کی طرف چہرہ کیے قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر جس طرح اچانک اس کے قہقہے شروع ہوئے تھے اسی طرح رک بھی گئے۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنا چہرہ نیچے کیا۔ اس کی آنکھوں میں پھر وہی بھیانک سرخی در آئی تھی۔ ”گوشت کھانا ہے۔ ہاں گوشت کھانا ہے۔ انسان کا گرم گرم گلابی گوشت، جاؤ دفع ہو جاؤ۔“ وہ چلایا۔ ”جا کر کھانے کا بندوبست کرو۔“

اسی وقت ڈاکٹر درانی چابی لے کر آ گیا۔ اس نے ایک بار پھر ڈاکٹر ندیم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”دروازہ کھولیں۔“ ڈاکٹر ندیم نے کہا۔ وہ بہت پرسکون لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر سلیمہ اور نرس کی آنکھوں میں خوف صاف پڑھا جا سکتا تھا۔

”آپ دونوں اگر جانا چاہتی ہیں تو جا سکتی ہیں۔“ ڈاکٹر ندیم نے دونوں سے کہا۔ ان کی تو گویا زنجیر کھول دی گئی۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔ خوفزدہ تو ڈاکٹر رشید اور ڈاکٹر درانی بھی تھے مگر مرد کی انا نے انہیں وہاں کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اگر اس وقت وہاں سے ہٹ جاتے تو خواتین کے سامنے ان کی ہیٹی ہو جاتی۔ وہ صرف اپنی عزت بنائے رکھنے کے لیے وہاں کھڑے اندر ہی اندر کانپ رہے تھے۔

ڈاکٹر درانی نے تالا کھولا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر ندیم آگے بڑھا اور کنڈی کھول کر جنگلے والا دروازہ اندر دھکیل دیا۔ پاگل بڈھا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر ندیم نے پلٹ کر ایک نظر دونوں ڈاکٹروں پر ڈالی اور جنگلے کے اندر قدم رکھ دیا۔

بابا بھی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر کھڑے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ نظروں کی یہ جنگ دو منٹ تک جاری رہی۔ ڈاکٹر ندیم کا دل ہی جانتا تھا کہ اس نے ان وحشیانہ نظروں سے کیسے نظریں ملائی ہوئی تھیں، مگر یہ ضروری تھا۔ بڈھے کی انا توڑنے کے لیے یہ ضروری تھا۔

''جا۔'' بابا اسے ہاتھ کا اشارہ کر کے بولا۔ ''جا جا کے کھانا لا۔ چل جا۔''

''تمہیں گوشت کھانا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ بابا کچھ نہیں بولا۔ صرف ڈاکٹر کو گھورتا رہا۔ ''لو کھاؤ۔'' ڈاکٹر ندیم نے اپنا بازو آگے کر دیا۔

ڈاکٹر ندیم کو لگا جیسے اس نے بابے کی آنکھوں میں حیرت کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے آئی اور غائب ہو گئی۔ نہ جانے واقعی ایسا تھا یا محض ڈاکٹر کے ذہن کی اختراع تھی۔ بابا اب بھی اسے گھور رہا تھا۔

''لو کھاؤ نا۔'' ڈاکٹر ندیم نے بازو آگے کیے رکھا۔ ''انسانی گوشت ہے۔ نرم نرم، گرم گرم۔''

بابا چند لمحے اسے گھورتا رہا۔

''میرے سے مذاق نہ کر۔ دفع ہو جا۔'' وہ غرایا۔

''میں مذاق نہیں کر رہا۔'' ڈاکٹر ندیم اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں بھوک لگی ہے نا۔ تو لو کھاؤ۔''

اب ڈاکٹر اور بابے کا فاصلہ پانچ فٹ رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر کا ہاتھ مسلسل آگے بڑھا ہوا تھا۔ بابا اس کے بازو کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر ندیم نے آدھی بازو کی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ وہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اب بابے کے بالکل قریب تھا۔

''لو کھاؤ۔ کھاتے کیوں نہیں؟'' ڈاکٹر نے کہا۔

بابا پیچھے ہٹ گیا۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر ندیم کا حوصلہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

''پیچھے کہاں جا رہے ہو؟'' وہ بولا۔ ''آگے بڑھو۔ گرم گرم گوشت کھاؤ۔ نمکین نمکین خون پیو...... آؤ۔''

بابے کی وحشت اچانک خوف میں تبدیل ہو گئی۔

''نہیں نہیں۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''مجھے نہیں مارو۔ خدا کے لیے مت مارو۔'' وہ تیزی سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ ڈاکٹر ندیم آگے بڑھتا رہا۔

''نہیں نہیں۔'' بابے کی آواز بلند ہو گئی۔ اس میں منت اور رقت آ گئی تھی۔ ''دیکھو ہمیں جانے دو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ خدا کے لیے۔ تمہیں تمہیں۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگا تھا۔ اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ ''نہیں۔'' وہ چلایا۔

ڈاکٹر ندیم اب اس کے سر پر جا پہنچا تھا۔ بابا بری طرح خوفزدہ تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ آنکھیں پتھرا گئیں تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔

''نہ مارو۔ دیکھو نہ مارو۔ تمہیں خدا کا واسطہ۔'' وہ بلبلا رہا تھا۔ اچانک وہ بیٹھا اور اس نے ڈاکٹر ندیم کے پاؤں پکڑ لیے۔

''نہ مارو'' وہ مسلسل کہہ رہا تھا۔ اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ ''خدا کے لیے۔'' وہ ہچکیوں میں بولا۔

ڈاکٹر ندیم چند لمحے اسے سر جھکائے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔ بابے کو گویا زبردست کرنٹ پڑا۔

''نہیں۔'' وہ اتنی زور سے چلایا کہ اس کی آواز پورے اسپتال میں گونجی۔ ڈاکٹر ندیم نے گھبرا کر اپنا ہاتھ ہٹالیا۔

بابا بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔

جب بابا ہوش میں آیا تو آپریشن تھیٹر کی میز پر پڑا تھا۔ اس نے یکدم اٹھنے کی کوشش کی اور چکرا کر رہ گیا۔

''آرام سے آرام سے۔'' ڈاکٹر ندیم نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

بابے نے اسے غور سے دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں میں پہلے والی وحشت نہیں تھی۔ وہ بالکل تندرست لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر ندیم نے اس کے ذہن کو اتنے زور کا جھٹکا دیا تھا کہ تمام کل پرزے اپنی جگہ واپس فٹ ہو گئے تھے۔

''کون ہو تم؟'' بابے نے پوچھا۔ اس کا لہجہ صاف اور آواز پرسکون تھی۔

''میرا نام ندیم ہے۔ ڈاکٹر ندیم اور تم؟''

''میرا نام ریاست علی ہے۔'' بابے نے کہا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ تم اس وقت ایک اسپتال میں ہو؟'' ڈاکٹر ندیم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

ریاست علی کے چہرے پر سوچ کے بادل چھا گئے۔ پھر وہ بولا۔

''ہاں مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں کافی عرصے سے ایک اسپتال میں ہوں۔''

''تمہیں بھوک لگی ہے؟ کچھ کھاؤ گے؟'' ڈاکٹر ندیم نے پوچھا۔

''ہاں مجھے بھوک لگی ہے۔''

ڈاکٹر ندیم پیچھے مڑا۔ ایک میز پر کچھ کھانے کا سامان رکھا ہوا تھا بسکٹ، کیک، نمکین دال اور تھرمس میں چائے۔ ڈاکٹر نے کیک اور دال ریاست علی کے سامنے رکھ دی۔ وہ اب میز پر بیٹھ گیا تھا۔ کیک دیکھ کر اس کی بھوک اور چمک اٹھی۔ اس نے ندیدوں کی طرح کھانا شروع کر دیا۔

جب اس نے دونوں چیزوں کا صفایا کر دیا تو ڈاکٹر نے اسے پیالی میں چائے ڈال کر دی۔

''چینی کتنے چمچے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''دو۔'' ریاست علی نے کہا۔ وہ ہر بات کہنے سے پہلے سوچا کرتا تھا۔ ڈاکٹر ندیم اس کی ایک ایک بات اور حرکت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے لیے بھی چائے بنائی اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ کر پینے لگا۔

''تم اس اسپتال میں کیوں رہ رہے ہو؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

ریاست علی پھر سوچ میں گم ہو گیا۔

''یہ تو مجھے نہیں پتہ۔ جب میں کھیت میں بے ہوش ہوا تھا تو مجھے شاید اسی اسپتال میں ہوش آیا تھا۔''

''یہ کب کی بات ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''زیادہ نہیں ہوئے۔ پچھلے جولائی کی۔ بیس جولائی کی'' ریاست علی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پتہ ہے کہ آج کیا تاریخ ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''آٹھ مئی۔''

''مئی؟'' ریاست علی کو جھٹکا سا لگا۔ ''تو کیا پورا سال گزر گیا؟ مجھے پتہ نہیں چلا۔ کیا میں بہت بیمار تھا؟''

ڈاکٹر نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔ وہ سب سے مشکل مرحلے میں داخل ہو رہا تھا۔ اسے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا تھا۔

''تم کہاں کے رہنے والے ہو؟'' ریاست علی کے چہرے پر سوچ کے بادل چھا گئے۔ وہ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولا۔

''میں لدھیانہ کے قریب ایک قصبے نواں شہر کا رہنے والا ہوں۔''

''تم پاکستان کب آئے؟''

''بیس جولائی کو'' ہم بیس جولائی کو لدھیانہ سے ریل میں سوار ہوئے تھے۔'' ریاست علی خود بخود سوچ کے سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ ''میں' میری بیوی ریشماں اور میرا باپ فراست علی۔ میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ آٹھ ماہ ہوئے تھے۔ آٹھ ماہ کی شادی نئی ہی ہوتی ہے نا؟'' اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''ہاں ہاں۔ شادی تو ایک سال تک نئی رہتی ہے۔''

''میری شادی بھی نئی تھی۔ ریشماں بڑی ہی پیاری تھی۔ گوری چٹی' نازک سی۔ میں تو بس اس کو دیکھ کر جیتا تھا۔ وہ بھی مجھ سے بڑا پیار کرتی تھی۔ روز اپنے سامنے بٹھا کر کھانا کھلاتی تھی جیسے میں اس کا بیٹا ہوں۔'' ریاست علی ہنس پڑا۔ ڈاکٹر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ریاست علی کو ہلکا سا ٹھوکا دیا تھا۔ وہ خود ہی چل پڑا تھا۔ ''وہ میرے باپو کا بھی خیال رکھتی تھی۔ وہ بھی اسے باپو کہتی تھی۔ بڑا اچھا لگتا تھا اس کے منہ سے یہ لفظ۔ اس کا باپ مر گیا تھا نا بچپن میں۔ اس لیے اسے باپ کا پیار نہیں ملا تھا۔ باپو اس کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ اسے دھی رانی کہا کرتا تھا۔'' ریاست علی چپ ہو گیا۔ وہ ہوا میں یوں گھور رہا تھا جیسے اسے گزشتہ گھر میں بیٹھا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ بے تحاشا بڑھے ہوئے بال اور ڈاڑھی کے باوجود اس کے چہرے کی مسرت صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ وہ وقت میں الٹی قلابازی لگا کر بہت دور نکل گیا تھا۔ کمرے میں سناٹا طاری تھا۔ ڈاکٹر ندیم بھی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ اس مرحلے کو قدرتی طور پر گزارنا چاہتا تھا۔ خود دخل اندازی کرتا تو معاملہ بگڑ سکتا تھا۔

خاصی دیر بعد ریاست علی نے آنکھیں دوبارہ ڈاکٹر ندیم پر مرکوز کر دیں۔

’’ہماری ریل صبح چھ بجے چلی تھی۔ بڑی سخت گرمی تھی اس روز۔ بڑا ہی حبس تھا۔ آٹھ بجے کے قریب ہم جالندھر پہنچے۔ میں نے ریل سے اتر کر صراحی میں پانی بھرا۔ ریشماں اور باپو کے لیے نان پکوڑے خریدے اور پھر دھکم دھکا کرتا اپنی جگہ آ گیا۔ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی جی ریل۔ ہر پاسے بندہ ہی بندہ۔‘‘ ریاست علی کی زبان آہستہ آہستہ بدل رہی تھی۔ اب وہ کچھ الفاظ اپنی مادری زبان پنجابی کے بھی بولنے لگا تھا۔ یہ ایک اچھی تبدیلی تھی۔

’’ریشماں نے مجھے کہا تھا کہ نہ تر پر میں نہ مانا۔ آخر کو گھبرو جوان تھا‘‘ ریاست علی نے ڈاکٹر کے کہا۔ ’’کوئی مخول ہے۔‘‘ وہ پھر چپ ہو گیا۔ ’’ریل چلی تو کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا آئی۔ ہماری جان میں جان آئی۔ پر...... پر آدھے ہی گھنٹے بعد ریل رک گئی۔ ریل پر سکھوں نے حملہ کر دیا تھا‘‘ ریاست علی کی آواز بدل گئی۔ ’’ہر پاسے کھیت ہی کھیت تھے۔ سکھوں کے ہاتھوں میں کرپانیں اور چاقو تھے۔ وہ بندوں کو دبا دب مار رہے تھے۔ میں نے ریشماں اور باپو کا ہاتھ پکڑا اور ڈبے کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہاں ابھی سکھ نہیں پہنچے تھے۔ لوگ بھاگ رہے تھے‘ عورتیں اور بچے چلا رہے تھے۔ قیامت تھی جی قیامت۔‘‘ ریاست علی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ’’ہر کسی کو اپنی پڑی تھی۔ بندے ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے ڈبے سے نکل رہے تھے۔ میں بھی لوگوں کو دھکے دیتا دروازے تک پہنچ گیا۔ پہلے خود باہر چھال ماری‘ فیر ریشماں اور باپو کو گود میں لے کر اتارا۔‘‘

’’اب کیا ہوگا ریاستے؟‘‘ ریشماں نے گھبرا کر پوچھا۔

’’تو فکر نہ کر۔ میں ہوں نا‘‘ میں نے اسے تسلی دی۔

’’ہم تینوں تیزی سے کھیتوں میں اتر گئے۔ ریشماں زیادہ تیز نہیں چل سکتی تھی۔ وہ چھ ماہ کے پیٹ سے تھی۔ باپو بھی بوڑھا تھا۔ جے میں کلا ہوتا تو اتنی دیر میں کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوتا۔ پر......‘‘ ریاست علی نے گہری سانس لی۔ ’’پیچھے سے عورتوں کی چیخیں اور سکھوں کے نعرے اور بڑھکیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ’’راج کرو گا خالصہ۔ باقی رہے نہ کو‘‘ کے نعرے لگا رہے تھے۔ ہم پر شاید کسی سکھ کی نظر پڑ گئی۔ وہ چلایا۔

’’اوے دیکھو۔ وہ مسلے نس رہے ہیں۔‘‘

چار سکھوں نے منہ پر ہاتھ رکھ کے بل بل بل کے نعرے لگائے اور کرپانیں لہراتے ہماری طرف لپکے۔ ہم بھاگ نہیں سکتے تھے اس لیے انہوں نے ہمیں فوراً ہی آ لیا۔ ہم ریل سے خاصی دور آ گئے تھے اور شاید کھیتوں کے درمیان میں تھے۔ انہوں نے آتے ہی ہمارے گرد گھیرا ڈال لیا۔

’’کدھر جا رہے ہو نس کے بے غیرتو‘‘ ایک سکھ نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ریشماں ڈر کے مجھ سے لپٹ گئی۔ چار سکھوں میں سے دو بالکل جوان تھے۔ ان کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ ایک تیس کے آس پاس تھا اور چوتھا ذرا بڑا تھا۔ مونچھوں پر تاؤ دینے والا جوان تھا۔

’’دیر نہ کر بھورے۔‘‘ بڑے سکھ نے کہا۔ اخلاص کر دے۔ ادھر بڑے پڑے ہیں۔‘‘

ایک جوان سکھ کرپان اٹھائے ہماری طرف بڑھا۔ میں نے ریشماں کو پیچھے ہٹا کر باپو کے ساتھ کر دیا اور آگے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

’’خبردار کوئی آگے بڑھا۔ ٹوٹے کر دوں گا۔‘‘

جوان اپنی جگہ رک گیا۔ وہ کچھ دیر مجھے غور سے دیکھتا رہا۔

’’بلے بھئی بلے۔‘‘ وہ مسکرا کے بولا۔ ’’تو تو بڑا ہی اوکھا ہے۔ چاچا تو ذرا اسے پکڑ میں باقیوں سے نمٹ کر اسے دیکھوں گا۔‘‘

''خبر دار جو کسی نے ان کو ہاتھ بھی لگایا۔'' میں نے کہا۔ دو سکھ آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے جکڑ لیا۔ میں نے بڑا زور لگایا۔ پر ان میں بھی بڑی جان تھی۔ میں نے زور لگا کر انہیں زمین پر گرا دیا اور خود بھی گر پڑا۔ ریشماں بری طرح چیخ رہی تھی۔ اچانک میرا ایک بازو آزاد ہو گیا۔ میں نے ایک سکھ کی ناک پر گھونسا رسید کر دیا۔ اس کی ناک سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ میرے دوسرے گھونسے نے اس کے منہ سے خون نکال دیا۔ یہ دیکھ کر ایک اور سکھ آگے بڑھا اور اس نے میری ٹانگوں کے درمیان زور سے ٹھڈا مارا۔ درد سے میری چیخ نکل گئی۔ میں پیٹ پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔ دونوں سکھوں نے مجھے چھوڑ دیا جس سکھ کو میں نے مارا تھا وہ غصے سے بلبلا رہا تھا۔ اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنا خون آلودہ چہرہ میرے سامنے لا کے بولا:

واہ گرو کی سونہہ! تجھے میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے میرے منہ پر زور سے گھونسا مارا۔ میرے منہ سے بھی خون نکل پڑا۔ ریشماں چیختی ہوئی آگے بڑھی تو ایک سکھ نے اسے پکڑ لیا۔

''کدھر جاتی ہے سوہنی۔'' وہ خباثت سے دانت نکال کر بولا۔ ''اسی مر گئے آں۔''

''حرامزادے۔ چھوڑ دے اسے۔'' باپو گالیاں بکتا ہوا آگے بڑھا۔ جس سکھ کو میں نے مارا تھا اس نے باپو کو زور سے دھکا دیا۔ وہ کمزور بڈھا دور جا کے پڑا۔ اس سکھ نے کرپان نکال لی اور ایک ہی وار میں باپو کی گردن اڑا دی۔ میرے سامنے' میری آنکھوں کے سامنے۔'' ریاست علی کی آواز میں وحشت بر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور وحشت پھر نمایاں ہونے لگے تھے۔ ڈاکٹر ندیم کھڑا ہو گیا۔

''اچھا چھوڑ و رہنے دو۔ پھر بتا دینا۔'' اس نے ریاست علی کو تسلی دی۔ مگر وہ شاید سن ہی نہیں رہا تھا۔

''باپو کا خون زمین پر پھیل رہا تھا۔ شدید درد کے باوجود میں اس کی طرف بڑھا مگر اس سکھ نے میری پنی (پنڈلی) پہ کرپان ماری۔ میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ میری لت (ٹانگ) سے بھی تازہ تازہ خون نکل رہا تھا۔ ریشماں مسلسل چلا رہی تھی۔ زخمی سکھ اس کی طرف بڑھا

''چپ کر رنڈی۔'' اس نے ڈانٹ کر کہا۔ ریشماں خوف سے خاموش ہو گئی' مگر وہ اب بھی ہولے ہولے ہچکیاں لے رہی تھیں۔ آنسو اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ دو سکھوں نے مجھے اب بھی جکڑا ہوا تھا۔ ایک سکھ نے ریشماں کو پیچھے سے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔

''واہ واہ سوہنی چیز ہے یہ تو چاچا۔'' زخمی سکھ نے اس سے کہا جو ریشماں کو تھامے کھڑا تھا۔

''کتے' حرامزادے' چھوڑ دے اس کو۔'' میں چلایا۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کی۔ دونوں سکھوں کے لیے مجھے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے زور لگایا اور انہیں گھسیٹتا ہوا آگے لے آیا۔ زخمی سکھ نے میرے منہ پر ٹھڈا مارا میں پھر لڑھک گیا۔ شاید میری ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔'' ریاست علی اپنی ناک ٹٹولتے ہوئے بولا۔ اس کی ناک پر ٹانکوں کے نشان تھے۔ ''درد سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔''

''بڑا غیرت والا ہے تو تو۔ سور۔'' زخمی سکھ بولا۔ ''پر آج میں تیری غیرت کو اس کرپان پر نچاؤں گا۔'' اس نے کرپان لہرا کر کہا۔ وہ تیزی سے مڑا اور ایک ہی جھٹکے میں ریشماں کی قمیص تار تار کر دی۔ میرے سامنے میری ریشماں سکھوں کے آگے بے لباس ہو گئی۔'' ریاست علی نے چہرے پر ہاتھ رکھ لیے۔ وہ خوف اور دکھ سے کانپ رہا تھا۔ ''میرے سامنے میری ریشماں۔ میرے سامنے۔'' ریاست علی پھر چپ کر گیا۔ ڈاکٹر ندیم بھی خاموش رہا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اب کیا کرے۔ وہ اپنی جگہ کھڑا ہونٹ چبا رہا تھا۔ اچانک ریاست علی نے اپنا آنسوؤں میں بھیگا چہرہ اٹھایا۔

''وہ۔ وہ کتے کا بچہ میری ریشماں کو گھور رہا تھا۔ میں چلایا۔ میں نے اسے واہ گرو کا واسطہ دیا پر وہ جانور بن چکا تھا۔

''یہ تو پیٹ سے ہے چاچا'' زخمی سکھ نے مایوسی کے عالم میں کہا۔ مجھے اچانک سکون محسوس ہوا۔

''دفع کر پھر۔ ختم کر دے۔ دیر ہوگئی ہے۔''

''نہیں، نہیں خدا کے واسطے نہ مارو۔'' میں چلایا۔ ''ہمیں جانے دو۔ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

زخمی سکھ میرے پاس آیا۔

''کیا بگاڑا ہے؟'' وہ دانت کچکچا کر بولا۔ ''یہ یہ کیا ہے۔'' اس نے اپنے خون آلودہ بھیانک چہرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں تو تیری نسلوں کو ختم کر دوں گا'' وہ واپس مڑا اور ریشماں کے سر پر پہنچ گیا۔

''چل حرامزادی۔ بس تیرے ساتھ اتنی ہی عیش کرنی تھی۔'' اس نے ریشماں کے منہ پر تھپڑ مار کے کہا۔ ریشماں خوف سے چلانے لگی۔

''نہیں، نہیں۔ مجھے نہ مارو۔ میرا بچہ نہ مارو''

''چپ کر'' وہ غصے سے بولا۔ ''تیرے بچے کا بھی بندوبست کرتے ہیں۔'' اس نے ریشماں کے پیٹ پر زور سے گوڈا مارا۔ ریشماں درد سے چلائی۔

''نہیں، نہیں۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ جس سکھ نے ریشماں کو پکڑا ہوا تھا اس نے اب اسے چھوڑ دیا تھا۔ ریشماں زمین پر دوہری ہوگئی تھی۔ وہ سکھ باقی دونوں سکھوں کی مدد کے لیے آ گیا۔ اس نے میرے سر کے بال پکڑ لیے۔

''رب کا واسطہ ہے میرے بچے کو نہ مارو۔ اور ریشماں گڑگڑائی۔ اس نے سکھ کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''میرے بچے کو نہ مارو''

''چپ کر حرامزادی۔'' اس نے ایک جھٹکے سے ریشماں کو زمین پر پھینک دیا۔ اور ایک ہی وار سے اس کی گردن بھی اتار دی۔

میری ریشماں کی ننگی لاش کھیتوں میں پڑی تھی۔ میرے سامنے۔'' ریاست علی کی آواز کپکپانے لگی تھی، مگر وہ رکا نہیں۔ کسی خودکار آلے کی طرح بولتا رہا۔

''وہ سکھ پھر بھی باز نہیں آیا۔ اس نے ریشماں کا پیٹ چاک کیا اور اس میں سے بچہ باہر نکال لیا۔ میرا بچہ میرے سامنے تھا۔ چھوٹا سا بالکل چھوٹا سا، گلابی گلابی۔ اس نے'اس نے ریاست علی کی سانس پھول گئی تھی۔ اس کا چہرہ بے بھیانک ہو گیا تھا۔ وہ دونون ہاتھ پھیلائے خلا میں گھور رہا تھا۔ ڈاکٹر ندیم خوف اور دکھ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اس نے میرے بچے کو زمین پر پھینکا۔ وہ بالکل نہیں رویا۔ چلا بھی نہیں۔ خاموش رہا۔ آخر کو مسلمان تھا۔ بہادر ماں کی اولاد تھی۔ سب کچھ خاموشی سے سہ گیا۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ میں اتنی دور سے اسے ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے صرف بازو، ٹانگیں اور سر نظر آ رہے تھے۔ اس ظالم نے اسی کرپان سے......خون آلودہ کرپان سے میرے بچے کے ٹوٹے کر دیے۔ چھوٹے چھوٹے۔ میں نے خوف اور دکھ سے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے باپو اور ریشماں کے مرنے پر آنکھیں بند نہیں کی تھیں پر۔ اپنے بچے کے مرنے پر۔ اس کے ٹوٹے ٹوٹے کرنے پر۔'' ریاست علی کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اس کا جسم عجیب طریقے سے جھٹکے کھا رہا تھا۔

’’فیر‘ فیر۔ اس کتے خبیث نے ایک ہاتھ سے میرا منہ پکڑ کر دبایا اور میرے منہ میں ایک بوٹی ڈال دی۔

’’لے کھا سور‘ کھا اسے۔‘‘ وہ بولا۔

’’جب مجھے پتہ چلا کہ وہ کیا ہے تو میں نے وحشت سے اسے تھوک دیا۔ میرے منہ سے میرے بچے کی بوٹی نکل کر زمین پر جا گری۔ پر میرے منہ میں نمکین ذائقہ موجود تھا۔ میں‘ میں‘ میں نے اپنے بچے کا گوشت کھایا ہے ڈاکٹر صاحب۔‘‘ ریاست علی چلایا۔ وہ تیزی سے آپریشن تھیٹر کی میز سے اترا اور اس نے ڈاکٹر ندیم کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔

’’میں نے اپنے بچے کا۔ چھوٹے سے بچے کا۔ گلابی گلابی گوشت کھایا ہے۔‘‘ وہ آنکھیں پھاڑے چلا رہا تھا۔ ’’میں نے‘ میں نے۔‘‘

اگلے ہی لمحے وہ چکرایا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ڈاکٹر ندیم اسے دہشت اور دکھ سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا جسم سن ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں ہلکے ہلکے آنسو تیر رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دوبارہ ہوش میں آنے پر ریاست علی دوبارہ پاگل ہو چکا ہو گا یا حواسوں میں ہو گا؟ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دوبارہ پاگل ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔

(تحریر شکیل زاہد۔ اردو ڈائجسٹ اگست 1998ء)

☆☆☆ختم شد☆☆☆

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

ا۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچایئے۔
۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجیے۔
۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔